زمانہ

مرتبہ دیانرائن نگم بی اے

جلد [illegible] | اپریل [illegible] | نمبر [illegible]

فہرست مضامین

تصاویر: مسز [illegible] ... پنڈت جواہر لال نہرو ... [illegible]

[illegible]

"ایسی ہولی میں آگ لگے۔"

اس درد بھری چھیڑ سے مایوس دل کی بنیا۔ ٹوٹے ہوئے تار کی طرح میں جھنا کر رہ گئی کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ سا بھر گیا۔ پرمدا کی حالتِ زار دیکھ کر آنسوؤں کا سمندر پہلے ہی متلاطم ہو رہا تھا۔ ذرا سی جنبش ہی سے تُلی ہوئی گھٹا کی طرح برس پڑا۔ جب رونے دھونے سے چھٹی ملی تو انل بن مالی کے بھائی سے پرمدا کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے بیٹھا۔ وہ پرمدا کی خصلت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسلئے اس کی خواہش تھی کہ وہ اُسے اپنے ساتھ ہی بنارس لیتا جائے۔ دین بابو بڑے منکسر مزاج اور روشن خیال آدمی تھے۔ انہوں نے بڑی ہمدردی کیساتھ جواب دیا۔ "مجھے تو ویسے کوئی عذر نہیں ہے۔ لیکن اس بارے میں ماں کی رائے لینا ضروری ہے!"

مصیبت کی ماری بڑھیا ماں نے روتے روتے کہا۔ "بیٹا! جب لال ہی کھو بیٹھی تو نصیبوں جلی بہو کو رکھ کر کیا کروں گی تم لوگ جیسا مناسب سمجھو کرو۔"

مغموم و مجبور ماں کی بات کا جواب دینا ہی مناسب سمجھ کر دونوں خاموش ہو رہے۔ دوسرے دن پرمدا کو ساتھ لیکر انل وہاں سے چل دیا۔ پرمدا ایک ایسی مرجھائی ہوئی کلی کیطرح دکھائی دیتی تھی جسے کوئی سنگدل ہاتھوں سے مل کر چھوڑ گیا ہو۔ وہ آج وہاں سے لٹ کر لوٹی تھی جہاں اس کے عزیز وں نے لُٹیرا اپنا سب کچھ کھو دینے کے لئے ہنستے کھیلتے بھیج دیا تھا۔

وقت کے مطابق سب کی بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ پرمدا اپنا رنج و غم بھولتی گئی۔ اور انل بھی پھر انہیں رنگ رلیوں میں کھو گیا۔ راگ رنگ کی اُجڑی ہوئی محفلیں پھر گرم ہو گئیں۔

(۲)

دورِ چوبے کا پیچھا ہو جانے پر اُن کی خوش سلیقہ بیوی سوشیلا نے اپنی بال بیوہ کمدنی کو سینہ سے لگا کر بڑے حُسن انتظام سے ڈھ دیتے ہوئے گھر کا بار سنبھال لیا تھا۔ چوبے کی یہی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسکی فکر میں وہ اپنی بیوگی کی ساری کلفتوں کو بھول گئی تھی۔ کمدنی کے عنفوانِ شباب کے فطری رجحان کو روکنے کی اگر دقیانوسی رسموں میں قدرت ہوتی تو تشویش کی ایسی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ لیکن اس کا حُسن ہلال کی طرح دن بدن نکھرتا ہی جاتا تھا اور اس کی تنہا اور شرکت سے محروم شباب اپنی شوخیاں دکھاتا تھا۔

کمدنی کے بچپن ہی سے پرمود اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ان دونوں کے گھر بھی پاس





هز اکسیلنسی لارڈ لنلتھگو گورنر جنرل و وایسرائے ہند

زمانہ

جلد ۶۵ — اپریل ۱۹۳۶ء — نمبر ۴

ادب کی غرض و غایت[1]

از منشی پریم چند بی۔ اے پریسیڈنٹ آل انڈیا پروگریسیو رائٹرس کانفرنس لکھنؤ

حضرات! یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا ابتدائی لٹریچر جو موجود ہے اس کا منشا خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرلے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے پائنیروں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کرکے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔ لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کرلی ہے کہ ہم زبان سے گذر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیونکر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً باغ و بہار اور بیتال پچیسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی اب اس قابل ہوگئی ہے کہ علم اور حکمت کے مسائل بھی ادا کرے۔

اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔ زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی۔ بول چال کی زبان تو میر امن اور للو لال کے زمانہ میں بھی موجود تھی۔ انھوں نے جس زبان کی داغ بیل

[1] ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء میں یہ مضمون صدارتی خطبہ کی حیثیت سے پڑھا گیا۔

ڈالی وہ تحریری زبان تھی، اور وہی ادب ہے۔ ہم بول چال سے اپنے قریب کے لوگوں سے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں، اپنی خوشی یا رنج کے جذبات کا نقشہ کھینچتے ہیں، ادیب وہی کام تحریر سے کرتا ہے، ہاں اس کے سننے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور اگر اس کے بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرنوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔ میرا یہ منشا نہیں کہ جو کچھ سپرد قلم ہو جائے وہ سب کا سب ادب ہے۔ ادب اُسی تحریر کو کہیں گے جس میں حقیقت کا اظہار ہو، جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو۔ اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو۔ اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہوں۔ طلسماتی حکایتوں یا بھوت پریت کے قصوں یا شہزادوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ہم کسی زمانہ میں متاثر ہوئے ہوں لیکن اب اُن میں ہمارے لئے بہت کم دلچسپی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت انسانی کا ماہر ادیب شہزادوں کے حسن و عشق اور طلسماتی حکایتوں میں بھی زندگی کی حقیقتیں بیان کر سکتا ہے، اور ان میں حسن کی تخلیق کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اسی حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ قصہ میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہو۔ پھر اُسے آپ جس پس منظر میں چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ چڑے کی حکایت یا گل و بلبل کی داستان بھی اس کے لئے موزوں ثابت ہو سکتی ہیں۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو، یا افسانوں کی، یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیئے۔ ہم جس دور سے گذرے ہیں اُسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخیلات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانۂ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستان خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے، اس میں کلام ہی نہ تھا، بلکہ وہ مسلم تھا۔ قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی، دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعراء پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انھیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی جدت اور جولانی کے معجزے دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی بندش، یا نئی تشبیہ یا نئی پرواز کا ہونا داد پانے کے لئے کافی تھا۔ چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی

بعید کیوں نہ ہو۔ یاس اور درد کی کیفیتیں، آشیانہ اور قفس، برق اور خرمن کے تخیل میں اس خوبی سے دکھائی جاتی تھیں کہ سننے والے دل تھام لیتے تھے، اور آج بھی وہ شاعری کس قدر مقبول ہے اسے ہم اور آپ خوب جانتے ہیں۔ بیشک شعر اور ادب کا منشا ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا ہے۔ لیکن انسان کی زندگی محض جنسی نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اور اُن سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود ہو یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو۔ ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ جنسیت انسان کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ اس قوم اور اس زمانہ کے لئے فخر کا باعث نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے صحیح مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔ کیا ہندی اور کیا اُردو شاعری، دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس وقت ادب اور شاعری کا جو مذاق تھا اُس کے اثر سے بے نیاز ہونا آسان نہ تھا۔ تحسین اور قدردانی کی ہوس تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔ شعرا کے لئے اپنا کلام ہی ذریعہ معاش تھا۔ اور کلام کی قدردانی رؤسا اور اُمرا کے سوا اور کون کر سکتا۔ ہمارے شعرا کو عام زندگی کا سامنا کرنے اور اس کی حقیقتوں سے متاثر ہونے کے لئے یا تو موقعے ہی نہ تھے۔ یا ہر خاص و عام پر ایسی ذہنی پستی چھائی ہوئی تھی کہ ذہنی اور شعوری زندگی رہ ہی نہ گئی تھی۔ ہم اس وقت کے ادیبوں پر اس کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ادب اپنے زمانہ کا عکس ہوتا ہے۔ جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں، وہی ادب میں بھی اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ ایسی پستی کے زمانہ میں یا تو لوگ عاشقی کرتے ہیں یا تصوف اور ویراگ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی شاعری اور ادب دونوں اسی قسم کے ہیں۔ جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس اور شکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجئے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی ہے اور اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اُس نے درجاتِ عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں، اور مشاہدے کی قوت غائب ہو گئی ہے۔

مگر ہمارا ادبی مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق اور عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے، ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے، وہ اب تحریک یا ابہام کیلئے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا، نہ قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا۔ بلکہ اس کو اُن مسائل

سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی فضیلت کا موجودہ معیار، جذبات کی وہ شدت ہے جس سے وہ ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہے صرف اُن کے طرز خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے ادب نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چن لیا ہے۔ ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا ہم پر جو کچھ گذرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخیل میں جاکر تخلیق ادب کی تحریک کرتی ہیں شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدت احساس ہوتی ہے اُتنا ہی اُس کا کلام دلکش اور بلند ہوتا ہے۔ جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو۔ روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے۔ جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا زمانۂ قدیم میں مذہب کے ہاتھ میں سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی۔ اور وہ تخویف یا تحریص سے کام لیتا تھا۔ عذاب و ثواب کے مسائل اُس کے آلۂ کار تھے۔ اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے۔ اور اس کا آلۂ کار ذوق حسن ہے۔ وہ انسان میں اسی ذوق حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو۔ ادیب میں یہ ذوق جتنا ہی بیدار اور پُر عمل ہوتا ہے اتنی ہی اُس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوت احساس کے ذریعے اس میں جذبۂ حسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے۔ غیر مستحسن ہے انسانیت سے خالی ہے، وہ اس کے لئے ناقابل برداشت بن جاتا ہے۔ پھر وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔ یوں کہئے کہ وہ انسانیت کا، ملویت کا، شرافت کا علم بردار ہے۔ جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت، اُن کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اُس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے۔ اور عدالت کے احساس حق اور انصاف اور جذبۂ حسن کی تائید کر کے اپنی کوشش کو کامیاب سمجھتا ہے۔ مگر عام وکلاء کی طرح وہ اپنے مؤکل کی جانب سے جا و بیجا دعوے نہیں پیش کرتا۔ مبالغہ سے کام نہیں لیتا، اختراع نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس عدالت کی تالیف قلب بھی ممکن ہے جب آپ

حقیقت سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں ورنہ عدالت آپ سے بدظن ہو جائیگی اور آپ کے
خلاف فیصلہ سنا دیگی۔ وہ افسانہ لکھتا ہے مگر واقعیت کے ساتھ۔ وہ ایک مجسمہ بناتا ہے مگر
س طرح کہ اس میں حرکت بھی ہو اور قوت اظہار بھی ہو، وہ فطرتِ انسانی کا باریک نظروں
سے مشاہدہ کرتا ہے، نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کے کیرکٹر ہر
الت میں اور ہر موقع پر اس طرح برتاؤ کریں جیسے گوشت پوست کے انسان کرتے ہیں۔
وہ اپنی طبعی ہمدردی اور حسن پسندی سے زندگی کے ان نکات پر جا پہونچتا ہے جہاں انسان
پنی انسانیت سے معذور ہو جاتا ہے۔ اور واقعہ نگاری کا رجحان یہاں تک بڑھا ہے کہ
ج کا افسانہ ممکن حد تک مشاہدے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم محض اس خیال سے تسکین نہیں
پاتے کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ سبھی کیرکٹر انسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ ہم یہ اطمینان چاہتے
ہیں کہ وہ واقعی انسان ہیں، اور مصنف نے حتی الامکان ان کی سوانح عمری لکھی ہے۔ کیونکہ تخیل
کے انسان میں ہمارا عقیدہ نہیں۔ ہم اس کے فعلوں اور خیالوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہمیں یہ
تحقیق ہو جانا چاہیئے کہ مصنف نے جو تخلیق کی ہے وہ مشاہدات کی بنا پر۔ یا وہ خود اپنے کیرکٹروں
کی زبان سے بول رہا ہے، اسی لئے ادب کو بعض نقادوں نے مصنف کی نفسیاتی سوانح عمری
کہا ہے۔ ایک ہی واقعہ یا کیفیت سے سبھی انسان یکساں طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ ہر شخص کی
ذہنیت اور زاویۂ نظر الگ ہے۔ مصنف کا کمال اسی میں ہے کہ وہ جس ذہنیت یا زاویۂ
سے کسی امر کو دیکھے ہمیں اس کا پڑھنے والا بھی اس کا ہم خیال ہو جائے۔ یہی اس کی
کامیابی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم ادیب سے یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیدار مغزی
سے اپنی وسعت خیال سے ہمیں بیدار کرے۔ ہم میں وسعت پیدا کرے۔ اس کی نگاہ اتنی
باریک اتنی گہری اور اتنی وسیع ہو کہ ہمیں اس کے کلام سے روحانی سرور اور تقویت حاصل ہو۔
بہتر بننے کی تحریک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح
چمٹی ہوئی ہیں جیسے جسمانی تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری بالکل غیر فطری۔ اسی طرح
اخلاقی اور ذہنی صحت بھی فطری بات ہے اور ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اسی طرح مطمئن نہیں
ہوتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ جیسے وہ ہمیشہ کسی طبیب کی تلاش میں رہتا ہے
اسی طرح ہم بھی اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی کمزوریوں کو پرے پھینک کر بہتر انسان بن
جائیں۔ اسی لئے ہم سادھوؤں اور فقیروں کی جستجو کرتے ہیں، پوجا پاٹ کرتے ہیں، بزرگوں کی صحبت

میں بیٹھتے ہیں، علماء کی تقریریں سنتے ہیں اور ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور ہماری ساری کمزوریوں کی ذمہ دار ہماری بدمذاقی اور محبت کے جذبہ سے محروم ہونا ہے۔ جس میں صحیح ذوقِ حسن ہے جس میں محبت کی وسعت ہے وہاں کمزوریاں کہاں رہ سکتی ہیں۔ محبت ہی تو روحانی غذا ہے اور ساری کمزوریاں اسی غذا کے نہ ملنے سے یا مضر غذا کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ ہم میں حسن کا احساس پیدا کرتا ہے اور محبت کی گرمی۔ اس کا ایک فقرہ، ایک لفظ، ایک کنایہ اس طرح ہمارے اندر جا بیٹھتا ہے کہ ہماری روح روشن ہو جاتی ہے، مگر جب تک آرٹسٹ خود جذبۂ حسن سے سرشار نہ ہو اور اس کی روح خود اس نور سے منور نہ ہو تو ہمیں یہ روشنی کیونکر عطا کر سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ حسن کیا شئے ہے؟ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حسن کے متعلق ہمیں کسی طرح کا شبہ نہیں ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع وغروب دیکھا ہے۔ شفق کی سرخی دیکھی ہے، خوشنما اور خوشبودار پھول دیکھے ہیں، خوشنوا چڑیاں دیکھی ہیں۔ نغمہ خواں ندیاں دیکھی ہیں، ناچتے ہوئے آبشار دیکھے ہیں، اور یہی حسن ہے۔ ان نظاروں سے ہماری روح کیوں کھل اٹھتی ہے؟ اس لئے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے۔ سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی دلکشی کا باعث ہے۔ ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوئی ہے۔ اور ہماری روح ہمیشہ اسی توازن، اسی ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹسٹ کی روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے۔ اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشوونما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں، وہیں استحکام ہے، زندگی ہے؛ جہاں ان کا فقدان ہے وہیں افتراق، خودپروری ہے، اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے۔ یہ افتراق غیر فطری زندگی کی علامتیں ہیں جیسی بیماری غیر فطری زندگی کی۔ جہاں فطرت سے مناسبت اور توازن ہے وہاں تنگ خیالیوں اور خودغرضیوں کا وجود کیسے ہوگا۔ جب ہماری روح فطرت کی کھلی ہوئی فضا میں نشوونما پاتی ہے تو خباثتِ نفس کے جراثیم خود بخود ہوا اور روشنی سے مرجاتے ہیں۔ فطرت سے الگ ہو کر اپنے کو محدود کرنے سے ہی یہ ساری ذہنی اور جذباتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اسی کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہی اس کا مقصدِ اولیٰ ہے۔

ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے۔ ادب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقتاً

ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو شاید وہ ادیب نہ ہوتا۔ وہ آئیڈیلسٹ ہوتا ہے، اُسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے اس کی روح بیقرار رہتی ہے۔ وہ اپنے تخیل میں فرد اور جماعت کو مسرت اور آزادی کی جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اُسے نظر نہیں آتی۔ اس لئے موجودہ ذہنی اور اجتماعی حالتوں سے اس کا دل بیزار ہوتا ہے۔ وہ ان ناخوشگوار حالات کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے تاکہ دنیا جینے اور مرنے کے لئے بہتر جگہ ہو جائے۔ یہی درد اور یہی جذبہ اُس کے دل و دماغ کو سرگرم کار رکھتا ہے، اُس کا حساس دل اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک جماعت کیوں معاشرت اور رسوم کے بندھنوں میں پڑ کر اذیت پاتی رہے۔ کیوں نہ وہ اسباب مہیا کئے جائیں کہ وہ غلامی اور عسرت سے آزاد ہو۔ وہ اس درد کو جتنی بیتابی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اتنا ہی اُس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو جس تناسب سے ادا کرتا ہے وہی اس کے کمال کا راز ہے۔ مگر شاید اس تخصیص کی ضرورت اس لئے پڑتی کہ ترقی کا مفہوم ہر ایک مصنف کے ذہن میں یکساں نہیں ہے۔ جن حالات کو ایک جماعت ترقی سمجھتی ہے انھیں کو دوسری جماعت عین زوال سمجھ سکتی ہے اس لئے ادیب اپنے آرٹ کو کسی مقصد کے تابع نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے خیال میں آرٹ صرف جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ ان جذبات سے فرد یا جماعت پر خواہ کیسا ہی اثر پڑے ترقی کا ہمارا مفہوم وہ صورت حالات ہے جس سے ہم میں استحکام اور قوت عمل پیدا ہو۔ جس سے ہمیں اپنی خستہ حالی کا احساس ہو، ہم دیکھیں کہ ہم کن داخلی اور خارجی اسباب کے زیر اثر اس جمود اور انحطاط کی حالت کو پہونچ گئے ہیں اور انھیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے لئے وہ شاعرانہ جذبات بے معنی ہیں جن سے دنیا کی بے ثباتی ہمارے دل پر اور زیادہ مسلط ہو جائے۔ جن سے ہمارے دلوں پر مایوسی طاری ہو جائے۔ وہ حسن و عشق کی داستانیں جن سے ہمارے رسائل بھرے ہوتے ہیں ہمارے لئے بے معنی ہیں اگر وہ ہم میں حرکت اور حرارت نہیں پیدا کرتے۔ اگر ہم نے دو نوجوانوں کے حسن و عشق کی داستان کہہ ڈالی، مگر اس سے ہمارے ذوق حسن پر کوئی اثر نہ پڑا، اور پڑا بھی تو صرف اتنا کہ ہم اُن کی ہجر کی تکلیفوں پر روئے تو اس سے ہم میں کون سی ذہنی یا ذوقی حرکت پیدا ہوئی ان باتوں سے کسی زمانہ میں ہم کو وجد آیا ہو مگر آج کے لئے وہ بیکار ہے۔ اس جذباتی آرٹ کا زمانہ اب نہیں رہا۔ اب تو ہمیں اُس آرٹ کی ضرورت ہے جس میں عمل کا پیغام ہو۔ اب تو

حضرت اقبال کے ساتھ ہم بھی کہتے ہیں :-

رمز حیات جوئی ؟ جز در تپش نیابی   در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را
بہ آشیاں نہ نشینم ز لذت پرواز   گہے بشاخ گلم گاہ برلب جو ئم

چنانچہ ہمارے مشرب میں داخلیت وہ شے ہے جو جمود و پستی اور سل انکاری کی طرف لے جاتی ہے، اور ایسا آرٹ ہمارے لئے نہ انفرادی حیثیت سے مفید ہے اور نہ اجتماعی حیثیت سے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کے میزان پر تولتا ہوں، بیشک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے۔ اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے۔ لیکن ایسی کوئی ذہنی، معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے۔ اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی ہے اور غم بھی۔ آسماں پر چھائی ہوئی شفق بیشک نہایت خوشنما نظارہ ہے، لیکن اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لئے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر کالی کالی گھٹائیں دیکھکر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھکر ہم اس لئے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی امید ہوتی ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی اسی لئے ہماری روحانی مسرت کا باعث ہے کہ اس سے ہمیں زندگی میں نمو اور تقویت ملتی ہے۔ فطرت کا قانون نمو اور ارتقا ہے، اور جن جذبات، کیفیات یا خیالات سے ہمیں مسرت ہوتی ہے، وہ اسی نمو کے معاون ہیں۔ آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کرکے اسباب اور حالات کو بالیدگی کے لئے ساز گار بناتا ہے۔

مگر حسن بھی اور چیزوں کی طرح مطلق نہیں، اس کی حیثیت بھی اضافی ہے۔ ایک رئیس کے لئے جو چیز مسرت کا باعث ہے وہی دوسرے کے لئے رنج کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک رئیس اپنے شگفتہ و شاداب باغچہ میں بیٹھکر چڑیوں کے نغمے سنتا ہے تو اُسے جنت کی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن ایک نادار لیکن باخبر انسان اس امارت کے لوازمے کو مکروہ ترین چیز سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغدار ہو رہی ہے۔ اخوت اور مساوات، تہذیب اور معاشرت کی ابتدا سے ہی آئیڈیلسٹوں کا زرّیں خواب رہی ہے۔ پیشوایان دین نے مذہبی اخلاقی اور روحانی بندشوں سے اس خواب کو حقیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ حضرت محمد سبھی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر اس مساوات کی عمارت کھڑی کرنی چاہی مگر کسی

کو کامیابی نہ ہوئی، اور آج اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفاوت جتنی بیدردی سے نمایاں ہے، شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ آزمودہ را آزمودن جہل است کے مصداق اب بھی دھرم اور اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس مساوات کی منزل پر پہنچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہی ہوگی۔ کیا ہم اس خواب کو پریشاں دماغ کی خلاقی سمجھکر اسے بھول جائیں؟ تب تو انسان کی ترقی اور تکمیل کے لئے کوئی آئیڈیل ہی باقی نہ رہ جائیگا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انسان کا وجود ہی مٹ جائے۔ جس آئیڈیل کو ہم نے تہذیب کے آغاز سے پالا ہے جس کے لئے انسان نے خدا جانے کتنی قربانیاں کی ہیں جسکی تکمیل کے لئے مذاہب کا ظہور ہوا، انسانی معاشرت کی تاریخ اسی آئیڈیل کے تکمیل کی تاریخ ہے، اسے مسلمہ سمجھکر ایک نہ مٹنے والی حقیقت سمجھکر ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے جہاں وہ مساوات محض اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے۔ ہمارے لٹریچر کو اسی آئیڈیل کو پیش نظر رکھنا ہے، ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ، عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہ محلسراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھی، جھونپڑے اور کھنڈر اس کی التفات کے قابل نہ تھے۔ انہیں وہ انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھتا تھا۔ اگر کبھی ان کا ذکر بھی کرتا تھا تو مضحکہ اڑانے کے لئے اس کی دہقانی وضع اور معاشرت پر ہنسنے کے لئے۔ اس کا شین قاف درست نہ ہونا یا محاوروں کا غلط استعمال ظرافت کا ازلی سامان تھا۔ وہ بھی انسان ہے، اس کے بھی دل ہے اس میں بھی آرزوئیں ہیں یہ آرٹ کے ذہن سے بعید تھا۔ آرٹ نام تھا اور اب بھی ہے، محدود صورت پرستی کا۔ الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا۔ اس کے لئے کوئی آئیڈیل نہیں ہے زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں ہے۔ بھگتی اور ویراگ اور تصوف اور دنیا سے کنارہ کشی اس کے بلند ترین تخیلات ہیں۔ اس کے نزدیک یہی معراج زندگی ہے، اس کی نگاہ ابھی اتنی وسیع نہیں ہوئی ہے کہ وہ کشمکش حیات میں حسن کا معراج دیکھے۔ فاقہ و عریانی میں بھی حسن کا وجود ہو سکتا ہے، اسے شاید وہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے لئے حسن حسین عورت ہے، اس بچوں والی غریب بے حسن عورت میں نہیں جو بچے کو کھیت کی مینڈ پر سلائے پسینہ بہا رہی ہے۔ اس نے طے کر لیا ہے کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں اور ابروؤں میں فی الواقعی حسن کا باس ہے، اُلجھے ہوئے بالوں،

ترک دنیا

پیڑیاں پڑے ہوئے ہونٹوں اور کملائے ہوئے رخساروں میں حسن کا گذر کہاں۔ لیکن یہ اسکی تنگ نظری کا قصور ہے۔ اگر اس کی نگاہ حسن میں وسعت آجائے تو وہ دیکھے گا کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں کی آڑ میں اگر نخوت اور خود آرائی اور بے حسی ہے تو ان مرجھائے ہونٹوں اور کملائے ہوئے رخساروں کی آڑ میں ایثار اور عقیدت اور مشکل پسندی ہے۔ ہاں اس میں نفاست نہیں، نمود نہیں، لطافت نہیں۔ ہمارا آرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھکر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اسکی خود پسندیوں اور چوچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیلزم کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا۔ اسے تو اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا۔

از دست جنون من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

یا

چو موج ساز وجودم ز سیل بے پرواست گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم

اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہ حسن عالمگیر ہو جائیگی۔ جب ساری خلقت اس کے دائرہ میں آجائیگی۔ وہ کسی خاص طبقے تک محدود نہ ہوگا۔ اس کی پرواز کے لئے محض باغ کی چہار دیواری نہ ہوگی، بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ تب ہم بد مذاقی کے متحمل نہ ہونگے۔ تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کر سکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں تب ہماری خود دار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔ تبھی ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کرکے خاموش نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق اور خودداری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ اُن کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔

ہمیں اکثر یہ شکایت ہوتی ہے کہ ادیبوں کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے یعنی ہندوستان کے ادیبوں کو۔ مہذب ملکوں میں تو ادیب سوسائٹی کا معزز رکن ہے اور وزرا اور امرا اُس سے ملنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں مگر ہندوستان تو ابھی تک قرون وسطی کی

حالت میں پڑا ہوا ہے مگر ادب نے صرف امرا کی دریوزہ گری کو ذریعۂ حیات بنا لیا ہو اور ان تحریکوں اور ہلچلوں اور انقلابوں سے بے خبر ہو جو سوسائٹی میں ہو رہے ہیں۔ اپنی ہی دنیا بنا کر اسمیں روتا اور ہنستا ہو تو اس دنیا میں اس کے لئے جگہ نہ ہونا انصاف سے بعید نہیں ہے۔ جب ادیب کے لئے موزوں طبیعت کے سوا اور کوئی قید نہیں رہی یا اسی طرح جیسے مہاتما پن کے لئے کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ اُن کی روحانی بلندی ہی کافی ہے تو جیسے مہاتما لوگ در در پھرنے لگے اسی طرح ادیب بھی لاکھوں کی تعداد میں نکل آئے۔ اسمیں شک نہیں کہ ادیب پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا، لیکن اگر ہم تعلیم اور طلب سے اس فطری جوہر میں اضافہ اور وسعت پیدا کر سکیں تو یقیناً ہم ادب کی زیادہ خدمت کر سکیں گے۔ ارسطو نے بھی اور دوسرے حکما نے بھی ادیبوں کے لئے سخت شرطیں عاید کی ہیں اور ان کی ذہنی، اخلاقی، روحانی، جذباتی تہذیب اور تربیت کے لئے اصول اور طریقے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ مگر آج تو ادیب کے لئے محض ایک رجحان کافی سمجھا جاتا ہے اور بس۔ اور کسی قسم کی تیاری کی اس کے لئے ضرورت نہیں۔ وہ سیاسیات یا معاشیات، یا نفسیات وغیرہ علوم سے بالکل بیگانہ ہو، پھر بھی وہ ادیب ہے۔ حالانکہ ادب کے سامنے آج کل جو آئیڈیل رکھا گیا ہے اس کے مطابق یہ سبھی علوم اس کے جزو خاص بن گئے ہیں اور اُس کا رجحان داخلیت یا انفرادیت تک محدود نہیں رہا۔ وہ نفسیاتی اور معاشی ہوتا جاتا ہے۔ وہ اب فرد کو جماعت سے الگ نہیں دیکھتا بلکہ فرد کو جماعت کے ایک حصہ کی شکل میں دیکھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ جماعت پر حکومت کرے، اُسے اپنے غرض کا آلہ بنائے۔ گویا جماعت میں اور اسمیں ازلی دشمنی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ جماعت کی ہستی کے ساتھ اس کی ہستی بھی قائم ہے اور جماعت سے الگ وہ صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں جنہیں بہترین تعلیم اور بہترین ذہنی قویٰ ملے ہیں ان کے اوپر سماج کی اتنی ہی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ جس طرح سرمایہ دار کو ہم غاصب اور جابر کہتے ہیں اس لئے کہ وہ عوام کی محنت سے خود زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اُسی طرح ہم اس ذہنی سرمایہ دار کو بھی پرستش کے قابل نہ سمجھیں گے جو سماج کے پیسے سے اونچی سے اونچی تعلیم پاکر اُسے خاصتاً اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ سماج سے ذاتی نفع حاصل کرنا ایسا فعل ہے جسے کوئی ادیب کبھی پسند نہ کریگا۔ اس سرمایہ دار کا فرض ہے کہ وہ جماعت کے فائدہ کو ذات سے زیادہ توجہ کے لایق سمجھے۔ اپنے علم و کمال سے جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانے کی کوشش کرے وہ ادب کے کسی صنف میں بھی قدم کیوں نہ رکھے اُسے اس صنف پر خصوصاً

اور عام حالات سے عموماً واقف ہونا چاہیئے۔ اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھیں، تو ہم دیکھیں گے کہ ایسا کوئی علمی، معاشی، تاریخی اور نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر ان میں تبادلۂ خیالات نہ ہوتا ہو۔ اس کے برعکس ہم اپنے مبلغ علم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے علمی پر شرم آتی ہے۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ حاضر طبیعت اور رواں قلم ہی ادب کے لئے کافی ہے۔ مگر ہماری ادبی پستی کا باعث یہی خیال ہے۔ ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار اونچا کرنا پڑیگا تاکہ وہ جماعت کی زیادہ قابلِ قدر خدمت کر سکے۔ تاکہ جماعت میں اُسے وہ درجہ ملے جو اُسکا حق ہے، تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبے سے بحث کر سکے اور ہم دوسری زبانوں اور ادیبوں کے دستر خوان کے جوٹھے نوالے ہی کھانے پر قناعت نہ کریں، بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں۔ ہمیں اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع کا انتخاب کر لینا چاہیئے اور اس موضوع پر عالمانہ عبور حاصل کرنا چاہیئے۔ ہم جس اقتصادی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں یہ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ہمارا معیار اونچا رہنا چاہیئے۔ اگر ہم پہاڑ کی چوٹی تک نہ پہونچ سکیں گے تو کمر تک تو پہونچ ہی جائیں گے جو سطح زمین پر پڑے رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر ہمارا باطن محبت سے منور ہو اور خدمت کا معیار ہمارے پیشِ نظر ہو جو اسی محبت کی ظاہری صورت ہے تو ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر ہم فتح نہ پا سکیں۔ جنہیں ثروت اور دولت پیاری ہے اُن کے لئے ادب کے مندر میں جگہ نہیں ہے۔ یہاں تو اُن اُپاسکوں کی ضرورت ہے جنہوں نے خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہو، جن کے دل میں درد کی تڑپ ہو اور محبت کا جوش ہو۔ اپنی عزت تو اپنے ہاتھ ہے۔ اگر ہم سچے دل سے جماعت کی خدمت کریں گے تو اعزاز و امتیاز اور شہرت سبھی ہمارے قدم چومیں گی، پھر اعزاز و امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے؟ اور اس کے نہ ملنے سے ہم مایوس کیوں ہوں۔ خدمت میں جو روحانی مسرت ہے وہی ہمارا صلہ ہے، ہمیں جماعت پر اپنی حیثیت جتانے کی، اس پر رعب جمانے کی ہوس کیوں ہو؟ دوسروں سے زیادہ آرام اور آسائش سے رہنے کی خواہش بھی ہمیں کیوں ستائے؟ ہم امرا کے طبقہ میں اپنا شمار کیوں کرائیں؟ ہم تو جماعت کے علم بردار ہیں، اور سادہ زندگی کے ساتھ اونچی نگاہ ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔ جو شخص سچا آرٹسٹ ہے وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنے قلب کے اطمینان کے لئے نمائش کی ضرورت نہیں، اس سے تو اُسے نفرت ہوتی ہے۔ وہ تو اقبالؔ کے ساتھ کہتا ہے:۔

مردم آزادم و آں گونہ غیورم کہ مرا   می تواں کشت بہ یک جام زلالِ دگراں

ہماری انجمن نے کچھ اسی طرح کے اصولوں کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھا ہے۔ وہ ادب و خریات و شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ ادب کو سعی او رعمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کا مدعی ہے۔ اُسے زبان سے بحث نہیں، آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے، حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ جو ادیب امرا کا ہے وہ امراء کا طرز بیان اختیار کرتا ہے، جو عوام الناس کا ہے وہ عوام کی زبان میں لکھتا ہے۔ ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کر دینا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو و نما پا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں، جبھی وہ فضا تیار ہوگی، جبھی ادب کے نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوگا۔ ہم ہر ایک صوبہ میں، ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں کھولنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہونچائیں یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ یہ ہماری ایجاد ہے، نہیں ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موجزن ہیں، ہندوستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالات روزگار نے پہلے ہی سے کر رکھی ہے۔ جا بجا اس کے انکھوئے بھی نکلنے لگے ہیں، اس کی آبیاری کرنا، اُس کے آئیڈیل کو تقویت پہونچانا ہمارا مدعا ہے۔ ہم ادیبوں میں قوت عمل کا فقدان ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے، مگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ابھی تک ہم نے ادب کا جو معیار اپنے سامنے رکھا تھا اُس کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی، فقدان عمل ہی اُس کا جوہر تھا۔ کیونکہ بسا اوقات عمل اپنے ساتھ تعصب اور تنگ نظری بھی لاتا ہے۔ اگر کوئی شخص پارسا ہو کر اپنی پارسائی پر غرہ کرے تو اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ پارسا نہ ہو کر رند ہو۔ رند کی شفاعت کی تو گنجایش ہے پارسائی کے غرور کی تو کہیں شفاعت نہیں۔ بہر حال جبتک ادب کا کام محض تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گا گا کر سلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا اُس وقت تک ادب کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی، وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے، مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے، ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اتریگا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی

سلہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن۔

شرابِ عشق

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی اے ایل ایل بی)

ایک دن میں نے کہا پیرِ مغاں سے روکر
بادۂ عشق سے محروم ہوں انساں ہوکر

آسماں بارِ امانت سے بہت ڈرتا تھا
میں نے معبود سے پیمانِ وفا باندھا تھا

دل مرا دیکھ کے پروانہ کو شرماتا ہے
ایسے کیڑے کے مقدر پہ بھی رشک آتا ہے

شعلۂ شمع محبت کا جو شیدائی ہو
جس نے دنیا میں فنا ہو کے بقا پائی ہو

حیف صد حیف مئے عشق سے محروم رہوں
فخرِ ہستی ہوں مگر فانی و معدوم رہوں

مدتوں دخترِ رز کا میں طلبگار رہا
خوب افشردۂ انگور سے سرشار رہا

اب ہوا اور سمائی ہے دلِ مضطر میں
بادۂ عشقِ حقیقی کا ہے سودا سر میں

اے کہ کونین کا حاصل ہے ترا جامِ شراب
بوالہوس کو سمِ قاتل ہے ترا جامِ شراب

مستیِ عشق کے اسرار بتادے مجھکو
ایک ساغر مئے الفت کا پلادے مجھکو

طلبِ عشق میں جب قلب کو صادق پایا
پیرِ میکش نے بصد لطف و کرم فرمایا

بادۂ عشق عجب بادۂ روحانی ہے
اس کے قطروں میں نہاں بحر کی طغیانی ہے

شیرۂ رز کی طرح یہ مئے گلفام نہیں
اس کی مستی کا ہے آغاز پر انجام نہیں

جو اسے پیتے ہیں دانائے رموزِ جاں ہیں
اسکی سرمستیوں پہ ہوش و خرد قرباں ہیں

اللہ اللہ نگۂ شوق نے کیا کیا دیکھا
اس کے ساغر میں رخِ یار کا جلوہ دیکھا

آبِ انگور تو اربابِ طرب پیتے ہیں
یہ وہ صہبا ہے جسے سوزِ طلب پیتے ہیں

بادۂ عشقِ حقیقی خمِ آزار میں ہے
پھول یہ جلوہ نما وادیِ پرخار میں ہے

چشمِ تر جب صفتِ ابرِ سیہ روتی ہے
جب گرہ تلخیِ دوراں کی بہم ہوتی ہے

دلِ پرداغ کی ہم سیر کیا کرتے ہیں
کنجِ تنہائی میں اس مے کو پیا کرتے ہیں

تو جو صہبائے محبت کا تمنائی ہے
کچھ غم و رنج سے بھی تیری شناسائی ہے

مئے الفت اسے دیتے ہیں جو رنجور بھی ہے
آتشِ غم میں تجلی سرِ طور بھی ہے

جناب برق دہلوی مرحوم

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

جدید اردو کے مایہ ناز شاعر منشی مہاراج بہادر برق دہلوی جن کا فروری ۳۶ء پانی پت میں دفعتاً انتقال ہو گیا۔ مجھ سے اوّل اور آخر مرتبہ کانپور کے آل انڈیا مشاعرہ واقعہ دسمبر ۳۵ء میں صرف چند منٹ کی ملاقات ہوئی تھی۔ گورے رنگ کے دُبلے پتلے آدمی تھے۔ چہرہ شگفتہ مگر صحت خراب معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قبل آپنے اپنے ۵؍ جولائی ۳۵ء کے خط میں لکھا بھی تھا:۔

"..... مگر افسوس ناسا عدت زمانہ سے بہت افسردہ و غمزدہ ہوں.... اور صحت بھی بہت خراب ہو گئی ہے برائے نام زندہ ہوں"

افسوس! اب اُس "برائے نام" زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ آپ کی بیوقت وفات سے اُردو کی بزم ادب میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے اُس کا بھرنا مشکل نظر آتا ہے۔ اگرچہ آپکی شاعری فی الجملہ بزمیہ شاعری ہے مگر کہیں کہیں درد و رقت کی تصویر کھینچنے میں بھی کمال دکھایا ہے۔ "یتیموں کی فریاد" کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

آوارۂ جہاں ہیں برباد خانماں ہیں ۔۔۔ بیزار زندگی ہیں قسمت کے نوحہ خواں ہیں
ہم سر سے پاؤں تک ہیں اک نقش نامرادی ۔۔۔ تصویر بیکسی ہیں روداد بیکساں ہیں
خانہ بدوش ہیں ہم حسرت فروش ہیں ہم ۔۔۔ ہم نالۂ مجسم سر تا بپا فغاں ہیں
غم سے شکستہ دل ہیں صدموں سے مضمحل ہیں ۔۔۔ ناروں سے جاں بلب ہیں فاقوں سے نیم جاں ہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھکر سنتا ہے جسکو عالم ۔۔۔ وہ درد کا بیاں ہیں وہ غم کی داستاں ہیں
غربت نصیب ہیں ہم خود اپنے ہی وطن میں ۔۔۔ جلجائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں

کہیں کہیں رزمیہ مضامین پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ تیغ ہندی نامی مسدس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تو وہ ہے بحر رواں جس سے روانی مانگے ۔۔۔ تیرا مارا ہوا میداں میں نہ پانی مانگے
چشم بد دور وہ بانکی ہیں ادائیں تیری ۔۔۔ ملک الموت بھی لیتا ہے بلائیں تیری
زخم دیدوں کے دم مرگ خبر لیتی ہے ۔۔۔ چادر خوں سے شہیدوں کو کفن دیتی ہے
فیصلہ کرتی ہے دو نوک وہ بے لاگ ہے تو ۔۔۔ خشک و تر سب کے جلانے کیلئے آگ ہے تو

وہ ہاں مانے ہوئے بیٹھا ہے زمانہ تیرا　　کہ لب زخم پر اب تک ہے فسانہ تیرا!

مختصر یہ کہ آپ کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی سطباعی کا یہ عالم تھا کہ فی البدیہ نظمیں اور غزلیں کہہ سکتے تھے۔ اصلاح دینے کا بھی ملکہ تھا، صاحب تلامذہ تھے۔ چنانچہ حضرت بیتاب بریلوی جیسے ممتاز شاعر و ادیب کو آپ سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔

آپ نے ابتداء میں ڈرامہ نویسی بھی اختیار کی تھی مگر وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ آپ نے ۲۵ر جولائی سنہ ۲۳ء کے خط میں لکھا تھا:۔

" ایک دو ڈرامے بھی لکھے ۔۔۔۔ اُنہیں سے ساوتری کئی بار اسٹیج پر کھیلا گیا۔ پسند عام ہوا۔ افسوس، اب اُس کا مسودہ تک میرے پاس نہیں، شائع نہ ہو سکا"

حُسن تخیل کے علاوہ حُسنِ اخلاق بھی تھا۔ میں نے مارچ سنہ ۲۳ء میں بلا کسی ذاتی تعارف کے فتحپور کے ایک مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ آپ نے جوابی خط میں تحریر فرمایا تھا۔

".. مزد تشریف آوری" کا ذکر فرما کر آپ نے ناحق مجھے محجوب کیا ہے۔ ایسی باتوں کا اظہار مراسم برادرانہ کے خلاف ہے جہاں ہم محض تفریح و دیگر مشاغل کے لئے صدہا روپیہ صرف کردیتے ہیں تو پھر ملاقات باہمی اور علمی دلچسپیوں کے خاطر کچھ صرف کردینا بارِ خاطر نہیں ہو سکتا"

کسی قدر زود رنج ضرور تھے مگر وہ جذبہ دیرپا نہ ہوتا تھا کیونکہ آپ کی فطری محبت بہت جلد اس پر غالب آجاتی تھی۔

برق صاحب سکینہ کایستھ تھے شاعری ترکہ میں ملی تھی، باپ اور ماں کے دونوں طرف سے۔ آپ کے والد کا نام منشی ہر نراین داس حسرت تھا۔ آپ کے نانا منشی دولت رام عبرت ایک بلند پایہ شاعر اور ملک الشعراء ذوق کے شاگرد تھے۔ برق کی والدہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر وہ ننھے شاعر کو روزانہ رامائن سنایا کرتی تھیں اُنہوں نے مثنوی گلزار نسیم کے چند اشعار بھی انہیں یاد کرا دیئے تھے۔ جیسے:۔

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون　　ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
شبنم کے سوا چرانے والا　　اُوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں ہو گل وہ داغ ہو جائے　　جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے!

قدرت کی سب سے بڑی دین یہ تھی کہ اُن کا جنم دہلی جیسے مشہور شہر میں ہوا تھا جس کی دلکش و لطیف فضا میں اب بھی اُردو شاعری کی گونج ہے۔ اسی شہر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس کی خاک

پاک سے میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، داغؔ، جیسے اساتذۂ فن اٹھے جن کا جواب مقابل شاید دنیا پیدا کر سکی نہ آئندہ پیدا کر سکے گی۔ ایسے مقام کے بود و باش سے تو خشک مزاجوں میں بھی رنگینی پیدا ہو سکتی ہے پھر اس وجود مسعود کا کیا کہنا جس کی سرشت ہی میں شاعری کا خمیر ہو اور جس کو وہاں رہتے پشتیں گزر چکی ہوں آپ کے خاندان کا اصلی وطن قصبہ سکیٹ ضلع ایٹہ ہے جہاں سے ان کے آباؤ اجداد اسلامی عہد میں دہلی جا کر بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر مامور ہو گئے تھے اور اس طرح دہلی کی سکونت بھی اختیار کر لی تھی۔

برقؔ صاحب جولائی ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے شاعرانہ آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ لکھنے کے قبل انہیں اشعار کے سننے میں لطف آتا تھا اور صدہا اشعار نوکِ زبان ہو گئے تھے وہ انہیں اپنی طفلانہ لہجہ میں مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ شاعری میں بھی ترقی ہونے لگی۔ باپ خود شاعر تھے اور ان کے شاعرانہ رجحان کی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اشعار سنکر خوش ہوتے اور کبھی کبھی اصلاح بھی دے دیتے تھے۔ باپ کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی۔ کیونکہ برقؔ اپنے پانچ چھ بھائیوں اور ایک بہن کی وفات کے بعد باپ کی ڈھلتی عمر میں پیدا ہوئے تھے۔ ادھر خود مجھے لکھا تھا:-

"بچپن کا زمانہ جیسے ناز و نعم میں گذرا وہ اطمینانِ قلب عمر کے کسی حصہ میں مجھے پھر نصیب نہ ہو سکا۔ مگر شعر و سخن کے معاملہ میں باپ نے بیٹے کی اس اندیشہ سے کہ مبادا تعلیم میں ہرج واقع ہو۔ زیادہ حوصلہ افزائی نہ کی مگر اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا کیونکہ تعلیم میں بھی فرق نہ آیا اور شاعری پر بھی ترقی ہوتی گئی۔ ۱۹۰۱ء میں انٹرنس پاس کیا اور اسکے ساتھ ہی اس قابل بھی ہو گئے کہ مشاعروں میں شریک ہو کر کلام کی داد پانے لگے۔

تعلیم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ فروری ۱۹۰۵ء میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چلتے ہوئے کام میں رکاوٹ پیدا ہو گئی اور برقؔ کو مجبوراً پڑھنا چھوڑ کر اسی دفتر میں ایک معمولی نوکری کرنی پڑی جس میں وہ بالآخر افسری کے عہدے تک پہونچ گئے مگر ملازمت کی مجبوریوں کے باوجود بھی شعر و سخن کا مشغلہ جاری رہا۔ پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں سپرنٹنڈنٹ کے ذمہ دارانہ عہدے پر ہوتے ہوئے بھی آپ اپنے فطری مشاغل سے باز نہ رہ سکے گو آپ کو عدیم الفرصتی کی ہمیشہ شکایت رہی انہیں مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے اپنے ۲۵ جولائی ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھا تھا۔

"حضرت داغؔ دہلوی سے ۱۹۰۲ء میں صرف چند غزلوں پر اصلاح لی تھی۔ جو پہلی غزل انہیں

ارسال کی تھی اس کا ایک مطلع اور ایک شعر یاد ہے جو حسب ذیل ہے:-

ہمارے خون کی مہندی لگاؤ دست خنجر میں — قسم ہو ایک ہوگے تم ہی تم نکلوگے محشر میں

سوال بوسۂ ابرو پہ جھنجلا کر کہا اُس نے — کوئی تلوار کا بھی نام لیتا ہو بھرے گھر میں

جناب داغ نے میرے ابتدائی کلام کی بہت حوصلہ افزائی فرمائی لیکن چونکہ خط و کتابت میں تاخیر ہوتی تھی۔ میں نئے نئے شوق کیوجہ سے جلد اصلاح کا تقاضا کرتا تھا اسلئے انہوں نے بخیال سہولیت مجھے افسرالشعراء حضرت آغا شاعر سے مشورہ کا حکم دیا.... جناب شاعر صاحب کیساتھ جو سب سے پہلی غزل دہلی کے ایک عظیم الشان مشاعرہ میں پڑھی تھی اس کا مطلع ابتک یاد ہے ؎

مثل شمشیر کھنچی جاتا ہے قاتل اپنا — خاک ارمان نکالے کوئی بسمل اپنا

یہ مطلع بہت مقبول ہوا تھا اور بہت داد ملی تھی...... دوسری غزل جو پھر ایک بڑے مشاعرہ میں پڑھی اُس کا مطلع اور ایک شعر یہ ہے:-

وفا ہیں کرکے تم سے بیوفائی دیکھنے والے — "ہمیں تو ہیں بھلائی میں برائی دیکھنے والے

نقاب اُلٹی صبا نے سامنے میرے تو فرمایا — کہ اب تو ہر طرح تیری بن آئی دیکھنے والے"

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ وہ پہلے فصیح الملک داغ اور پھر جناب آغا شاعر دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ مگر فی الحقیقت انکا تلمذ محض برائے نام تھا، اسلئے کہ شاگرد کا طرز تصنیف اُستادوں سے جداگانہ ہو چلا تھا اور وہ خود شاگردی کے درجہ سے تیزی کیساتھ گزرتا ہوا اُستاد بننے کے قابل ہو رہا تھا!

یہاں یہ بھی بتلا دینا ضروری ہے کہ باپ کا سایہ اُٹھ جانے کیوجہ سے برق صاحب کی تعلیم میں جو خامی رہ گئی تھی اُسے بھی اُنہوں نے اپنی دلی لگن اور اَن تھک کوشش سے پورا کر لیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا وہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات میں پرائیویٹ طور پر بیٹھ گئے۔ چنانچہ سنہ ۱۹ء میں ایف اے اور سنہ ۲۰ء میں بی اے پاس کر لیا۔ پھر سنہ ۲۲ء میں اپنے محکمہ کے "سب اکاؤنٹ سروس" کا امتحان پاس کیا جس سے آئندہ ترقی کا دروازہ کھل گیا۔ سرکاری ملازمت اور مشق سخن جاری رکھتے ہوئے بھی جس عجلت سے یہ سارے امتحانات پاس کئے اُس سے اُنکی غیر معمولی ذہانت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

شروع میں عام رواج کے مطابق آپ بھی صرف غزلیں لکھتے تھے۔ اسکے متعلق خود تحریر فرمایا

ما کہ
"میری سب سے پہلی نظم جو ۱۹۰۸ء میں رسالہ زبان دہلی میں شائع ہوئی تھی وہ "کارِ خیر" ہے۔
اس نظم نے غیر معمولی مقبولیت و شہرت حاصل کی اور فی الحقیقت میری نظم نگاری اور شہرت
کا بنیادی پتھر ہے۔ اس سے قبل میری شاعری مشقِ غزل تک محدود تھی"
یہ نظم اسقدر مقبول ہوئی کہ کئی بار علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں چھاپی گئی۔ نظم نہایت دلکش، مؤثر
درد پُر شکوہ ہے۔ پہلے ہی مصرعہ میں شاعر پوچھتا ہے ع بتا اے خاک کے پتلے کہ دنیا میں کیا کیا؟
سوالات کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے اور ہر سوال ایک سبق آموز جواب رکھتا ہوا معلوم
ہوتا ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:۔

شریکِ دردِ دل ہو کر کسی کا دکھ بٹایا ہے — مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے
پرائی آگ میں پڑ کر کبھی دل بھی جلایا ہے — کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اٹھایا ہے
کبھی آنسو بہائے ہیں کسی کی بدنصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ہے مفلس کی غریبی پر

کبھی امداد دی تو نے کسی بیکس بچارے کو — سخی بنکر دیا کچھ تو نے مفلس کے گزارے کو
تسلی دی کبھی تو نے کسی آفت کے مارے کو — کبھی تو نے سہارا بھی دیا ہے بے سہارے کو؟
کبھی فریاد رس بنکر خبر لی بے نواؤں کی
لگی ہے چوٹ بھی دل پر صدائے گداؤں کی

لطف یہ ہے کہ شاعر ایک ہی بات کو مختلف طریقہ پر بیان کرتا ہے مگر اس طرح کہ نظم کی شگفتگی
میں فرق نہیں آتا۔
اِسی قبیل کی اور نظم "راجہ اج کا ولاپ" ہے جو زمانہ بابت ماہ جون ۱۹۱۳ء میں چھپی تھی۔
اندُمتی ایک بد دعا کے سبب آسمانی مالا کے گرنے سے دفعتاً مر جاتی ہے اور راجہ دفعت ماتم
کرتا ہے۔ زورِ بیان اور رنگِ تاثیر ملاحظہ ہو:۔

اُف اُف یہ دردناک صدا کس غضب کی تھی — آوازِ دلخراش یہ کس جاں بلب کی تھی
کیا وجہ یہ شکستِ خموشیٔ شب کی تھی — یہ آہِ دل گداز کس ایذا طلب کی تھی
یہ کون چپ ہوا نفسِ سرد کھینچ کر
دی کس نے جان نالۂ پُردرد کھینچ کر؟

اے جوشِ اضطراب بتا ماجرا ہے کیا | بیتاب کیوں ہے اے دلِ دردآشنا ہے کیا
اے فرطِ غم یہ حادثۂ جانگزا ہے کیا | اے چشمِ نم یہ منظرِ حسرت فزا ہے کیا

حیرت بتا کہ نقش بدیوار کیوں ہوں میں
اے فرطِ یاس اجان سے بیزار کیوں ہوں میں

مجموعۂ خیالِ پریشاں تو یہ نہیں | ہنگامۂ تصورِ ہجراں تو یہ نہیں
نیرنگِ خواب دیدۂ حیراں تو یہ نہیں | فتنہ طرازیِ غمِ پنہاں تو یہ نہیں

وہم غلط نہ ہو کہیں عین الیقیں مجھے،
دھوکا نہ دے رہی ہوں نگاہیں کہیں مجھے؟

آخری بند شاعرانہ اعتبار سے تعریف سے مستغنی ہے۔

گر یہ نظم اُس وقت کی ہے جب نازک خیال شاعر کو نظمیں لکھتے ہوئے تقریباً پانچ سال ہو چکے تھے اور اُنہیں پختہ مشقی کی جھلک آچلی تھی۔ دراصل شاعر کی پہلی ہی نظم حسنِ تخیل و چستی بندش کے لحاظ سے بعد کی نظموں کا پیش خیمہ تھی اور اُسی کے پیچھے ہی لوگوں کو برقؔ صاحب کی قابلیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ انکی نظموں کے لئے زمانہ، ادیب، مخزن وغیرہ مشہور ادبی رسالوں کے صفحے کھلے رہتے تھے۔ غرض برقؔ شعرائے اُردو کے اوّلیں صف میں جگہ پانے کے اہل بن رہے تھے۔ نظم کیسا تھ ہی غزلوں کا سلسلہ بھی جاری تھا مگر موضوع کے اعتبار سے غزلیں بھی نظموں کی روش ہی پر جارہی تھیں۔

آپ کی نظموں کا مجموعہ "مطلعِ انوار" ۱۹۲۹ء میں شائع ہو کر اُردو کی دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ غزلوں کی اشاعت کے متعلق آپنے ۲۵ر جولائی ۱۹۳۲ء کے خط میں لکھا تھا:۔

"غزلوں کا دیوان بھی تقریباً مرتب ہے۔ فرصت ملنے پر ایک نظر ڈال کر پریس میں بھیجونگا مگر فرصت کے لمحے میرے لئے عنقا صفت ہیں۔"

یہ مجموعہ "تجلیاتِ برقؔ" کے نام سے چھپنے والا تھا۔ افسوس مرگِ بے ہنگام نے اس حسرت کو پورا نہ ہونے دیا۔

"مطلعِ انوار" مذہبی، سماجی، تاریخی، نیچری طرح کی نظموں کا مجموعہ ہے یوں تو سبھی نظمیں قابلِ قدر ہیں لیکن مجھے ۲ نظمیں خاص طور پر پسند ہیں یہ دونوں اچھوت اُدّھار پر ہیں۔

یک تاریخی ہے جسیں شاعر نے مہاراجہ رامچندر اور شبری کے ساتھ حسن سلوک کی مثال کو ہمارے سامنے رکھتے ہوئے اپنی بات میں زور پیدا کیا ہے۔ دو بند درج ذیل ہیں۔ رامچندر جی بن باس کی حالت میں گھومتے ہوئے اچھوت شبری کے جھونپڑے میں پہونچتے ہیں۔ شبری عقیدت اور روحانی مسرت کیساتھ بیر لاکر انکے سامنے رکھتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:-

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا وارفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا
ڈوبے ہوئے تھے بیر محبت کے جوس میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں

ہے رسم محبت کی زمانے سے نرالی بھگتی کبھی تاثیر سے ہوتی نہیں خالی
منظور کیا رام نے یہ تحفۂ عالی بنیاد جہاں میں محبت اودھار کی ڈالی
لے کوشش اچھوتوں کو گلے ہم بھی لگائیں
اس پریم کے افسانے کو آدرش بنائیں

اب دوسری نظم کا پہلا بند اور کچھ متفرق اشعار دئے جاتے ہیں۔ نظم مسدس ہے اور اسکا عنوان ہے "اچھوتوں سے نفرت فضول ہے"

سب کیلئے ہی یکساں قدرت کا فیض جاری مفلس ہو یا تونگر راجہ ہو یا بھکاری
ٹوٹی سی جھونپڑی ہو یا قصر کا مگاری دونوں پہ مہر انور کرتا ہے جلوہ باری
ہیں خاک بوس کرنیں مہتاب ضوفشاں کی
ہر گھر میں روشنی ہے قندیل آسماں کی

تفریق جو ہے قائم یہ غیر قدرتی ہے اسفل بھی آدمی ہے، افضل بھی آدمی ہے
زیبا نہیں کسی سے بیجا سلوک کرنا منہ سے اچھوت کہنا، نفرت سے نام دھرنا
تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی
اس خاک کے ہیں پتلے بھارت کے بچے ہیں سب گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب!

یہ نظم کس مؤثر پیرائے پر شروع کیگئی اور کسقدر صاف، سادہ اور مدلل ہے۔ اچھوت اودھار کیلئے اس سے زیادہ پر زور اپیل ہو ہی نہیں سکتی آخری شعر تو بڑے ہی حرکہ کا اور دل میں اتر جانے والا ہے۔ بیشک ہم سبھی بھارت ماتا کی دلاری سنتان ہیں، قدرتاً سب میں برادرانہ محبت

و مساوات ہونی چاہیئے۔

مذکورہ نظموں میں پہلی [illegible]ء اور دوسری [illegible]ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ وہ وقت اچھوت اُدھار کی موجودہ تحریک سے برسوں پہلے کا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ برقؔ صاحب میں ابتدا ہی سے کتنی فراخدلی اور رواداری تھی اور اُنکی نگاہ کتنی دوراندیش تھی!

"میرا بائی" کی نظم بھی نہایت پُرلطف ہے اسکی روحانیت پر بے اختیار دل وجد کرنے لگتا ہے: نظم تاریخی اور مذہبی ہے۔ اُسمیں وہی سادگی اور روانی ہے جو بھگتی سے بھری ہوئے سیدھے سادے دل میں ہو سکتی ہے۔ واقعہ نگاری کیساتھ ہی مختلف جذبات کو منظوم کرنا کمال شاعری ہے۔

بھگوان کو رجھانا سہل نہیں۔ وہ اپنے بھگت کی آزمایش ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ سختی کیساتھ کرتے ہیں اور بالآخر جب وہ مطمئن ہو کر ریجھ جاتے ہیں تو پھر بھگت کی ساری مشکلیں دور کر کے اُس کے دل کو ہر طرح کی روحانی اور مادی خوشیوں سے بھر دیتے ہیں۔

میرا کو کرشن جی کا عشق تھا۔ اُسکی پُرجوش بھگتی کا بکھان سُنکر خود شہنشاہ اکبر اعظم تان سین کے ساتھ آنکلے بن جاتا ہے اور میرا کی محویت پر وارفتہ ہو کر مؤدبانہ عرض کرتا ہے:۔

اے دیوی! کرشن مراری کو ہم بھینٹ چڑھانے آئے ہیں
تیرے روحانی نغموں سے کھنچکر دیوانے آئے ہیں،
ہے یہ ہیروں کی مالا ہے یہ ادنےٰ نذر ہماری ہے
کر ارپن اُس کی سیوا ہے تو جس کی پریم بھکاری ہے

معصوم میرا اکبر کے ہاتھ سے مالا لیکر مورت کے گلے میں ڈالدیتی ہے۔ راناؔ سنتا ہے اور مشتعل ہو جاتا ہے۔ میرا کیلئے یہ سزا تجویز ہوتی ہے کہ اُس کے پاس زہر بھرا پیالہ بھیجا جاتا ہے۔ بنی درتا میرا خوشی سے پی لیتی ہے مگر اُس پر زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ راناؔ اُسے جلاوطن کرتا ہے۔ میرا وہاں سے رخصت ہو کر سیدھے بھگوان کرشن کے برنداؔبن دھام میں چلی جاتی ہے اور وہاں بھی اپنا وہی پُرانا راگ چھیڑتی ہے۔

برندابن سارا گونج اُٹھا جوگن کی مست صداؤں سے
درشن کو لوگ اُمنڈ آئے شہروں سے گاؤں گاؤں سے

رفتہ رفتہ میرا کی بھگتی کا اتنا شہرہ ہوتا ہے کہ راناؔ خود متاثر ہو کر فقیر کا بھیس بنا کر فرط عقیدت سے اُس کے پاس جا کر یوں کہتا ہے:۔

رانا نے کہا اے پریم لتا — میں تیرا دل سے خادم ہوں
سرزد جو خطائیں مجھ سے ہوئیں — سو دل سے ان پر نادم ہوں

یہ سنکر میرا کا نرم و نازک دل پگھل جاتا ہے۔ وہ رانا کو معاف کر دیتی ہے۔ اس کا گلا رقت سے بھر جاتا ہے، بول نہیں سکتی مگر شاعر کے الفاظ میں۔

بیساختہ دونو ہاتھ اپنے — رانا کے گلے میں ڈالدئے
آدرش دکھایا بھگتی کا — سب شکوے دل سے نکالدئے

بیشک بھگتی کا آدرش (معیار) یہی ہے کہ دل میں پریم کے سوا اور کسی کی گنجائش ہی نہ ہو ایسے دل میں شکوے کے خیال کا گزر تو وہاں ہو ہی نہیں سکتا۔

بھگتی کے ایسے ہی آدرش کو سیتا جی نے بھی پورا کر دکھایا تھا۔ برق نے سیتا جی (اشوک بن میں) کے عنوان سے بھی ایک نظم لکھی تھی جو اگست ۱۹۳۸ء کے ادیب میں شائع ہوئی ہے۔ اسکے چند اشعار بھی درج ذیل ہیں۔ باکمال شاعر کو سیتا جی کی جسمانی اور جذباتی تصویر کھینچنے میں جو کامیابی ہوئی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے:-

سراپا یاس کی صورت مجسم نقش حیرانی — کھڑی ہیں سنگوں زیر شجر سیتا مہارانی
پریشاں تا کمر ہیں موئے سر بیگانۂ تزئین — لباس جوگیا ہے پردہ دار جسم نورانی
برستا ہے ملال دلنشیں مغموم چہرے سے — نگاہ مضطرب ہے ترجمان درد پنہانی
ہجوم درد میں پنہاں ہو جیسے شعلۂ آتش — نہاں الجھے ہوئے بالوں میں یوں ہے نور پیشانی
قد موزوں جو تھا بوٹا سا اعضائے تناسب — نظر آتا ہے اب کاہیدگی سے سرو طولانی

سیتا جی کی زبانی

یہ کن کرموں کا بدلا لے رہا ہے او فلک مجھ سے — یہ کن پاپوں کے کارن ہوں گرفتار پریشانی
غضب ڈھایا اکیلا پاکے مجھکو دشٹ راون نے — دیا دھوکا خلاف رسم آئین جہانبانی
پتی ورت دھرم سے لیکن گرا سکتا نہیں مجھکو — میں ستونتی ہوں میں کر کے رہونگی اپنی من مانی
زمین و آسماں زیر و زبر ہو جائیں ممکن ہے — مگر یہ غیر ممکن ہے نہوں لنکا کی پٹ رانی
سری رگھناتھ جی ہیں پرش اور میں انکی چھایا ہوں — ازل کے دن سے ہے میرا تعلق جسمی و جانی

اس بند کا حسن محاکات ملاحظہ ہو۔ سداماں کرشن جی کے ہم سبق تھے۔ افلاس سے تنگ آکر دستگیری کی امید میں کرشن جی کے یہاں جاتے ہیں کرشن اسوقت چوسر کھیل رہے

تھے مگر۔

سُنا جب لکشمی پت نے تو ہو کر بیقرار اُٹھے ... طلائی تخت سے چشم سراپا انتظار اُٹھے
رہی چوسر کے پانسوں کی نہ سُدھ بے اختیار اُٹھے ... فدا ہونیکو ٹوٹے یار پر پروانہ وار اُٹھے

جھپکتے ہی پلک حیراب نظارہ نگاہیں تھیں
سُدا ماں کے گلے کا ہار منموہن کی باہیں تھیں

نظم سراپا سبق آموز ہے اور ہمارے دیرینہ اخلاق و مراسم پر روشنی ڈالتی ہے۔

جگنو پر علامہ اقبال کی نظم بڑی مشہور اور لاجواب ہے جسمیں شاعر نے تشبیہات واستعارات کا عدیم المثال نمونہ پیش کرتے ہوئے آخر میں ایک فلسفیانہ نکتہ کی نہایت کامیاب تشریح کی ہے۔ برقؔ کی جگنو والی نظم میں وہ بات نہیں، مگر اُسکی خصوصیت نئی نئی تشبیہوں کی تلاش میں ہے جن سے ہیں اور جن سے نظم میں خاصی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

محو پروانہ یہ لعلِ یمنی ہے شاید ... اُڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہو شاید
کسی ناشاد کی آہوں کا شرارا تو نہیں ... آسماں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں

شوخیوں میں ہیں تری برقِ نظر کے انداز ... تیری پرواز میں ہیں رقصِ شرر کے انداز
تیرے جلوے سے منور ہوا صحنِ گلشن ... تو ہے وہ شمع کہ ہے موجِ ہوا پر روشن

آخری شعر خوب ہے۔ گلشن کی وسیع فضا میں ہوا کا بہنا بالکل قدرتی امر ہے۔ ساتھ ہی جگنو کی چمک سے اُجالا بھی ہو رہا ہے۔ پس شاعر نے جگنو کو ہوا میں جلنے والا چراغ کہکر بجا فرمایا۔

"جوشِ بہار" والی نظم میں بھی شاعر نے ایسے چُن چُن کر الفاظ رکھے ہیں کہ نظم میں موسیقیت ہوگئی ہے جو شاعری کی جان ہے۔ پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہار کی لہر رگ رگ میں دوڑ رہی ہے اور نہیں وہ رَس بھر رہی ہے جس سے بہار کے آتے ہی ساری کائنات تر و تازہ ہے۔ غضب کی تحریک اور جانفزائی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

گھرا ہوا سرِ فلک جو ابر قطرہ بار ہے ... خزاں پہ اوس پڑگئی۔ چمن چمن بہار ہے
گلوں کے روئے صاف پر کمال کا نکھار ہے ... ورق ورق ہے خوشنما، نظر نظر نثار ہے

جمی تھی برگ برگ پر جو گرد اب وہ دھل گئی
کلی کلی نکھر گئی گرہ دلوں کی کھل گئی

نمو کا آشکار ہے بسا یہ خاک سے نشاں ... بچھا ہے فرش مخملی گیاہِ نو سے ہے عیاں

اُگل رہی ہے لعل اب زمینِ باغ بیگماں | روش روش کھلے ہیں گل چمن ہے دلکش جناب

کلی ہے نیم وا کوئی دلھن ہے با حجاب میں

کھلا ہوا ہے نیم رخ، ہے نیم رخ نقاب میں

مطلع انوار میں قدرتی مناظر پر عمدہ عمدہ نظمیں ہیں مگر اس کے جوڑ کی بہت کم ملیں گی۔

ایک اور نظم "دو رنگی زمانہ" ہے جسمیں شاعر نے دنیا کی دو رنگی پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ نظم کے آخری حصے میں دنیوی حالت کا تغیر دکھلاتے ہوئے انسانوں میں یقینی اور حقیقی مساوات کے دکھلانیکی کوشش کی گئی ہے:۔

دو رنگیِ دنیائے دوں کے تماشے | دکھاتی ہو گردش یہاں ہر کسی کو

نزاکت سے پھولوں میں کٹتا ہو کوئی | میسر ہے کانٹوں کا بستر کسی کو

کوئی خاک افتادہ و بینوا ہے | میسر ہے اورنگ و افسر کسی کو

مگر کوئی سلطاں ہو یا بینوا ہو | مہم ایک درپیش ہے ہر کسی کو

تقابل کے خیال سے ویسی باتوں کا انتخاب بہت موزوں ہوا ہے۔ زبان صاف اور طرز شاعرانہ ہے۔ پوری نظم میں ایک ہی رنگ ہے۔

برق نے منظوم ترجمے بھی کئے ہیں جنھیں انہیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہاں پر نمونہ ملک الشعراء ٹیگور کی گیتانجلی کی چند نظموں کے ترجمے ہدیۂ ناظرین ہیں۔

عُروسِ مرگ

جب روزِ موت آن کے دَر کھٹکھٹائے گی

کیا پیشکش وہ گھر سے ترے لیکے جائے گی؟

نذرِ اجل کروں گا متاعِ حیات میں | جانے نہ دوں گا اُسکو کبھی خالی ہات میں

ثمرہ جہاں میں جو مری عمرِ رواں کا ہے | حاصل جو میری کشتِ بہار و خزاں کا ہے

وقتِ اخیر سامنے اُسکے دھروں گا میں | سب کچھ عروسِ مرگ پہ صدقے کروں گا میں

تو پاک ہاتھ جب مجھے لگاتا ہے | خوشی سے دل مرا پھولا نہیں سماتا ہے

بول تک آتا ہے وہ ساز جوشِ مستی میں | ہر نغمہ جو نہاں ہے سازِ ہستی میں

جلوۂ صبح سے چمکے گا ستارا میرا | تیرگی رات کی جب نور سے شرمائے گی

تیری آواز بھی پھر مثلِ شعاعِ خورشید | سات پردوں سے ضیا بنکے نکل آئے گی

اشعار بالا کی لطافت پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ اصلی نظمیں تو اس شاعرِ اعظم کی ہیں جس کی آج کل دنیائے شاعری تقلید کر رہی ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ برق نے بڑی سادگی سے کام لیتے ہوئے شاعر کے اصلی خیالات کو اس طرح واضح کر دیا ہے جس سے ترجمہ میں دلکشی اور کچھ اوریجنلٹی بھی آگئی ہے اور یہی ترجمہ کی کامیابی ہے۔

برق صاحب کا کلام وقتی سیاسیات سے قطعی مبرّا ہے۔ اگرچہ واقعی

نیرِ اقبال چمکے گا ہمارا ایکدن ۔۔۔ اوج پر اس دیش کا ہوگا ستارا ایکدن

لکھنے والے کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا قلب حب الوطنی سے خالی تھا مگر ناموافق حالات سے مجبوری ہو جاتی ہے۔

آخر میں برق کی غزلوں کے بھی کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں:۔

ہم نہ کہتے تھے مریضِ غم کا حال اچھا نہیں ۔۔۔ دیکھتے ہی غش تجھے اے چارہ ساز آ ہی گیا
عشق جب صادق ہوا تو بڑھ گیا عجز و نیاز ۔۔۔ حُسن جب کامل ہوا تو عجز و ناز آ ہی گیا

کتنے عمدہ اور معنی خیز اشعار ہیں۔ پہلے شعر میں مریض کو دیکھتے ہی چارہ ساز کا بیہوش ہو جانا مریض کی انتہائی نازک حالت کا مظہر ہے۔ شاعر کا طرزِ بیاں بھی ابتدا ہی سے کتنا زوردار ہے کہ آخر میں چارہ ساز کی غشی پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا۔ دوسرے شعر میں ایک امرِ واقعہ کا شاعرانہ ذکر ہے۔

کعبہ و بتخانہ کیوں مسجود ہونا چاہئے ۔۔۔ لاتعین کس لئے محدود ہونا چاہئے؟
جوشِ ہمت کا تقاضا ہے یہ اک اک گام پر ۔۔۔ صرفِ راہِ منزلِ مقصود ہونا چاہئے

پہلے شعر میں ایک فلسفیانہ سچائی کو شعر کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ واقعی جب خدا ہر جگہ ہے تو ہمیں کیا حق ہے کہ خود غرضانہ طور پر اُسے محدود کریں؟ دوسرے شعر میں اُسی سچی ہمتِ مردانہ کا ذکر ہے جو انسان کو منزلِ مقصود کی طرف برابر بڑھائے لئے جاتی ہے اور کبھی قدم پیچھے نہیں سرکنے دیتی۔

مجھ سے سہواً بھی خطا ہو تو لرز جاتا ہوں ۔۔۔ خونِ انصاف جو کرتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں
حُسن اور حسن میں قایم ہے مراتب کا لحاظ ۔۔۔ وہ جفا کرتے ہیں ہم شکرِ جفا کرتے ہیں

پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ مجھ سے تو انجان میں بھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو کانپ جاتا ہوں، پھر پتہ نہیں کہ جان بوجھ کر انصاف کا خون کرنے والے جیسے بُرے خطا کاروں کی کیا

حالت ہوتی ہے یا وہ کیسے اتنی زیادہ جرأت کرسکتے ہیں۔ دوسرا شعر تغزل اور حسن تخیل کا ایک نادر نمونہ ہے۔ معشوق کا شیوہ ظلم کرنا اور عاشق کا فرض اُسے بخوشی برداشت کرنے سے شکر گذار ہونا ہے۔

داغ الفت سے اُجالا خانۂ دل میں ہے ۔۔۔ روشنی اس شمع کی تاریک منزل میں ہے
برق حُسن یار اتنی کس لئے ہے بیقرار ۔۔۔ یہ مری آنکھوں میں ٹھہرے یہ مرے دل میں رہے

دوسرا شعر بڑے معرکہ کا ہے۔ بجلی کی تڑپ مشہور ہی ہے جسے ٹہلنے کے لئے شاعر اُسے آنکھوں اور دل میں آکر ٹھہر جانے کی دعوت دیتا ہے۔ اُسے خود جل جانے کا ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے انتہائی عشق کی دلیل سمجھئے۔ دونوں شعروں میں معرفت کی چاشنی ہے۔

دم زدن میں ہو الٹے عالم فانی کا سفر ۔۔۔ کھل گیا راز کہ ہستی سے عدم دُور نہیں
اُسکے پرتو سے ہے جذبات کی دُنیا آباد ۔۔۔ آنکھ سے دُور ہے وہ دل سے مگر دُور نہیں

پہلے شعر میں شاعر کس اختصار کیساتھ ہستی سے عدم کا دور ہونا ثابت کرتا ہے اور ثبوت میں وہ اتنا ہی کہدینا کافی سمجھتا ہے کہ ایسی طول و عرض والی دنیائے ناپائدار کا سفر جسمیں بہت زیادہ وقت لگنا چاہیے تھا، آن واحد میں طے ہوگیا۔ دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ چاہے خدا آنکھ سے اوجھل ہو مگر دل سے دور نہیں، کیونکہ دل جذبات کی دنیا صرف اُسی کے دم سے آباد ہے ورنہ اُجاڑ ہی ہوتی۔ ثبوت یقین ہے۔ جذبات کی دنیا آباد بہترین بندش ہے جسمیں روحانیت کا شائبہ۔ ہم دکھا چکے کہ برق دہلوی کی شاعری کتنی بلند پایہ ہے۔ اگرچہ فی الجملہ ہم اُن کی نظموں کو غزلوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

آپ کی عوام میں تو قدر تھی ہی، راج درباروں میں بھی کافی عزت ہوئی تھی۔ دسمبر سنہ میں دہلی کے شاہی دربار والے قصیدہ پر آپ کو پنجاب گورنمنٹ کی جانب سے نقرئی تمغہ اور اعزازی سارٹیفکٹ ملا تھا۔ اور سنہ میں والیِ ریاست نرسنگھ گڑھ نے بھی انعام اکرام دیا تھا۔ آپ پٹیالہ دربار سے بھی دو مرتبہ مدعو ہوئے تھے۔

یوں تو بڑے سے بڑے شاعر کا کلام اسقام سے پاک نہیں ہوتا اور نہ برق ہی کے کلام میں وہ بات ہے۔ مگر "غلطی اقتضائے بشریت ہے" اس خیال سے اسقام کا ذکر بیجا ہے۔

رہروِ ہستی

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب)

حُسنِ گل و لالہ زار رقص کناں جوئبار
شوخیٔ بادِ بہار دل کشیٔ کوہسار
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

بزم کی زیبائیاں حُسن کی رعنائیاں
عشق کی رُسوائیاں اور جبیں سائیاں
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

خانۂ خُمّار کو ساغرِ سرشار کو
بادۂ گلنار کو رندِ قدح خوار کو
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

بیکس و غم خوار کو بے زر و زردار کو
رہزنِ عیّار کو جاں کے طلب گار کو
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

وعظ میں واعظ کا رنگ وسعتِ تخئیل تنگ
جملہ مذاہب سے جنگ طُرفہ کمانے کے ڈھنگ
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

مسلکِ صوفی کے راز نکتۂ عرفاں نواز
قول، حقیقت طراز فعل میں رنگِ مجاز
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

بسملِ ناکام کو قاتلِ بدنام کو

صبر و صمصام کو تحمل کے انجام کو
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

تاجِ شہِ باوقار تختِ زمرد نگار
قلعۂ آتش نگار عسکرِ ہمت شعار
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

مجمعِ حیرت فروش لاشۂ بیکس بدوش
بے خبرِ عقل و ہوش چشمِ تر و لب خموش
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

مرقدِ بوسیدہ کو سبزۂ روئیدہ کو
میتِ خوابیدہ کو بیکس و غم دیدہ کو
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

غزل

(از محمد شہاب الدین صاحب صدیقی بھوپال)

مے فروش لئے ساغر و شراب اُٹھا — کہ آفتاب کو لے کر اِک آفتاب اُٹھا
اٹھا خیز کوئی نغمۂ شباب اُٹھا — اُٹھا مغنیِ رنگیں نوا رباب اُٹھا
ماہیں چھا گئی موجِ شراب کی مستی — کچھ اس ادا سے وہ مستِ مئے شباب اُٹھا
مے رنگِ جہاں ہے غبارِ تشنہ لبی — نگاہِ شوق سے یہ پردۂ سراب اُٹھا
ب پستیِ ہمت ہے زورِ بیتابی — قیاس غم سے گذر، لطفِ اضطراب اُٹھا
ھاؤں نیم نگاہی کی کشمکش کب تک — ستم ظریف نگاہوں کو بے حجاب اُٹھا
ہار قدم جستجوئے منزل میں — سمجھ سمجھ کے اُٹھا اور کامیاب اُٹھا
جب آہِ سرد بھری دل سے ابرِ غم چھایا — ہوا جو مست چلی جھوم کر سحاب اُٹھا

حریمِ ناز کہاں سجدۂ نیاز کہاں
جبینِ بے ادب لے واقفِ خراب اُٹھا

انشا کا کلام

(سید محمد محسن رضوی بی اے)

شائقین اردو نے انشا کے کلام کو اس نظر سے نہیں دیکھا جس کا وہ مستحق ہے اور نہ انشا کو ادبی دنیا میں کما حقہٗ شہرت حاصل ہوئی جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں جواہر پاروں کیساتھ بہت سے خزف ریزے بھی ہیں جنھوں نے اصلی جواہر کی آب و تاب کو ماند کر دیا ہے حالانکہ ان کا ظریفانہ کلام وقت نظر اور موقع محل کی مناسبت سے دیکھا جائے تو خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انشا کا کلام بادشاہ کو خوش کرتا تھا جسمیں مذاق کے ادنی یا اعلیٰ معیار کو کوئی دخل نہ تھا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کی شاعری کا معیار بہت پست ہو گیا تھا انشا کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ بادشاہ کے افتاد طبیعت کے موافق اشعار کہہ کے اپنی معاش کا سامان بہم پہونچائیں اس مقصد میں وہ یقیناً کامیاب ہوئے۔ اس نظر سے ان کے ظریفانہ کلام کو دیکھا جائے تو اسکی وقعت بڑھ جاتی ہے اگر وقت و زمانہ کا خیال نہ کیا جائے تو قدما شعرا میں کوئی شاعر ایسا نہ ہے کا جس نے اپنی زبان مبتذل اور فحش مضامین نظم کرنے میں آلودہ نہ کی ہو خود میر کے دیوان میں اس قسم کے بیشمار اشعار موجود ہیں لیکن اس سے انکی حقیقی قدر و منزلت میں کمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ محاسن کا پلہ معائب سے بھاری ہے یہی حال انشا کی شاعری کا بھی ہے دربارداری کی ضروریات اور اس کے نتائج کے لحاظ سے ان کے کلام پر نظر ڈالنا چاہیے۔

انشا کے دیوان میں اعلیٰ اور پست درجہ کی غزلیں ملی جلی ہیں۔ جب کئی اعلیٰ غزلوں کے بعد ایک پست غزل پر نظر پڑتی ہے تو ان کے کمال شاعری کا جو نقش ہمارے دل پر پہلے جمتا ہے ہلکا ہو جاتا ہے اور اس طرح انکی حقیقی قدر و منزلت پردے ہی میں رہ جاتی ہے اسلئے انکی شاعری کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی ہے۔

اردو داں طبقہ میں انشا کے نام سے کون آگاہ نہیں لیکن حقیقی انشا ایک بڑی مدت تک عوام کی نظروں سے اسوقت تک پوشیدہ ہے۔ انشا کے پرزور اور شاندار قصائد کا کوئی نام بھی نہیں لیتا اور سودا کے قصائد کا ہر شخص دم بھرتا ہے حالانکہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انشا کے قصائد بھی ایک خاص اور ممتاز درجہ کے مستحق ہیں میدان غزل گوئی میں بھی

اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ درحقیقت غزل کا دائرہ حُسن و عشق کی داستان تک ہی محدود نہیں بلکہ اُسکی وسعت کہیں زیادہ ہے اسمیں ہر قسم اور ہر صنف کے مضامین نظم ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ غزل کو صرف حُسن و عشق کی داستان تک محدود سمجھتے ہیں وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ غالب کے زور تخیل نے بھی اس نکتہ کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ غزل کا دائرہ صرف عاشقانہ مضامین پر ختم نہیں ہو جاتا سے

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہئے وُسعت مرے بیاں کیلئے

انشا نے بھی غزل کو حُسن و عشق کی داستانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسمیں ہر قسم کے مضامین نظم کئے۔ مزاحیہ غزلیات سے قطع نظر جب ہم اُنکی سنجیدہ غزلوں کو دیکھتے ہیں تو اُن میں عمدہ شاعری کی اعلیٰ ترین مثالیں ملتی ہیں اور ایسے اشعار نظر آتے ہیں جنمیں حقیقی شاعری کی رُوح بھری ہوئی ہے۔ مثلاً اُنکی وہ غزل ملاحظہ ہو جس کا مطلع ہے سے

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اس غزل کے تمام اشعار انتخاب ہیں۔ اس مطلع کا مضمون اگرچہ نیا نہیں دنیا و مافیہا کی ناپائیداری کا ذکر پہلے شعرا بھی دل کھول کر نظم کر چکے تھے لیکن انشا کے طرز بیان نے اسے سب الگ کر دیا ہے اور قبولیت عام نے اس شعر کو حیات جاودانی کا خلعت عطا کر دیا ہے جس طرح گریبان کے مضمون پر تمیر کا یہ شعر سے

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے تار اور گریبان کے تار میں

لاثانی اور آپ ہی اپنا جواب ہے اسی طرح انشا کا یہ مطلع بھی بےمثل و بے نظیر ہے۔ اس غزل کا دوسرا شعر بھی عجب تیور رکھتا ہے سے

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

طرز ادا نے اس شعر کے حُسن کو بھی دوبالا کر دیا ہے اور اسکی بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر کو اپنے مافی الضمیر کے من و عن بیان کرنے میں مناسب الفاظ مل گئے ہیں۔ شعر کو رک رک کر پڑھنے سے اسکی خوبی کا پورا اندازہ ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے دل پر وہی جذبہ طاری ہو جاتا ہے جو انشا کے دل پر تھا۔ باد بہاری سے جس طرح خطاب کیا گیا ہے اس سے بہتر کوئی اور انداز

ممکن نہ تھا۔ ایک مایوس اور شکستہ دل سے ان کے علاوہ دوسرے الفاظ نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ "نہ چھیڑ" "راہ لگ اپنی" "تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں" ان الفاظ نے شعر میں جان ڈالدی ہے اور بیزاری و غم کے جذبہ کا پورا پورا اظہار ہو گیا ہے زبان اور محاورہ کی خوبی نے شعر کی آب تاب کو اور بھی چمکا دیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ دنیا میں "حالت ہجر بلا ہوتی ہے۔ جبیں عاشق کو تو مہدم آرزوئے مرگ سوا ہوتی ہے" اور جو باتیں جو سکون دل اور راحت قلب کا سامان ہوتی ہیں وہ اور بھی زیادہ تکلیف دہ بن جاتی ہیں یہاں تک کہ ٹھنڈی ہوا سے دل جلنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں سودا کو بھی ایکبار باد بہاری کی چھیڑ ناگوار گذری تھی ؎

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں ہوں نکہتِ گل　　پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

مرزا غالب کو بھی غم فراق میں تنہا اور خاموش بیٹھنا پسند آیا تھا ؎

غمِ فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو　　مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

انسان گو کتنا ہی بذلہ سنج کیوں نہ ہو لیکن فراق میں اس کے لب پر مُہر خموشی لگ جاتی ہے۔ غالب نے ذیل کے شعر میں اسی حالت کا اظہار کیا ہے ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اس غزل کا تیسرا شعر ہے ؎

تصورِ عرش پہ ہے اور سر ہے پائے ساقی پر　　غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

شاعر نے اس شعر میں اپنے شوق میخواری کی انتہا کا اظہار کیا ہے۔ لیکن غالب کے شوق میخواری سے اس کا شوق کمتر ہے۔ اس مضمون پر غالب کے ذیل کے شعر سے بڑھ کر کوئی شعر اب تک نہیں کہا گیا ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مگر انشا کا شعر درد کے مندرجہ ذیل شعر سے بلاشبہ بڑھ گیا ہے ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

لیکن انشا کے شعر میں صرف بادہ نوشی ہی کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم بڑے غضب کے پینے والے ہیں جب دیکھا کہ ساقی کے آگے دست سوال دراز کرنے سے کام نہیں چلتا تو حالتِ اضطراب میں اس کے

...ں پر سر رکھ دیا کہ اب تو اُسے ہلانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ لیکن پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ ...ں جلد باز اور حقیقت ناآشنا حضرات ہیں بے غیرت و حقیر نہ سمجھ لیں اس غلط فہمی کے تدارک ...لئے شاعر نے پیشتر ہی سے کہہ دیا کہ اس حالت میں بھی "تصور عرش پر ہے" اس ٹکڑے ... ساقی کی قدر و منزلت کا بھی اظہار ہو گیا۔ کیونکہ جب پائے ساقی پر "سر رکھنے سے یہ ...حاصل ہوتا ہے کہ دماغ عرش پر پہونچ جاتا ہے تو پھر اُس ساقی کی قدر و منزلت کیا ...ں۔ اس غزل کے تمام اشعار ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ سب میں یکساں ...ں و خروش پایا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آتش نے جوش اور گرم بیانی انشا ہی سے ...ی۔ اس کے بعد کا شعر بھی اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتا ہے

...ِن نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

...کمزوری اور ناطاقتی کا اس سے بڑھ کر اور کیا اظہار ہو سکتا ہے اور پھر اس قید کے ...۔ کہ اسمیں شان تغزل بھی پائی جائے۔ نقش پا کی اُفتادگی سے ناطاقتی کی تشبیہ کتنی ...ہے۔

...شاعر نے ذیل کے شعر میں بھی اپنی ناطاقتی کا اظہار کیا ہے ؎

...نا چال ہے افتادگی سے ان دنوں پہروں نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار بیٹھے ہیں

...پھر کہا ہے ؎

...ہیں صبر کسکو آہ ننگ و نام کیا شے ہے غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم اکبار بیٹھے ہیں

اس شعر کا مضمون کسقدر حقیقت نفس الامری کے مطابق ہے۔ عشق میں بشرطیکہ عشق ...ق و کامل ہو انسان کو نہ تو بے غرتی کا خیال رہتا ہے نہ موت کا خطرہ بلکہ جان نثار کر دینا ...کھیل سا ہو جاتا ہے۔

...اس کے بعد شاعر ضمنی طور پر کچھ زمانہ کی ناقدردانی کا حال بیان کرتا ہے ؎

...ں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

اس شعر میں زمانہ کی شکایت ہے لیکن شکایت عام نہیں ہے بلکہ صرف نجیبوں کی زبانی ...۔ زمانہ کا دستور ہے کہ اہل علم و فضل کی قدر کم کرتا ہے اور تکلیف و آزار زیادہ پہونچاتا ...ہے۔ شریفوں کو چین نہیں دیتا۔ انشا کا شمار بھی اسی زمرہ میں ہے۔ اور علم و فضل تو اس درجہ ...کہ کسی اور اردو شاعروں کو نصیب نہ ہوا۔ لیکن زمانہ نے ایسے باکمال شخص کی بھی قدر نہ کی۔

اس شعر میں شاعر اپنی بیکاری کا اظہار کرتے ہوئے اظہارِ تاسف کرتا ہے۔

مطلع بھی خوب کہا ہے ؎

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا　　غنیمت ہے جو ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

اس شعر میں شاعر نے غنیمت شمر صحبتِ دوستاں کا سبق دیا ہے۔ گردش فلک کی شکایت بھی برسبیل تذکرہ ہے۔

غرض پوری غزل مُرصّع ہے اور اس کا دائرہ صرف حسن و عشق کی داستان تک محدود نہیں ہے۔ کسی شعر میں دنیا کی ناپائیداری کا ذکر ہے تو کسی میں اپنی ناطاقتی کا غم۔ کسی میں گردش فلک کی شکایت ہے تو کسی میں غم ہجر کا تذکرہ۔ کسی میں انتہائے شوق یا دہ خواری کا بیان ہے تو کسی میں درس زندگی موجود ہے گویا پوری غزل مختلف مضامین کے پھولوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ ایسے باکمال شاعر کو صنف غزل گوئی میں بہت اعلیٰ درجہ ملنا چاہیئے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ جب لوگوں کی نظریں وسیع ہونگی تو انشا کی خوبیاں انھیں اپنی طرف متوجہ کرینگی اور اسوقت اُن کی اعلیٰ شاعری کو کما حقہ شہرت حاصل ہوگی لیکن اس کے لئے ایک زمانہ چاہیئے کیونکہ ابھی۔

ع:- داماںِ نگہ تنگ و گلِ حُسنِ تو بسیار

گُناہ

(رُباعیات حضرت سیماب اکبرآبادی)

پندار سے دل تباہ ہوجاتا ہے　　انسان یونہی روسیاہ ہوجاتا ہے
نیکی کے فرشتے تجھے معلوم بھی ہے　　ہر سانس میں اِک گناہ ہوجاتا ہے

عشرت کو گناہ زندگی سمجھا ہے　　تسکین طبیعت کو بدی سمجھا ہے
ہوجائیگا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خفا　　کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے

میخانۂ زیست سے بھرے کشتی جاتا ہوں　　سرگشتۂ کیف بےخودی جاتا ہوں
جس آب سے روز مانگتا ہے تو پناہ　　بھر کر میں اُسے جام میں پی جاتا ہوں

(کلیم دہلی)

ہندوستان کے نئے وائسرائے

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے نئے وائسرائے ہز اکسلنسی لارڈ لنلتھگو نے سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی اپنی ہوشمندی، سیاست دانی اور نیک نفسی کا سکہ ہندوستانیوں کے دل پر جمانا شروع کر دیا ہے۔

ہز اکسلنسی نے ہندوستان کی عنانِ حکومت اسوقت اپنے ہاتھوں میں لی ہے جبکہ آئین حکومت میں ایک نئے باب کا افتتاح ہونے والا ہے۔ اور صوبجات کو اندرونی خودمختاری حاصل ہونے والی ہے۔ اور جب گورنر جنرل اور گورنران صوبجات کو بے پایاں اختیارات خصوصی ملنے والے ہیں جن کے بدولت ہمارے حکام ہندوستان کی سیاسی کشتی کو غرق بھی کر سکتے ہیں اور ساحل مراد پر بھی پہنچا سکتے ہیں۔

لارڈ لنلتھگو خاندانی رئیس اور بڑے دولتمند زمیندار ہیں۔ عجب حسن اتفاق ہے کہ آج سے چھتیس سال پہلے جب آسٹریلیا میں فیڈرل گورنمنٹ قائم ہوئی تھی تو آپ کے والد بہ جدید دستور کے مطابق آسٹریلیا کے سب سے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے اور جبکہ ہندوستان میں فیڈرل گورنمنٹ قائم ہونے والی ہے تو آپ اس کے سب سے پہلے حاکم اعلیٰ مقرر ہو کر تشریف لائے ہیں۔ انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے کہ جس کا آغاز اچھا اس کا مآل اچھا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی آپ کی تقریروں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں آپکی ذات سے نئی امیدیں پیدا کر دی ہیں۔

ہز اکسلنسی لارڈ لنلتھگو آج سے دس سال پہلے بھی ہندوستان کے حالات سے واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ شاہی زراعتی کمیشن کے صدر کی حیثیت سے تمام ملک کا دورہ کر کے ہندوستانی دیہاتوں کے حالات بچشم خود ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ دو سال کی محنت شاقہ کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کر کے پیش کی تھی اسوقت کسی کو کیا معلوم تھا کہ آج جو شخص ہندوستان کے دیہاتیوں کے حالات معلوم کرتا پھرتا ہے وہی ایکدن کشور ہندوستان کا گورنر جنرل اور وائسرائے بنکر آئیگا۔ یہاں یہ خصوصیت آپ سے قبل ہندوستان کے کسی وائسرائے کو حاصل نہیں ہوئی تھی لارڈ ولنگڈن بھی وائسرائے ہونے سے پہلے مدت مدید تک مدراس و بمبئی کے گورنر رہ چکے تھے۔ ہم وائسرائے ہند کے لئے اس بات کو خوبی میں داخل نہیں سمجھتے ہیں کہ تمام ضروری

مسائل کے متعلق اس کی رائیں پہلے ہی سے قائم ہو چکی ہوں۔ آپ نے زراعتی کمیشن کے صدر کی حیثیت سے نو سو صفحات کی جو ضخیم رپورٹ پیش کی تھی اس کے ہر صفحہ سے ہمدردی ٹپکی پڑتی ہے۔ اس رپورٹ میں آپ نے صاف بتا دیا ہے کہ ہندوستان کے زراعت پیشہ طبقے کے افلاس و ناداری کا اصلی سبب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا ناموافق اور زمین خراب ہے بلکہ اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ یہاں نئے طریقے رائج نہیں ہیں اور ہمارے کسان ہر طرف سے رسم و رواج کی زنجیروں میں بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔

ہز اکسیلنسی ۱۹۳۳ء میں جدید اصلاحات کے متعلق جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے پریسیڈنٹ بھی رہ چکے ہیں چنانچہ آئین جدید کے متعلق آپ کو ہندوستانی لیڈروں کے خیالات سے پوری پوری آگاہی حاصل ہے۔ اسوقت تو آپ سنتے خوب گر بولتے بہت کم تھے۔ شاید ہی کبھی دل کی بات یک لخت زبان پر آنے دی ہو۔

دولت و ریاست کے باوجود لارڈ لنلتھگو بڑے بیدار مغز جفاکش مدبر ہیں۔ تن آسانی و راحت طلبی آپ کے پاس نہیں پھٹکی۔ چنانچہ آپ ہمیشہ کوئی نہ کوئی پبلک خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں آپ نے ایک فوجی افسر کی حیثیت سے چار سال تک میدانِ جنگ میں اہم خدمات انجام دیں۔ حتیٰ کہ مسلح کاروں کی ڈرائوری کرتے رہے۔ بعدازاں آپ نے صیغہ امیرِ بحری کے سول لارڈ اور یونینسٹ جماعت کے ڈپٹی چیرمین کی حیثیت سے کام کیا۔ اور اس طرح انتظامی اور سیاسی مشین کے تمام کل پرزوں سے آپکو واقفیت حاصل کرنیکا موقع مل چکا ہے۔ ہندوستان کے زراعتی کمیشن سے فارغ ہونے کے بعد آپ انگلستان کے زراعتی کمیشن کے بھی چیرمین منتخب کئے گئے۔ اور جب کبھی ایک عہدہ سے دوسرے عہدہ تک پہونچنے میں کچھ وقفہ ہوا تو آپ بنکوں، بیمہ اور صنعتی کمپنیوں کے ڈائرکٹری کی ذمہ داریاں اپنے سر لئے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ نیوی لیگ، میڈیکل ریسرچ کونسل اور امپریل کالج آف سائنس کی صدارت کے فرائض بھی آپ انجام دے چکے ہیں۔

لارڈ لنلتھگو بالطبع کم سخن واقع ہوئے ہیں، لیکن آپکی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی مشہور ہے۔ عرصہ کی بات ہے کہ جب آپکو اپنے والد کی جائداد میراث میں ملی تو ایک بے تکلف مگر بدصورت شخص نے آپ سے پوچھا کہ "میاں یہ لہلہاتی ہوئی جائداد تمہیں کہاں سے ملی؟" آپ نے فوراً جواب دیا کہ "جہاں سے تم کو یہ بھونڈی صورت ملی ہے۔"

لارڈ لنلتھگو کے بزرگوں میں جج، سپاہی، سوداگر، قانون داں سبھی قسم کے لوگ گذرے ہیں شاید اسی وجہ سے آپکی ذات میں یہ تمام قابلیتیں موجود ہیں۔ لارڈ بالفور آنجہانی نہایت اعلیٰ درجہ کے مردم شناس مدبر تھے۔ لارڈ لنلتھگو کے والد بزرگوار اپنے حلقے میں چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا بلکہ پبلک خدمات انجام دینے کا چسکا لگا دیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے دوست کے فرزند رشید یعنی موجودہ لارڈ لنلتھگو کو بھی پبلک خدمات کے میدان میں آگے بڑھایا۔ لارڈ ہیلیفکس، (لارڈ اردن وائسرائے ہند) اور دیگر مدبرین بھی آپ کی قدردانی و حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔

ہز ایکسلنسی لارڈ لنلتھگو محض مدبر اور سیاست داں ہی نہیں بلکہ آپکو اسپورٹ کا بھی بہت شوق ہے جب کبھی آپ کو اپنے عہدوں کی ذمہ داریوں اور اپنی جائداد کے انتظامات سے فرصت ملتی ہے تو آپ اپنی جاگیر میں کبھی کتوں کیساتھ شکار کھیلتے ہیں، کبھی ہاتھ میں مچھلی کی ڈنگن لئے کسی خوبصورت چشمہ کے کنارہ مچھلی کے شکار میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آپکو گولف سے بھی خاص دلچسپی ہے مگر آپ فیشن ایبل سوسائٹی سے ذرا علیحدہ ہی رہتے ہیں اور سوسائٹی کے مقابلہ پر اپنے بال بچوں کیساتھ سادہ گوشہ نشین و خودم زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اسی لئے لندن والے آپ سے زیادہ آشنا نہیں ہیں اور نہ آپ ہی لندن کی گلی کوچوں سے چنداں واقف ہیں۔ جب کبھی آپ کا اپنے وطن ہوپٹن میں دیہاتی زندگی بسر کرتے کرتے دل اکتا جاتا ہے تو آپ لندن کے بجائے اڈنبرا میں چلے جاتے ہیں۔

برطانیہ کی سیاسی زندگی میں بھی آپ نے کوئی خاص پوزیشن حاصل نہیں کی کیونکہ آپ کبھی دارالعوام کے ممبر منتخب نہیں ہوئے البتہ اب لارڈ ہونیکی حیثیت سے آپ دارالامراء کے رکن ہیں۔ لیکن دارالامراء میں آپ نے اسقدر کم تقریریں کی ہیں کہ سیاسی دنیا میں آپ کا کوئی خاص نقش ثبت نہیں ہوا ہے۔

لارڈ لنلتھگو غیر معمولی طور پر کشیدہ قامت کشادہ پیشانی اور طاقتور کلّے جبڑے کے آدمی ہیں جو آپ کی دماغی قوت اور ذہانت کی دلیل ہے۔ آپ بہت مستقل مزاج اور اولوالعزم واقع ہوئے ہیں جو کام کرتے ہیں سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور اچھی طرح کرتے ہیں۔ شرافت، مروت اور دریا دلی سخاوت آپ کی خاندانی خصوصیات میں داخل ہیں۔ اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ وائسرائلٹی کا چارج لیتے ہی اپنی شادی خانہ آبادی کی سلور جوبلی کی تقریب میں آپنے دہلی کے سات ہزار غربا و مساکین کو پر تکلف دعوت دی، اور اس خصوصیت کیساتھ کہ ہندوؤں کو پوری کچوری

مسلمانوں کو قورمہ پلاؤ، اور عیسائیوں کو انگریزی طرز کا کھانا کھلایا۔ ہم کو کامل یقین ہے کہ ان غریب ہندوستانیوں کی بھوکی آتماؤں سے جو دعائے خیر نکلی ہو گی وہ ہز اکسلنسی کے حق میں کسی دن ضرور اثر دکھائے گی۔

لارڈ موصوف اسکاٹلینڈ کے امیر ہیں اور فی زمانہ اسکاٹلینڈ کا نیر اقبال عروج پر ہے۔ کیونکہ اس اسوقت کناڈا میں لارڈ ٹوئیڈ میر، آسٹریلیا میں لارڈ گوری، فلسطین میں لارڈ واچوپ اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ لنلتھگو یہ سبھی حکام اعلیٰ اسکاٹلینڈ کے رہنے والے ہیں۔

ہم ہز اکسلنسی وائسرائے اور لیڈی لنلتھگو کا اُمیدوں بھرے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور اسی کیساتھ یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اب پُرانا زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہندوستان مطلق العنانہ حکومت کا خوگر نہیں رہا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ لارڈ کرزن فرمان جاری کیا کرتے تھے۔ مگر اب زمانہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ لارڈ لنلتھگو صرف صلاح و مشورہ پر اکتفا کریں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ لارڈ کرزن فہمایش کیا کرتے تھے مگر اب لارڈ لنلتھگو کو صرف اظہار افسوس کرکے خاموش رہ جانا چاہیئے۔ اب سے چوتھائی صدی پہلے ہندوستان میں وائسرائے کی شخصیت اور اس کے سیاسی خیالات سے خاص دلچسپی لیجاتی تھی۔ لیکن اس عرصہ میں ہندوستان کے مدبر، باوسیوں کے معتقد نہ رہے۔ جو سمجھے ہیں کہ اب وہ کسی نئے وائسرائے یا گورنر کی شخصیت سابقہ کارگذاریوں یا مدبرانہ قابلیتوں سے چنداں متاثر نہیں ہوتے۔ بات یہ ہے کہ جب لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوکر آئے تو انکی قابلیت اور سیاست دانی کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بجگیا۔ لیکن ان کے زمانہ کے واقعات اسقدر دل شکن اور یاس انگیز ہوئے کہ پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ لارڈ کرزن کے بعد لارڈ منٹو اور لارڈ ہارڈنگ تشریف لائے جو دونوں کنسرویٹو تھے لیکن ان دونوں کا عہد حکومت لارڈ کرزن سے زیادہ کامیاب رہا۔ لارڈ چیمسفورڈ کی نسبت شروع شروع میں کوئی توقعات قائم نہیں کی گئی تھیں۔ لیکن آخر میں آکر وہ اجتماع الضدین نکلے۔ یعنی ایکطرف تو انہوں نے مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم نافذ کرائی اور دوسری طرف انہوں نے پنجاب سر مائیکل اوڈوائر کو مطلق العنان بنا دیا۔ لارڈ ریڈنگ جیسے تجربہ کار اور قانون داں کے عہد حکومت میں ہندوستانیوں کو آئینی ترقی کی غیر معمولی اُمید تھی لیکن بدنصیبی سے کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات پیش آئے کہ ہندوستان جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ لارڈ ارون نے البتہ ہندوستان کے جذبات کا احترام کیا۔ گو وہ کنسرویٹو جماعت سے تعلق رکھتے تھے لیکن ۱۹۲۹ء میں انہوں نے وہ

پالیسی برتی کہ ان کا نام آج تک ہندوستان میں احترام کیساتھ لیا جاتا ہے۔ لارڈ ویلنگڈن کا عہد حکومت گو ذاتی طور پر ایک کارنامہ عظیم تھا لیکن پبلک حیثیت سے اہل ہند کے لئے نہایت مایوس کن ثابت ہوا۔ خدا کرے ہز اکسلنسی لارڈ لنلتھگو کا زمانہ ملک کے حق میں مبارک ثابت ہو۔ آپ کی تقریروں سے یہ توقع ضرور قایم ہوگئی ہے کہ آپ اہل ملک کی شکایات کو رفع کرنیکی کوشش کریں گے۔

لارڈ لنلتھگو کا اصلی نام HOPE یعنی اُمید ہے اسلئے اُمید ہے کہ ہز اکسلنسی کا عہد حکومت ہندوستان کے لئے مبارک ثابت ہوگا۔ ع

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

رسالہ کلیم دہلی

یہ ماہنامہ ملک کے نامور ادیب اور شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی ادارت میں پوری آب و تاب کیساتھ جنوری ۱۹۳۶ء سے بمقام دہلی شائع ہونا شروع ہوا ہے اسوقت تک اس کے تین پرچے جاری ہو گئے ہیں جو مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے بہت گرانمایہ ہیں۔ اس رسالہ کے اغراض و مقاصد میں ہندوستانی زبان، ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی علم و ادب بالفاظ دیگر ہندوستانی روح کی صحیح رہنمائی اور انقلاب پیدا کرنا داخل ہے۔ خود حضرت جوش کی شاعری ہر قسم کی تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ آپکے غیر مطبوعہ اور تازہ کلام کے علاوہ دیگر مشاہیر شعرائے ہند کے شاہکار بھی اسمیں نظر آتے ہیں۔ حضرت جوش کی نثر اگرچہ خطیبانہ شان رکھتی ہے البتہ نتیجہ کیقدر دور جاکر نکلتا ہے۔ رسالہ کے مضمون نگاروں میں ملک کے مشاہیر شعرا و ادیب داخل ہیں مثلاً منشی پریم چند، ملک حبیب احمد بی اے، حضرت سیماب اکبرآبادی، مسٹر لطیف احمد اکبرآبادی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، نواب جعفر علی خاں اثر، حضرت فانی جائسی، ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری، سید فرید جعفری، آغا شاعر قزلباش دہلوی، احسان بن دانش، ملا رموزی، خواجہ غلام السیدین پانی پتی، مولانا ظفر علیخاں، مجنوں گورکھپوری، مرزا احمد عسکری بی اے لکھنوی وغیرہ وغیرہ۔ الغرض یہ ماہنامہ ہر طرح تعریف کے قابل ہے۔ رسالہ کی قیمت چھ روپیہ سالانہ ہے۔ ہر پرچہ میں متعدد رنگین و سادہ تصاویر بھی ہوتی ہیں۔ ہم اس ماہنامہ کی ترقی و بقا کے لئے دعاگو ہیں۔

جواہر لال نہرو

(از جناب پنڈت آنند نرائن مُلّا صاحب بی۔ اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ لکھنؤ)

وطن میں کون سردارِ وطن پھر بن کے آتا ہے — چمن کی سمت ارمانِ چمن پھر بن کے آتا ہے
رُخِ غم پر تبسّم کی کرن پھر بن کے آتا ہے — سوئے یعقوب بوئے پیرہن پھر بن کے آتا ہے
حکومت نے کیا تھا قید جسکو سرگراں ہو کر
وہی یوسف پھر آتا ہے امیرِ کارواں ہو کر

یہ جس کیاری کا گل ہے اسکی پہچانی ہوئی بو ہے — مہک پھیلی ہوئی اس کی چمن بھر میں ہر اک سو ہے
خزاں کے دورِ حاضر میں یہی تسکین کا پہلو ہے — یہی جانِ گلستاں ہے اسی کا نام "نہرو" ہے
دلوں پر نقش ہے اس کا زبانوں پر وظیفہ ہے
یہی وہ نام ہے جس کے سہارے قوم زندہ ہے

تری فرقت میں رنجیدہ تھے یارانِ کہن سارے — ترانے بھولتے جاتے تھے مرغانِ چمن سارے
لگے تھے جھلملانے سے چراغِ انجمن سارے — تری آواز کے تھے منتظر سازِ وطن سارے
ترا محفل میں آنا تھا کہ پھر منہ میں زباں آئی
رگوں میں پھر لہو دوڑا، تنِ بیجاں میں جاں آئی

ترے دل میں تڑپ ہے ایک سوزِ غیر فانی کی — نظر میں اک تجلی ہے شعاعِ زندگانی کی
ہنسی ہلکی سی ہونٹوں پر امیدِ کامرانی کی — قسم کھاتا ہے فردائے وطن تیری جوانی کی
انہیں ہاتھوں کھلے گا اک نہ اک دن بابِ آزادی
تری صورت میں دیکھا ہے وطن نے خوابِ آزادی

نہیں رکھنے کا تو پائے جفا پر فرقِ حریت — ستمگاری کے بیڑوں کو کیا ہے غرقِ حریت
ترے خوں میں سرایت کر گئی ہے برقِ حریت — بنا دیگا وطن کو تو کسی دن شرقِ حریت

---

[1] یہ بے مثل نظم ۱۲-اپریل ۳۶ء کے اجلاس چہل و نہم انڈین نیشنل کانگریس لکھنؤ میں پڑھی گئی تھی۔ اب ہمارے محب مکرم مُلّا صاحب کی عنایت سے "زمانہ" میں شائع ہو رہی ہے۔ اس نظم میں پنڈت صاحب نے اہلِ ملک کے ملی جذبات کی ترجمانی کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ (ایڈیٹر)



پنڈت جواہرلال نہرو
پریسیڈنٹ انڈین نیشنل کانگریس لکھنؤ
سنہ ۱۹۳۶ء

تو ہی اِس دورِ طوفاں میں ہے اپنا لیج آزادی
ترے قالب میں کھنچکر آگئی ہے روحِ آزادی

قریب اختتام آنے لگا ہے دورِ بربادی
مرے کانوں میں آتی ہے صدائے نغمۂ شادی
کہیں روکے سے رُک سکتی ہے اب تعمیر آزادی
ہر اک زنداں میں رکھ آیا ہے تو اک سنگ بنیادی

ترے نقشِ قدم ہیں رزم گہ کے چپے چپے پر
ترے ایثار کی مہریں لگی ہیں ذرّے ذرّے پر

جواہر لال نہرو کی قربانیاں

کچھ عرصہ ہوا جناب ایک خوب نہ عنایت فرمانے جو ہندوستان کے مشہور شاعر ہیں پنڈت جواہر لال نہرو کی شان میں یہ قطعہ لکھکر بھیجا تھا۔ پنڈت صاحب ممدوح کانگریس کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم یہ قطعہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

محبت کو، مسرت کو، سرور و شادمانی کو
تنعّم کو، تموّل کو، تعیش کو، جوانی کو
وجاہت کو، امارت کو، وقارِ خاندانی کو
تن آسانی کی خواہش کو، نشاطِ زندگانی کو
وطن پر کردیا قرباں، جواہر لال نہرو نے

پنڈت جواہر لال نہرو

(از ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ)

پنڈت جواہر لال نہرو نومبر ۱۸۸۹ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ قوم کے نامور رہنما پنڈت موتی لال نہرو کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ پنڈت صاحب نے جواہر لال جی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اُن کی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور اسی غرض سے ان کو اکثر سیر و سفر و تبدیل آب و ہوا کے لئے کشمیر بھیجا کرتے تھے

۱۹۰۵ء میں جب جواہر لال کی عمر سولہ[1] سال کی ہوئی تو اُن کو حصول تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجا گیا۔ جہاں پہلے برطانیہ کے مشہور و معروف درسگاہ ہیرو اسکول میں داخل ہوئے اور بعد ازاں کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرنیٹی کالج میں تکمیل تعلیم کے لئے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں لندن سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ مگر آپ کا رجحان طبع ہمیشہ سائنس کی تعلیم کی طرف رہا جس کا اندازہ آپ کی مشہور تصنیف "باپ کے خطوط بیٹی کے نام" میں بخوبی ملتا ہے۔ یہ مفید و دلچسپ کتاب ۱۹۲۹ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہے۔ اور کتابستان الہ آباد کی توجہ سے اُردو میں بھی دستیاب ہو سکتی ہے۔

پنڈت جواہر لال انگلستان میں قیام کرنے کے وقت ہی سے ہندوستان کے سیاسی مسائل میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۰۷ء میں فخر قوم لالہ لاجپت رائے کی جلاوطنی ہوئی تو وہ لندن ہی میں بیٹھے ہوئے اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اُن دنوں لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک شری یت بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے کی سیاسی پالیسی سے لوگوں کو بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ گرم دل کے ان ملکی رہنماؤں کی تقریروں و تحریروں کا پنڈت جواہر لال پر بہت بڑا اثر پڑا۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک آپ نے الہ آباد ہائیکورٹ میں پریکٹس کی۔ مگر دل کا رجحان وکالت کی طرف نہ تھا اس لئے اس پیشہ میں کامیابی حاصل کرنے کی نہ انھوں نے کوئی کوشش کی اور نہ کامیابی حاصل ہوئی۔

---

[1] اس مضمون کے لکھنے میں ہندوستان ریویو کے ایڈیٹوریل مضمون سے جو رسالہ کے مارچ نمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ہے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

۱۹۲۰ء میں جب تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی تو آپ نے وکالت کو ترک کر دیا اور اب آئندہ آپ کے اس طرف رخ کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں ہے۔ اس لئے اسی سال کو آپ کی وکالت کے خاتمے کا سال سمجھنا چاہیئے۔

ہندوستان آنے کے تھوڑے ہی دن بعد نہرو جی پٹنہ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں گوکھلے فنڈ کے لئے انھوں نے چالیس ہزار روپیہ اکٹھا کیا۔

۱۹۱۷ء میں جب ڈاکٹر بیسنٹ صاحبہ کی تحریک ہوم رول شروع ہوئی تو آپ نے اس میں بھی دل کھول کر حصہ لیا۔ اور اپنی لیاقت اور سرگرمی کی وجہ سے انجمن ہوم رول کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ہی پنجاب مارشل لا کے واقعات رونما ہوئے۔ اور کانگریس نے ان کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تو آپ نے بھی اس تحقیقات میں سرگرم حصہ لیا۔

اسی سال آپ کو اودھ کے کسانوں کی تحریک میں بھی حصہ لینے کا موقع ملا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں کے موافق قانون میں ترمیم کی گئی۔

۱۹۲۰ء میں فخر قوم لالہ لاجپت رائے صاحب کے زیر صدارت کانگریس کا خاص اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا اور اس میں تحریک عدم تعاون کے موافق فیصلہ ہوا تو پنڈت جواہر لال صاحب بھی سرگرمی کے ساتھ کانگریس کی تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے لگے جس کی وجہ سے دسمبر ۱۹۲۱ء میں آپ پہلی مرتبہ چھ ماہ کے لئے جیل بھیجے گئے۔ لیکن چند ہی دنوں بعد رہا کر دیئے گئے۔ اس کے بعد دو سال کے عرصہ میں آپ متعدد بار گرفتار اور رہا کئے گئے۔ ۱۹۲۳ء کی آخری ششماہی میں آپ نابھا سٹیٹ میں سکھوں کے اکالی دل کے ساتھ تشددات کو بچشم خود ملاحظہ کرنے تشریف لے گئے اور جب ریاست نے آپ کے خلاف اخراج کا حکم جاری کیا تو آپ نے اس کی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں آپ کو چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ پر سازش کرنے کا الزام بھی لگایا گیا اور اسی بات میں دو سال مزید کی سزا ملی لیکن دونوں سزائیں علی حیثیت معاف کر دی گئیں اور آپ کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا۔

اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں کلکتہ پریسیڈنسی مجسٹریٹ نے باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں آپ کو دو سال کی سزا دی۔ لیکن آپ کی اہلیہ محترمہ کملا نہرو صاحبہ کی خطرناک علالت کے خیال سے گورنمنٹ نے آپ کو قبل از میعاد رہا کر دیا اور آپ فوراً یورپ روانہ ہو گئے۔ جہاں آپ کی رفیقۂ حیات زیر علاج تھیں مگر نہرو جی کی تمام کوششیں بے سود ہوئیں اور فروری گذشتہ میں انکا انتقال ہو گیا۔

پنڈت جواہر لال ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ اس وقت سے وہ اس قومی تحریک میں غیر معمولی سرگرمی کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔ کانگریس کے نوجوان طبقے میں آپ کو عالمگیر ہردلعزیزی حاصل ہے، آپ کی صداقت شعاری، نیک نفسی اور ایثار نے عوام ملک کے دلوں میں آپ کے لئے ایک خاص جگہ کر لی ہے، چنانچہ اسی ہردلعزیزی کا نتیجہ تھا کہ آپ ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ کانگریس کی تاریخ میں آپ پہلے پریسیڈنٹ ہیں جو کانگریس کے وجود میں آنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔

۱۹۲۶-۲۷ء کا بیشتر حصہ آپ نے یورپ ہی میں بسر کیا۔ مگر اس اثنا میں بھی آپ کو جب کبھی موقعہ ملا تحریر و تقریر کے ذریعہ کانگریس کے اغراض و مقاصد کو تقویت پہونچاتے رہے۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں سوویٹ روس کی دسویں سالگرہ کے موقعہ پر آپ ماسکو میں موجود تھے۔ ۱۹۲۸ء میں آپ نے سوویٹ روس کے حالات قلمبند کرکے کتابی صورت میں شائع کئے۔ یہ تصنیف اس وقت کے سیاسی اور اقتصادی حالات کی ایک بہترین یادداشت ہے۔ اسی دورے میں آپ انقلاب روس اور اس کے موجودہ حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اب تک آپ کی تحریر و تقریر میں اس کی پوری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہر نوع مکمل آزادی کا خیال غالباً روس ہی کے حالات ملاحظہ کرنے کے بعد آپ کے دل میں پیدا ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے سب سے پہلے مدراس کانگریس میں اس کے متعلق ریزولیوشن پیش کیا لیکن اس وقت یہ تجویز منظور نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے بعد لاہور کانگریس میں یہ ریزولیوشن آپ ہی کی صدارت میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ پاس ہوگیا۔

۱۹۱۶ء میں آپ کی شادی ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ لڑکی سے ہوئی جس نے مرتے دم تک ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے اپنے ذاتی آرام اور آسائش کو بخوشی قربان کرکے اپنے نامور شوہر کا ساتھ دیا۔ کملا نہرو کو جیسے کہ جب یہ کام میں آپ کے خیالات و جذبات کے ساتھ پوری ہمدردی تھی دیش کی بھلائی کے لئے جیسی ان تھک محنت اور جانفشانی انھوں نے آپ کی رہنمائی میں کی اسکو دیکھکر یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ان کی بے وقت موت سے ہندوستان کی سیاسی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔

ذاتی حیثیت سے پنڈت جواہر لال کا شمار دنیا کی ان چند قابل قدر اور مایۂ ناز ہستیوں میں ہے جو اپنے دشمنوں سے بھی خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ انگلستان کے اہل الرائے حضرات اس قدر اختلاف رائے رکھنے کے باوجود بھی ہمیشہ آپ کی ذہانت اور وطن پرستی کے معترف رہے ہیں۔

پروفیسر ہیرلڈ لاسکی (Harold J. Laski) نے جو موجودہ زمانہ کے ایک بہترین ماہر سیاسیات میں آپ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

"نہرو جی کی رگوں میں خون کی جگہ سوراج گردش کرتا ہے۔ اُن کے والد ماجد آزادی کے میدان کے بے خوف ہو کر لڑنے والے سپاہی تھے لیکن وہ خود اُن سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ وہ ہندوستان میں صرف سیاسی انقلاب کے آرزومند نہیں ہیں بلکہ معاشرتی انقلاب کے بھی بیحد خواہاں ہیں اور رسم و رواج کی تمام قیود کو جنھوں نے یہاں کے نظام تمدن کو بری طرح جکڑ رکھا ہے یک لخت توڑ دینا چاہتے ہیں"

پنڈت جواہر لال اعلیٰ درجے کے انگریزی داں ہیں۔ سیاست کے ہر شعبے سے انھیں گہری دلچسپی اور واقفیت ہے۔ اُن کی زندگی پر اُن بزرگوں کی صحبت کا بہت بڑا اثر پڑا ہے جن سے آپ کو وقتاً فوقتاً ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔

آپ کا دماغ مغربی تہذیب و خیالات کا ممنون ہے لیکن دل بدستور ہندوستانی ہے۔ آپ مشرقی شائستگی کے قائل ہیں اور اپنی تہذیب و کلچر و تمدن قائم رکھنے کے زبردست حامی ہیں۔ سائنس کی روز افزوں ترقی سے آپ کو بڑی گہری دلچسپی ہے اور آپ ہندوستانی موسیقی اور مصوری اور دیگر فنون لطیفہ کے بھی بہت بڑے قدرداں ہیں۔ انگریزی لکھنے میں آپ کو جو کمال اور مہارت حاصل ہے اس پر انگلستان کے بڑے بڑے ادیب بھی آپ پر عش عش کرتے ہیں

آپ کے خاندان نے ملک کی خاطر جو قربانیاں کی ہیں وہ ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اس لئے آپ کے خلوص نیت، حب الوطنی اور ایثار سے انکار کرنا کفر ہے۔ اب آپ اس سال پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اگرچہ ہر شخص کا آپ کے خیالات سے متفق نہیں ہے لیکن اگر آپ کی صدارت میں نوجوان طبقہ اور ملک کے آزمودہ رہنماؤں کے مابین کوئی متفقہ دستور العمل طے ہو جائے اور عوام کی فلاح و بہبود کیلئے سب لوگ آپ کی رہنمائی میں بیش از بیش اتفاق رائے سے کام کر سکیں تو یہ بجائے خود بہت بڑا کام ہوگا۔ ملکی اتفاق و اتحاد کی خاطر اگر آپ نے اپنے خیالات کے عملدرآمد میں ایثار نفس سے کام لیا اور آپ سے اسکی پوری توقع کیجا سکتی ہے تو کانگریس کا کھویا ہوا وقار پھر حاصل ہو سکتا ہے۔ بہرحال نوجوان طبقہ کی بیجا کشمکش اور کانگریس کے اندرونی نفاق کا علاج اگر ہو سکتا ہے تو آپ ہی کی کوشش اور رہنمائی سے ہو سکتا ہے۔

سوال کیا۔ میں نے بٹوہ کھول کر اسکے پھیلے ہوئے ہاتھ پر روپیہ پھینک دیا۔ فقیر کی آنکھیں پھٹ گئیں! دعائیں دینی بھول گیا! میں اپنی سخاوت پر کچھ جھینپتا اور پچھتاتا ہوا جلدی سے آگے بڑھا۔

عورتیں بڑی بوڑھیاں اور جوان، کچھ لہنگے اور زیادہ تر رنگین ساڑیاں پہنے جلد جلد مندر کیطرف جارہی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ انہیں دیویوں کی بدولت دھرم، پریم، اور سیوا قائم ہے! ہمارا ہندوستان کیسا خوش قسمت ملک ہے کہ یہاں کی عورتیں ایسی ستیائیں ہیں! اتنی صبح پوجا کی خاطر مندر آتی ہیں، اس سردی میں اٹھکر اشنان اور پوجا کرتی ہیں! اور ایک میں ہوں کہ اپنے پلنگ پر پڑا سستی کی نیند سوتا رہتا ہوں! اپنا روپیہ جو فقیر کو دیا تھا اِن دیویوں کی عقیدت اور نیکی کے سامنے حقیر معلوم ہونے لگا۔ میرا دل اُنکی عزت سے اتنا بھر گیا تھا کہ میں ہر اُس عورت کے جو مندر کی طرف جارہی تھی، پاؤں چھونے کے قابل بھی اپنے کو نہیں سمجھتا تھا۔

میرا رستہ بھی وہی تھا۔ عورتیں اپنی پوجا کی دھن میں آگے بڑھی جارہی تھیں۔ ان دیویوں کا ایک سمندر تھا کہ اُمنڈا چلا آرہا تھا۔ گو میلے کا دن بھی نہیں تھا پھر بھی اُنکی عقیدت کا یہ حال تھا! اُنکے ہاتھوں میں پھول اور رومالوں میں لپٹی ہوئی کچھ چیزیں تھیں۔ چند ہی عورتیں خالی ہاتھ ہونگی۔ کسی کسی کی مٹھی میں مَیں نے پیسے بھی دیکھے۔ پیسے دینے والیاں تھوڑی تھیں اور مانگنے والے بہت زیادہ۔ وہ اُن دیویوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہاتھ بڑھا بڑھا کر بھیک مانگنے لگے۔ بھکمنگوں کے ہجوم کو اِس طرح اپنے قریب دیکھ کر وہ زور سے چیخ اٹھیں "ارے دور ہٹ" دیکھ کیا کرتا ہے، کہیں چھو نہ لینا!"

دس پندرہ کے گروہ میں ایک پیسہ گرتا اور وہ سب کے سب اُسے لوٹنے کیلئے زمین کی طرف لپکتے۔ ایک پیسہ پر گالی گلوچ، ہتھا پائی اور مکا بازی تک ہوجاتی! وہ پُن کی دیویاں ایک انداز بَری سے پیسے پھینکتیں، اپنے کپڑے بچا کر نکل جاتیں اور مڑ کر بھی نہ دیکھتیں کہ اُنکی نیکی کا کیا نتیجہ ہوا۔

مندر کے باہر کے صحن میں چند پیسوں کیلئے انسانوں میں یہ ہلڑ، یہ آفت مچی ہوئی تھی اور یہ سیوا کی پتلیاں خوش ہو ہو کر گایوں کو روٹیاں کھلا رہی تھیں۔!

یہ منظر دیکھ کر مجھے متلی ہونے لگی۔ کیا یہی وہ دیویاں ہیں جنکو دیکھکر میرا دل عزت سے بھر گیا تھا؟ کیا وہ یہی عورتیں ہیں جنکے پاؤں چھونے کی مجھے آرزو تھی؟ یہ جو چند پیسوں کے لیے بھوکوں کو آپسمیں لڑا دیتی ہیں، انسانوں کی خوراک چھین کر گایوں کے منہ میں ٹھونس دیتی ہیں اور مگن ہیں کہ صبح ہی صبح دھرم کر رہی ہیں!

وقت دیکھا، گاڑی آنیوالی تھی۔ میں اس پاپ کے سماں کو چھوڑ کر اور آگے بڑھا۔ رستہ میدان میں سے ہو کر گذرتا تھا مگر ڈنڈی سے ذرا فاصلہ پر ایک گدھا مرا پڑا تھا۔ موڑ سے میں نے اسکو دو تین دن پہلے بھی یہیں پڑے ہوئے دم توڑتے دیکھا تھا، لیکن ہندوستان یہ منظر روز ہی نظر آتے ہیں اور کون ٹھیر کر دیکھتا ہے! آج میں اُسکے پاس سے ہو کر گذرا۔ اسکی پیٹھ پر بڑا سا زخم تھا، مکھیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ ہر طرف سے پیپ بہ رہی تھی اور زخم کے اندر سے ہڈیاں تک دکھائی دے رہی تھیں اسکے نیچے بھی کافی پیپ اور خون جمع تھا جس سے ظاہر تھا کہ جس کروٹ وہ پڑا ہے وہ بھی زخمی ہے۔ گدھے کی آنکھیں آدھی کھلی ہوئی تھیں، اور سفیدی نظر آ رہی تھی۔ گدھا قریب المرگ تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر گدھ بیٹھے ہوئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے گدھے کی موت کے انتظار میں یہیں میدان میں رات گذار دی تھی۔ میں نے گدھے کو چمکارا۔ اور اس نے ذرا جھکڑ کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اُسوقت اُسکی آنکھوں میں شکایت تھی!

میں آگے بڑھا۔ مندر کے ایک پنڈت سیتا رام "سیتا رام" جپتے، لوٹا ہاتھ میں لئے ہوئے مندر کیطرف جا رہے تھے۔ میں نے انہیں روکا۔ "پنڈت جی! کتنے دن سے یہ گدھا مندر کے سامنے پڑا دم توڑ رہا ہے۔ اسکا کچھ بندوبست نہیں کیا گیا؟"

"گدھا کوئی ہمارا ہے؟ جس کا ہو وہ بندوبست آپ کریگا"

"یہ تو بڑا ظلم ہے۔ اس غریب کے گولی ہی مار دینی چاہئے کہ اس ..... "میں نے آہستہ سے کہا

"رام! ..... رام! ..... رام! یہ تو بڑی ہتیا ہے ..... جان لینا بڑی ہتیا ہے۔"

"اور یہ چار روز سے جو دھیرے دھیرے ہتیا ہو رہی ہے؟" "ایشور کی مرضی" "سیتا رام سیتا رام" کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ اب نہ گاڑی یاد تھی اور نہ بھائی کا خیال تھا۔ گلی کوچوں سے پھرتا ہوا میں باہر آیا۔ سورج نکل چکا تھا۔ اسکی دھوپ چھٹے ہوئے بادلوں میں سے نکلکر، درختوں اور عمارتوں کی بلندیوں سے اُترتی ہوئی نیچے پھیل رہی تھی۔ فاصلہ پر کچھ لوگ نظر آئے جو کوؤں کو کھیلیں ڈال رہے تھے کئی موٹے موٹے مہاجن پیپل اور تانگوں پر بیٹھے اس پن میں مشغول تھے۔ میں قریب آیا۔ اُن کوؤں کے درمیان کئی غریب بھوکے اور ننگے بچے بھی تھے جنھیں کوؤں کیطرح انھیں کیساتھ کھیلیں چن چن کر جلدی جلدی منہ میں بھر رہے تھے۔ لالہ صاحبان اُن بچوں سے بہت ناخوش تھے، اور بُرا بھلا کہہ کر بھگا رہے تھے!

نہ معلوم میں کب گھر پہونچا۔ وہاں بھائی صاحب منہ پھلائے ایکطرف بیٹھے تھے اور اماں جان کو سمجھا رہی تھیں کہ نہ معلوم کیا ہوا؟ کہاں گیا؟ بیچارا سویرے ہی چلا گیا تھا۔"

تنقید کتب

نسیمِ عرفاںؔ

نسیم عرفاں کے نام سے منشی بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی (خلف حضرت افقؔ مرحوم) نے دماغ سوزی اور جگر کاوی سے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ شگفتہ اور مستند ہندوستانی زبان میں کیا ہے۔ شروع کے دو صفحات میں "ڈاکٹر بھگوان داس صاحب کا پیش نامہ" ہے جس کے بعد جناب کیفیؔ دہلوی کی تقریظ ہے۔ بعد ازاں حضرتِ برقؔ مرحوم کی ایک مختصر نظم اور "تعارف" کے عنوان سے منشی گوبرسرن لال ادیب لکھنوی نے قابل مترجم کے سوانحی حالات قلمبند کر کے آپکے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے مترجم صاحب نے بھی اپنے ترجمہ کے متعلق چند سطور تحریر کیے ہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو نے بھی ایک مختصر تقریظ لکھی ہے۔ اس کتاب میں کئی تصویریں بھی ہیں۔ مصنف صاحب (اُن کے والد گرامی) اُنکے اُستاد منشی بونت رائے صاحب نظرؔ لکھنوی اور کرشن و ارجن کی رنگین تصاویر سے اسکی دلچسپی میں خاصہ اضافہ ہو گیا ہے۔

اصل گیتا کی نسبت جو ہندی فلسفۂ الٰہیات کی رُوحِ رواں ہے کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ البتہ ترجمہ کی نسبت کچھ عرض کرنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

فاضل مترجم نے ترجمہ کے لئے پنڈت دیاشنکر نسیمؔ کی مشہور و معروف مثنوی "گلزارِ نسیم" کی بحر پسند کی ہے۔ اسلئے ترجمہ کا نام "نسیم عرفاں" رکھا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو طبع زاد تصنیف و تالیف کا گمان ہوتا ہے۔ جب میدان جنگ میں ارجن کے دل پر اپنے بھائیوں کی محبت غالب آتی ہے۔ اور وہ اندرونی جذبات سے متاثر ہو کر جنگ و جدل سے انکار کرتا ہے تو کرشن جی فرماتے ہیں ؎

ارجن! ارجن!! عزیز ارجن | سب تم کو کہیں گے ہیز ارجن

لہ ملنے کا پتہ:- زمانہ بک ایجنسی کانپور قیمت عہ، دو روپیہ (۱) لکھنؤ پرنٹنگ ورکس (۲) مکتبۂ تجلی خانہ۔ دہلی (۳) مسرز سنت سنگھ اینڈ سنز سہیل ایجنسی لاہور۔

کیوں حسرت دیاس سے ہو مغلوب | یہ طرزِ عمل ہے سخت معیوب
ہمت جرأت یہ چھوڑنا کیا | منہ جنگ سے اب یہ موڑنا کیا
کر دیگا تمہیں یہ فعل مذموم | فردوس کی راحتوں سے محروم
تم مرد ہو، مردمی سے لو کام | نامردی کا زبون ہے انجام
یہ رخصت عقل و آگہی کیا | دانا ہو کر یہ گمرہی کیا؟

اس ترجمے میں ترکیبوں کی چستی، الفاظ کی روانی اور برجستگی اور مصرعوں کا ترنم بہت قابل قدر ہے کہیں کوئی گرا ہوا لفظ نہیں ہے اور نہ کوئی جملہ ایسا ہے کہ ثقات لکھنؤ کی زبان پر جاری نہ ہو۔ اور متانت و سنجیدگی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

فلسفہ الہیات بازیچۂ اطفال نہیں۔ اسکو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بہت بڑی قابلیت کی ضرورت ہے۔ اکثر لوگ اصطلاحات ہی میں اس طرح پھنس کر رہ جاتے ہیں کہ صحیح مفہوم بھی ادا نہیں ہو سکتا ہے۔ اور اکثر لوگ روانی طبع کے زور میں ساحل مقصود سے دور نکل جاتے ہیں۔ دیکھئے وحدت وجود و شہود کو منور صاحب نے کن آسان الفاظ اور کیسی خوبصورت ترکیبوں میں سمجھایا ہے کہ منہ سے بیساختہ مرحبا اور سبحان اللہ نکل جاتا ہے ؎

جلوہ جس کا ہے سایۂ کل | ہستی جس کی ہے دائرہ کل
حاصل اس کو ہمیشگی ہے | وہ عین حیاتِ سرمدی ہے
کوئی اس کو مٹائے گا کیا | نقشِ باطل بنائے گا کیا
کس طرح ہو آدمی کے بس کی | یہ بات نہیں کسی کے بس کی
ہے نقشِ دوام جسکی ہستی | قایم ہے مدام جسکی ہستی
فرضی شے ہے زوال جس کا | اندازہ بھی ہے محال جس کا
ہیں ان اجسام میں وہ موجود | ہوتا ہے جنہیں ضرور نابود
جب یہ سچ ہے تو ہوش میں آؤ | ارجن! مصروف جنگ ہو جاؤ

مندرجہ ذیل اشعار میں رُوح یا جیو کے متعلقات کیسی برجستہ ترکیبوں اور پاکیزہ جملوں میں بیان کئے گئے ہیں ؎

پیدایش و مرگ سے ہے آزاد | ہوتی نہیں زیست اس کی برباد
اب تک وہ نہیں ہوا ہے پیدا | ہے اپنی قدامتوں سے پیدا

اس کی کہیں ابتدا، نہیں ہے　　　اس کی کہیں انتہا نہیں ہے
جب تن کو پہونچتا ہے ضرر کچھ　　　اس پر پڑتا نہیں اثر کچھ
تخلیق کی قید سے ہے آزاد　　　ہوتا ہی نہیں کبھی وہ برباد
اسکو کسی طور سے بھی ہتھیار　　　پہونچا سکتے نہیں کچھ آزار
ممکن ہی نہیں بزیر افلاک　　　آگ اس کو جلا کے کر سکے خاک
کچھ بھی اس پر اثر نہ ہوگا　　　پانی سے ذرا یہ تر نہ ہوگا
ممکن نہیں خشک ہو ہوا سے　　　محفوظ ہے یہ ہر اک بلا سے
کٹنا اس کا محال تر ہے　　　گھٹنا اس کا محال تر ہے
جلنا اس کا نہیں ہے ممکن　　　گلنا اس کا نہیں ہے ممکن
خشکی کے اثر سے ہے یہ آزاد　　　برنگ دگر سے ہے یہ آزاد
ساکن ہمہ اوست جاودانی　　　لاجنب و قدیم، غیر فانی

مسئلہ تناسخ کو چار شعروں میں بیان کرکے دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے ؎

انسان جس طرح، دوست جانی　　　پوشاک اُتار کر پرانی
کرتا ہے بہ شوق دلفریبی　　　اک خلعتِ نو سے جامہ زیبی
یہ ساکن پیکر عناصر　　　یہ حاصلِ دفتر عناصر
ہو کر ملک عدم کا رہرو　　　کرتا ہے قبول قالب نو

عارفِ کامل کی شناخت ملاحظہ ہو:- ؎

ناظر ہے نگاہ دور رس سے　　　جس کو نہیں لوث کچھ ہوس سے
تسکین دوام ذات میں محو　　　رہتا ہے قیام ذات میں محو
آلام کی کلفتوں سے بے لوث　　　آرام کی لذتوں سے بے لوث
پابندیٔ نفس دوں سے آزاد　　　جذبِ زشت و زبوں سے آزاد
آلائش بیم سے مبّرا　　　رکھتا نہیں چشم زہرا صلا
ایسا انسان ہے مردِ کامل　　　اسکو کہتے لوگ عامل

الغرض منّور صاحب کے اس ترجمہ کو جس معیار پر بھی جانچا جائے پورا اُترتا ہے ماسوقت تک بھی بھگوت گیتا کے جتنے ترجمے اُردو زبان خصوصاً اُردو نظم میں ہوئے ہیں، ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ منّور صاحب کی نسیم عرفاں ان سب میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ اسکی سلاست، روانی اور صفائی [illegible] اور [illegible] آسانی سے ذہن نشین کرادیتی ہے

قاموس اعلام[1]

حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب ملک کے مشہور ادیب، مورخ اور محقق ہیں جن کی ذات گرامی پر اُردو زبان کو فخر ہو سکتا ہے۔ آپ کی تمام عمر علم و ادب کی خدمت میں گذری ہے اور آپ کے گرانمایہ مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ زمانہ میں ہدیۂ ناظرین ہو چکے ہیں، اس لئے ہم کو آپ کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی یہ جدید تالیف ایک عظیم الشان ادبی کارنامہ کا جزو اول ہے۔ پوری کتاب نہ معلوم کتنے اجزا میں تکمیل کو پہونچے گی۔ اس عظیم الشان کتاب میں مشرق و مغرب کے ایسے مشاہیر، سلاطین، علماء، فقہا، حکما، اطبا، مشائخ، مصنفین وغیرہ کے مختصر سوانح حیات اور تمام اقوام و قبائل کے حالات مع سنین و شجرات اور تمام ملکوں، ولایتوں، شہروں، قصبوں کے جغرافی حالات درج ہونگے جن کے نام اردو کی علمی، ادبی، مذہبی و تاریخی تصانیف میں بار بار آتے ہیں مستند و معتبر حالات کے ساتھ کتابوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ پوری کتاب کی تقسیم دو حصوں (۱) تاریخی و (۲) جغرافی میں ہوگی۔ پہلے تاریخی بعد میں دوسرا حصہ شائع کیا جائیگا۔ اس کتاب کے سال بھر میں چھ جزو ہر دوسرے مہینے میں شائع ہونگے۔ جس کام کا بیڑا حکیم صاحب کی ہمت عالی نے اٹھایا ہے اگر یہ پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا تو اردو لٹریچر پر ایک احسان عظیم ہوگا۔ کیونکہ کوئی فہرست تلمیح اس انسائیکلوپیڈیا سے باہر نہ ہوگی۔ تقطیع بڑی اور لکھائی چھپائی، کاغذ سب اعلیٰ درجہ کی ہے حجم ۹۰ صفحات۔

داستان زوال[2]

یہ کتاب بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کے عروج و زوال کی تاریخ ہے جسے مشہور اور کہنہ مشق مصنف امیر احمد صاحب علوی کاکوروی ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے توریت۔ زبور۔ انجیل۔ تالمود۔ تاریخ جوزیفس اور دیگر مستند کتب یہود سے اخذ کر کے بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھا ہے۔ کتاب کو ختم کئے بغیر چھوڑنا مشکل ہے۔ یہودیوں کا شمار دنیا کی قدیم ترین اقوام میں ہوتا ہے جنھیں حضرت موسیٰ کی سرکردگی میں مصر سے خروج کے بعد سرزمین فلسطین میں جسے یہودیوں کی اصطلاح میں "ارض موعود" کہا جاتا ہے بہت کافی عروج حاصل ہوا تھا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان جن کی روایات دنیا میں بہت مشہور ہیں

---

[1] قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ: دفتر رسالہ تاریخ حیدر آباد دکن۔

[2] لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ سفید چکنا سائز ۲۶×۲۰ ضخامت ۲۲۶ صفحات قیمت ۲/ ملنے کا پتہ محمد زکی احمد آنریری لائبریرین امیر محل لائبریری نصیر باغ کاکوری ضلع لکھنؤ۔

اسی قوم کے مشہور تاجدار تھے۔ یہ بھی واضح رہے کہ حبش کے بادشاہ جہاں آجکل اٹلی کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے حضرت سلیمان اور بلقیس ملکۂ سبا کی اولاد ہونے کے دعویدار ہیں، اور ملک فلسطین کا دارالحکومت یروشلم جو یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں قبلہ سمجھا جاتا ہے، اسی قوم یہود کا آباد کردہ اور اس کا پایہ تخت تھا۔ توریت اور قرآن شریف میں اس قوم کے لئے "خیر الامم" "اہل الکتاب" اور بنی اسرائیل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مذہبی لحاظ سے یہ قوم بہت بڑی سمجھی جاتی ہے لیکن تاریخی لحاظ سے اس سے زیادہ نافرمان، سرکش، فتنہ پرداز اور قدامت پرست شاید دنیا میں کوئی قوم نہ ہوگی۔ چنانچہ اجتماعی غلامی کا طوق لعنت سب سے پہلے اسی نافرمان قوم کی گردن کا ہار ہوا۔ شاہ بابل بخت نصر نے تمام ملک یہود کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور وہ تمام قوم یہود کو پابزنجیر کرکے آشوریہ میں لے گیا تھا۔ یہ عہد اسیری شہنشاہ ایران کیخسرو کے زمانہ میں ختم ہوا جس نے تمام آشوریہ کو فتح کرکے یہودیوں کو آزادی کا پروانہ عطا فرما دیا تھا ([illegible] ق.م) انھوں نے اپنے وطن واپس آکر پھر اپنی سلطنت قائم کی۔ لیکن سرکشی اور خانہ جنگیوں کی بدولت بالآخر رومیوں کے ہاتھ تباہ ہوئے۔ اب اگرچہ وہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ مالدار ہیں۔ لیکن نہ ان کی کہیں حکومت ہے اور نہ کہیں وطن۔ اب جب سے ملک فلسطین انگریزوں کے قبضہ میں آیا ہے بالفور اسکیم کے بموجب فلسطین کو "وطن الیہود" بنایا جا رہا ہے۔ اور دنیا بھر سے یہودیوں کو لاکر فلسطین میں آباد کرایا جا رہا ہے۔

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے نہ صرف قوم یہود کے عروج و زوال سے بحث کی ہے بلکہ حواشی اور مختلف ابواب کے ذریعہ سے مصر، آشوریہ، بابل، ایران، روم و یونان کی بھی معاصرانہ تاریخ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں ایک جدید باب میں یہودیوں کے طرز معاشرت مذہب و تمدن اور رسم و رواج پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے غرض یہ کتاب بہت مفید اور دلچسپ ہے

نیشنل پریس الہ آباد اردو لٹریچر سیریز

مرحوم لالہ رام نراین بک سیلر الہ آباد نے اردو اساتذہ کے کلام تنقیدی، و تحقیقی تصانیف، علمی و ادبی کتب کو عمدہ اور چھوٹے سائز پر طبع کرا کے اردو پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ چنانچہ نیشنل پریس الہ آباد سے اردو لٹریچر سیریز کے نام سے تقریباً پچیس مفید و مستند اردو کتابوں کا ایک قابل قدر سلسلہ شایع ہو چکا ہے۔ یہ سب کتابیں عموماً ۲۰×۳۰/۱۶ کے چھوٹے سائز پر عمدہ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے

ساتھ شائع ہوتی ہیں اور اکثر مجلد ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے اس سیریز کی حسب ذیل کتابیں ہیں۔

۱۔ معیار البلاغت۔ مصنفہ منشی دیبی پرشاد صاحب سحر بدایونی۔ فن معنی و بیان، بدیع، عروض قوافی اور اقسام نظم و نثر پر ایک سبق آموز اور مفید کتاب ہے۔ ذیلی حاشی نے کتاب کی افادی حیثیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ طلبا اور شعرا کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات قیمت آٹھ آنہ ۸/

۲۔ دیوان ذوق۔ جسے حضرت طالب الہ آبادی نے مرتب فرمایا ہے۔ موصوف نے ایک طولانی مقدمہ میں ذوق کی سوانحعمری درج کرنے کے علاوہ اُن کی خصوصیات کلام پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ضخامت ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

۳۔ دیوان داغ۔ جو گلزار داغ کا خلاصہ ہے۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت دس آنہ

۴۔ موازنہ انیس و دبیر۔ مولانا شبلی نعمانی کی مشہور و معروف کتاب ہے جو محتاج تفصیل نہیں ضخامت ۳۰۴ صفحات مجلد قیمت ڈھائی روپیہ

۵۔ تذکرہ نیرنگ سودا۔ مؤلفہ منشی عبدالرفیع صاحب علوی آتر کاکوروی۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے شروع سے ابتک مرزا رفیع سودا پر جتنی تنقیدیں ہوئی ہیں اُن سب کو یکجا درج کرکے پھر اپنے قلم سے سب پر تنقید کی ہے، گویا یہ کتاب تنقید بر تنقید ہے۔ اس میں میر و سودا کے کلام کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ کتاب قابل قدر اور اس لائق ہے کہ اسکول کی لائبریریوں میں رکھی جائے۔ شروع میں حضرت وصل بلگرامی کا تعارف بھی درج ہے جو اُردو شاعری کے موضوع پر پڑھنے کے قابل چیز ہے۔ ضخامت ۱۵۰ صفحات، مجلد بوضع انگریزی۔ قیمت بارہ آنہ۔

۶۔ گل بکاؤلی۔ مشہور قصہ ہے۔ ضخامت ۱۲۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

یہ سب کتابیں لالہ رام نراین لال بک سیلر الہ آباد کی دوکان سے مل سکتی ہیں۔

مصری افسانے

سید مصطفیٰ لُطفی، جنوبی مصر کے شہر منفلوط کے رہنے والے مصر کے ممتاز اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ مجموعہ آپ ہی کے پانچ دلچسپ عربی افسانوں کا ترجمہ ہے جسے ادبی دنیا کے سابق اڈیٹر قاضی زین العابدین سجاد نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ سجاد صاحب اُردو زبان کے ادیب ہیں

اور عربی زبان پر بھی اچھی قدرت رکھتے ہیں، تاہم کہیں کہیں ترجمہ نظر ثانی کا محتاج ہے اور بعض جگہ غیر مانوس الفاظ استعمال ہوگئے ہیں، مثلاً تسارۂ عصری گمپ گھاپ ہمہچل۔ حوادثات وغیرہ مجموعی حیثیت سے افسانے اخلاقی نقطۂ خیال سے پاکیزہ اور سبق آموز اور اس قابل ہیں کہ مسلم اسکولوں کے نصاب میں داخل کئے جائیں۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ اچھی۔ ٹائیٹل رنگین و دیدہ زیب ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۱۱۲ صفحات قیمت آٹھ آنہ ملنے کا پتہ مینجر مطبع مجتبائی قاضی منزل میرٹھ۔

نیم شب[1]

یہ چھوٹا سا دلچسپ ڈرامہ دنیا کی دو متضاد طاقتوں یعنی استبداد اور اشتراکیت میں جنگ و جدال کی ایک مؤثر تصویر ہے۔ جس میں کائنات کی سب سے بڑی طاقت حسن و عشق کی آمیزش سے ایک لطف پیدا ہوگیا ہے۔ آخر میں نتیجہ انقلاب کے موافق نکالا گیا ہے۔ البتہ فریقین کے خیالات وجذبات کو ایمانداری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈرامہ کی زبان پیاری اور سلیس ہے اور ڈرامہ پڑھنے کے قابل ضرور ہے لیکن ہم اسے اسٹیج کے لئے مناسب نہیں سمجھتے۔ بہرحال مولانا اشتیاق حسین صاحب قریشی پروفیسر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی نے چھوٹے سائز کے ساڑھے چار جزو کا یہ ڈرامہ بہت خوب لکھا ہے۔ اس سے پہلے بھی آپ مختلف سبق آموز دلچسپ ڈرامے لکھ چکے ہیں

فلم و ڈرامہ[2]

اس کتاب میں مسٹر اویس احمد ادیب صاحب نے سینما کی مختصر تاریخ، ہندوستان میں فلم کا آغاز اور ترقی، ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے مختصر حالات مع سن پیدائش، ڈائرکٹروں اور فلم تقسیم کرنیوالوں کے نام اور پتے اور بہت سے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی تصویریں بھی دی ہیں۔ لائق مؤلف خود لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کی عمدگی ایک بڑی حد تک ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی امداد پر منحصر تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ معدودے چند کے سوا اکثریت نے اس بارہ میں نہایت ہی مایوس کن بے نیازی سے کام لیا۔ جس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ انھوں نے سوانح حیات بھیجنا درکنار خطوط کے جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔"

بایںہمہ فاضل مصنف نے مختلف ذرائع سے اس کتاب کو فلم اسٹاروں کے لئے اچھی خاصی پروپیگنڈا بک

[1] لکھائی چھپائی۔ کاغذ عمدہ۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ قرولباغ دہلی۔

[2] مجلد، قیمت سوا روپیہ ملنے کا پتہ: (۱) ادریس احمد ادیب مادھو گنج کٹرہ روڈ۔ الہ آباد (۲) ماڈرن بک ڈپو جیوٹ روڈ الہ آباد۔ (۳) نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ (۴) زمانہ بک ایجنسی کانپور

بنا دیا ہے۔ اس کا نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہوگا۔ یہ کتاب بھی کسی حد تک دلچسپ معلومات سے پر ہے لیکن معلوم نہیں فاضل مؤلف نے اکیز لیسوں کی پیدائش کی تاریخیں درج کر کے ان پر کیوں ظلم کیا ہے۔ کیونکہ اس دنیا کے لوگوں کی عمریں خواہ کتنی دراز کیوں نہ ہوں مگر "صنف نازک" ہمیشہ کم ہی رہتا ہے۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ معمولی۔ حجم بڑی تقطیع کے ۱۴۰ صفحات

حبش و اطالیہ

اب دنیا کی سلطنتوں کے جھگڑوں کی جڑ "زرخیز ملک۔ معدنیات اور سستی مزدوری" ہے۔ اور یہی وجہ اٹلی اور حبش کے نزاع کی ہے، کیونکہ انہیں تینوں باتوں کے لئے اٹلی بھی حبش سے برسر جنگ ہے۔ یورپ کے بعض علمبرداران تہذیب و آزادی نے غلامی کا ایک اور جدید نظریہ قائم کیا ہے۔ اُن کے نزدیک انفرادی غلامی تو جرم ہے لیکن اجتماعی غلامی جائز اور مباح سمجھی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر کسی قوم کو غلام بنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اختر حسین صاحب رائے پوری بی۔ اے۔ نے اس کتاب میں مختلف عنوانوں پر مختلف اہل قلم کے مضامین جمع کر کے حبش کے جغرافیائی، تاریخی اور تمدنی حالات پر بہت کافی روشنی ڈال دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اٹلی و حبش کی جنگ کے اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے شہنشاہ حبش۔ مسولینی۔ جنرل دی بونو۔ جنرل وہیب پاشا کی تصویروں کے علاوہ ملک حبش کا نقشہ بھی اس میں دیدیا گیا ہے جس میں گو موجودہ مقامات جنگ کے نام نہیں ملتے پھر بھی غنیمت ہے۔

لکھائی چھپائی معمولی۔ کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ ٹائیٹل باتصویر۔ قیمت سوا روپیہ
ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔

MORNING SHADOWS.

اپریل سنہ ۳۵ء کے تیسرے ہفتہ میں ایک روز صبح کے وقت ایک چوبیس سالہ کشمیری نوجوان کی لاش وکٹوریہ میموریل کلکتہ کے پاس میدان میں پائی گئی۔ لاش کے قریب پانچ فیر کا ایک ریوالور، ایک کارتوس خالی اور چار بھرے ہوئے ملے۔ یہ لڑکا ایم۔ اے میں پڑھتا تھا۔ بیحد ذہین۔ طباع اور شاعرانہ ذہنیت کا تھا۔ وہ رات دن رباعیات عمر خیام کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ یہ لڑکا جس کا نام پنڈت سورج کشن تھا رائے صاحب پنڈت سری کشن صاحب کا لخت جگر تھا یہی جوانمرگ شخص اس کتاب کا مصنف ہے۔ کتاب زیر نظر مرحوم کی انگریزی نظموں اور ایک انگریزی فسانہ کا مجموعہ ہے مصنف کے شاعرانہ خیالات کی رفعت اور زبان کی شستگی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مرحوم کے دل شکستہ والد نے اس مجموعہ کو طبع کر کے شائع کیا ہے۔ شائقین مسٹر الس این سپرو ۱۵ سٹا ہوپلانہ طلب کریں۔

رفتارِ زمانہ
نئے وائسرائے کی تقریر

ہز اکسلنسی لارڈ لنلتھگو نے عنان حکومت سنبھالتے ہی دہلی سے ایک تقریر براڈ کاسٹ کی جو ملک کے اخبارات میں شایع ہو چکی ہے۔ ہز اکسلینسی کی یہ تقریر رسمی فصاحت و بلاغت کا نمونہ نہیں ہے۔ بلکہ اسمیں دل سے نکلی ہوئی باتیں ہیں جنکو دلوں میں ہی اُتر جانا چاہیئے۔ اسمیں ملک کے ہر طبقے اور ہر جماعت کو مجموعی حیثیت سے مخاطب کرکے اپنے عہد حکومت کے اصول جہانبانی کا جو خاکہ لارڈ ممدوح نے صاف سیدھے سچے لفظوں میں پیش کیا ہے۔ اس پر اگر آیندہ پانچ سال تک عمل کیا گیا تو حکام اور رعایا کے درمیان ملک میں عرصہ سے جو کشمکش اور بددلی پھیلی ہوئی ہے وہ بہت بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔

ہز اکسلنسی لارڈ لنلتھگو ہندوستان کے لئے نئے نہیں ہیں۔ آپ اس سے پہلے بھی شاہی زراعتی کمیشن کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے ہندوستان کے حالات سے براہ راست واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں کے سیاسی مسائل سے بھی آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ کیونکہ انگلستان میں آپ جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ملک کے اہل الرائے اصحاب سے تبادلہ خیالات کر چکے ہیں۔ اسلئے جو کچھ آپ نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا ہے وہ سنی سنائی باتوں پر نہیں بلکہ ذاتی تجربہ اور آنکھوں کی دیکھی باتوں پر مبنی ہے۔

ہز اکسلنسی نے شروع میں تحفظ امن و قانون کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اس بارہ میں اپنا فرض بلا رورعایت ادا کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے جس سے کسی شخص کو انکار نہ ہوگا کہ ملک کی سب سے بڑی ضرورت امن و امان کا قیام ہے جس کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے بعض اوقات جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں وہ مسلمہ اصولوں سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ہز اکسلنسی کے عہد حکومت میں ان طریقوں کے اختیار کرنے کی نوبت نہ آئے گی۔ اور جو قابل اعتراض آرڈیننس لارڈ ویلنگڈن کے وقت میں پاس ہو گئے ہیں وہ رفتہ رفتہ منسوخ کر دئے جائیں گے۔ درحقیقت ملک کا معمولی قانون ہر قسم کی بے عنوانیوں کے تدارک کے لئے کافی ہے۔

ہز اکسلنسی انگلستان کے ان بڑے زمینداروں میں ہیں جنھیں اپنے کاشتکاروں سے

خاص ہمدردی ہے زراعتی کمیشن کے سلسلہ میں آپکو ہندوستان کے زراعت پیشہ طبقہ کی حالت سے بھی پوری واقفیت حاصل ہو چکی ہے۔ چنانچہ کسانوں کے فلاح و بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے حکام ضلع سے فرمایا ہے کہ اپنے اپنے اضلاع میں وہ ملک معظم کے نمایندوں کی حیثیت سے گورنمنٹ اور دیہاتی آبادی کے درمیان ایک اہم کڑی کا کام دیتے ہیں۔ ہندوستان کا کسان اُن سے رہنمائی امداد اور دلجوئی کی توقع رکھتا ہے۔ اسلئے انہیں دیہاتوں کا خوب دورہ کرنا چاہیے اور گانوٗں والوں سے براہ راست ملکر ان کے اصلی حالات معلوم کرکے ان کی دادرسی کرنی چاہیئے لارڈ ممدوح کا خیال صحیح ہے کہ دورے کا خیمہ دفتر کے قلم سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

اس ارشاد کی صداقت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان کی آبادی کا نوّے فیصدی دیہات میں آباد ہے۔ اسلئے ملک کی اصلی ضروریات دیہاتوں ہی میں معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس وقت ہندوستان کے تقریباً ساڑھے سات لاکھ دیہاتوں میں ہرطرف مفلسی و ناداری کا دور دورہ ہے اور فصلوں کی تباہی اور زراعتی پیداوار کی کساد بازاری نے دیہات کی آبادی کو جو ملک کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اقتصادی تباہی کی آخری حد تک پہونچا دیا ہے۔ اگر حکام ضلع نے ہز اکسلنسی کی نصیحت پر عمل کیا اور دیگر محکموں نے بھی وائسرائے کے منشاء کے بموجب اہل دیہات کے فلاح و بہبود کے لئے ضروری اسکیمیں جاری کیں تو ملک کی بہت کچھ حالت بدل سکتی ہے۔

ہز اکسلنسی کی تقریر کا اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں آپ نے اقوام ہند کیساتھ اپنی مکمل غیر جانبداری کا اعلان فرمایا ہے۔ کچھ عرصہ سے اس کے متعلق دلوں میں خاص بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور ہندوستان کی اکثر جماعتوں میں اس بارے میں بددلی پھیلی ہوئی ہے۔ نئے آئین نے بھی اکثر جماعتوں کے ساتھ خاص زیادتیاں روا رکھی ہیں۔ ملازمتوں میں بھی فرقہ وارانہ نیابت کے خیال نے قابلیت کے معیار کو پس پشت ڈالدیا ہے اور روزمرہ بھی کثیر تعداد والی جماعت کو ہر موقعہ پر جا و بیجا دبایا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں نئے وائسرائے نے سب کے ساتھ بے رو رعایت عدل و انصاف اور غیر جانبداری کا برتاؤ کرنے کا جو اعلان کیا ہے وہ خاص طور پر اہم ہے۔ دوسرا بڑا اعلان یہ ہے کہ لارڈ لنلتھگو ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے ساتھ کھلے دل سے ملاقات کے لیے

ہر وقت تیار رہیں گے اور اس بارے میں انگلستان کی بہترین روایات کے مطابق عمل کریں گے۔ لارڈ ویلنگڈن نے اس بارے میں جو پالیسی برتی وہ بیحد افسوسناک تھی چنانچہ بہت سے اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کی ملاقات سے انکار کرکے بہت بڑی غلطی کی۔ خوشی کی بات ہے کہ نئے وایسرائے کا ایسا خیال نہیں ہے اور وہ مختلف سیاسی جماعتوں کے نقطۂ خیال کو یکساں ہمدردی کیساتھ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ انتخابات میں بھی انہوں نے اپنی گورنمنٹ کی غیر جانبداری کا اعلان کیا ہے یہ بہت بڑا اعلان ہے جس کے بعد بہت سی مشکلات کا خود بخود خاتمہ ہو جانا چاہیئے۔ مگر اس اعلان پر عمل کرانے کے لئے لارڈ ممدوح کو خاص کوشش کرنا ہوگی۔ بہرحال خوشی کی بات ہے کہ آپ نے آتے ہی کسانوں کے فلاح و بہبود میں خاص دلچسپی لینا شروع کردی ہے۔ چنانچہ آپ نے شریف نوازی کے ساتھ ہر جگہ کاشتکاروں سے ملاقات کی اور مضافات دہلی کے بیلوں کی نسل میں ترقی دینے کے خیال سے اپنی طرف سے دو سانڈ خریدے ہیں۔ جو آپ کے ذاتی صرفہ پر دیہاتوں میں گشت کرائے جائیں گے۔

آپ کو غریبوں کا بھی خیال ہے۔ تعلیم یافتہ بیکاروں سے بھی ہمدردی ہے۔ غریبوں کو تو آپ نے اپنی شادی کی پچیس سالہ جوبلی کے موقعہ پر (جو حسن اتفاق سے آپ کے دہلی پہونچنے کے دوسرے ہی دن ہوئی) یاد فرمایا اور اپنے صرف سے سات ہزار ہندو مسلمان، سکھ و عیسائی غریبوں کی پُر تکلف دعوت کی۔ غرض نئے وایسرائے کے عہد حکومت کا آغاز تو بہت ہی دل خوش کن ہوا ہے خدا کرے انجام بھی ایسا ہی مبارک ہو۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگریس

اس سال آل انڈیا نیشنل کانگریس کا اجلاس جس دھوم دھام کیساتھ لکھنؤ میں ہوا اُس سے یہ حقیقت ایک دفعہ پھر ظاہر ہوگئی کہ ابھی تک کانگریس کا لوگوں کے دلوں پر سکہ بیٹھا ہوا ہے لیڈروں کی کمزوریوں اور ان کے باہمی تنازعوں کے باوجود عوام میں کانگریس کی ہردلعزیزی میں زیادہ فرق نہیں آیا ہے اور اُسوقت تک نہ آوے گا جبتک غیر ملکی حکومت کی طرف سے دلوں میں منافرت باقی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اثر خود پنڈت جواہر لال صاحب نہرو صدر کانگریس کے

دل پر چھایا ہوا ہے۔ پنڈت جی کا دل ہندوستانی مگر دماغ انگریزی ہے۔ ان کی تربیت و تعلیم سب بہترین انگریزی طریقے کے مطابق ہوئی ہے۔ وہ خود ناز و نعم میں پالے ہوئے ہیں اور دماغی نشو و نما کے اعتبار سے بہترین انگریز کے برابر ہیں مگر ان کا دل ایک سچے ہندوستانی کا دل ہے۔ انھیں اپنے ملک کی محکومیت۔ اپنے وطن کی بے بسی۔ اپنے ملک کے افلاس کا اتنا ہی صدمہ اتنا ہی رنج ہے جتنا کہ انگلستان کے بہترین محب وطن کو اپنے مادر وطن کی تکلیف اور ذلت کا ہوگا۔ وہ سچے دل سے محکومیت کی زنجیروں کو جلد سے جلد توڑ ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارا ملک سیاسی پستی کے علاوہ صدیوں کی تمدنی خرابیوں۔ باہمی رقابتوں اور صدہا دوسری کمزوریوں میں مبتلا ہے۔ اسلئے جو علاج ترقی یافتہ مغربی ممالک کے لئے کارگر ہو وہ ضروری نہیں کہ ہمارے پسماندہ ملک کے لئے بھی موزوں ہو۔ اسمیں شک نہیں کہ یہاں کا طریقہ زمینداری اصلاح و ترقی کا محتاج ہے۔ مگر نجی جائداد کا معدوم کر دینے کی تجویز کسی طرح سے عملی تدبیر نہیں ہے۔ افلاس کے ہاتھوں عوام کی حالت بیشک زار و نزار ہے لیکن سرمایہ داروں کو مٹا کر جمہور کی حالت درست کرنے کا خیال جنون سے کم نہیں ہے غیروں کی محکومیت اور دست نگری ہر حیثیت سے تباہ کن ہوتی ہے۔ لیکن جس ملک کے باشندوں میں ذرا ذرا سی باتوں میں اسقدر نزاع باہمی ہو جیسی کہ ہمارے بد قسمت ملک میں روزمرہ دیکھنے میں آتی ہے۔ وہاں موجودہ حکومت کے اٹھ جانے کے بعد بھی چین سے بیٹھنے کا خیال صریحاً غلط ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جاپان کا برتاؤ انگلستان سے بدرجہا بدتر نہ ہوگا۔ اور خدا نخواستہ آج انقلاب سلطنت ہو تو ہمارا حال ویسا ہی نازک ہو جائیگا جیسا کہ اسوقت چین کا ہے۔ غرض مرض کی صحیح تشخیص اور مریض کے تکالیف و مصائب کے سچے احساس کے باوجود بھی پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی صدارتی تقریر کانگرس میں جو علاج تجویز کیا ہے اسمیں ہماری غیر معمولی مشکلات اور کمزور حالات کو قطعی مدنظر نہیں رکھا گیا ہے۔ پنڈت جی نے اپنی تقریر میں دنیا کے سیاسی حالات پر صحیح تبصرہ کرکے موجودہ زمانہ کی پولیٹکل تحریکوں کا صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔ لیکن سیاسی غلامی۔ معاشرتی بیکسی اور تمدنی بے بسی کا علاج جو وہ تجویز کر رہے ہیں اس میں مریض کے قوت کا مطلقاً کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی حکیم حاذق کسی سل و دق کے مریض کو جو ایک جیلخانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں مقفل پڑا ہو۔ سوئٹزرلینڈ کے بلند پہاڑوں کی سیر تجویز کر دے۔ یا نان شبینہ کے محتاج شخص کے لئے کوئی بیحد قیمتی دوا کا نسخہ لکھدے یا کسی ازحد کمزور مریض کو اس کی قوت ہاضمہ سے کہیں زیادہ مقوی غذا استعمال کرنے کی صلاح

دے۔ یہی وجہ ہے کہ خلوص و سچائی کے باوجود صدر کانگرس کے مشورے زیادہ ناقابل عمل ہیں اور خود کانگرس کے زیادہ تجربہ کار لیڈروں نے پنڈت جی کے صلاح و مشورہ پر کاربند ہونا مناسب نہیں سمجھا چنانچہ ایک جزوی تجویز کے علاوہ ورکنگ کمیٹی اور کانگرس کے کھلے اجلاس نے شروع سے آخر تک سوشلسٹ پروگرام اور تجاویز کو رد کر دیا۔ اسلئے ہمارا خیال ہے کہ اس سال بھی کانگرس مہاتما گاندھی۔ بابو راجیندر پرشاد اور مسٹر پٹیل ہی کی رہنمائی میں رہے گی۔ اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی دیسائی کی پوزیشن پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئی ہے۔ اور غالباً مستقبل قریب میں کانگرس کے نئے صدر کی پالیسی کا کوئی خاص اثر نمایاں نہ ہوگا البتہ عوام کی بہتری کے لئے جو پروگرام تجویز ہوا ہے اس سے ممکن ہے کوئی مفید نتیجہ نکل آئے۔ لیکن یہ بھی اسی صورت میں ممکن ہوگا جب خلوص و صداقت کے علاوہ اعتدال اور حسن تدبیر سے بھی کام لیا جائے اور خواہ مخواہ ملک کے مختلف طبقوں سے جنگ و جدل کا اعلان نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ایک قابل ذکر بات ہے کہ پنڈت جواہرلال نے ورکنگ کمیٹی کے انتخاب میں انتہائی حق پرستی اور حب الوطنی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنے صدارتی ایڈریس میں اس امر کا اطمینان دلایا ہے کہ وہ کانگرس کی عام رائے کا پورا احترام کریں گے۔ اور ہر ممکن طریقے سے باہمی اتفاق و اتحاد کو قایم رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس وعدہ کو انھوں نے پورے طور پر نباہنے کی کوشش کی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ ورکنگ کمیٹی کی موجودہ ساخت کہانتک متفقہ عملدرآمد کی معین و معاون ہوگی؟ اگر سب ٹکڑیوں نے اسی ایثار و حق پرستی سے کام لیا جس سے پنڈت جواہرلال نہرو ظاہر و باطن دونوں میں متاثر ہیں تو یقیناً کوئی قباحت نہ ہوگی اور حب الوطنی کے علاوہ لیڈری کا بھی سودا دماغوں میں سمایا تو واقعی سخت مشکلات کا سامنا ہوگا اور شکست اور جگت ہنسائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ لیکن اگر تنظیم اور ایثار سے کام لیا گیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ سیاسی خدمت کا سلسلہ ترقی کیساتھ قایم نہ رہے۔

آئندہ سال کا سب سے بڑا واقعہ نئے آئین کے ماتحت کونسلوں کے انتخابات ہیں۔ اگر اس موقع پر کانگرس کوئی قابل عمل پروگرام ووٹروں کے سامنے پیش کر سکی۔ اور جمہور ملک کو اپنے پیغام اور دستور العمل سے نیز مزید سیاسی حقوق حاصل کرنیکے لئے اپنی طرف کھینچ سکی تو وہ ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دیگی۔ عہدوں کا لینا یا وزارتوں کو قبول کرنا ابھی دور ہے۔ وقت مناسب پر اس کا خود بخود حل ہو جائے گا۔ اور ضروری نہیں کہ ایک ہی حل تمام صوبوں

کے لئے کافی ہو۔ آئین میں ایسے روڑے اٹکا دینے کی تجویز جس سے بنیادی دستوری اساسی معطل و منسوخ ہو جائے بظاہر کتنی ہی دل جوش کن کیوں نہ ہو۔ لیکن واقعی حیثیت سے یہ نسخہ کئی بار ناکامیاب ہو چکا ہے اور آیندہ کے لئے اسکے متعلق مزید انتظامات کر لئے گئے ہیں۔ اسلئے موجودہ حالات میں اس کی کوشش کرنا پتھر کی دیوار پر سر دے مارنے کے برابر ہے۔ لیکن متفقہ و مشترکہ کوششوں سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور اس عجیب الخلقت آئین سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کم سے کم ہم دنیا پر ملک کی اہلیت ضرور ثابت کر سکتے ہیں۔ اس وقت پولیٹکل حالات میں جس تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں انکو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ برٹش گورنمنٹ بھی ہمارے سیاسی اتفاق۔ ملکی تنظیم اور مشترکہ جد و جہد سے دیر تک بے اثر رہ سکے گی۔ دنیا کی سیاسی تحریکات کا شائد ہی کسی ہندوستانی نے پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ گہرا مطالعہ کیا ہو۔ خدا کرے وہ ملک کی بنیادی کمزوریوں اور ہماری موجودہ مشکلوں کو بھی سمجھ بوجھ کر کام کریں۔ تاکہ مشترکہ مقصد حاصل ہونے میں کم سے کم وقت اور قوت ضائع ہو۔

جذباتِ محشر

(از حضرت محشر لکھنوی)

صبح سے لیکے صبح تک میں ہوں اسی خیال میں
ایسی حیات کے فدا گذرے جو ایک حال میں

یہ مانا ہجر میں روتے ہی روتے دم نکلتا ہے
مگر آنسو جسے کہئے وہ آنسو کم نکلتا ہے

نام دنیا میں دوستی کا نہیں
کوئی ہمدرد اب کسی کا نہیں

گلی میں دوست کی سرتا قدم تمنا ہوں
کوئی کسی کو پکارے میں بول اٹھتا ہوں

لذت رہی خوشی میں نہ ایذا ملال میں
دیوانہ ہو رہا ہوں کسی کے خیال میں

جو گذرتی ہے محشر اسکو سہو
چپ رہو چپ کسی سے کچھ نہ کہو

لطفِ سخن

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب)

شاملِ حال زبوں لطف ستمگر ہوتا اپنے قابو میں جو اپنا دلِ مضطر ہوتا
خوگرِ عدل اگر داورِ محشر ہوتا رتبۂ شاہ و گدا ایک برابر ہوتا
آج اپنی بھی فرشتوں پہ حکومت ہوتی دولتِ علم نہ ملتی تو تونگر ہوتا
چاہ میں ڈال کے چل دیتے ہوس کے بندے کب وفا کرتے جو یوسف سا برادر ہوتا
لاکھ سر مارا بتوں نے نہ پسیجے پتھر ان سے بہتر تو درِ یار کا پتھر ہوتا
دو گھڑی چین سے دنیا میں بسر ہو نہ سکی میں نہ ہوتا تو بھی اس حال سے بہتر ہوتا
ہار گل ہوتے حسینوں کے گلے کے کیونکر منحصر وصلِ حسیناں جو نہ زر پر ہوتا

آئینہ دیکھنے والے نہ کسی کے ہوتے
اپنی قسمت کا کوئی لاکھ سکندر ہوتا

(از ماسٹر جیمنی سرشار خیر پور سادات)

کونسا ظلم نہیں کون سی بیداد نہیں پھر بھی لب پر ترے نالہ نہیں فریاد نہیں
غیر پر لطف کہ مجھ پر تری بیداد نہیں تو کسی بات میں بھی کم ستم ایجاد نہیں
قوتِ ذوقِ عمل کو جو زیادہ کر دے زینہ ہے بامِ ترقی کا وہ افتاد نہیں
خوب جی بھر کے ستم توڑ لے گلچیں مجھ پر "میں وہ بلبل ہوں جسے آہ و فغاں یاد نہیں"
موت ہی مانگ خدا سے کہ جہاں میں جز مرگ دردِ فرقت کا علاج اے دلِ ناشاد نہیں
آنکھ کیا آنکھ ہے جس آنکھ نے دیکھا نہ تجھے دل وہ کیا دل ہے کہ جس دل میں تری یاد نہیں
فکرِ عقبیٰ ہے نہ دنیا کی ہوس کچھ اس کو تیرے پابند سے بڑھ کر کوئی آزاد نہیں
دل کو دل جس نے بنایا ہے یہی تیر تو ہے دل ہی وہ کیا جو غمِ عشق سے آباد نہیں
حسنِ مغرور کسی بات کا پابند نہیں عشق مجبور کسی کام میں آزاد نہیں

دین و ایمان و دل و جان و جگر ہوش و حواس
کون سرشار رہِ عشق میں برباد نہیں

فہرست مقالات

[illegible]

زمانہ کے پرانے فائل

دفتر زمانہ میں ۱۹۲۹ء سے پرانے فائل موجود ہیں۔ دنیائے ادب کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم علمی اور مشہور رسالہ چھتیس سال سے اردو زبان و ادب کی مسلسل خدمت کر رہا ہے۔ اس کے مقالات و مضامین اور گرانمایہ تنقیدیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پرانے فائل کبھی بیکار نہیں ہوتے۔ وہ لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ شائقین ان سے محروم نہ رہیں۔ اس لئے پرانے فائلوں کے خریداروں سے حسب ذیل رعایت کی جائے گی۔

(۱) دس سال کے مکمل سیٹ کے خریدار سے ... پچیس فیصد

(۲) چار سال کے یکجائی خریدار سے علاوہ محصول ... فیصدی

(۳) ایک سال کے فائل خریدنے والوں سے صرف چار روپے لئے جائیں گے۔ چند فائل باقی ہیں۔ شائقین جلد طلب فرمائیں۔

کمال داغ

حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوانوں کا انتخاب مع مقدمہ تنقیدی مرتبہ مولانا حامد حسن قادری

مقدمہ میں (۱) اردو غزل گوئی پر جدید زاویہ نگاہ سے تنقید کر کے تغزل کے قدیم و جدید رنگ کے محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد (۲) حضرت داغ کی غزل گوئی پر ہر پہلو سے ریویو کر کے انکو دور متاخرین کا بہترین غزل گو ثابت کیا گیا ہے۔ مقدمہ کے بعد دواوین داغ (گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ) کا بہترین انتخاب

قیمت مجلد دو روپیہ

ملنے کا پتہ:

زمانہ بک ایجنسی کانپور



اس موسم میں گرم و غبار آلود ہوا بیماریوں کے جراثیم سے بھری ہوئی ہوتی ہے اور آپ کے ہر سانس کے ساتھ آپکے جسم میں بیماری داخل ہوتی ہے۔ اول اول تو حلق خشک ہوتا ہے، گلے میں دکھن اور ورم معلوم ہوتی ہے پھر بعد سخت کھانسی اور پھیپھڑوں کی سخت بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تاوقتیکہ آپ سانس کے ذریعہ سے آرام پہنچانے والی پیپس کی ٹکیاں استعمال نہ کریں۔ پیپس کی ٹکیہ سے منہ میں گھلتے ہی گراں قدر جراثیم کش ابخرے خارج ہوتے ہیں جو مضرت جراثیم کا اثر مٹا دیتے ہیں۔ اور بہت جلد تکلیف زدہ حلق

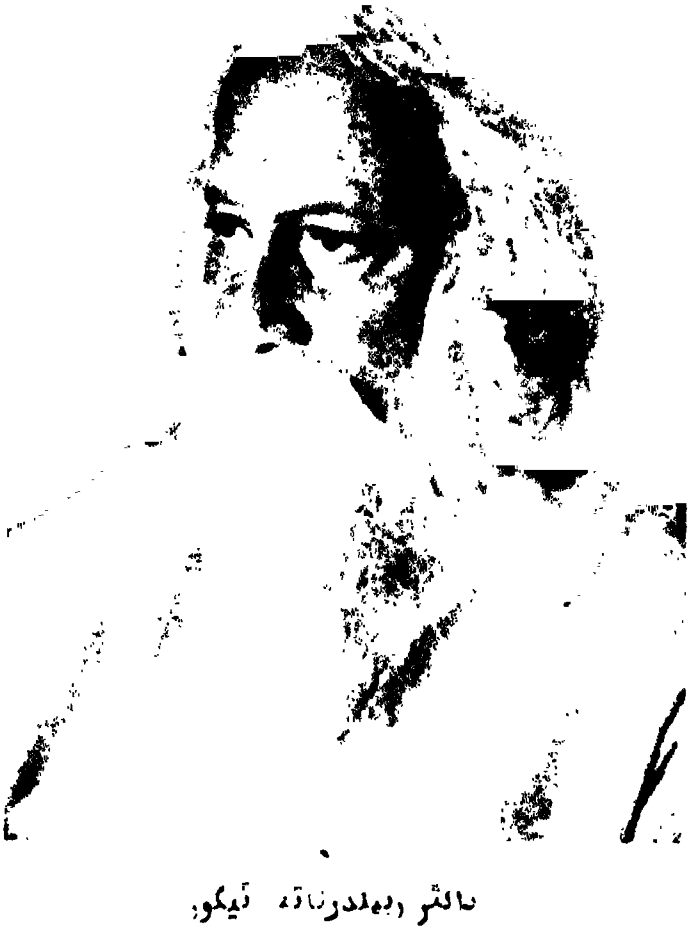


اور آلات تنفس کو آرام پہونچاتے ہیں۔ پیپس ٹکیاں سینہ اور پھیپھڑوں کی بیماریوں کے خلاف قابل قدر ڈھال ہیں۔ تمام دوا فروشوں سے ایک روپیہ میں شیشی ملتی ہے۔

سانس کے ذریعے آرام پہونچانے والی پیپس کی ٹکیاں استعمال کیجئے۔

پیپس

PEPS



ڈاکٹر ربندرناتھ ٹیگور

زمانہ

نمبر ۵ — مئی ۱۹۳۶ء — جلد ۶۶

اردو یا ہندی

از منشی جگیشور ناتھ ورما جناب بریلوی بی، اے ایل ایل بی،

جس طرح پیدائش عالم کی ساعت سے دنیا بے خبر ہے اسی طرح کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ سب سے پہلے کب اور کونسی زبان عرصۂ ظہور میں آئی لیکن فطرت کے بعض نمونوں کا جائزہ لیکر دیکھنے سے اس سوال کا تسکین بخش جواب مل سکتا ہے۔ مثال کیلئے پرندوں کی دنیا میں سے کوّے ہی کو لے لیجئے۔ کالے یا سفید کوّے آپ کو دنیا کے ہر حصہ میں بکثرت ملیں گے۔ لیکن جہاں تک انکی بولی کا تعلق ہے۔ تقریباً ہر خطہ کے کوّے بلا امتیاز رنگ و نسل، اگر انکی بولی کو آپ بے نام و نشان زبان سے تعبیر کیا جائے تو ایک ہی زبان کا استعمال کرتے سنائی دیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ تفریق آب و ہوا کے لحاظ سے ان کے لب و لہجہ میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔ ٹھیک یہی بات انسان کی قدیم ترین زبان کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ نقص و نارسائی کے باوجود عقل انسانی یہی فیصلہ کرتی ہے کہ ابتداءً دنیا کی ایک ہی زبان تھی۔ اور اگر ڈارون کے نظریہ میں کچھ بھی حقیقت ہو تو یہ ثابت ہے کہ لب و لہجہ کی تفریق سے قطع نظر حضرت آدم کی زبان بھی وہی ہوگی جو اس وقت دیگر حیوانات کی بول چال تھی۔ جون کیٹس کی ایک طویل نظم "لامیہ" سے بھی جو غالباً کسی یونانی قصہ سے ماخوذ ہے اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ خود فطرت کی یکسانیت دیگر بھی شاہد ہے کہ اوّلین نسل انسانی صرف ایک ہی مشترکہ زبان کی مالک تھی۔ جس میں رفتہ رفتہ مقامی تبدیلیوں اور طبعی اثرات کے باعث سیکڑوں رنگ آگئے۔ اور ایک ہی دریا کی ان بیشمار شاخوں میں مختلف راستے اختیار کر لینے کے بعد اتنا بعد ہوگیا کہ ان کی صورت ہی بدل گئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ بنی آدم کی اوّلین زبان کیا تھی اور اس میں کس طرح اتنی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ دنیا کی قدیم ترین زبان کے بارے میں محققین کی رائے میں شدید اختلاف ہے۔ کوئی سنسکرت

۱؎ سنسکرت کے بعض اشلوکوں کی مدد سے آج بھی لوگ کوّے کی بولی سمجھ لیتے ہیں۔ بنارس کی طرف کوّے کی بولی سے شگون پکارنے کا رواج عام ہے (چندر کانتا مصنفہ دیوکی نندن) ۲؎ جدید تحقیقات نے سفید کوّں کی نسل کا بھی پتہ لگایا ہے۔

کو دنیا کی ابتدائی زبان کہتا ہے۔ کوئی "پراکرت" کو اس فخر کا مستحق بتاتا ہے۔ کوئی ماگدھی کا دم بھرتا ہے اور کوئی پالی کا راگ گاتا ہے۔

ویدوں کو دنیا کی اولین تصنیف مانا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ویدوں کی زبان کو جو قدامت او فضیلت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ خود ویدوں کی زبان میں بھی اختلاف موجود ہے۔ شکشا نامی ویدانگ کے پانچویں باب میں لکھا ہے کہ ویدوں کی اصلی زبان سنسکرت نہیں ہے، بلکہ جب ویدک بھاشا آرش (आर्ष) پراکرت کے رنگ میں رنگی جا رہی تھی۔ اُس وقت اُسے سنسکرت کے روپ میں ڈھالا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سنسکرت اور پراکرت دونوں ویدک زبان کی بدلی ہوئی دو مختلف صورتیں ہیں۔ اسی ویدک زبان کو ہم آدی آریہ بھاشا (आदि आर्य) کہہ سکتے ہیں۔ ہندی بھاشا کی اُت پتی (उत्पत्ति) کے مصنف نے تسلیم کیا ہے کہ آریوں کی قدیمی زبان کے چند نمونے رگ وید میں موجود ہیں۔ یہی آریہ بھاشا کتنی ہی پراکرتوں کا سرچشمہ ہے۔ سنسکرت حقیقت میں کسی پرانی پراکرت ہی سے ماخوذ ہے۔ بنگلہ وشو کوش (बंगला विश्व कोष) کے مصنف نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ سنسکرت اور پراکرت ویدک (वैदिक) بھاشا ہی کی توام بیٹیاں ہیں۔ پراکرت کے سنسکرت سے آزاد زبان ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ ویاکرن ہیم چندر (वैयाकरण हेम चन्द्र) "پراکرت چندریکا کار (प्राकृत चन्द्रिका कार) اور پراکرت سنجیونی کار (प्राकृत संजीवनीकार) نے بھی پراکرت کو سنسکرت سے بے تعلق اور ایک علیحدہ زبان تسلیم کیا ہے۔ ہم ان آرائے پنڈت بہاری ناراین کی طرح پراکرت کو سنسکرت ہی کا ایک دوسرا نام تصور کرتے ہیں۔

"شکشا نامی ویدانگ کے مطابق پراکرت ہی پہلی انسانی زبان قرار پاتی ہے۔ لیکن "پالی پرکاش" کا بنگالی مصنف رقمطراز ہے کہ آریوں اور غیر آریوں کے میل جول سے جو زبان بنی وہی پراکرت کہلائی میکڈانل نے اپنی مشہور تصنیف "علم لغت" میں لکھا ہے کہ ژند اور سنسکرت میں جتنا تفاوت ہے اصلی ویدک زبان اور سنسکرت میں اس سے کہیں زیادہ اختلاف موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وید مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ایک سے زائد زبانوں میں لکھے گئے۔

سنسکرت زبان کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں (۱) ویدک سنسکرت یا وہ زبان جس میں وید لکھے گئے اور (۲) لوکک (लौकिक) سنسکرت جو پانینی (पाणिनी) اور اس کے بعد مروج تھی۔ لیکن یہ تقسیم زیادہ صحیح نہیں مانی جا سکتی کیونکہ خود ویدوں کی زبان میں اختلاف موجود ہے۔

پالی زبان کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ پراکرت زبانوں میں قدامت کے اعتبار سے اولیت کا سہرا پالی ہی کے سر ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں نکالا جا سکتا کہ پالی ہی دنیا کی پہلی زبان ہے جبکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ویدک بھاشا ہی سے پراکرت اور سنسکرت کا ظہور ہوا۔ اور اس کے بعد مختلف پراکرت زبانیں معرضِ وجود میں آئیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پالی بھی ماگدھی کی طرح آرش پراکرت کی مترادف ہے۔ لیکن یہ دعویٰ ہنوز محتاجِ ثبوت ہے۔

پراکرت لکشن (प्राकृत लक्षणा) کے مصنف چنڈ نے پراکرت کی چار قسمیں گنائی ہیں:
(۱) آرش پراکرت (है) (۲) آپ بھرنش (अपभ्रंश) (۳) پیشاچی (पैशाची) اور (۴) ماگدھی۔ لیکن بعض بعد کے تذکرہ نگار تقسیم میں سنسکرت ڈراما (शौरसेनी) شورسینی کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ور روچی (वररुचि) کی رائے میں مہاراشٹری، پیشاچی، شورسینی اور ماگدھی ہی پراکرت کے ذیل میں آتی ہیں۔ ہیم چندر کے نزدیک مول پراکرت، شورسینی، ماگدھی، پیشاچی، چولیکا (चूलिका) اور آپ بھرنش مختلف زبانیں ہیں جو بعد کے دور کی پراکرت زبانیں ہیں۔ تذکرہ مختلف بیانات کی موجودگی میں بھی کہے جاتے ہیں کہ ماگدھی سنسکرت اور پراکرت کی طرح ایک نہایت قدیم زبان ہے۔ کاتیاین (कात्यायन) کی پراکرت شدھی میں درج ہے کہ دنیا میں ماگدھی کا قدیم ترین بول چال ہے۔ پانینی (पाणिनी) نے تسلیم کیا ہے کہ ویدک زبان کے علاوہ ماگدھی بھی عوام میں مستعمل تھی۔ جینیوں کا دعویٰ ہے کہ اردھ ماگدھی (अर्द्ध) ہی دنیا کی پہلی زبان ہے:-

जैनेरा अर्द्ध मागधी भाषा कई आदि भाषा वलिया मने करन ।

غرض جسے دیکھئے وہ کسی ایک یا دوسری زبان کو انسان کی اولین زبان ثابت کرنے کی دھن میں جھگڑے و شور و غوغا دیوانہ ہو رہا ہے۔ لیکن ان ساری زبانوں میں جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے، وہ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ سب کی سب ایک ہی چشمہ کی مختلف شاخیں ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ چشمہ کیا اور کہاں ہے؟

جہاں تک زبان کی اولیت کا تعلق ہے دیانتداری سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فخر سنسکرت کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ غالباً پراکرت ہی وہ زبان ہے جو فطرت نے پہلے پہل آغوشِ مادر میں انسان کے کان میں پھونکی۔ اس کے بعد ماحول کے اثرات سے لوگوں کے لب و لہجہ میں تبدیلی واقع ہوتی گئی جس سے مختلف زبانوں کی نشو و نما ہوئی۔ اور پھر ان کا باہمی اختلاط و اشتراک نئی نئی زبانوں کی پیدائش کا

باعث ہوا، اس کا ثبوت حسب ذیل ہے :-

مسٹر واٹسے اور سیرن گو دیر کا بیان ہے کہ کسی زمانہ میں سنسکرت ہی تمام دنیا میں مستعمل تھی، مشہور جرمن ادیب ریڈ نگر رطب اللسان ہے کہ سنسکرت دنیا کی سو سے زیادہ زبانوں کی ماں ہے، ان میں بارہ ہندوستانی، سات میڈین پارسی، دو وارناکی البانین، سات یونانی، اٹھارہ اطالوی، چودہ اسکیلوانین اور چھ گیلک کیلٹک زبانیں شامل ہیں۔ (ہندو سُپیریارٹی)

مسٹر ہمیر اور سر ولیم جونس ژند اور فارسی زبانوں کو سنسکرت ہی کا بدلا ہوا روپ بتاتے ہیں۔ ہاک ہیڈ کی نگاہ میں عربی سنسکرت ہی کا اترا ہوا عکس ہے، اور آئیڈلنگ صاحب کے نزدیک انڈو چین اور اس کے گرد و نواح کے دیگر ممالک کی تمام زبانیں سنسکرت ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہیں۔ اگر اس عالمگیر تبدیلی کے اسباب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی لب و لہجہ کا فرق ہی ایک بڑی حد تک اختلافِ زبان کا ذمہ دار ہے۔ ذیل میں مختلف زبانوں کے بعض ہم معنی الفاظ نقل کئے جاتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہی الفاظ صرف تلفظ کی برائے نام تبدیلی کے باعث مختلف زبانوں کا سرمایۂ حیات ہیں :-

نمبر	سنسکرت	میڈی	یونانی	اطالوی	انگریزی	فارسی
۱	پتر पितृ	پتر पतर	پاٹر पटेर	پیٹر पेटर	فادر	پدر
	ماتر मातृ	متر मतर	ماٹر माटेर	میٹر मेटर	مدر	مادر
	نام	نام	اونوما	نامین	نیم	نام

نمبر	سنسکرت	آرش پراکرت	پالی	پراکرت
۲	اگنی	اگّی अग्गि	اگی अग्गि	اگی अग्गी
	بُدھی	بُدھی	بُدھی	بُدھی बुद्धी

نمبر	سنسکرت	پالی	ماگدھی
۳	شَش	سَیا	سو
	اشو अश्व	آشّس अस्स	ساٹگا
	ویاگھر व्याघ्र	ویگھو व्यग्घो	وی वी

اسی نوع کی ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے۔ ڈیکوریشن (سجاوٹ) فیشن اور لینٹرن انگریزی زبان کے مشہور الفاظ ہیں۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ متذکرۂ الفاظ علی الترتیب "دیکھو رے شان" "پئے شان" اور "لال ٹین" سے مشتق ہیں۔ ممکن ہے کہ اس بارے میں کچھ اختلاف رائے ہو۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لب و لہجہ کی تبدیلیوں کے ساتھ زبان کو بھی کینچلی بدلنا پڑتی ہے۔ عربوں، ایرانیوں، پنجابیوں، پوربیوں اور دکھنیوں کو سنئے اُن میں سے ہر ایک ایک ہی لفظ اپنے اپنے مخصوص انداز میں ادا کرے گا اور ان کے تلفظ میں زمین و آسمان کا فرق پایا جائیگا۔ ہماری روزمرہ کی بول چال ہمیشہ سے عوام کی سہولت کی رہین ہے۔ اور مختلف مقامات کے لوگ اپنی اپنی آسانی کے لحاظ سے ایک ہی لفظ کو مختلف انداز سے ادا کرتے چلے آتے ہیں۔ یہی مخصوص انداز تبدیلی زبان کا ذمہ دار ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ کسی وقت میں ہندوستان میں صرف دو زبانیں سنسکرت اور پراکرت رائج تھیں۔ لیکن وہ دن بھی آیا کہ لوگ سنسکرت کے رعب میں آکر پراکرت کو بھول گئے۔ اس کے بعد سنسکرت کو بھی یہی دن دیکھنا نصیب ہوا۔ چنانچہ جب وہ زوال و ادبار کے چکر میں آئی تو ایکبار پھر پراکرت زبانوں کا نیّر اقبال بلند ہوا۔ پروفیسر لاسین کے قول کے مطابق پراکرت زبانوں میں شورسینی اور ماگدھی کو جو فروغ نصیب ہوا۔ اسکی مثال ملنی مشکل ہے۔ مسٹر ستیش چندر اپنی پالی زبان کی قواعد کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ چلکر ماگدھی میں بھی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اور اس سے بنگلہ، مرہٹی، ہندی اور اڑیا وغیرہ کئی نئی زبانیں نکل کھڑی ہوئیں۔ لیکن جیسا کہ آگے آئیگا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ہندی کی پیدایش تو ماگدھی کے اثرات سے مستثنیٰ ہے۔

پیشتر کہا جا چکا ہے کہ لب و لہجہ یا تلفظ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں کا اختلاط بھی ایک نئی زبان کی پیدایش کا باعث ہو سکتا ہے۔ چنانچہ عصر جدید کی فارسی زبان اس دعویٰ کا زندہ ثبوت ہے۔ فارسی، فرانسیسی اور روسی زبانوں کے زیر اثر بسرعت تبدیل ہیئت کرنے میں مصروف ہے اور شاید وہ دن بھی دور نہیں ہے جبکہ ایرانی زبان فارسی کے بجائے کسی دوسرے نام سے پکاری جانے لگے۔

آریوں کے متعلق اب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ خطۂ کشمیر اور اسکے گرد و نواح کا علاقہ ہی انکا ادیوم ہے۔ یہیں سے آریہ قبائل شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی جانب پھیلتے گئے۔ رگ وید کے دسویں منڈل کے پچھترویں سوکت میں सूक्त جن دریاؤں کا نام آیا ہے وہ سب

ہندوستان ہی کے مشہور دریا ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ ویدوں کے زمانہ میں آریہ لوگ ہندوستان ہی میں آباد تھے۔ اور اسی لئے یہ مقدس سرزمین آریہ ورت کہلائی۔ روشن ہے کہ جب آریہ قبائل اس خطہ سے آگے بڑھے ہونگے تو مفتوحہ علاقوں کے قدیم باشندوں کے میل جول کے باعث ہر دو قوم کی زبانوں نے ایک دوسرے کے اثرات بلا تکلف قبول کئے ہونگے۔ بعض اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ اسی اشتراک و ارتباط کے باعث ایک نئی زبان آرش پراکرت معرض وجود میں آئی۔ اسی طرح ماگدھی، اردھ ماگدھی، شورسینی، مہاراشٹری اور اونتی وغیرہ زبانیں بنتی چلی گئیں۔ ان سب میں ماگدھی کو جسقدر عروج ہوا وہ کسی دوسری زبان کو نصیب نہ ہوسکا۔ گوتم بدھ کے زمانے سے لیکر پریہ درشی اور شیلا وتیہ کے عہد تک ماگدھی ہی کا دور دورہ رہا۔ چنانچہ اشوک نے جتنے کتبے نصب کرائے انکی زبان یہی ماگدھی تھی اسکے بعد شورسینی کا شور ہوا۔ لیکن بناؤ کی فکر میں جلد ہی اس نے اپنی صورت بگاڑلی۔ اور اپ بھرنش بنکر رہ گئی۔ جو خود انقلاب روزگار کے پھیر میں پڑکر ہندی کے روپ میں ڈھل گئی۔" ڈاکٹر ویبر اور میکسمولر جیسے فضلا اہل علم کا خیال ہے کہ آرش پراکرت میں بھی وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ لیکن اس کا اصلی روپ پرانے قصوں میں ہنوز محفوظ ہے۔

آن بان کے لحاظ سے شورسینی آرش پراکرت یا ماگدھی کا مقابلہ نہ کرسکی تاہم غیر معمولی سادگی و شیرینی کے باعث گیارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک اسکی دھوم مچی رہی۔ اس کے بعد وہ ہندی سے بدلنے لگی۔ یہانتک کہ کچھ ہی دنوں میں لوگوں نے اسے ہمیشہ کے لئے فراموش کردیا۔ ہندی کی ابتدائے سخن چند ورد ائی مصنف پرتھوی راج راسو ہی سے مانی جاتی ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی بہت سے ہندی لکھنے والے ہو گذرے ہیں۔ انہیں سے قطب علی کھمان

पुष्पकवि پشپ کوی दान चरस्था اکرم فیض سائن دان چرنتر अनुमान

بنچولی جانکی داس اور ہنر منرائے خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن ہندی ادب کے مورخین جانکی داس ہنر من رائے کو چھوڑکر باقی اصحاب کو ہندی کا ادیب تسلیم نہیں کرتے۔

بعض مبصرین نے چند کو ہندی دنیا میں چاسر کا درجہ دینے کی کوشش کی ہے لیکن ہم اسے مشکل ہندی کا مصنف کہہ سکتے ہیں۔

اول یہ کہ راسو کا بیشتر حصہ یا تو اپ بھرنش یا ہندی کے آغاز سے پہلے اپ بھرنش کی جو صورت تھی اسی میں تصنیف ہوا ہے۔ مثلاً ؎

जन सब्ब सरबी कृत विद्या महम
पुर मोद प्रमुदित पूरि रहम ।

جن سب سنگھی کرت ودیہ مہم ۔ پرہو وپرتمنی پورتی رہم۔

چند کے اس شعر کو ارش پراکرت کے حسب ذیل شعر کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھئے آپکو دونوں کی زبان میں برائے نام فرق نظر آئیگا۔

गिरि नद्य समव लघु शीघ्र जवम ।
वृजताय जगे पथ विद्यु नमे ॥

گری ندیہ سم لگھو شیگھر جوم ۔ ورجتایو جگے پتھ ودیو نبھے

पूरन सकल बिलास रस सरस पुत्र फलदान।
अंत होई सह गामिनी नेह नारि को मान ॥

دوسرے یہ کہ راسو کے بارے میں بھی ایسی ہی کہاوتیں مشہور ہیں جیسی کہ شیکسپیر کی تمام تصانیف، ہومر کی ایلیڈ و اوڈیسی، یوریپیڈز کے ناٹکوں، نیز جوڈا اور تمن سوفی کی تلگو مہابھارت کے متعلق زبان زد خلائق ہیں۔ کہ ادھر کا راستا تو محققین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ راسو کی تکمیل میں چند کے لڑکے جلہن (जल्हण) کا بھی ہاتھ ہے۔ لیکن ہندی کے فاضلوں کا یہ خیال ہے کہ ذیل کی عبارت کو بھی ہندی ہی تسلیم کرنی ہے۔

थारी राजमें ओषद थारी लेवेगा । ओषद ऊपरे मालकी थाकी है ॥

ترجمہ:- "اس راج میں تمہاری دوائیں لیں گے۔ اور دوا خانہ کی نگہداشت تمہارے سپرد ہوگی" یہ راسو سے پہلے کی زبان ہے اور اگر ہم اسے ہندی مان لیں تو راسو کو بھی ہندی کی تصنیف ٹھہرانا پڑیگا۔ ورنہ راسو کی زبان کے اختلاف کا یہ عالم ہے کہ بنگلہ، مرہٹی اور دیگر زبانیں بڑے فخر کیساتھ اُسے اپنی اپنی ادبی تصنیف تسلیم کرتے ہیں۔

چند کے بعد چودھویں صدی کے وسط میں ہندی زبان کا جو رنگ تھا وہ ودیاپتی ٹھاکر اور امیر خسرو کے کلام سے ظاہر ہے۔ ٹھاکر سنسکرت اور برج بھاشا کا دلدادہ تھا اور خسرو عربی و فارسی کا والہ شیدا۔ چنانچہ ان دونوں کی ادبی کاوشوں میں بھی یہی فرق نمایاں ہے

ललित लवंग लता परिशीलन कोमल मलय समीरे
मधुकर निकर करम्बित कोकिल कूजित कुंज कुटीरे

للت لونگ لتا پرشیلن کومل ملے سمیرے ۔ مدھوکر نکر کربت کوکل کوجت کنج کٹیرے

(ٹھاکر)

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
(خسرو)

خسرو نے اپنے کلام کے متعلق خود کہا ہے ع "عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال"

ٹھاکر اور خسرو کے کلام میں جو فرق ہے اس سے آگے چلکر اُردو اور ہندی میں جو اختلاف ہوتا گیا ہے اسکے سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی۔ لیکن اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خسرو برج بھاشا سے بے نیاز تھا۔ بلکہ برج بھاشا میں خسرو نے اپنے کمال کے وہ وہ جوہر دکھاے ہیں کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے ؎

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ تن میرو من پیو کو بھیو دوؤ بھئے یک رنگ

یا ؎ گوری سوے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چھون دیس

برج بھاشا کے علاوہ خسرو نے ایک ایسی زبان میں شعر کہے ہیں جو بعد میں کھڑی بولی کہانی اور اُردو کا سنگِ بنیاد بنی ؎

ایک تھال موتی سے بھرا سب کے سر پر اوندھا دھرا چاروں اور وہ تھالی پھرے موتی اس سے ایک نہ گرے

دراصل یہی ہماری ہندی یا اُردو زبان ہے۔ جسے ہم ہندوستانی یا ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے آئندہ نسلیں خسرو کے معیار زبان کی اس شان کو قائم و برقرار نہ رکھ سکیں اور اُردو ہندی ایک دوسری سے مختلف ہوتی گئیں۔ کہیں سنسکرت کی پٹ دیگئی اور کہیں فارسی کا رنگ و روغن چڑھایا گیا۔ اور ان گمراہ کن مساعی کے انہماک میں برج بھاشا کی اس عالمگیر لطافت کو بھلا دیا گیا۔ جس نے علی حزیں جیسے ادیب و شاعر سے برسوں برج کی گلیوں کی خاک چھنوائی تھی۔ اب ذرا اس بھاشا کی شیرینی سے بھی لطف اندوز ہو لیجئے۔

ایک دوشیزہ ننگے پاؤں اپنی ماں کیساتھ برج کی گلیوں میں سے گذر رہی ہے۔ راستہ کی کنکریاں اسکے نرم و نازک پیروں میں چبھ رہی ہیں۔ اس تکلیف سے بےچین ہوکر وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوتی ہے اور بیساختہ اسکے منھ سے یہ مصرعہ نکل جاتا ہے ع۔

"مائے ری مائے مہی سانکری گلی میں پگ کانکری گڑتو ہے"۔

خسرو کی دوربینی و رواداری تھی اب سے بہت پہلے ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس کر جسے ہندو اور مسلمان دونوں بلا تکلف اپنا سکیں فارسی کی آن بان اور برج بھاشا کی حلاوت باہم شیر و شکر کر دیا تھا ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

لیکن افسوس کہ ان تمام مساعیٔ جمیلہ پر یک قلم پانی پھیر دیا گیا اور تعصب بیجا کی نارکی میں اختلاف وافتراق کی خلیج دن بدن وسیع ہوتی گئی۔

کھڑی بولی یا اُردو کی ابتداء

کھڑی بولی ہندوستانیوں کی تبدیل معاشرت کی امین ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے تو عام طور پر ایک ایسی کاروباری زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو دونوں اقوام کے لب ولہجہ کی تفریق کے باوجود ادائے مطلب کا آسان ذریعہ بن سکنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ خود بخود ایک ایسی زبان کی بنیاد پڑنے لگی جسے ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہا جا سکتا ہے۔ یہی وہ کھڑی بولی یا اُردو زبان ہے جو برج بھاشا اور فارسی کے میل ملاپ سے تبدیل ہیئت کر کے لشکر و بازار میں آ کھڑی ہوئی۔ اور ہندو مسلمان دونوں نے اسے گلے لگایا۔

ہرچند کھڑی بولی کی شاعری کی ابتداء امیر خسرو کے کلام سے ہوتی ہے لیکن ابھی اُردو کی گرم بازاری نہ تھی۔ خسرو کی طرح بعد کے مسلمان شعراء بھی ہندی مخصوصاً برج بھاشا میں دادِ سخن دینا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ کھڑی بولی یا اُردو کی جائے پیدائش کے متعلق مختلف رائیں ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اسکی جنم بھومی دلی ہی ہے۔ حالانکہ اب کوئی دکن کو کوئی پنجاب کو اُردو کی پیدائش گاہ بتاتا ہے۔ لیکن یہ تمام دعوے بے بنیاد ہیں۔ اُردو شاہی حرم میں برسوں برج بھاشا کا جس کا آبائی وطن متھرا ہے۔ دودھ پی پی کر پروان چڑھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اُردو قطب شاہ والی گولکنڈہ سے تقریباً دو سو برس پیشتر بھی حدود دکن میں پہنچ چکی تھی۔ لیکن اس وقت تک اُسے زیادہ تر مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی ہونے کے باعث کوئی ادبی اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی۔ قطب شاہ ہی پہلا شاعر ہے جس نے اُردو میں ادبی شان سے مملو شعر و شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ یہ سولہویں صدی عیسوی کے آخری دور کی بات ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً تیرھویں صدی کے اختتام تک اُردو کے خودرو گملے میں کونپل پھوٹنے لگی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ برج بھاشا کا نیر اقبال عروج و اوج کے نصف النہار پر درخشاں تھا۔ اور امیر خسرو جیسے شیریں بیان اور قادر الکلام شاعر نے برج بھاشا اور فارسی کے امتزاج سے چمنستان ادب میں نئے نئے گل کھلانے شروع کر دئے تھے۔ مثلاً۔

شبانِ ہجراں دراز چون زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

आदि कटे से सब को पालै मध्य कटे से सब को पाले
अंत कटे से सब को मीठा सो ख़ुसरो मैं आंखों दीठा

خسرو کے متذکرہ کلام سے ظاہر ہے کہ تیرھویں صدی کے علماء بالعموم برج بھاشا یا فارسی کے مفتون تھے۔ بعض اہل قلم کا رجحان کھڑی بولی کیطرف ہو چلا تھا۔ پھر بھی کھڑی بولی ہنوز بول چال ہی تک محدود تھی۔ کھل کر اسمیں لکھنا پڑھنا کسر شان سمجھا جاتا تھا۔ یہی کھڑی بولی جو بعد میں اُردو یا ہندی کہلائی۔ دہلی سے نکل کر محض کاروباری زبان کی حیثیت سے دیگر قطاع ہند میں پہونچی۔ لیکن چونکہ جہلا بھی جذبات لطیف کے مالک ہوتے ہیں پھر اسلامی معاشرت ایران کی عربیہ زندگی ع

"خوش باش دمے کہ زندگانی این است"

کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اسلئے شعر و سخن کا پیدائشی مذاق رکھنے والی طبیعتیں ملک کی ادبی زبان سے بے بہرہ ہونے کے باعث اسی بول چال کی زبان میں "تک بندی" کرنے لگیں۔ مگر دہلی اور اس کے گرد و نواح میں جہاں برج بھاشا چھائی ہوئی تھی ان تک بندوں کا چراغ نہ جل سکا۔ ہاں ملک کے دور دراز علاقوں میں عام جہالت کے باعث انھیں کچھ نہ کچھ فروغ ضرور نصیب ہوا۔ چنانچہ اُردو کی ابتدائی شاعری اسی نوع کی ہے۔

اگر ادب اردو کی ابتدائی کائنات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اُردو کا آغاز شعرگوئی سے ہوتا ہے۔ جو صریحاً خلاف فطرت ہے۔ علاوہ ازیں پنجاب اور دکن کی اکثر بولیوں میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ کھڑی بولی یا اُردو جیسی برج بھاشا کے دودھ سے دھلی ہوئی زبان کی پرورش کر سکتیں۔ اُردو کے سب سے پہلے دکنی شاعر قطب شاہ کے کلام ہی کو دیکھ لیجئے ؎

آسماں مجلس جالا ہوا سورج اگن والا ہوا چندر سو جل کالا ہوا دکھوا پاری لئے لئے

متذکرہ شعر کا ایک ایک لفظ زبان حال سے پکار رہا ہے کہ اسکے مصنف نے برج بھاشا کا منہ چڑایا ہے۔ اگر یہی اُردو زبان ہے تو ظاہر ہے کہ نہ تو کھڑی بولی اور اُردو دو مختلف چیزیں ہیں اور نہ ہی انکے متحد المخرج ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہے۔ پھر بھی اگر کسی طرح یہ ثابت ہو سکے کہ برج بھاشا برج بن کے بجائے دکن ہی میں پیدا ہوئی تو ممکن ہے کہ سرزمین دکن کو اردو کی جنم بھومی ہونیکا فخر حاصل ہو جائے۔ لیکن پنجاب کو اردو کی پیدائش گاہ ہونیکا دعویٰ کرنا جتنا آسان ہے برج بھاشا دکنی ثابت کرنا اسیقدر مشکل بھی۔ پنجاب ہمیشہ سے دہلی کا دست نگر رہا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان بادشاہوں کا جو اثر واقتدار پنجاب میں محسوس ہوتا رہا ہے۔ دکن میں کبھی

شائبہ بھی نظر نہ آیا۔ علاوہ ازیں آندا، جاندا، اور آودے چھے میں وہ حلاوت کہاں سے آتی جو ہے، ہوں اور ہُوا کا حصہ ہے۔

ضرورت وقت کے لحاظ سے زبان ہمیشہ اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ اُردو ہی کی مثال لے لیجئے غدر کے ایام سے لیکر آجتک اُردو کے کتنے مستند الفاظ ٹکسال باہر ہوکر متروکات کی فہرست میں داخل ہو چکے ہیں اور انکی جگہ نئے اور غیر مانوس لفظوں نے لے لی ہے؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو کے ابتدائی شعراء نے اولاً اصناف شاعری فارسی مستعار لیکر ملک کی مروجہ بولی زبان میں اظہار خیال کیا۔ اسکے بعد زمانہ کی تبدیلی کیساتھ آہستہ آہستہ کھڑی بولی پر فارسی کا رنگ غالب آنے لگا۔ اور اب اُس نے جو صورت نکالی وہ یہ تھی سے

ہم جنگل میں اب بستے ہیں بستی ہے بن گھبراتا ہے　　تجھ بن مجھ کو تو جی دوبھر مرگھٹ سنگ سہاتا ہے

(الفت کشور)

اسکے بعد فارسی کا رنگ چوکھا ہوتا گیا سے

ہر چند جگ کے بخت سیاہ ہیں میں وے　　کاجل ہو جا بسے میں سجن کے نین میں ہم

یا سے　طالب نہیں وہ ماہ و مشتری کا　　دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا　(ولی)

حتیٰ کہ مرزا غالب نے تو فارسی ہی کو اُردو بنا کر رکھ دیا سے

تا کجا اے آگہی رنگ تماشا باختن　　چشم وا گردیدہ و آغوش وداع جلوہ ہے

غالب فارسی الفاظ کی کثرت استعمال ہی کے باعث اُن کو خدائے سخن مانا گیا ہے۔ فارسی بحور و اوزان اور فارسی الفاظ کے اُردو میں بلا تکلف داخل ہو جانیکے بعد اہل قلم کی توجہ اسطرف مبذول ہوئی۔ اور اب چونکہ عامیانہ رنگ زبان رخصت ہو چکا تھا لہذا ریختہ گوئی بھی معیوب نہ رہی۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ غالب کی مشکل پسندی ہی در اصل اسکی غیر معمولی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ ہے ورنہ مضامین کے لحاظ سے میر کو غالب پر فوقیت حاصل ہے لیکن بقول داغ مرحوم سے

کہتے ہیں اُسے زبان اُردو　　جسمیں نہ ہو رنگ فارسی کا

ولی کے عہد میں اُردو اور کھڑی بولی میں گہرا اختلاف ہو جانے کے باوجود بھی ملک کی ادبی زبان در اصل برج بھاشا ہی سمجھی جاتی رہی۔ اور لوگ کھڑی بولی کیطرح اس نئی اُردو یا کھچڑی زبان کو بھی حقارت ہی کی نظر سے دیکھتے تھے جنانچہ اُردو کے بعض وہ اہل قلم جنھیں باکمال شعراء کی صف اولین میں ممتاز جگہ دیجاتی ہے اعلیٰ طبقہ سے متعلق نہ تھے۔ بھانڈ، نخرے، حجے،

دربارِی، گوئے، اور اسی نوع کے دیگر افراد برسوں اُردو کے گلستانِ ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ جاؔن اور جرؔکین جیسوں سے قطع نظر بعض بڑے بڑے استاد و اہل زبان بھی اس الزام سے بری نہیں کئے جا سکتے۔ آتشؔ نے آتش رقابت سے آگ ہوکر جہاں ناسخؔ پر اشارۃً چوٹ کی ہے۔ [۱] وہاں نفسانیت کا شکار ہوکر بہانگِ دہل اپنی پست اخلاقی کا بھی اعلان کر دیا ہے" میرا قاتل ہے اک لڑکا"

دو راولیں کے بیشتر اُردو شعراء کا کلام اس قسم کی گندگیوں سے بریز ہے۔ حالانکہ اب ایسے قابل اعتراض اشعار میں معانی و مطالب تلاش کرنیکی بے سود کوششیں ہونے لگی ہیں۔ لیکن ادب اُردو کے دامن پر یہ ایک ایسا بدنما داغ ہے جسے کسی طرح مٹایا نہیں جا سکتا۔ اُس عہد کے کتنے ہی باکمال شعراء آپکو ایسے ملیں گے جو خواجہ صاحب کی طرح سر گھٹائے لٹھ لئے گلیوں کی خاک چھانا کرتے تھے۔ انشاؔ صاحب کے متعلق تو آجتک مشہور ہے کہ بہروپ بھرنے اور نقالی کے جوہر دکھانے میں ان سے کبھی کوئی سبقت نہ لیجا سکا۔ سید صاحب کا ایک شعر ہے ؎

ایسی گرمی میں نہ رکھ اے مری پیاری روزہ　　بندی رکھ لیگی ترے بدلے ہزاری روزہ

اس شعر سے متعلق جو حکایت ہے وہ ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔ اور بھی ایسے کتنے ہی بزرگ ہوئے ہیں جنھوں نے مومن کیطرح کسی شاہد بازاری سے محض اظہار عشق ہی کیلئے مشق شعر گوئی کی ہے اور اُردو کا دامن حشو و زوائد سے بھر دیا ہے حشرؔ مرحوم کے ایک شعر سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے ؎

حالِ دل اس کو سنانا ہے زبانِ شعر سے　　حشرؔ لکھی ہے غزل اظہار الفت کیلئے

شاید یہی وہ حقیقت ہے جس نے مرزا جیسے سنجیدہ مزاج شاعر سے اپنے اُردو کلام کو "بےرنگ من است" کہلوایا تھا۔

ہندی ادب کے بعض مورخین شاہد ہیں کہ جب مسلمان فاتح دارالسلطنت ہند میں داخل ہوئے اسوقت دہلی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کا رواج عام تھا۔ مسلمانوں کے ربط و ضبط سے کھڑی بولی میں صدہا عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ الفاظ داخل ہوگئے۔ اسی ملاوٹ کے باعث ہندی اُردو کہی گئی۔ ڈاکٹر گل کرائیسٹ اور ڈاکٹر راجیندر لال مترکی رائے ہے کہ اُردو و ہندی میں کوئی بنیادی فرق نہیں اُردو، ہندی، ریختہ یا ہندوستانی ایک ہی زبان کے مختلف نام ہیں۔ مسٹر بیمس (　　) رقمطراز ہیں کہ وؔلی اور سوؔدا جیسے مصنفانِ اُردو کی زبان اور ہندی کے ملک الشعراء گوسوامی تلسی داس اور بہاری لال کی زبان ایک ہی ہے اُردو و ہندی کو دو مختلف زبانیں سمجھنا غلطی ہے۔ ذیل میں اُردو اور ہندی

[۱] آتش کی مشہور غزل کا مطلع سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا۔ کہتی ہے۔ تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

..وں کے گنجینۂ ادب سے چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جو صرف یا ہندی ہونے کے باوجود
..دو کا سرمایۂ حیات ہیں یا جو سراسر اردو ہوتے ہوئے بھی ہندی کے لئے باعث فخر ہیں۔

ملاحظہ کیجئے ؎

۱، چھیل اتنا پڑا ہے کیوں تو یاں	یا پا لگے گئے کہاں تک سوچ	(میرؔ)
۲، نہ سنو گر برا کہے کوئی	نہ کہو گر برا کرے کوئی	(غالبؔ)
۳، تم میرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا	(مومنؔ)
۴، اب گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے	مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے	(ذوقؔ)
۵، کہا اس پری کی ہے کچھ دن	پتہ دل کا پاتا ہے ہو گا	(میر حسنؔ)
۶، ہم کو چھیڑو گے تو پچھتاؤ گے	ہنسنے والوں سے ہنسا کرتے ہیں	(داغؔ)
۷، چاہ ہم کو تو اس کا چاہئے	وہ ہمیں چاہے تو چاہ کیا چاہئے	
۸، ڈوبے ہوئے تھے یہ محبت کے جو زنیں	خود پڑے سے اگر بھی ہوئے پر نہ سکے تیر	(برقؔ)
۹، پاس رکھتے تھے پاس رکھتے تھے	دور رہتے ہیں دور رہتے ہیں	

یا رب ایسی بپائی کرشن کنہیا نے بانسری (نظیرؔ)

اب ذرا ہندی کے بھی کچھ نمونے دیکھ لیجئے ؎

पजनेस नसहूक नाबिसमिल जुल्फ़ फ़ुरकत नक़बूल कसे
महबूब चुनामद मस्त सनम अज़ दस्त अलावल लुत्फ़ बसे।

(पजनेस)

जेहि मग दौरत निरदई तेरे नैन कज़ाक़ - तेहि मग फिरत सनेहिया किये गरीबां चाक

(रसनिधि)

गोरी गोल कपोल पर परी कुटिल लट साफ़। खुशनसीब मुंशी मदन लिख्यो कांच पर क़ाफ़

(शृंगार सरोज)

تاج نامی ایک شاعر کا کلام ہے ؎

۱، سنو دل جانی میرے دل کی کہانی - تم دست ہی بکانی — بدنامی بھی کہونگی میں!
دیو پوجا ٹھانی میں نواج ہوں بھلانی تجے کلمہ قرآن سارے گُنن گہونگی میں!
سانولا سلونا سرتاج کلّے دئے تیرے نیہ داگ میں نداگ ہو دہونگی میں!

ہند کے کمار قربان تا نتری سورت پہ تا تنر نال پیارے ہندوانی ہو رہی ہیں!"
آپنے دیکھا اُردو میں ہندی الفاظ کی اور ہندی میں عربی، فارسی اور پنجابی وغیرہ مختلف زبانوں کے الفاظ کی اسقدر کثرت و زیادتی کے باوجود متذکرہ اشعار اُردو یا ہندی ہی کی جان ہیں۔ یہ اُردو ہندی کے دراصل ایک ہی چیز ہونیکا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ بدقسمتی سے اُردو پر عربی فارسی کے اور ہندی پر سنسکرت کے غالب آجانیکے باعث ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا ہے۔ لیکن اگر ہندی سے سنسکرت اور اُردو سے عربی و فارسی الفاظ کو خارج کردیا جائے۔ تو جو کچھ باقی رہے گا وہ ایک ہی چیز ہوگی اور ہم اُسے اُردو و ہندی کی بجائے خالص ہندوستانی کہنے میں حق بجانب ہونگے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ یہ تو ہماری بول چال کی زبان ہوگی۔ جو ادبی لطافتوں اور علمی باریکیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ الزام قابلِ قبول نہیں ہے۔ اگر تعصب و جانبداری کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبان جسقدر تصنع سے عاری ہوگی طرزِ بیان اتنا ہی زیادہ موثر اور دلکش ہوگا اور خیال کی لطافت و رفعت کو بھی کوئی آنچ نہ آنے پائیگی مثلاً ؎

"ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری!

نہ ہم دوسرے ہیں نہ تم دوسرے ہو زمانہ مگر دوسرا آگیا ہے
اے جنون کچھ دھجیاں پیر گلے میں ڈالدے جسمیں کونپل پھوٹتی ہے وہ مہینہ آگیا

شہزادی زیب النساء کے متعلق مشہور ہے کہ ایکروز اتفاقاً کسی ایک کنیز سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ خطاوار خادمہ شہزادی کو اس واقعہ سے مطلع کرنیکے لئے ایک ایسا پہلو ڈھونڈھنے کی فکر میں تھی جو اُسے شہزادی کے غیظ و غضب سے بچا سکتا کہ اس کے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔ ع۔ "از قضا آئینہ چینی شکست" شہزادی پھڑک اٹھی اور اس نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ چسپاں کردیا۔ ع۔ "خوب شد سامانِ خود بینی شکست" اس شعر کی روانی۔ وزمرہ ہے۔ ۔ دونوں مصرعوں کی شانِ نزول کا یہ عالم ہے کہ بالکل آمد ہی آمد ہے آورد کا ذکر ہی کیا ہے تاہم یہ سادہ و صریح شعر جن شاعرانہ لطافتوں کا حامل ہے وہ تصنع کی حد سے باہر ہے۔

اسی نوع کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ دیہات کی ایک دُلہن گنگا اشنان کر کے کے ہمراہ خوش خوش نیشنہ یہ ساتھ گنگا ... بی ہے۔ ۔ راستہ میں کسی طرح اسکے شوہر کو

اودنی چپیلا اور دوسرے چپیلے جو اس نے خود خرید کئے تھے کہیں گر جاتے ہیں۔ اس نقصان کے غم و افسوس میں ایک حیادار دوشیزہ کی بے لوث محبت کے جذبات بھی پنہاں ہیں۔ چنانچہ وہ جن لفظوں میں اپنی سہیلیوں سے خطاب کرتی ہے وہ اسکے فن شعر اور علم و ہنر دونوں سے قطعاً بے بہرہ ہونے اور ٹھیٹ دیہاتی زبان کے استعمال کے باوجود اسقدر موزوں اور درد و اثر سے لبریز ہیں کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ ع:-

ہائے ہے میرا اودنی چپیلا کہوں گر گیو۔

اسی خیال کو غالب اس سے بہتر زبان و انداز میں ادا کر جا سکتا تھا۔ لیکن کیا وہ دل کی بات ہوتی؟ اور جو کیفیت کہ ان لفظوں کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کس طرح حاصل ہوسکتی تھی؟

ہندی کا ایک تک بند بڑھاپے سے خطاب کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

हाय बुढ़ापा तेरे मारे अब तो हम नक न्याय गये ।

करत धरत कुछ बनते नाहीं कहांज और कैस करन।

اگر یہ سچے جذبات ہیں اور شاعر کے دل سے نکلکر بول چال کی عام زبان میں صحت و صفائی کیساتھ ادا ہوئے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہماری بول چال کی زبان میں جو یقیناً سنسکرت یا فارسی نہ اردو یا ہندی نہیں بلکہ سیدھی سادی ہندوستانی ہے تو خوبصورتی کیساتھ خیالات کی بندش نہیں ہوسکتی ؟ اردو میں ایسے کامیاب شاعر بکثرت موجود ہیں جنہوں نے روزمرہ لکھنے میں واقعی قیامت ڈھا دیا ہے۔ اور لطیف سے لطیف خیال بالکل سیدھے سادے الفاظ میں بڑے حسن و کمال کیساتھ نظم کر دکھایا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ طرز بیان کے لحاظ سے انہیں مرزا غالب سے بھی زیادہ کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ مثلاً ؎

اتنی سی تو بس کسر ہے تم میں — کہنا نہیں مانتے کسی کا (داغ)

ورسہ نے ہاتھ تھامے بیٹھے انیس — چمن کو لگیں دیکھنے بھائیں (میر حسن)

غرض اپنی صورت سے تاروں کو توڑ — زمیں کو فلک کا بنایا تھا جوڑ (" ")

کالے ڈسیں بال اگر چھوٹے ہوں — چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں (نسیم)

یہ تصویر سا منہ اترا کیوں رہا ہے — کھنچے کس سے ہو کیا ہی نقشہ تمہارا (" ")

جسے تو سینک سمجھے ہے یہ ہیں خار — لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے (نظیر)

آم میر تھور بن گیا سب کا — مَود کا مَور باندھ کر سر پر

پاکر خطاب ناج کا بھی ذوق ہو گیا　　سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا　(اکبر)

بخوفِ طوالت صرف انہیں چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

رسم الخط، زبان اور مذہب — بعض سادہ لوح ہندوؤں کا خیال ہے کہ اُردو سراسر مذہب اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی ہونیکے باعث مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ ہندو اسے کسطرح اپنا کہہ سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ خود مذہب بھی زبان کی طرح براہ راست انسانی معاشرت کے تابع ہے۔ اور اقوام عالم کا معاشرتی اختلاف ہی تفریق مذاہب کا ذمہ دار ہے۔ قوموں کی جداگانہ طرز معاشرت کی سب سے بڑی وجہ ماحول کے اثرات اور بعض وہ فطری اصول ہیں۔ جنکا مختلف اقطاعِ عالم کے طبعی حالات سے گہرا تعلق ہے۔ جو مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں نسل انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ زبان کا لگاؤ بھی دراصل ہماری معاشرت ہی سے ہے۔ اور مذہب کی اختراع بھی طرز معاشرت ہی کی رہین ہے۔ انھیں معاشرتی اختلافات کی بنا پر کبھی کبھی خالص اسلامی تخئیل ہندوؤں کے لئے عجیب غریب اور ناقابل قبول نظر آ سکتا ہے۔ لیکن اس سے زبان کا بالواسطہ کوئی علاقہ نہیں ہے۔ زبان تو محض اظہار خیال کا ایک پیرایہ ہے۔ خیالات پر ممکن ہے کہ کسی مذہب کا رنگ چڑھا ہوا ہو۔ مگر زبان اس الزام سے بری الذمہ ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی طرح بعض ہندو شعراء نے بھی ہندوؤں کے مذہبی خیالات و عقائد کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی کیساتھ نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ برق، محروم، چکبست، سرور، ذوق، نظر، شعلہ، ندا، وفا، اور سحر وغیرہ ہندو سخنوران کامل کا بیش بہا کلام اسکا زندہ ثبوت ہے۔ کبھی کبھی اُردو رسم الخط پر بھی لوگوں کو اعتراض کرتے سُنا گیا ہے۔ لیکن اُردو رسم الخط ہندو مسلمانوں میں سچی محبت و یگانگت کا علمبردار ہے۔ بدقسمتی سے اب وہ اہمیت معدوم ہے۔ ورنہ اسلاف نے دو مختلف قوموں کو متحد کرنے اور حب الوطنی کا سبق پڑھانیکے لئے ہندوستانی الفاظ کو ایرانی جامہ پہنا کر اردو کی صورت دی تھی۔ لیکن ہماری سیاسی غلامی نے ہماری ذہنیت کو اسقدر پست اور غلامانہ بنا دیا ہے کہ ہم اپنے عزیز وطن کی ہر چیز کو نفرت و حقارت سے ٹھکرانے لگے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنے ان بزرگوں سے جنہوں نے قیود مذہب سے بے نیاز ہو کر خالص ہندی خیالات کو ملک کی ادبی زبان میں نظم کرکے اپنی حب الوطنی کا ثبوت دیا تھا۔ کھلم کھلا بغاوت کرنے ہی میں اپنی بہتری و بہبودی دیکھی اور انہیں افعالِ قبیحہ کو فخر جانا۔ اور ملکی زبان و الفاظ تو درکنار خیالات بھی غیر ممالک سے مستعار لینا شروع کر دیے۔

آزاد جیسی دردمند ہستیاں ہمارے شعراء کی اس گمراہی پر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں مگر ہم نے کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی انکی بات پر کان دھرنا گوارا نہ کیا۔ دراصل کسی قوم کیلئے بھی یہ غلامانہ ذہنیت اسکی سیاسی غلامی سے کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہے۔

ادب قومی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے اس آئینہ پر ذہنیت اور تعصب و تنگ نظری کی زنگ چڑھی ہوئی ہے اور اس میں سچی قومی زندگی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ ہم تصنیف کی خوبیوں کو دیکھنے کے بجائے مصنف کی قومیت کی ٹٹول کرنا مقدم سمجھتے ہیں۔ جبتک ہماری یہ ذہنیت تبدیل نہ ہوگی۔ ہماری قومی زندگی اور ہمارے قومی ادب کی صحیح طور پر نشو ونما نہیں ہو سکتی۔ اگر مردہ قوم کی اس ذہنیت کو تبدیل کرنیکے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی کی بھی ضرورت پڑے تو ہمیں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ دنیا نے قومی زندگی کی بقا و حفاظت کیلئے ہنستے ہنستے قوموں کو قربان کر دیا ہے تو کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنی ملکی زبان کو اجنبیت کے غیر ضروری عناصر سے پاک و صاف کرکے ایک مشترکہ قومی زبان کی تعمیر میں کوشاں ہوں؟ اور رسم الخط کے قضیہ کو برضامندی باہمی ہمیشہ کیلئے خیرباد کہدیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب ہی کے ذریعہ سے ملک میں قومی زندگی کی روح پھونکی جا سکتی ہے۔ اسلئے اگر ہم اپنی زبان کو اسدرجہ عام فہم نہ بنائیں گے کہ ہمارا ادب بلا تخصیص و تکلف ہر کس و ناکس پر اثر انداز ہو سکے تو ظاہر ہے کہ ہمارے ناظرین کا دائرہ نہایت محدود اور تنگ رہ جائیگا اور ملک ہمیشہ اس عام بیداری کیلئے منتظر رہیگا جسکی قوم کو سخت ضرورت ہے۔ ہمارے شاندار ماضی کی داستان ہمیں بتا رہی ہے کہ برہمنوں نے علوم و معارف کے دروازے عوام پر بند کرکے ملک کو عام جہالت کی تاریکی میں غفلت کی نیند سلا دیا تھا۔ یہی خود بینی و خود غرضی ملک کیلئے غلامی کی شکست نادیدہ زنجیروں میں بدل گئی۔ پس قوم کا مستقبل بنانے کیلئے سب سے بڑی ضرورت اسبات کی ہے کہ ہم پہلے ایک ایسی زبان کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوں جو ملک کے طول و عرض میں بلا تفریق رنگ و مذہب ہر کس و ناکس کے لئے قابل قبول و فہم ہو۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کی یہ مشترکہ زبان بیسویں صدی کی اردو یا ہندی ہرگز نہیں ہو سکتی بلکہ ہم اسے کل کی "ہندوستانی" زبان کہہ سکتے ہیں۔

پرانی دِلّی

(از مسٹر رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔ اے)

بارہا بستی رہی لیکن اُجڑنے کے لئے
مدتوں بنتی رہی لیکن بگڑنے کے لئے

ہستناپور میں چمکتا بھارتوں کا تاج تھا
ایک دن وہ تھا کہ سورج بنسیوں کا راج تھا

خانداں تومار کا تجھ میں کبھی تھا حکمراں
تھے کبھی چوہان بھی اس سرزمیں کے پاسباں

راجدھانی تھی ترے دامن میں پرتھی راج کی
جلوہ گہ تھی تو علاء الدیں کے تخت و تاج کی

مخبرِ شانِ غلاماں اک فقط مینار ہے
خلجیوں کی یاد اک ٹوٹی ہوئی دیوار ہے

سیّدوں کا حکم بھی دو چار دن چلتا رہا
تغلقوں کا بھی چراغ اس بزم میں جلتا رہا

کر دیا تیمور کو دیوانہ تیری چاہ نے
ولولے دل کے نکالے آ کے نادر شاہ نے

شوکتِ چغتائی کا اُجڑا ہوا مسکن ہے تو
خاک ڈالی لودھیوں پہ جس نے وہ مدفن ہے

تجھ میں رونق تھی کبھی افغانیہ دربار کی
تھی کبھی تجھ میں حکومت تغلقی سرکار کی

اب کہاں باقی وہ شانِ شاہجہاں آباد ہے
جو چمن پھولا پھلا تھا آج وہ برباد ہے

تاجدارانِ جہاں قبروں میں ہیں سوئے ہوئے
لعل و گوہر ہیں بہت اس خاک میں کھوئے ہوئے

پادشاہانِ سلف کی ہیں یہی بربادیاں
چند شاہی مقبروں تک ختم ہیں آبادیاں

درج ویرانوں میں ہے عہدِ کہن کی داستاں
دشت کے کانٹے سناتے ہیں چمن کی داستاں

جن سروں پر تاج تھے وہ خاک میں غلطاں ہیں آج
جلوہ افگن کل جو تھے دنیا میں وہ پنہاں ہیں آج

تیرے ہر ٹوٹے ہوئے پتھر میں ہے شانِ قدیم
سوکھے تنکوں میں بسی ہے اُجڑے گلشن کی شمیم

یہ زمیں مٹ جائیگی یہ آسماں مٹ جائیگا
ایک دن ناشاد تیرا بھی نشاں مٹ جائیگا

ایرانی ادبیات

جناب طالب الہ آبادی ایم۔اے

اسلام سے پہلے کی ادبیات ایران میں سب سے بڑی اور متبرک کتابیں اوستائی زبان میں ہیں جن کی قدر زردشتیوں میں اتنی ہی ہے جتنی ویدوں کی ہندوؤں میں۔ اوستائی زبان سنسکرت سے ملتی جلتی بھی ہے۔

ان مقدس کتابوں کی تفسیریں اور ترجمے ایران کے قرون وسطےٰ میں ہوئیں جنکی زبان پہلوی ہے۔ اُن کے علاوہ غیر مذہبی ادب کا بھی گنجینہ ہے جنمیں زرتشتی شعرانے اور سنسکرت کے تراجم کثرت سے ملتے ہیں جہاں کہیں اصل نہیں ہے اُن کا عربی ترجمہ موجود ہے۔

جدید ادبیات ایران کی پہلی منزل وہی سمجھی جا سکتی ہے جب ایرانیوں نے عربی زبان میں نظم کا ترجمہ نظم میں و نثر کا ترجمہ نثر میں کرنا شروع کیا۔ یہ تغیر عربوں کی فتوحات کے دوش بدوش ہوا۔ غزالی فیلسوف اور سعدی شیرازی نے دونوں زبانوں میں کتابیں لکھیں آج تک الہیات کی کتابیں عربی میں تصنیف ہوتی ہیں عمر خیام ، کے اکثر رسالے بھی عربی میں ہیں۔

ڈھائی سو سال سے زیادہ ایران اور عرب شیر و شکر رہے اس اثنا میں ہوشمند اور با فراست ایرانیوں نے عربی زبان کے نکات اور دقایق پر عبور کامل حاصل کر لیا۔

ساسانیوں کے وقت تک فارسی کا رسم الخط پہلوی تھا جو نہایت پیچیدہ اور مشکل ہے۔ عربی کے صحیح اور مکمل حروف ہجا ایرانیوں کے کیسے جاذب و جالب ثابت ہوئے جنکی وجہ سے انہوں نے اپنی شاہی خط اور رسم تحریر بدل کر عربی کر لی جو آج تک باقی ہے۔ پہلوی زبان کے اصلی خط کے پڑھنے والے لوگ اب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ایرانیوں نے بھی دل کھول کر عربی زبان کی خدمت کی۔ پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبیات ایران میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ اگر عربی ادب سے اہل ایران کی تصانیف خارج کر دی جائیں تو بہت کم سرمایہ باقی رہ جائے گا۔

فارسی زبان کی طرف جب دوبارہ توجہ ہوئی تو عربی لغات اور اصطلاحات کی بھرمار تھی۔ مگر عربی لغات بغیر کسی تحریف کے فارسی میں داخل ہو گئے تھے حالانکہ خود عرب دوسری زبانوں سے جو الفاظ

لیتے ہیں اُسکو معرب کر لیتے ہیں، انگریزی نے بھی فرانسیسی زبان سے بہت کچھ سرمایہ لیا ہے مگر اس میں ایسی کانٹ چھانٹ کر دی ہے کہ بعض وقت اُنکی اصل پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔

جدید فارسی کے شعر گوئی کی معراج نویں صدی عیسوی میں تھی۔ خوشنویسی اور کیلیگرافی ہارون رشید کے دور میں اپنے شباب پر تھے۔

غرض تمام مملکت ایران میں سوریہ اور مصر اور مغربی نقاط میں ولایتی اور محلی زبانوں کی جگہ عربی بدلوا چکی تھی۔ بقول ایک ہمعصر کے فارسی زبان کا سیکھنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا پولیس کے لئے عام معلومات کا حاصل کرنا۔"

پہلا زبردست شاعر جس نے فارسی کو ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کر کے ترقی دی رودکی تھا۔ افسوس ہے کہ اس بلند مرتبت شاعر کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا ہے جسمیں حکیم بیدپا کی کہانیاں اور کلیلہ دمنہ کی بعض منظوم حکایات بھی شامل تھیں۔

رودکی کے ہر لفظ میں جادو اور ہر حرف میں اثر تھا۔ نصر بن احمد سامانی نے اپنا وطن بخارا چھوڑ کر ہرات میں طولانی قیام کیا تھا اسکے سب خیر خواہ مصاحب، وزرا اور عمال پریشان تھے، ہزاروں وسیلے اختیار کئے گئے مگر سب بے سود ثابت ہوئے، آخر رودکی نے وطن کی تعریف میں ایسا سریع الاثر اور جادو بھرا قطعہ لکھا کہ اسکے سنتے ہی نصر پر حُب الوطنی کا جذبہ چھا گیا اور وہ مجبور ہو کر گھوڑے پر بیٹھ کر بخارا کی طرف روانہ ہوگیا پھر کیا تھا سارا خیمہ و خرگاہ پیچھے پیچھے پہونچ گیا۔

دسویں صدی سے سولھویں صدی تک سب سے اچھے اور سب سے زیادہ مشہور شعرا رودکی، فردوسی، انوری، ناصر، عمر خیام، نظامی، خاقانی، رومی، حافظ اور جامی گذرے ہیں۔ یوں تو ہر صنف سخن میں طبع آزمائیاں کی گئی ہیں مگر انکی رباعی، غزل، قصیدے اور مثنویاں اپنا جواب نہیں رکھتیں فارسی شاعری بھی ایرانی نقاشی کی طرح چند زمینوں اور بحروں تک محدود ہے۔ غزل اور مینا تور کے قانون اور قاعدے اسلوب بیان اور طرز سب مشابہ ہیں۔ عمدہ شعر اگر ایک خوش تراش ہیرا ہے تو عمدہ مینا تور ایک بیش بہا گوہر زبان ایسی دیتی اور اتنی پیاری ہے کہ ایک ہی خیال کے ادا کرنے کیلئے سیکڑوں لفظ موجود ہیں اور لچک اتنی ہے کہ نازک سے نازک عواطف اور احساسات چٹکیوں میں ادا ہوجاتے ہیں۔

فارسی میں ادبی نثر بہت کم ہے۔ فن نطق اور خطابت پر بہت کم کتابیں ہیں۔ گلستاں سعدیؒ نثر فارسی کی سب سے مشہور کتاب ہے اسمیں بھی آدھے سے زیادہ اشعار ہیں شاید اسلئے کہ اخلاقی

الفاظ کے اشعار پڑھنے والے کے ذہن میں بہت جلد نقش ہو جاتے ہیں۔

فارسی میں نثر مسجع کا جس کے پڑھنے سے سر چکرا جاتا ہے، بہت رواج تھا، یہاں تک کہ تاریخوں میں بھی، طولانی اور صنایع سے بھری ہوئی عبارتیں موجود ہیں۔ وصاف کی تاریخ مسول پیچیدہ، معترضات اور تعقیدات سے ایسی بھری ہوئی ہے کہ مطلب کا سرشتہ بار بار ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور معنی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

نظامی عروضی کا چہار مقالہ البتہ قدیم نثر کی کتابوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے یہ ۵۵۰ ہجری کی تالیف ہے، یعنی آج سے تقریباً آٹھ سو برس پہلے کا لکھا ہوا ہے اسکی زبان صاف ستھری اور اسکی زبان نہایت سبک ہے۔ نظام الملک کا سیاست نامہ بھی اساس تاریخی اور تجربات کا گنجینہ ادبی حیثیت سے قابل قدر ہے۔

فارسی شعر کی ترجمانی اتنی ہی دشوار ہے جتنا اس کا ترجمہ مشکل ہے۔ تاہم فیٹزجیرلڈ کا ترجمہ خیام اگرچہ آزاد ہے اور بل کا ترجمہ حافظ بہت قابل قدر ہے۔

اس مختصر مضمون میں جدید ادبیات کے تذکرے کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلئے صرف بعض عمدہ نمونوں کے مختصر تذکرے پر اکتفا کیا جاتی ہے۔ یہ تمام نسخے مرتب اور مرصع ہیں۔

(۱) شاہنامہ فردوسی میں قدیم سلاطین کی داستانیں اور ایرانی پہلوانوں کی حکایتیں ہیں، دنیا کی تاریخ، ادب، تمدن اور تہذیب پر فردوسی نے جو احسان کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نقاش اور مینا توری، حجار اور مورخ، سب کے لئے شاہنامہ سرچشمۂ فیض ہے۔ رزمیہ شاعری میں بھی یہ مثنوی بے مثل ہے۔

(۲) نظامی کے چار منظوم افسانے ہیں ایک خسرو و شیریں جس کا ہیرو فرہاد ہے دوسرا لیلیٰ و مجنوں جس میں دکھایا گیا ہے کہ عاشق و معشوق ہمیشہ صرف اس لئے ہجراں نصیب رہے کہ دونوں کے خاندانوں میں خصومت تھی۔ تیسرا ہفت پیکر جسمیں بہرام گور کی کہانیاں ہیں اور آزادہ کنیز کے قصے بھی جو ہمیشہ شکار میں اپنے آقا کے ساتھ رہتی تھی۔ ساسانیوں کے دور میں شکارگاہ نقاشی کا بہترین موضوع سمجھا جاتا تھا۔ چوتھا سکندر نامہ جسمیں اسکندر اعظم کے تمام کارنامے افسانوی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں۔

ان افسانوں کے علاوہ نظامی نے اپنا دیوان پانچ جلدوں میں چھوڑا ہے، جسمیں اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی لہریں دوڑی ہوئی ہیں۔ اس مجموعہ کا نام خمسہ ہے۔ نظامی نے تیرھویں صدی

رومانی اشعار میں نظامی کا جواب مشکل سے ملیگا۔

کے اوائل میں وفات پائی ہے۔

جامی نے پندھویں صدی میں اہم سخن پر حکمرانی کی تیموریوں کے دور میں جامی سے زیادہ اور کسی کی تصنیفات قابل ذکر نہیں ہیں۔ جامی نے نظامی کے طرز پر سات مثنویاں کہی ہیں قصیدے اور غزلوں کے کئی دیوان ہیں جامی کی "یوسف زلیخا" بہت مقبول اور مشہور ہے، ظرایف کار نقاش اور مشاق مینا توریوں نے اسوقت کا سماں اکثر، تصویر اور نقوش میں دکھایا ہے۔

جب زلیخا نے ہم نشینوں کے طعن سے پریشاں ہوکر نوجوان پری جمالوں کو اکٹھا کیا اور سب کے ہاتھ میں ایک چاقو اور ایک لیموں دیکر یوسف کو پردے سے نکالا کہ اس مجلس سے گزر جائیں، جیسے ہی عورتوں نے یوسف کو دیکھا ایسی مدہوش ہوئیں کہ لیموں کے بجائے انگلیاں کاٹ ڈالیں۔

مغول کے غلبہ کے بعد نثر کی کتابوں کی شروعات ہوئی۔ جامع التواریخ ۱۳۱۰ء میں مشہور مورخ حکیم رشید الدین وزیر نے لکھی۔ اور امیر تیمور کی تاریخ ظفر نامہ بھی مرتب اور مصور کیا گیا۔ کلیلہ و دمنہ کی بید پائی کہانیاں میناتوریوں اور مصوروں کے مد نظر رہی ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا جلال الدین رومی کی عرفانی مثنوی (تیرھویں صدی) کا ذکر بھی ضروری ہے یہ قابل قدر مثنوی چھ جلدوں میں ہے اور اسکی مختصر سی تعریف یہ ہے کہ

مثنوئی مولوی معنوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی

صوفیوں اور اشراقیوں کے حلقے میں اسکی بڑی قدر ہے۔ حکایات تلخ و شیریں دلکش اور نغز بھی ہیں مگر ہر جگہ حقیقت اخلاقی اور عرفانی کی تلقین مقصود ہے۔

صوفیوں کا اعتقاد ہے کہ خدا اور جہان ایک چیز ہے۔ عالم نشۂ ذات الٰہی ہے۔ خدا کے ماسوا کوئی چیز نہیں ہے آدمی کی روح "روح کلی" کی ایک جز ہے اور موت کے بعد اپنی اصل سے مل جاتی ہے۔ جیسے قطرہ سمندر میں دوبارہ پہونچکر جذب ہوجاتا ہے۔

صوفیوں نے عاشقانہ اشعار کے استعارات اور مجازات سے فائدہ اٹھاکر اپنے عقائد کی تبلیغ کا کام لیا ہے۔ ہجر، اشتیاق، آرزو اور وصل کے تمام مراتب عشقیہ ہیں۔ اس گنجینہ کا اصل شعبہ یہ مضمون ہے کہ خدا ایک پوشیدہ گنج تھا اس نے چاہا کہ پہچانا جائے تو بشر کو پیدا کیا تاکہ پہچان لیں۔

انیسویں صدی میں تین شعراء ایران کیلئے باعثِ زینت ہوئے یعنی قاآنی شیرازی، یغمائی خراسانی اور مرزا سروش اصفہانی۔ ان کے یہاں سلاستِ گفتار، حسن انتخاب

برجستگی اور جوش حافظ وسعدی سے کم نہیں ہے۔

قاآنی طلاقت لسانی میں استاد، نغمہ پردازی میں مشاق آہنگ سازی میں چست اظہار جذبات اور لطف بیان میں بےمثال ہے۔

یوں تو ہر ایرانی کم وبیش شاعر واقع ہوا ہے۔ استعداد اور سخن فہمی کا مادہ سب میں موجود ہے۔ فارسی کی شیرینی اور روانی اشعار ارتجالی کی کان ہے، اکثر ایسی عورتوں اور مردوں نے جنکو ساری عمر شعر گوئی کا شوق نہ تھا مرتے وقت اسے بڑے قابل قدر اشعار، رباعیاں اور غزلیں کہی ہیں۔

خود فتح علی شاہ غضب کے شاعر تھے۔ خاقان تخلص تھا۔ ۱۸۳۱ء میں دیوان چھپا تھا اب بہت کمیاب ہے اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ شاہ کثیر الاولاد تھے اور اُن کے دسوں لڑکوں کو شاعری کا دعویٰ تھا۔

موجودہ زمانہ میں تاثیر اور بلندی خیال نے تصنع اور سادگی کی جگہ لے لی ہے۔ قفقازی اور فرانسوی عناصر زیادہ ہیں۔ ایرانیوں کو ہر زمانہ میں ادبیات سے عشق رہا ہے۔ عمدہ اشعار صحرائی، قبائل، قاطرچی، کوچوان اور گڈریوں کے نوک زبان رہے ہیں۔

آجکل پور داؤد، سعید نفیسی، خلیلی اور بوتجت کا دور دورہ ہے۔ تاریخ میں جس پرنیا اور مثنوی میں بوتجت کا جواب نہیں۔ بوتجت نے فردوسی کی زمین اور زبان میں شاہنامہ پہلوی لکھا ہے جسکو فردوسی کا تتمہ کہنا چاہیئے۔ جہاں سے پہلا شاہنامہ ختم ہوتا ہے وہیں سے یہ پہلوی نامہ شروع ہوتا ہے اور رضا شاہی دور تک آتا ہے ۱۹۳۱ء تک کے حالات ہیں۔ کتابوں کے ترجمے کثرت سے شائع ہو رہے ہیں، علوم، فنون ادبیات اور تاریخ اقتصادیات، مالیات اور سیاسیات، جغرافیہ اور ریاضیات پر کثرت سے کتابیں لکھی جارہی ہیں۔

خطاطی کا ذوق بھی ابتک باقی ہے۔ یاقوت مستعصمی اور سلطان علی مشہدی کے کتبے دیواروں کی زینت ہیں۔ انشا، اور اخبار نویسی بھی ترقی پر ہے۔

ایرانی طالبعلم روز افزوں تعداد میں ہر سال یورپ جاکر اعلیٰ تعلیم اور تجربات حاصل کرتے ہیں۔ مرزا محمد خاں قزوینی، مرزا حسن تقی زادہ اور عبد الکریم قسمی ایسے عالم متبحر اور مجتہد بےبدل بھی فیض بخش اور فیض رساں ہیں۔

ابھی میں سویا نہیں ہوں

از جناب فطرت واسطی

بہارِ حسن کی رنگینئ بہار ہے تو
کہ میرے عشق و محبت کی یادگار ہے تو
اگر نگاہ کی روٹھی ہوئی بہار ہے تو
تو میرے حسنِ تصور کا افتخار ہے تو
ابھی میں سویا نہیں ہوں خیال میں تیرے

اُبھر رہی ہیں محبت کی گرم آہیں ابھی
نظر نواز ہیں ہستی کی بارگاہیں ابھی
ترے خیال میں سرگرم ہیں نگاہیں ابھی
کھلی ہوئی ہیں محبت کی درگاہیں ابھی
ابھی میں سویا نہیں ہوں خیال میں تیرے

قیامِ عیش کی نظروں کو آس ہے اب تک
سمجھ رہا ہوں کہ تو میرے پاس ہے اب تک
یقین ہے کہ تو فطرت شناس ہے اب تک
مری نظر کو محبت کا پاس ہے اب تک
ابھی میں سویا نہیں ہوں خیال میں تیرے

اگر ہے جھوٹ کہ تو ہے نظر پہ چھایا ہوا
اگر یہ سچ ہے کہ میں ہوں فریب کھایا ہوا
تو آ کہ آج بھی احساس ہے ستایا ہوا
تو محوِ ناز ہوا اور حسن ہو لجایا ہوا
ابھی میں سویا نہیں ہوں خیال میں تیرے

موازنہ

(از مسٹر سلیم جعفر)

موازنہ کیا ہے اس کے لغوی معنی سے قطع نظر کیجئے اور اس کے کام کی طرف توجہ فرمائیے۔ درحقیقت یہ نام ہے ہمارے معاون انتخاب کا۔ اور ایسی کارآمد چیز ہے کہ اس کے بغیر دنیا میں کسی کا کام نہیں چلتا۔ ہم اس عالم میں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن ہمارے اُن کاموں کو چھوڑ کر جو ہمیں انسان ہونے کی وجہ سے کرنے پڑتے ہیں اور ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔ اُن سب کاموں میں اسے دخل ہے جن کے کرنے کے لئے ہم بوجہ تقاضائے بشریت مجبور نہیں۔ مثلاً اولاد کی تعلیم و تربیت ہی کو لیجئے۔ ایک شخص علم کو اچھا سمجھتا ہے۔ اس لئے اس کے بچے نے ہوش سنبھالا نہیں کہ اُس نے اُسے مولوی صاحب کے حوالے کیا نہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ شخص لکیر کا فقیر ہے، چونکہ اس کے خاندان میں لوگ کئی پشتوں سے پڑھتے لکھتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے وہ آنکھ بند کرکے اپنی اولاد کو بھی اسی ڈگر پر چلانے لگا۔ میں اسے صحیح نہیں سمجھتا اور غور کریں گے تو شاید آپ بھی میرے ہم خیال ہو جائیں یہ قطعی دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس شخص نے اپنی عمر میں کبھی عالم اور جاہل کی حالتوں کا مقابلہ نہیں کیا اور بے سمجھے بوجھے اپنی اولاد کو ایک غلط راہ پر ڈال دیا۔ علم سے جو فائدے ہوتے اور جہالت سے جو نقصان اُٹھانے پڑتے ہیں اُن سے وہ بخوبی واقف ہے۔ اور ذاتی تجربہ کی بنا پر وہ علم کو جہالت پر فضیلت دیتا اور اپنی اولاد کو اس فضیلت سے آراستہ و پیراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اپنی اولاد کو وہ جہالت کے نقصانوں سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کا یہ فعل نفع اور نقصان کے موازنہ پر مبنی ہے، اور نفع کے انتخاب کا باعث محض موازنہ ہے۔ اب ایک اور مثال پر بھی غور کیجئے۔ جاہلوں کی اولاد اکثر کیوں جاہل رہ جاتی ہے حالانکہ وہ سنتے اور دیکھتے ہیں کہ علم سے بڑے بڑے فائدے ہوتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ خود اُن کی ردی حالت کا سبب اُن کی جہالت ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ لوگ موازنہ و مقابلہ کا کام ہی نہیں لیتے۔ لیتے اور ضرور لیتے ہیں۔ لیکن علم و جہل کا موازنہ کرتے

راس فیصلہ کے بعد کہ علم کو فوقیت حاصل ہے اور اس لئے اولاد کو پڑھانا لکھانا چاہیئے
یں ایک اور موازنہ سے سابقہ پڑتا ہے یعنی وسائل تعلیم۔ یہ اُن کے بس کے نہیں ہوتے
س لئے انھیں سوچنا پڑتا ہے کہ آیا اُن قربانیوں کا پلہ جو تعلیم اولاد کے لئے کرنی پڑتی ہیں
ن قربانیوں کے پلے سے بھاری ہے یا نہیں جو اولاد کو تعلیم نہ دلانے کی صورت میں نہ کرنی
یں گی۔ اور چونکہ اکثر وہ قربانی کا نہ کرنا اپنے لئے سودمند سمجھتے ہیں اس لئے تعلیم اولاد کی
رف توجہ نہیں کرتے۔ میں فراخی و تنگی وسائل کا قائل نہیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ایک شخص
س کی آمدنی کل اٹھارہ روپے ماہوار تھی اور کنبہ بھی تھا اُس نے اپنے ایک عزیز کو سول
رجمن بنا دیا۔ اس کے لئے اُسے کیا کیا قربانیاں کرنی پڑیں اس کا ذکر فضول ہے۔

لیکن انتخاب میں ہر فرد کی طبیعت کو بہت بڑا دخل ہے اور موازنہ و انتخاب سے بھی
پہلے یہ ایک معیار مقرر کر دیتی ہے جو موازنہ پر اپنا اتنا اثر ڈالتا ہے کہ اس کی ہدایت کے بغیر
یک قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ درحقیقت انتخاب ایک مظہر ہے جس کا ہیولا معیار اور موازنہ
سے مرکب ہے۔ معیار سے موازنہ اور موازنہ سے انتخاب پیدا ہوتا ہے۔ اس انتخاب سے
تخاب کرنے والے کی طبیعت کا پتہ لگتا ہے اور جب کوئی دو چیزوں میں سے ایک کو
پسند کرتا ہے تو اُس کی پسند میں اس کی طبیعت کا رنگ جھلکتا ہے۔ اب چونکہ طبائع
انسانی الگ الگ ہیں اس لئے ہر شخص کی پسند و انتخاب بھی الگ الگ ہیں کسی کی
پسند و انتخاب ثبوت ہیں اس کا بھی کہ وہ اپنی پسندیدہ و منتخبہ شے کی نسبت جو رائے رکھتا
ہے اس کے مقابلہ میں اوروں کی رائے کی وقعت نہیں کرتا۔ یہاں ان لوگوں سے
بحث نہیں جو بزرگ ہستیوں کے رعب میں آ کر اپنی پسند و انتخاب کی پرواہ نہیں کرتے
اور اسے ان بزرگ ہستیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں یا ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتے
تو ان کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔ بصورت ہم نوائی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی قوت
انتخاب سے کام نہیں لیا۔ اس کے صرف یہ معنی ہوتے ہیں کہ ان کے اور ان بزرگ ہستیوں
کے موجبات انتخاب ایک ہی ہیں۔

لیکن موازنہ میں اکثر مغالطہ ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح منطق میں قیاس کے دونوں
مقدموں میں حد اوسط کا مکرر ہونا انتاج کے لئے شرط اعظم ہے اور مغالطہ سے بچنے کو یہ ضروری
ہے کہ حد اوسط کے جملہ قیود و اعتبارات جو ایک مقدمہ قیاس میں ملحوظ ہیں وہی اس کے

دسرے مقدمہ میں ہوں اسی طرح موازنہ میں بھی یہ لازمی ہے کہ دونوں موضوع یا محمول موازنہ بہ قیود و اعتبارات کے لحاظ سے یکساں ہوں ورنہ موازنہ سے جو نتیجہ نکالا جائیگا وہ صحیح نہ ہوگا واز دین مغالط محمولوں کے عامل معیار میں ہوا کرتا ہے۔ تا وقتیکہ عامل معیار رہو ایک سے نہ ہو ن معیار میں فرق ہوگا اس سے موازنہ پر اثر پڑے گا اور موازنہ کی مدد سے جو نتیجہ نکالا جائے یا انتخاب کیا جائے گا وہ غلط ہوگا۔

موازنہ میں مغالطہ صاف صاف اس وقت نظر آتا ہے جب دو مصنفوں کا مقابلہ کرکے یہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے کہ کس کا کلام کس سے بڑھا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اس فیصلہ کو لیجئے کہ ذوق کا سہرا جو انھوں نے شہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقع پر بایائے بادشا غالب کے سہرے کے جواب میں کہا تھا۔ غالب کے سہرے سے بڑھا ہوا ہے۔ اس فیصلہ میں میرے نزدیک مغالطہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ دونوں کی طبیعت یا عامل معیار موازنہ کا فرق نظر انداز کرکے موازنہ ان مفروضات سے شروع کیا جاتا ہے کہ دونوں شاعر ہیں، دونوں قصیدہ کہہ سکتے ہیں اور انھوں نے کہا ہے، دونوں کا علم وفضل برابر ہے اس لئے جب دونوں نے ایک ہی قسم کا کام کیا تو دونوں کے فعل کا نتیجہ ایک ہی سا ہونا چاہئیے۔ اور اگر فرق ہے تو صاحب موازنہ نے موازنہ کے لئے جو معیار مقرر کیا ہے اس پر جو پورا اُترتا ہے وہ کامل اور جو نہیں اُترتا وہ ناقص ہے۔ درحقیقت ان مفروضات سے ابتدا ہی نہ کرنی تھی بلکہ دونوں کی طبیعت شاعرانہ کا اندازہ لگانے کے بعد یہ سوچنا تھا کہ باوجود اختلاف یہ دونوں صحیح صحیح معنی میں موضوع یا محمول موازنہ ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر یہ رائے قرار پاتی کہ دونوں کی طبیعت میں اختلاف ہے اور وہ صحیح صحیح معنی میں موضوع موازنہ نہیں ہو سکتے تو موازنہ سے دست کشی بہتر تھی۔

اگر شاعر کا کلام اس کی طبیعت کا آئینہ ہو سکتا ہے تو اس سے ان دونوں کی طبیعت کا اندازہ لگانا چاہئیے۔ پروفیسر آزاد نے جوان دونوں کی طبیعت کا اندازہ لگایا ہے وہ مرحوم ہی کے الفاظ میں یہ ہے:۔

ذوق کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

"غزلوں کے دیوان کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر اُن کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے۔ (صفحہ ۴۶۹۔ آبحیات مطبوعہ رفاہ عام پریس ۱۹۱۳ء)

"اصلی میلان ان کی طبیعت کا سودا کے انداز پر تھا۔ نظم اُردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پرو ست کاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا اور انھوں نے مرقع کو ایسی محراب پر سجایا جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا (صفحہ ۴۳۴ ایضاً)

غالب کی نسبت لکھتے ہیں :۔

" دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں۔" (صفحہ ۵۱۵ ایضاً)

اقتباسات بالا سے ذوق کے اصلی میلان طبیعت کا پتا نہیں لگتا اس لئے ہمیں سودا کے انداز طبیعت کا پتا لگانا چاہیئے۔ سودا کے ذکر میں میر تقی میر سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے پروفیسر آزاد لکھتے ہیں :۔

" اصل حقیقت یہ ہے کہ قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی وغیرہ اقسام شعر میں ہر کوچہ کی راہ جدا جدا ہے جس طرح قصیدہ کے لئے شکوہ الفاظ۔ بلندی مضامین چستی ترکیب لوازمات ہیں۔ اسی طرح غزل کے لئے عاشق و معشوق کے خیالات عشقیہ۔ ذکر وصل .... گویا وہی دونوں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ادا ے مضامین کے لئے الفاظ بھی اور ہیں .... بیشک ان کی غزلوں کے بھی اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدہ کا رنگ دکھلاتے ہیں۔" (صفحہ ۱۹۳ ایضاً)

اس اقتباس سے صاف صاف ظاہر ہے کہ سودا پر قصیدہ کا رنگ غالب تھا اور یہی رنگ خاص ذوق کی طبیعت کا رنگ ہے۔ لیکن قصیدہ کا خاص رنگ۔ یعنی حقیقت نفس مضمون کیا ہو؟ یعنی اس کو سچ سے کتنا لگاؤ ہے۔ اور کوئی لگاؤ نہیں تو اس کی خوبی کا مدار کس چیز پر ہے؟ ایک نہیں جتنے قصیدے آج تک لکھے گئے ہیں سب کے سب اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ سچ اور حقیقت کو ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ سب کی خصوصیت یہ نظر آئیگی کہ شاعر نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ اور مبالغہ کو حد غلو تک پہنچانے میں کمال دکھایا ہے۔ چونکہ ذوق کی طبیعت کا اصلی میلان سودا کے انداز پر زیادہ تھا اور سودا کی طبیعت میں غلو تھا اس لئے ذوق کی طبیعت میں بھی غلو ماننا پڑے گا۔ مزید ثبوت کے لئے ذوق کی دو غزلوں کے چند شعر پیش کرتا ہوں :۔

دود دل سے ہے یہ تاریکی مرے غم خانہ میں
شمع ہے اک سوزن گم گشتہ اس کاشانہ میں

مں وہ کیفی ہوں کہ پانی ہو تو بن جائے شراب
جوش کیفیت ہے میرے خاک کے پیمانہ میں

عشق کو نشوونما منظور کب ہے ورنہ سبز　　تخم اشک شمع ہو خاکستر پروانہ میں
کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحاد حسن و عشق　　زلف واں شانہ نے کھینچی درد ہو یاں شانہ میں

ہے ملا کر ساقیان سامری فن آب میں　　کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں
زلف افعی وش کو دھووے گر وہ پُر فن آب میں　　ہوں بجائے موج پیدا مار رہزن آب میں
میں وہ ہوں تفسیدہ دل کر جائے اک دریا کو جذب　　گر پڑے گر ذرہ میری خاک مدفن آب میں
سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے　　اژدہا بن بن کے شب اے رشک گلشن آب میں

غزل جتنی زیادہ زوردار ہوگی اس میں اتنے ہی زیادہ مبالغہ غلو کے اشعار نظر آئیں گے۔ مثلاً اس غزل کو ملاحظہ کیجئے جس کے مطلع کا پہلا مصرع ہے

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلف سرکش ہو

اب دیوان غالب اٹھا کر ملاحظہ کیجئے، غزل کی بیشتر بیتوں میں مبالغہ نظر نہ آئے گا۔ جہاں مبالغہ ہے۔ وہاں زیادہ تر تبلیغ و اغراق سے کام لیا ہے۔ غلو شاذ و نادر ہی ہے۔

چونکہ طبائع میں اس قدر اختلاف تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب جب سہرا کہنے بیٹھے تو ذوق کا سا نہ کہہ سکے، کیونکہ سہرا بھی درحقیقت ایک قسم کا قصیدہ ہی تھا اور ذوق کو قصیدہ میں مقابلۃً فوقیت حاصل تھی، اس کے علاوہ ایک کا طرۂ امتیاز صفائی کلام تھا اور دوسرے کا معنی آفرینی۔

لیکن اس واقعہ سے دونوں کا موازنہ کرنا اور اس سے ذوق کی فوقیت کا نتیجہ نکالنا ہمارے نزدیک اصول موازنہ کے خلاف ہے۔ درحقیقت موازنہ بہت متعذر شے ہے اور اس سے حذر انسب و اولیٰ۔ کیونکہ معمول موازنہ کا ہر لحاظ سے یکساں ہونا ناممکن ہے، کسی نہ کسی اعتبار سے ان میں ضرور فرق ہوگا اور یہ فرق موازنہ کے نتیجہ یا انتخاب یا اس کی مدد سے جو حکم لگایا جائیگا اس کی قدر و قیمت کو ساقط العیار کر دے گا۔

دوزخ کی آگ

(از مسٹر جگدیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی اے ایل ایل بی)

تدوینِ بزمِ صبح کا قصہ ہوا تمام
پیشِ نظر ہے گلشنِ عالم کا اہتمام
پھیلی شعاعِ نور بڑھی گرمیِ خرام
بوسہ جبینِ کوہ نے دے کر کیا سلام
نورِ شعاعِ مہر سے روشن اُفق ہوا
بیابا غمِ فراق میں رنگِ شفق ہوا

طوفانِ موجِ نو کا منظر تھا لاجواب
پھر پھر گئی ہیں بدلیاں کھا کھا کے پیچ و تاب
ہنگامۂ شباب سے ہو ہو گئے بے حجاب
لپٹی کرن سحاب سے اللہ رے اضطراب
لینے چلی خزاں کو چمن سے بہارِ صبح
پھولوں نے سر جھکائے کیا زر نثارِ صبح

دم میں بساطِ گردشِ گردوں اُلٹ گئی
گرمی سے آفتاب کی کایا پلٹ گئی
دیکھا جو روئے مہرِ منور تو لُٹ گئی
شرما کے خشکیِ لبِ دریا سمٹ گئی
ناری رکی نہ نور کے لشکر کے سامنے
بزدل ٹھہر سکے ہیں دلاور کے سامنے؟

کشتِ شعاعِ مہر جو شاداب ہو گئی
چشمِ حباب خیر سے غرقاب ہو گئی
چڑھتے ہی دھوپ موج تو بیتاب ہو گئی
اُتری ندی کچھ ایسی کہ پایاب ہو گئی
سردی کا آنکھ مارتے دم سرد ہو گیا
ایسا چڑھا بخار کہ منہ زرد ہو گیا

گرمی کا تھا وہ زور وہ عالم کہ الاماں
جلتی تھی کائنات جھلستا تھا آسمان
چشمہ کا تھا اُبال کہ آتش فشاں رواں
کانٹا بنی تھی سوکھ کے منہ میں دبی زبان
بیتاب مثلِ ماہیِ بے آب تھی زمیں
دریائے نورِ مہر سے سیراب تھی زمیں

لرزاں تھا آفتاب درِ آغوشِ آبشار — ساحل ہوا تھا خاک لبِ وصلِ جو بہا
ذرّے زمیں پہ لوٹ رہے تھے بے قرار — دم لینے میں بھی موجِ رواں کو تھی عار
غرقاب تھے حباب تو پانی کی چاہ میں
چھالے پڑے تھے موج کے پائے نگاہ میں
کالا تھا رنگ دھوپ سے روزِ سیاہ کا — آنکھوں سے چھوٹتا تھا سہارا نگاہ کا
منہ تک رہے تھے کوہ کھڑے برگِ کاہ کا — ملتا تھا دو جہاں میں نہ گوشہ پناہ کا
پھرتا تھا آفتاب کہ مغرب میں جا چھپے
سایہ کو تھی تلاش کہیں زیرِ پا چھپے
چھاتی زمین کی شق تھی فلک کا جگر کباب — ساحل سے اُٹھ رہی تھی صدا العطش بیاب
بولی تڑپ کے موجِ رواں اند کے شتاب — سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے حباب
پانی پہ کی نگاہ عجب اضطراب سے
آنسو ٹپک کے رہ گئے چشمِ حباب سے
سینوں میں دم تھا آہ کی صورت گھٹا ہوا — اُڑتا تھا دود کی طرح پانی رُکا ہوا
ابرِ تنک اُٹھا بھی تو فوراً ہوا ہوا — حیراں تھے عقلِ رحمتِ باری کو کیا ہوا
کہنے کو خشت و خاک پہ بارش تھی نور کی
بجلی کو برقِ طور سے نسبت ہے دُور کی

اقوال زریں

غصہ کا بہترین علاج خاموشی ہے۔

ایک ہی غلطی عمر بھر کے لئے افسوس کا سامان پیدا کر سکتی ہے۔

غریب آدمی چند چیزوں کا محتاج ہے لیکن لالچی ہر چیز کا۔

وقت کی قدر کرو۔ تمہاری قدر ضرور ہوگی۔

اگر آرام کی زندگی چاہتے ہو تو ہر چیز نقد دام دیکر خریدو

دانا دوسروں کے تجربات سے سیکھتے ہیں اور بیوقوف اپنے تجربات سے

آباد لکھنوی

کیا آباد لکھنوی نے ہر بحر میں ایک دیوان مرتب کیا تھا؟

(از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، بی اے کلکٹر و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مئو تھنڈ)

"مرزا مہدی حسن خاں آباد سے میری خاندانی قرابت تھی۔ میں نے اپنے صغر سن میں انکی بیوہ کو دیکھا تھا اور چھوٹی نتا" کہتا تھا۔ دراصل وہ میرے والد کی چھوٹی نتا" (یعنی میری دادی صاحبہ کی والدہ کی چھوٹی بہن) تھیں۔ ہم لوگوں میں دستور ہے کہ بزرگوں کے بزرگوں کو بچے بھی وہی کہتے ہیں جو ہمارے بزرگ انکو کہتے ہیں۔ چنانچہ یہی طریقہ ابتک جاری ہے۔ میرے بچوں کی طرح انکے بچے بھی مجھے بتا کہتے ہیں۔ اسطرح محبت کی سنہری زنجیر میں کڑیاں اضافہ ہوتی رہتی ہیں اور سلسلہ منقطع ہونے کے بجائے مضبوط ہوتا جاتا ہے۔

یہ آباد اسقدر فنا فی الشعر تھے کہ پاگل سمجھے جاتے تھے اور انکی بنا پر میری دادی صاحبہ کا عقیدہ تھا (انکو ہم لوگ باجی اماں کہتے تھے) کہ شاعر دیوانے ہوتے ہیں اور انکو لڑکی دینا اسکی زندگی برباد کرنا ہے۔ سو ملاتفاق سے یہ بات انکی ایک پوتی کے کان میں پڑ گئی اور یہ ایسا زبردست حربہ ہے جو وقت ضرورت نہایت کامیابی سے استعمال کیا جاتا ہے۔

میں بہک کر کہاں سے کہاں پہونچ گیا! مؤلف تذکرہ خمخانۂ جاوید تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

آباد۔ مرزا مہدی حسن خاں خلف مرزا غلام جعفر خاں لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شیخ ناسخ کے نامی شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۲۲۸ہجری میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ لکھنؤ کے عمائدین میں سمجھے جاتے تھے۔ نواب فرخ آباد کے قریبی رشتہ دار تھے۔ تمام عمر لکھنؤ میں رہے اور اپنی عمر فراغبالی سے بسر کی۔ اگلے لوگوں کی طرح وضعداری کے پابند اور مجالس مشاعرہ کے ازبس دلدادہ تھے۔" وضعداری جو پرانے لوگوں کا عام شیوہ تھا انکا خاص شعار تھا۔ چنانچہ آجتک مشہور ہے کہ آپ مشاعروں میں نہایت پابندی سے شریک ہوتے۔ اور حتی الامکان کوئی جلسہ غزلخوانی سے ناغہ نہ ہونے دیتے تھے۔ انکی پرگوئی بھی شہرت رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک تذکرہ نویس[۵] نے تو یہانتک غلو فرمایا ہے کہ عروض کی ہر ایک

---

[۵] اشارہ ہے عبدالغفور خاں نساخ کے تذکرہ سخن کی طرف۔ اثر

بحر میں انکا ایک دیوان ہے، بہرحال دو اور بقول بعض دو سے زیادہ دیوان اور ایک مثنوی۔ تین واسوخت انکی یادگار ہیں جنمیں سے ایک دیوان موسوم بہ نگارستان عشق ۱۲۶۲ھ میں لکھنؤ کے مرتضوی مطبع میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ بھی کمیاب ہے۔ مگر انکی مستقل یادگار بہارستان سخن ہے جو قائم ہوئی جسمیں ناسخ و آتش کے بالمقابل ہم طرح غزلیں درج ہیں۔ یہ مجموعہ بمشکل ملتا ہے۔ حق یہ ہے کہ گو انکا کلام ان دونوں استادوں کے پایہ کو نہیں پہونچتا مگر تاہم بجائے خود قادر الکلامی کا پتہ دیتا ہے . . . . . .

میرے چچا اور خسر حکیم مرزا عابد حسین خاں مرحوم کا کتبخانہ اردو، فارسی اور عربی کے قلمی نسخوں کا ایک نادر ذخیرہ تھا۔ چند وجوہ سے جن کے بیان کی ضرورت نہیں بیشتر کتابیں انکے انتقال کے بعد بری طرح تلف ہوئیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ برسات کے بعد ایک بڑا صندوق ایسی کتابوں سے بھرا ہوا جو پانی میں بھیگ بھیگ کے گوندا ہوگئی تھیں یا جنکو دیمک چاٹ گئی تھی محلے کے اندارے میں خالی کیا گیا۔ دو تین برس ہوئے کہ اس اجڑے کتابستان میں ایک بستہ میری نظر سے گزرا جسمیں مختلف کتابوں کے بعض اوراق بعض قلمی و بعض بوسیدہ بے ربط تھیں۔ اسمیں چند ورق آباد کے ایک قلمی دیوان کے تھے۔ کرم اور دیمک نے ان میں کیا کیا گلکاریاں کی ہیں اسکا اندازہ دیکھے بغیر نہیں ہوسکتا۔ الف سے لیکر نون تک ردیف وار غزلیں ہیں، اول و آخر کی دونوں ردیفیں ناکمل ہیں لہذا نہیں کہا جا سکتا لیکن ردیفوں میں خصوصاً نون کے ذیل میں جسمیں غزلوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے اور کتنی غزلیں ہونگی یا کس دیوان کا حجم کیا تھا۔ یہ تمام اوراق دیوان صرف ایک بحر (خفیف مسدس مقطوع، فاعلاتن مفاعلن فعلن) میں ہیں انکے دستیاب ہونے سے ناسخ کے اس قول کی گونہ تصدیق ہوتی ہے کہ آباد نے ہر بحر میں ایک دیوان مرتب کیا تھا، گو اسقدر ترمیم کی پھر بھی ضرورت ہے کہ دیوان صرف متداولہ بحروں میں مرتب کئے تھے۔ یوں تو عروض میں نہ معلوم کتنی بحریں ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر ایک میں ایک دیوان مرتب کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

اب میں ان اوراق سے منتخب اشعار قارئین زمانہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مذاق شاعری میں آباد کے وقت سے زبردست انقلاب ہوگیا ہے اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان شعروں کو پڑھئے۔ یہ پورا کلام شاید ابتک طبع نہیں ہوا کیونکہ بعض غزلوں میں مقطع درج نہیں ہے اور جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

خط ہمارا وہ پڑھ کے کہتا ہے		اس میں مضموں ہیں سربسر ناقص
ذرو دندان یار کے آگے		نظر آئے ہمیں گہر ناقص
تیرگی دور کی نہ آنکھوں کی		تھا یہاں شمع نہ بصر ناقص
لائق سر نہیں سمجھتا یار	ص	ہے یہ خورشید کا چنور ناقص
خانۂ دل میں کیا رہے وہ ماہ		داغ نے کر دیا یہ گھر ناقص
عشق کو بدجو کہتے ہیں آباد		عقل رکھتے ہیں وہ بشر ناقص

اُس صنم کا کبھی نہ آیا خط		قاصدوں سے نہ ہم نے پایا خط
حال سوز فراق جب لکھا		بخت نے آگ میں جلایا خط
ہمکو ہے سرنوشت سے یہ گلہ	ط	ایک اُس کا کبھی نہ آیا خط
میرے قاصد سے وہ یہ کہتا ہے		کیا کروں لیکے ہیں پرایا خط

چپ ہو تقریر اب نہ کر واعظ		ہمکو ہوتا ہے درد سر واعظ
تیرے دم سے ہے شور و شر واعظ		تو قیامت ہے فتنہ گر واعظ
کوئے بت ہی کو خلد کہتے ہیں	ظ	کیوں بہکتا ہے اسقدر واعظ
عشق کو بدجو کہہ رہا ہے تو		دھیان تیرا گیا کدھر واعظ
تجھ سے تقریر کیا کرے آباد		تو نہ سمجھے گا عمر بھر واعظ

نہ اٹھانے دیا قدم مجکو		ضعف ہر گام پر ہوا مانع
تیرے غل کے لئے ہوئی اے قیس	ع	میری زنجیر کی صدا مانع
تھا زبان سے گلہ نکلنے پر		اپنے دل کی ہوئی حیا مانع

زہر چھوٹا ہے بدبلا ہے زلف		سانپ سے بھی کہیں سوا ہے زلف
جی بکھرتا ہے دیکھکر میرا	ف	آپ کی ایسی خوشنما ہے زلف
زیب دیتی ہے تیرے چہرے پر		اے صنم قدرت خدا ہے زلف

کیوں سراپا نہ ہو قیامت وہ ۔ آفت جاں ہے قد، بلا ہے زلف

ق

قہر ہے، فتنہ ہے، بلا ہے عشق — کیا کہیں ہم بھلا کہ کیا ہے عشق
صبح سے شام تک جو روتے ہیں — زلف ورخسار کا ہوا ہے عشق
دل عاشق جلا کے خاک کیا — برق ہے، شعلہ ہے، بلا ہے عشق
رنج پاؤ گے، دیکھنا آباد — تم نے اس کا عبث کیا ہے عشق

ق

کس سے اٹھیں گے صدمہائے فراق — قہر ہے جان کو جفائے فراق
اس کے غم سے کبھی نہ ہونگا تنگ — جس طرح چاہے آزمائے فراق
روز گردوں ہے میرے درپئے غم — سوچتا ہے نئی بنائے فراق
صورت وصل سے ہیں بیگانہ — دل ہمارا ہے آشنائے فراق
ابتدا ہی میں جان دی ہم نے — نہ جئے تا بانتہائے فراق
سرد بازار ہجر ہے آباد — ایسے جلتے ہیں داغہائے فراق موجبہ
آنکھ جس روز سے کھلی آباد — نظر آیا نہ کچھ سوائے فراق

گ

کیا ہیں وحشت میں پیرہن سے تنگ — ہجر میں جان ہے بدن سے تنگ
کون نازک مزاج ہے اُن سا — وہ ہوئے بند پیرہن سے تنگ
باغ سے گھر کو جب پھرے گا وہ — ہوں گے مرغ چمن، چمن سے تنگ
سیر غربت کریں گے اے آباد — کچھ ہے دل آج کل وطن سے تنگ

گ

ہیں پسندیدہ تیرے سارے ڈھنگ — تو بھی پیارا ہے پیارے پیارے ڈھنگ
اے صنم ہیں جدا ہزار طرح — رنگ میں پھولوں سے تمہارے ڈھنگ
گاہ روتے ہیں، گاہ ہنستے ہیں — عشق میں ہیں عجب ہمارے ڈھنگ
سبب سے بندش جدا ہے اے آباد — اس غزل کے نئے ہیں سارے ڈھنگ

حال دل کا بیان مشکل ہے — نہیں عشاق کی کہانی سہل
شب فرقت کے قہر ہیں صدمے — نہیں اس سے نجات پانی سہل

ق

کون کہتا ہے مدعا ہو تم — اے مجسم قدرت خدا ہو تم
مثل خورشید ہے رخ تاباں — چاند سے حسن میں سوا ہو تم
دل دیا ہے نہ دینگے ہم تمکو — جانتے ہیں کہ بے وفا ہو تم
دل یہ کہتا ہے ہم سے اے آباد — جسقدر ہو اُسی کو چاہو تم

تم

دیکھنے کو عدم سے ہستی میں — چہرۂ رشک حور آئے ہم
یاد انجام کار پر روئے — جب قریب قبور آئے ہم
جوش حیرت سے مثل آئینہ — روبرو نے حضور آئے ہم
رہنما شوق دل ہوا اپنا — قرب قصر حضور آئے ہم
جلوہ کہتا ہے حسن جاناں کا — آنکھ میں مثل نور آئے ہم
اپنے قدموں مکاں جسگہ بخشو — دور سے ہیں حضور آئے ہم
پاس پہونچے نہ جب تو اے آباد — دور سے اُن کو گھور آئے ہم

تم

ساتھ والوں سے اب جدا ہیں ہم — نالہ زن صورت درا ہیں ہم
یہ حسینوں سے قول ہے اپنا — بے وفا تم ہو با وفا ہیں ہم
وہ جو ہم سے ہوئے ہیں آزردہ — اپنے جینے سے اب خفا ہیں ہم
بیخودی ہجر میں یہ ہم کو ہوئی — نہیں معلوم ہے کہ کیا ہیں ہم
اُسکے کوچے میں خاک اب لے چل — منتظر کب سے اے صبا ہیں ہم
ساتھ اُس آفت سب صورت کے — سایہ کی طرح جابجا ہیں ہم
موج کی طرح کیوں نہ ہوں بیتاب — بحر الفت کے آشنا ہیں ہم
وصل اُس سے کہاں ہوا آباد — درد فرقت میں مبتلا ہیں ہم

تم

نہیں اپنی خبر کہاں ہیں ہم — ملکِ ہستی میں بے نشاں ہیں ہم
جل رہے ہیں مزاج سے اپنے — گرمیِ آتشِ نہاں ہیں ہم
دانہ پانی قفس میں پاتے ہیں — گھر میں دشمن کے میہماں ہیں ہم
بوئے گل آکے رہبری تو کر — تم — کب سے گم کردہ آشیاں ہیں ہم
گردشوں میں بسر نہ ہو کیوں کر — پایۂ تخت آسماں ہیں ہم
حشر تک بھی نہ حشر میں پہونچیں — بارِ عصیاں سے یہ گراں ہیں ہم
اس بسنتی لباس پہ آباد — زرد مانندِ زعفراں ہیں ہم

اسکے پرنور ہیں مقام تمام — ہیں سوا آسمان سے بام تمام
مثلِ یوسف عزیز ہر دل ہے — تیرے عاشق ہیں خاص و عام تمام
تیری تیغِ نگہ ہے اور قاتل — عاشقوں کا کیا ہے کام تمام
بزم میں عکسِ روئے تاباں سے — بن گئے آفتاب بام تمام
کس کے گیسو کی بو صبا لائی — تم — کہ معطر ہوا مشام تمام
کعبہ و دیر چشم و خانۂ دل — اس صنم کے یہ ہیں مقام تمام
کیا خبر تھی مقیم ہے دل میں — اسکے ڈھونڈے عبث مقام تمام
باغ میں کون آئے گا ساقی — گل چمن میں ہیں مثلِ جام تمام
شہر اں شہروں سے ہے شہرۂ آباد — سب میں مشہور ہے کلام تمام

اب مزا ہے زلفِ یار ایذا دے — تم — تیرے مہمان سب کے شب ہیں ہم
زلف سے آنکھ کا اشارہ ہے — تو جو آفت ہے تو غضب ہیں ہم

روؤں جو یاد روئے خنداں میں — اشک بن جائیں پھول داماں میں
اشک شعلے ہیں چشمِ گریاں میں — ن — ہجر نے آگ دی ہے طوفاں میں
محو ہوں یاد روئے خنداں میں — پھول پھولے نگہ کے داماں میں
دامنِ دیدہ جل گیا دمِ دید — کیا حرارت ہے روئے تاباں میں

جسم میں ڈھونڈھتی ہیں کیا آنکھیں   دل سدھارا ہے کوئے جاناں میں
دوست تو دوست کوئی دشمن بھی   نہ پھنسے رنج و درد ہجراں میں
شعلے ہیں پھول ہجر میں اُسکے   جاؤں کیا خاک میں گلستاں میں
چار دیوار تن سے ایذا ہے   ق   روح گویا پھنسی ہے زنداں میں
یاد آئی ہے مجھے جو نوک مژہ   لاکھ نشتر سے چبھے رگ جاں میں
نہ ہوئے شاد وصل سے آباد   کٹ گئی زیست ہجر جاناں میں

صدمۂ ہجر سے گزر جاؤں   موت آتی نہیں کہ مر جاؤں
ناتوانی کمال ہے مجھکو   اب تصور میں اُسکے گھر جاؤں
دل ہے بیتاب اُسکی فرقت میں   ق   اُسکو لے کر بھلا کدھر جاؤں
تاک میں ہیں کروں کسی کا دل   مال یہ مار کر گھر جاؤں
اس بہانے سے اُسکو دیکھ آؤں   آپ میں بنکے نامہ بر جاؤں

حسن رخسار کا جواب نہیں   شعلۂ طور بے نقاب نہیں
آنکھ کو دیکھنے کی تاب نہیں   کس طرح چہرہ آفتاب نہیں
اشک ہیں ہجر میں شراب نہیں   دل تفسیدہ ہے کباب نہیں
عطش شوق جس سے بجھ جائے   تیغ قاتل میں ایسی آب نہیں
جسکو اُس چشم مست کا ہے عشق   ق   مائل ساغر شراب نہیں
مے پیوں کیوں نہ اُسکے کوچے میں   خلد میں حرمت شراب نہیں
دہن لاجواب کے آگے   منہ میں غنچے کے بھی جواب نہیں
پیاس جس سے بجھے شہیدوں کی   تیغ قاتل میں ایسی آب نہیں
شوق وصل صنم میں اے آباد   دل کو کس وقت اضطراب نہیں

خواب میں بھی کبھی جو آتے ہیں   ق   منہ کو بالوں سے وہ چھپاتے ہیں
تیرے قامت کے دھیان میں اکثر   سرو کو ہم گلے لگاتے ہیں

سوز فرقت سے شمع رو ہر شب — دل آباد کو جلاتے ہیں

جب سے دلبر نہیں ہے پہلو میں — دل ہے بیتاب ہوں نہ قابو میں
بل پر اُسکا مزاج ہے جتنا — اسقدر بل کہاں ہیں گیسو میں
مہر جلتا ہے رشک کے مارے — ہے وہ تعویذ اُس کے بازو میں
ہے داغ آج چرخ چارم پر — ق مہر میرا ہے میرے پہلو میں
یاد وہ ذات رُلا رہی ہے مجھے — صاف آب گہر ہے آنسو میں
اپنے گل کو گلے لگایا ہے — ہوں معطر میں آج خوشبو میں
دونوں عالم کو ہے بہا دیتا — زور ایسا ہے ایک آنسو میں

یاد رخسار ہے بہم دل میں — چاند سورج ہیں ایک منزل میں
اب دھڑک بھی ہے ضعف سے موقوف — کسی صورت سے حس نہیں دل میں
رحم کر اب تو اے غم جاناں — تاب باقی نہیں رہی دل میں
آ جلوت میں، ہو چکی خلوت — سب ہیں مشتاق کب سے محفل میں
جستجو اُس دہن کی ناحق ہے — کیوں پھروں دشت وہم باطل میں
کچھ تو پاس محبت عاشق — ق یار انصاف کر ذرا دل میں
عشق میں ہم نے نام اس دل کا — لکھ دیا ہے گواہ عادل میں
دوستو سر وبالِ دوش ہوا — لے چلا مجھکو کوئے قاتل میں
اُنس ہے مجکو اپنے ساقی سے — مئے اُلفت ہے شیشۂ دل میں
دشمنوں کا بھی دوست ہوں آباد — صاف ہوں، کب غبار ہے دل میں

راز کھلتا ہے آج میں، کل میں — اب نہیں دیر امر فیصل میں
عمر یوں تیز رو صبا سے ہے — ق فرق جیسے سوار و پیدل میں
آخری دور کی خبر کسکو — ہم تو بیخود ہیں جام اوّل میں

کب ہے روئے حضور پردے میں — ہے نہاں برق طور پردے میں
راز اُس نکتہ فہم سے کہدے — لے دل باشعور پردے میں
ق
تو ہے وہ خوش جمال اے پیارے — تجھ سے چھپتی ہے حور پردے میں
چہرے پر فائدہ نقاب سے کیا — کوئی چھپتا ہے نور پردے میں
نہیں نزدیک اُس کے جا سکتے — ہے نہاں ہم سے دور پردے میں
محتسب سے چھپائے شیشۂ مے — رکھے جام بلور پردے میں

گر کہ جاؤں کہیں خدائی میں — چین مجھکو نہیں جدائی میں
گرے آنکھوں سے لخت دل پیہم — کھو گیا کیا نگیں جدائی میں
ق
بن گئی بحر غم میں صورت موج — چشم پر آستیں جدائی میں
کوہ غم کو اُٹھا لیا اے دل — تو نے صد آفریں جدائی میں
اُٹھ گیا جسم سے ہمارا دل — بے مکاں ہو مکیں جدائی میں
نظر آتے نہیں ہیں اے آباد — آسمان و زمیں جدائی میں

سب زمانہ ہے تار آنکھوں میں — چھائی ہے زلف یار آنکھوں میں
راہ دیکھی یہ تیرے آنے کی — آگئی جان زار آنکھوں میں
شوق چشم صنم میں رہتی ہیں — پتلیاں بے قرار آنکھوں میں
ق
نرگسی چشم کا فراق جو ہے — ہے خزاں سب بہار آنکھوں میں
حسن نے کوٹ کوٹ کر موتی — بھر دیئے اے نگار آنکھوں میں
توتیا ہے غبار راہ ترا — سرمہ انتظار آنکھوں میں
جسم سے آگئی سمٹ کر جان — اے شب انتظار آنکھوں میں
نشہ اُس کا اُترا کے اے آباد — لے گئے بادہ خوار آنکھوں میں

خوش جمالوں سے مجھکو کام نہیں — کسی یوسف کا میں غلام نہیں
ق
یار تیرا ہی ذکر رہتا ہے — اور وِرد زباں کلام نہیں

در پہ اُسکے جھکا دے سر اے دل　　پاؤں رکھنے کا یہ مقام نہیں
غیر بھر بھر کے لے گئے خم کے خم　　اپنی قسمت میں ایک جام نہیں
ملکِ ہستی، سرا سے کچھ نہیں کم　　کوچ درپیش ہے مقام نہیں
وہ اندھیرا ہے ہجر کی شب کا　ق　روشنی کا نظر میں نام نہیں
جسقدر پی سکیں پئیں احباب　　مئے اُلفت کبھی حرام نہیں
وہ نہیں ہے تو ہم بدن میں نہیں　　یہی کب روح کا پیام نہیں
کر دیا شاہِ عشق نے برباد　　کشورِ دل میں انتظام نہیں
خلوتِ یار ہے اب اے آباد　　غیر کا پاس اپنے کام نہیں

تھی لگاوٹ کی گھات آنکھوں میں　　لے گئے دل کو رات آنکھوں میں
ہے جہاں بے ثبات آنکھوں میں　　ٹھہرے کیا کائنات آنکھوں میں
نور کے پردے چھا گیا تیرا　　نورِ ذات و صفات آنکھوں میں
ہمکو اصلا نظر نہیں آتا　　زندگی کا ثبات آنکھوں میں
مائل جور چشم ہے اُن کی　ق　وہ نہیں التفات آنکھوں میں
آؤ تمکو نہ کوئی دیکھے گا　　پردہ دوں کی ہے قنات آنکھوں میں
اے خیالِ حبیب تیری قسم　　خواب آیا نہ رات آنکھوں میں
ہر اشارے سے راز دل ہے عیاں　　اُن سے ہوتی ہے بات آنکھوں میں
ہے وہ رُخ زلف میں نہاں آباد　　دن ہے مدت سے رات آنکھوں میں

اُنکے خوش خاص عام ہوتے ہیں　　تم سے کب خوش کلام ہوتے ہیں
آتے ہیں جو عدم سے دنیا میں　　رنج ان کو مدام ہوتے ہیں
نہ ستایا کرو کسی کا دل　　شہرہ در نیک نام ہوتے ہیں
زخمِ تیغِ فراق لے قاتل　ق　قابل التیام ہوتے ہیں؟
تو چمن میں کبھی جو جاتا ہے　　شیفتہ گل تمام ہوتے ہیں
تیرے بسمل تڑپتے ہیں اے یار　　لطف کیا زیرِ دام ہوتے ہیں

یہی تسکین دل کو دیتا ہوں مہربان صبح و شام ہوتے ہیں
نخل اُمید سے نہ رکھ اُمید سب ثمر اس میں خام ہوتے ہیں
آہ کرتے ہیں، روتے ہیں دن رات ن وہی دو ہم سے کام ہوتے ہیں
قسم اے شادیٔ وصال حبیب ہجر میں ہم تمام ہوتے ہیں
تو سن عمر کی صدا یہ ہے ہم سے کب تیز گام ہوتے ہیں

ہجر میں بے حواس رہتا ہوں زندگی سے اُداس رہتا ہوں
دور گو ہوں، مگر تصور سے رات دن اُنکے پاس رہتا ہوں
ناطقہ جب سے میں نے پایا ہے ق محو شکر و سپاس رہتا ہوں
نکلے تیرے خیال میں خود میں شکل اُمید و یاس رہتا ہوں
پوچھ حالت نہ ہجر کی آباد بیخود و بے حواس رہتا ہوں

دم سے وعدوں کو ٹال دیتے ہیں بات میری اچھال دیتے ہیں
پھیر لیتے ہیں ہم سے منہ اپنا چاند سے جو مثال دیتے ہیں
تو ہے وہ خوش جمال اے دلبر ق جان صاحب جمال دیتے ہیں
چاہ کر چھینکتے ہیں جائے جواب ہم جو گھبرا کر سوال دیتے ہیں
کیا ثمر عشق کا ہمیں، دیکھیں اب سکے یہ نونہال دیتے ہیں
چاند سا منہ دکھا کے وہ آباد داغ دل کو کمال دیتے ہیں

داغ دل کے سوا رفیق نہیں کوئی جز رنج و غم شفیق نہیں
جسقدر بحر عشق ہے تہ دار ق قلزم ایسا کوئی عمیق نہیں
بد مزاج اُسکو کون کہتا ہے کوئی آباد سا خلیق نہیں

ہجر کا اس جگر میں داغ کہاں گھر میں مفلس کے ہے اجالا چراغ کہاں
ق
حد ہے جا اُٹھا میں جو رمق ہجر تنا دل و دماغ کہاں

رخِ رنگیں کو دیکھ لینے دو / پھر یہ لطفِ بہارِ باغ کہاں
شادیٔ وصل کب ہے قسمت میں / غمِ فرقت سے ہے فراغ کہاں
واقف ہی نہیں، سبو کی قسم / ساقیو! ہم کہاں ایاغ کہاں
دیکھتے ہیں بہار داغِ آباد / ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں

تجھ میں جو ہے پری میں شان نہیں / حور میں بھی یہ آن بان نہیں
جن کے آگے چلے نشان بردار / خاک میں نام کو نشان نہیں
سب مکانوں میں تو ہے جلوہ نما / پر مقرر کوئی مکان نہیں
علم کا تیرے ہے جدا عالم / اور کچھ قدر کا بیان نہیں
اُس کے کوچے میں مر کے اٹھ نہ سکے / کوئی بھی ہم سا ناتوان نہیں
جسم سوزِ فراق سے یہ گھلا / شمع کی طرح استخوان نہیں
تو جو کرتا ہے خوب کرتا ہے / تیری خوبی کا کچھ بیان نہیں
جان دینے کو ہم تو حاضر ہیں / تمھیں منظور امتحان نہیں
کون مرتا ہے، کون جیتا ہے / حیف اتنا بھی اُن کو دھیان نہیں

آدمی کا کچھ اعتبار نہیں / عمرِ فانی کو کچھ قرار نہیں
میرے پہلو میں جو وہ یار نہیں / کسی کروٹ مجھے قرار نہیں
رات دن جوش پر ہے بحرِ فنا / کون ہے جو حباب وار نہیں
جس کو کہتے ہیں دم، ہوا ہے وہ / خاک ہے، قصرِ جسم زار نہیں
آج گو اختیار ہے تیرا / کل تجھے خاک اختیار نہیں
سلسلہ زیست کا ہو کیا مضبوط / رشتۂ عمر پائدار نہیں
دل میں جتنی نہیں ہے گردِ ملال / اپنے آئینے پر غبار نہیں
مست رہتے ہیں چشمِ مست کے مست / نشۂ عشق کا اتار نہیں
رخِ رنگیں کے عشق میں آباد / کب گلِ داغ کی بہار نہیں

صفت شعلہ بیقرار ہوں میں — شمع کی طرح اشکبار ہوں میں
اُٹھے تعظیم کو مجھ سے سب — وحشیوں میں وہ خاکسار ہوں میں
حُسن ہے تجھ میں اور تپش مجھ میں — نور تو ہے اگر، تو نار ہوں میں
اس میں گر وہ بحر خوبی ہے — آج دریا سے ہمکنار ہوں میں
گلِ خورشید گل ہیں تربت پر — کشتۂ حُسن روئے یار ہوں میں
دوست میرا جدا ہوا مجھ سے — دل کے ماتم میں اشکبار ہوں میں
ناامیدی ہے میری قسمت میں [ق] — وصل کا کیا اُمیدوار ہوں میں
مجھ میں تجھ میں ہے فرق اتنا ہی — سرو گلشن ہے تو، چنار ہوں میں
سرِ شوریدہ کی تمنا ہے — کوئے جاناں میں سنگسار ہوں میں
مجکو طوفِ حرم سے کیا مطلب — رات دن گردِ کوئے یار ہوں میں

ہجر میں اُلٹی سانسیں بھرتے ہیں — اے مسیحا خبر لے، مرتے ہیں
تم کو آنا جو ہے تو آجاؤ — ہم تو دنیا سے اب گزرتے ہیں
ماہ و خورشید رات دن تم پر [ق] — چاندی سونا نثار کرتے ہیں
تو وہ یوسف ہے سیکڑوں مہوش — سامنے تیرے پانی بھرتے ہیں
ہیں جواں مرد وہ کہ جو آزاد — نام پر آبرو کے مرتے ہیں

دُور سے بھی اگر اشارے ہوں — میرے جینے کے کچھ سہارے ہوں
جبکہ وارفتہ ہم تمہارے ہوں — ہوش کیونکر بجا ہمارے ہوں
سامری کا چلے نہ سحر اُن پر — جو تری انکھڑیوں کے مارے ہوں
یہ بھی قسمت کی ایک خوبی ہے [ق] — اُلٹے مُنہ پر گلے ہمارے ہوں
منہ سے کلمہ نہ مرتے دم نکلے — در پہ آ کے جو ہم پکارے ہوں
چشم بے نور اپنی روشن ہو — اپنے یوسف کے گر نظارے ہوں
صورت آزاد کے ہو جینے کی — اُس قمر کے اگر نظارے ہوں

تم کو افسوس میری چاہ نہیں   مجھ پر الفت کی وہ نگاہ نہیں
اُس نے عالم کو یہ ستایا ہے   کون دنیا میں داد خواہ نہیں
مرمرِ غم سے بحر الفت میں   ق   کشتیٔ عمر سب تباہ نہیں
کام اعلیٰ کو کیا ہے زینت سے   سر خورشید پر کلاہ نہیں
سامنا اُس سے ایک دن ہوگا   جس سے آباد رسم و راہ نہیں

محو تیرے خیال میں ہم ہیں   ق   تو ہی آئے نظر جدھر دیکھیں
یہی تحریر تھا مقدر میں   پہروں ہم راہ نامہ بر دیکھیں

جسم پر کب بہار باغ نہیں   پھول یہ کھل رہے ہیں داغ نہیں
فکر ساغر عبث ہے اے ساقی   بھر دے چلو اگر ایاغ نہیں
رہ کے گلشن میں ہم نشیں نالے   ق   بلبلو یہ ہمیں دماغ نہیں
ہجر گلرو میں پھول انگر ہیں   کم جہنم سے مجکو باغ نہیں
نہیں کھنچنے میں وہ سر کاکل   دل میں کس وقت اب یہ داغ نہیں

دُرِ دنداں کے غم میں روتے ہیں   آبِ گوہر سے منہ کو دھوتے ہیں
پاؤں رکھتے ہیں بحر الفت میں   ق   اپنے جینے سے ہاتھ دھوتے ہیں
نہیں آرام اپنی قسمت میں   چشم بیدار بخت سوتے ہیں
کہیں دنیا میں اے پری پیکر   آرزو مند ہم سے ہوتے ہیں؟

رباعی

(حضرت سیماب اکبرآبادی)

گھیرے ہوئے ہر طرف سے فطرت ہے مجھے   جو کام ہے، فطرت کی ودیعت ہے مجھے
ڈر کر نہیں کرتا میں کبھی کوئی گناہ   کر کے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے

ملک الشعرائے ایشیا سے خطاب

(نتیجۂ فکر پنڈت دتاتریہ پرشاد صاحب قدا بی۔اے)

اے کہ ہے شرمندۂ احساں ترا ذوقِ سلیم طبعِ موزوں میں تری موجود ہے رنگِ قدیم
سازِ دل رہتا ہے تیرا حسنِ فطرت سے کلیم تجھ سے کرتی ہے عجب انداز سے باتیں نسیم

سحرِ بنگالہ ترے نغمات سے بیدار ہے
ایک عالم اس مئے جذبات سے سرشار ہے

حسنِ فطرت جلوہ گر رہتا ہے تیرے سامنے شانِ صبح و شام پائی تجھ سے صبح و شام نے
کی حدیثِ عشقِ گل سے جب ترے اوہام نے بلبلیں فوراً لگیں اپنے جگر کو تھامنے

فکر تیرا عارضِ گل کا ہوا ہے آئینہ
رازِ الفت اہلِ دل پہ کر رہا ہے آئینہ

نت نیا پیغام دیتی ہے تجھے فصلِ بہار دم دلاسے سے ترے بلبل کا دل ہے برقرار
تیرے نغموں میں ملی آکر پپیہے کی پکار رازِ سربستہ کئے فطرت کے تو نے آشکار

ندیوں نے گائے سو سو گیت تیرے روبرو
سازِ دل سے جو ادا تو نے کئے ہیں ہو بہو

اے جہانِ رنگ و بو کی روح اے جانِ چمن اے کہ عالم میں بڑھا تجھ سے وقارِ برہمن
اے کہ نازاں ہے تری الفت پہ فطرت کی دلہن تھی ترے دیدار کی مدت سے آنکھوں کو لگن

کم ہے جتنا بھی کریں اپنے مقدر پر غرور
شربتِ دیدار سے حاصل ہوا ہے اب سرور

فکر ہے یا رب نہ ہو عالم یہ کوئی خواب کا یا نہ ہو کوئی کرشمہ ہی دلِ بیتاب کا
اوج پر پہونچا ستارہ صوبۂ پنجاب کا پر لگا ہے آج اسکے بخت میں سرخاب کا

جلوہ فرما کشورِ پنجاب میں ٹیگور ہیں
رونق افزا محفلِ پنجاب میں ٹیگور ہیں

شانِ ایزد جلوۂ ٹیگور میں آئی نظر آنکھ میں فرطِ مسرت سے ابل آئے گہر
پرستش کرنے لگے افکارِ دل پر اس قدر جوش سے مائل تکلم پر ہوئے دیوار و در
جو یہی ہیں فرش راہ آنکھیں نئے انداز میں ڈھونڈتے ہیں کان لذت تری آواز میں

[illegible] ڈاکٹر ٹیگور کی ستر ویں سالگرہ منائی گئی تھی اسی کے اعزاز میں یہ دو نظمیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ج۔ ایڈیٹر

ٹیگور

(از جناب اندرجیت شرما چھرہ)

بزمِ دنیا کے جھمیلوں سے ترا دل دور ہے — پاک ہستی سے تری افسونِ باطل دور ہے
تیرا پیکر ہے بیاں اور فکرِ کامل دور ہے — سرحدِ ادراک سے بھی تیری منزل دور ہے
تیرے اک اک لفظ سے ہے حسنِ فطرت آشکار
تیری ہستی ہے خدا کے راز کی آئینہ دار

جب مکمل ہو چکا روزِ ازل ایوانِ حسن — دلربا رنگینیوں سے بھر گیا دامانِ حسن
ہو گئی ایک ایک ذرہ سے نمایاں شانِ حسن — قلبِ فطرت میں مگر اک رہ گیا ارمانِ حسن
کر دیا تخلیق نے تیری وہ پورا کر دیا
ساغرِ دل بادۂ کیف آفریں سے بھر دیا

رنگِ مستقبل نظر آتا ہے تیرے حال میں — کھینچ دی کونین کی تصویر استدلال میں
فرشِ رہ آنکھیں ہوئی جاتی ہیں استقبال میں — چھپ کے بیٹھا ہے کہیں تو جادوئے بنگال میں
زندگی کا حل ہوا عقدہ تری تحریر سے
جگمگا اٹھا جہاں اک روئے پُر تنویر سے

تیرے نغموں کے ترنم سے فضا معمور ہے — نکہتِ مہرِ محبت سے ہوا معمور ہے
ہستیوں سے مبتدا کیا منتہا معمور ہے — بادۂ عرفاں سے ذروں کی بقا معمور ہے
تیرا افسانہ بھلا دیتا ہے فکرِ دو جہاں
تیرے نغمے میں تڑپ اٹھتی ہے روحِ جاوداں

یوں تو لاکھوں ہو گئے ہیں شاعرانِ خوشنوا — مادرِ گیتی نہ پیدا کر سکی ثانی ترا
عشق کو تیری بدولت درسِ خودداری ملا — حسن نے پائے عقیدت پر ترے سر رکھ دیا
ہو مقابل کون تیرا تو ہے فخرِ روزگار
نقش پر تیرے تصدق ہائے لیل و نہار

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم

ہندوستان میں یوں ہی قحط الرجال ہے۔ لیکن مادرِ وطن کے چند سچے جاں نثار ضرور ایسے ہیں جو وطن کی خدمت کے لئے اپنا جان و مال قربان کر دینا اپنا فرض سمجھے ہوئے ہیں۔ افسوس اب وہ ایک ایک کر کے ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دیتے جا رہے ہیں۔ لاجپت رائے، اجمل خاں، سی آر داس، سین گپتا، مولانا محمد علی، پنڈت موتی لال نہرو کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کا دم غنیمت تھا مگر افسوس صد افسوس کہ ۹ و ۱۰ مئی کی درمیانی شب میں وہ بھی قلب کی حرکت یکایک بند ہو جانے سے ہم کو ہمیشہ کے لئے دلفگار چھوڑ گئے۔ آپ ایک روز کے لئے نواب صاحب رامپور کی طلبی پر منصوری گئے تھے دوسرے روز شب کے وقت دہلی واپس آرہے تھے کہ راستہ میں ہی ٹرین میں آپ کو تکلیف محسوس ہوئی اور دم کی دم میں صرف ۵۶ سال کی عمر میں رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔

مرحوم کی ذات میں نہ معلوم کتنے اوصاف جمع ہو گئے تھے۔ ایک چابکدست جراح اور ماہر فن ڈاکٹر ہونے کے علاوہ وہ انسانی اخلاق اور نیک نفسی کے مجسمہ تھے۔ ملک بھر میں وہ سب حلقوں میں یکساں ہر دلعزیز تھے۔ وہ فدائے وطن اور جاں نثار قوم۔ مخلص دوست۔ نیک نہاد انسان خاص طبع اور مستقل مزاج لیڈر تھے جنھوں نے اپنے قوم کی کھری و کھوٹی سنی مگر جادۂ خلوص و رواداری سے تمام عمر کبھی، ایک قدم بھی نہ ڈگمگائے۔

ڈاکٹر انصاری کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے نہ صرف انھیں کے گھر میں اندھیرا ہو گیا بلکہ تمام اہل ملک کے خانۂ دل میں اندھیاری چھا گئی ہے، آپ کی ذات والاصفات اپنے اور پرائے سب کے لئے ایک چشمۂ فیض تھی۔ وقت پڑنے پر وہ سب کے کام آتے تھے۔ اور انکے یہاں ہر دکھی کو پناہ ملتی تھی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے۔ وہ پھولوں میں گلاب کا پھول، جواہرات میں ہیرا اور انسانوں میں فرشتہ تھے وہ عوام میں بھی ہر دلعزیز تھے۔ اور والیان ریاست اور رؤسائے ملک بھی انکی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بھی ان کے ساتھ بڑی عزت و احترام کیساتھ



ڈاکٹر مختار احمد انصاری

پیدائش سنہ ۱۸۸۰ء　　　　وفات سنہ ۱۹۳۶ء

پیش آتے تھے۔

آپ صوبہ متحدہ میں موضع یوسف پور ضلع غازی پور کے ایک معزز و متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام حاجی عبدالرحمٰن انصاری تھا۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں پائی۔ ۱۸۹۶ء میں بنارس گئے جہاں سے انٹرنس پاس کرکے الٰہ آباد میور سنٹرل کالج سے ایف۔ اے پاس کیا اس کے بعد آپ حیدرآباد چلے گئے۔ اور نظام کالج حیدرآباد میں پڑھ کر ۱۹۰۰ء میں مدراس یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لی اور ریاست سے وظیفہ حاصل کرکے ۱۹۰۱ء میں ولایت چلے گئے جہاں اڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف میڈیسن اور ماسٹر آف سرجری کے ڈپلومے حاصل کئے۔ اپنی ذہانت اور محنت کی بدولت ۱۸۹۶ء سے لیکر زمانہ تعلیم کے آخر تک آپ ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور ان سے آپ اپنے بعض عزیزوں اور دوستوں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔

ڈاکٹری کے امتحانات پاس کرنے کے بعد آپ چارنگ کراس ہاسپٹل لندن کے ہاؤس سرجن مقرر ہوگئے اور یہ اعزاز آپ سے پہلے کسی ہندوستانی کو حاصل نہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کو لندن کے اور کئی اسپتالوں میں بھی کام کرنیکا موقعہ ملا۔ اس طرح دس سال تک یورپ میں کام کرنے کے بعد آپ ۱۹۱۰ء میں ہندوستان واپس آئے اور دہلی میں پریکٹس شروع کی۔ گر چھ مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ جنگ بلقان چھڑ گئی اور ترکوں پر مانٹی نیگرو، یونان، سرویا اور بلغاریہ وغیرہ نے دول یورپ سے شہ پاکر چاروں طرف سے نرغہ کرلیا۔ ہزاروں ترک میدان جنگ سے زخمی ہوہو کر اسپتالوں میں بھر گئے۔ یہ واقعات سُنکر ہندوستان کے مسلمانوں میں جوش پھیل گیا۔ مولانا محمد علی وغیرہ نے چندہ کرکے ٹرکش میڈیکل مشن مرتب کیا اور اُس کی رہنمائی ڈاکٹر انصاری کے سپرد ہوگئی چنانچہ آپ نے فوراً پریکٹس چھوڑ دی گھر کا سارا اسباب بیچ ڈالا اور فوراً زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔ اور دو سال تک ترکوں کی بہترین طبی خدمت انجام دی جس کی وجہ سے آپ کو ہندوستان بھر میں قابل رشک شہرت حاصل ہوگئی یہی شہرت آپکی غیر معمولی کامیابی اور لیڈری کا پیش زینہ تھا۔

آپ کے پرایویٹ سکریٹری کا بیان ہے کہ آپ اوسطاً چودہ مریض روزانہ دیکھتے تھے مریضوں کو صبح دو کو شام کے وقت اُن کے گھروں پر جاکر ایک ایک گھنٹہ دیکھتے تھے۔

اور دس مریضوں کو اپنے مطب میں آدھ آدھ گھنٹہ دیتے تھے۔ اس طرح گویا آپ مریضوں کی دیکھ بھال میں اوسطاً نو گھنٹہ روزانہ صرف کرتے تھے۔ آپ کی مصروفیت کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات دور سے آئے ہوئے مریضوں کو آٹھ آٹھ دن تک ملاقات کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ مگر جب دیکھنے کا نمبر آتا تھا تو ڈاکٹر صاحب اسقدر تفصیل کے ساتھ معائنہ کرتے تھے کہ باتوں باتوں میں بیمار کا آدھا مرض کافور ہوجاتا تھا۔ واقعی ڈاکٹر صاحب کی تشخیص بہت صحیح اور انکا طریقۂ علاج نہایت مکمل ہوتا تھا۔ آپ کے ہاتھ میں شفا بھی اتنی تھی کہ نوے فیصدی مریض شفایاب ہوکر جاتے تھے۔ اسی وجہ سے مریضوں کو ڈاکٹر صاحب سے بہت عقیدت ہوجاتی تھی۔

ڈاکٹر انصاری سرجری میں بھی بے مثل دیکتا تھے۔ وہ اسقدر سبکدست واقع ہوئے تھے کہ بڑے سے بڑے آپریشن میں بھی انکو کم سے کم دیر لگتی تھی۔ بعض اوقات انھوں نے ایسے معرکے کے اپریشن کئے ہیں جو طبی دنیا کے معجزات میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو روپیہ کا مطلق لالچ نہ تھا۔ رات دن ہن برستا تھا مگر وہ دولت کو ٹھکراتے رہتے تھے۔ بقول استیتسین دولتمند مریضوں کا اسقدر وسیع حلقہ کسی ڈاکٹر کو نصیب نہیں ہوا جیسا کہ ڈاکٹر انصاری کو۔ غرض ڈاکٹر انصاری ہندوستان کی طبی دنیا کے بھی لیڈر تھے اور یونانی طب میں جو مرتبہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کو حاصل تھا۔ وہی ڈاکٹری میں آپکو حاصل تھا۔

آپ بڑے وضعدار اور پابند اوقات تھے۔ ہمیشہ صبح کو چھ بجے بیدار ہوکر ضروریات سے فارغ ہو کر کپڑے بدلتے تھے۔ غسل روزانہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر سب سے نمایاں چیز ان کی گھنی اور خوبصورت مونچھیں تھیں جن کا آپکو ہمیشہ خاص خیال رہتا تھا۔ بہرحال معمولات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرتے اور اسکے بعد کپڑے پہن کر تیار ہوجاتے۔ لیکن اس دوران میں بھی باہر کے آئے ہوئے تار منگا کر انکے متعلق ہدایات دیتے اور مریضوں کے نمبر مقرر کرتے تھے۔ تاروں اور خطوں کے جوابات خود لکھواتے تھے اسی درمیان میں سیاسی مسائل پر بھی گفتگو کرتے تھے۔ وہ سب کام سہولت اور اطمینان کے ساتھ کرتے تھے۔ اسلئے مطب میں آتے آتے انکو دو گھنٹے لگ جاتے تھے وہ آٹھ بجے مریضوں کو دیکھنے نکلتے۔ اور دس بجے کے بعد واپس آکر مطب میں کام کرتے ایک کے قریب کھانا کھاتے۔ پانچ بجے چائے پیکر پھر مریضوں کو دیکھنے چلے جاتے اور آٹھ بجے شب واپس تشریف لاتے تھے تو خطوط کے جوابات لکھواتے اور پلنگ پر لیٹ کر رات کو بارہ بجے اخبارات پڑھتے۔ اس طرح چوبیس گھنٹے میں وہ مسلسل اٹھارہ گھنٹے مصروف رہتے تھے

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی سیاسی زندگی کی ابتدا جنگ بلقان کے زمانہ میں ہوئی تھی جب وہ ٹرکش میڈیکل مشن لیکر ٹرکی گئے تھے۔ ہندوستان واپس آکر وہ قومی تحریکوں میں باقاعدہ طور پر حصہ لینے لگے۔ چنانچہ جب ہوم رول لیگ قائم ہوئی تو آپ اس میں شریک ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں جب کانگرس اور مسلم لیگ کا دہلی میں اجلاس ہوا تو آپ ہی مسلم لیگ کی مجلس استقبالیہ کے چیرمین منتخب کئے گئے۔ اسکے بعد آپ کانگرس کے سکریٹری منتخب کئے گئے اور کانگرس کے پریسیڈنٹ منتخب ہونے تک اس عہدہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں آپ کے سیاسی خیالات میں حیرت انگیز تغیرات ہوئے۔ چنانچہ جب مسٹر سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے قانونی کونسلوں میں داخلے کا سوال اٹھایا تو ڈاکٹر صاحب اسکے خلاف تھے۔ اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے آپنے مجالس قانون ساز کے داخلہ کے خلاف رائے دی تھی لیکن دفعتاً حالات کچھ ایسے تبدیل ہوئے کہ خود ڈاکٹر صاحب ہی مجالس قانون ساز میں داخلہ کے علمبردار بنگئے تھے اور فتح وظفر نے آپ کا ساتھ دیا۔

تحریک خلافت میں آپ نے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا تھا حتی کہ ۱۹۲۰ء میں آپ اپنا موٹر فروخت کرکے خلافت ڈیپوٹیشن لیکر انگلستان گئے تھے۔ جب واپس آئے تو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگی ہوئی تھی مگر کوئی خدمت ایسی نہ تھی جس کے انجام دینے میں آپ نے دریغ کیا ہو۔ ہندو مسلم اتحاد کے آپ زبردست حامی تھے اور مادر وطن کے دونوں فرزندوں میں پیار اور محبت کا رشتہ محکم کرنے کے لئے آپ نے کبھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

ملکی سیاسیات میں آپ ہمیشہ مہاتما گاندھی کے ساتھ رہے۔ مولانا محمد علی کی گرفتاری کے بعد نظربندوں کی امداد و اعانت کے متعلق جو کمیٹی بنی ہوئی تھی اسکے صدر بھی آپ ہی منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں دہلی کے اسپشل اجلاس کانگرس کی مجلس استقبالیہ کے صدر بھی آپ ہی تھے۔ اسی سال آپ نے لالہ لاجپت رائے کیساتھ "لاجپت انصاری پیکٹ" کیا اور ایک آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی قایم کی۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نیشنل کانگرس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اور کانگرس کی تقویت و استحکام کے لئے ہندوستان بھر میں دورے مارے پھرے۔ اور تنگ دل احباب کی بری بھلی سنتے رہے۔ لیکن جس راہ صداقت پر آپ نے قدم رکھا اس سے کبھی ایک انچ بھی نہ ڈگمگائے۔

۱۹۲۸ء کی آل پارٹیز کانفرنس محض آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ آپ نے اسکی تحریک اپنی صدارتی تقریر میں کی تھی بہرحال اس کا پہلا جلسہ آپ ہی کی کوٹھی میں منعقد ہوا اور وہیں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنی جس نے نہرو رپورٹ کو مرتب کیا۔ اسمیں خود ڈاکٹر انصاری نے پنڈت جی کی امداد و اعانت کی۔ انھیں نے مسلم لیگ کے ممبروں کو اس شرکت پر آمادہ کیا۔ مگر جب کلکتہ کے اجلاس میں یہ رپورٹ نظرانداز ہوگئی تو آپ کو قدرتاً اس کا بیحد صدمہ ہوا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسوقت آپکی آنکھیں پرنم ہوگئی تھیں۔ غالباً آپکی عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا جب آپکو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ تاہم آپکی ہمت مردانہ ہار ماننا نہیں جانتی تھی اور وہ اس واقعہ کے بعد آخر دم تک ہندوستان کے مختلف اقوام میں اتحاد پیدا کرنیکی کوششوں میں مصروف رہے۔

۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی کی تحریک سول نافرمانی میں بھی آپنے نمایاں حصہ لیا اور اس سلسلہ میں آپ کو بھی جیلخانہ جانا پڑا۔ رہائی کے بعد آپکی کوٹھی ہندوستان کی سیاسی تحریک کا مرکز بنگئی۔ آپ مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور قومی اسپرٹ پیدا کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے اور نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے زیر اہتمام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جاکر مسلمانوں کے اندر متحدہ قومیت کے جذبات ابھارے۔ فریدپور میں بنگال نیشنلسٹ مسلم کانفرنس کی صدارت کیلئے بھی آپ ہی منتخب ہوئے۔

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد مہاتما گاندھی کی واپسی پر جب ستیہ گرہ کی تحریک دوبارہ جاری ہوئی تو آپ بھی گرفتار کر کے نظربند کردیے گئے تھے۔ مگر اس دفعہ جیلخانہ کی زندگی کا آپکی صحت پر بہت خراب اثر پڑا چنانچہ آپ بحالی صحت کیلئے یورپ تشریف لے گئے مگر یہاں بھی قوم و وطن کو نہ بھولے اور ملک کے آزادی کی برابر کوشش کرتے رہے لیکن اب آپ کی صحت خراب ہوچکی تھی چنانچہ یورپ سے واپسی پر آپ عملی سیاسیات سے کنارہ کش ہوگئے اور کانگرس کی مجلس عاملہ سے بھی استعفا دیدیا۔ تاہم جب کبھی آپ کے امداد کی ضرورت ہوتی تھی یا مہاتماجی کوئی برت رکھتے تھے یا انھیں کوئی تکلیف ہوتی تھی تو ڈاکٹر صاحب فوراً اُن کے پاس پہونچ کر تیمارداری و علاج میں مصروف ہوجاتے تھے۔ پچھلے لکھنؤ کانگرس میں بھی آپنے صلاح و مشورہ سے ہر وقت امداد دی اور خیال ہے کہ یہیں سے آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔

ڈاکٹر صاحب نے ملک کی دماغی تربیت میں بھی بہت بڑا حصہ لیا۔ اوائل عمر میں بھی وہ طلبۃ تعلیمی وظائف سے کچھ نہ کچھ بچا کر نادار طلباء کی مدد کرتے رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد قائم کر

میں مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں کے علاوہ آپ نے سب سے بڑا حصہ لیا تھا۔ حکیم اجمل خاں کے بعد اس کی تنظیم و ترقی آپ ہی کے ذمہ رہی۔ چنانچہ آپ نے اسکے استحکام کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور سچ پوچھئے تو جو کام سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کالج کے لئے کیا تھا وہی خدمت جامعہ ملیہ کے لئے آپنے انجام دی۔ دراصل جامعہ ملیہ سے آپ کو بے انتہا محبت تھی۔ اور وہ اس کے اخراجات پورا کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ چنانچہ اس کے لئے انھیں بعض اوقات بہت کچھ تردد کرنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے عزیزوں میں ایک بچہ جامعہ میں پڑھتا تھا۔ ایک روز چھٹی کے دن ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا تو باتوں باتوں میں اس نے یہ واقعہ بیان کیا کہ اس کے ایک استاد کی بیوی کو صرف نمک مرچ کے سہارے سوکھی روٹی نصیب ہوتی ہے یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ آواز بھرا گئی اور اضطراری حالت میں چیخ چیخ کر فرمانے لگے کہ میرے بچے بھوکے مرتے ہیں اور مجھے خبر تک نہیں۔ تف ہے میرے کھانے پینے پر۔ اب میں جب تک روپیہ فراہم نہ کرونگا چین سے نہ بیٹھونگا۔ اسی دن شام کو آپ باہر روانہ ہو گئے۔ اور ایک ہفتہ کے بعد واپس آئے تو یہ وہ پر رونق تھی کیونکہ وہ جامعہ ملیہ کے لئے پچیس ہزار روپیہ کی رقم لیکر آئے تھے۔ افسوس اب جامعہ میں وہ اتنا خیال کرنے والا ڈاکٹر صاحب کو جامعہ ملیہ سے اسقدر محبت تھی کہ مرنے کے بعد بھی ان کی مٹی نے جامعہ سے دوری گوارا نہ کی اور وہ جامعہ ملیہ کی ہی زمین میں دفن ہوئے۔ خدا آپکو غریق رحمت فرمائے۔ اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ ع

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں"

قوم کے ہوتے ہیں سرتاج پرستار وطن جو ہوں خدام وطن ہیں وہی سردار وطن
قوم کی جان ہوا کرتے ہیں انصار وطن محسن خلق خدا ہوتے ہیں احرار وطن

تھی وہ توفیق عمل ڈاکٹر انصاری میں
پھونکدی جان نئی جس نے وطن داری میں

(ماخوذ)

بکاپاتی تھے۔ پرمود سیدھا سادہ اور بھولا بھالا لڑکا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے کمدنی کو پڑھانے لکھانے اور اس کے ساتھ کھیلنے کودنے میں دلی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ کمدنی بھی بڑے چاؤ کیساتھ پرمود کے انتظار میں گھڑیاں گنا کرتی۔ اور جب وہ آجاتا یہ کنول کی طرح کھل اٹھتی اور اگر کبھی وہ کسی بات پر بگڑ جاتا تو گھنٹوں رویا کرتی!

غم نصیب ماں اس کشش کا انجام تو پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھی مگر اس خیال سے کہ ابھی دونوں نو عمر ہیں بڑھ کر آپ ہی آپ سنبھل جائیں گے۔ اس طرف کوئی خاص طور پر متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ کمدنی کے ننھے سے دل کو دکھانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اُس دن بڑے زور کی بارش ہوئی۔ سوشیلا بہت دیر تک چھت پر مٹی ڈالنے کے لئے بھیگتی رہی۔ رات کو اُسے حرارت آگئی۔ مفلس کو مجبور دیکھ کر سبھی دبا لیتے ہیں۔ دوا دارو نہ ملنے کی وجہ سے مریض کی حالت دن بدن ابتر ہوتی گئی۔

گرمی جاڑا برسات بہار اور خزاں سبھی وقت سے آتے ہیں لیکن ظالم موت کا وقت کوئی نہیں جانتا۔ بہر حال زندگی سے مایوس ہو کر سوشیلا نے کمدنی اور پرمود دونوں کو اپنے پاس بلایا اور آنکھوں میں آنسوؤں کا امنڈتا ہوا سمندر، سینہ میں غم و افسوس کی بھڑکتی ہوئی آگ کو دبا کر بولی۔ "بیٹا! تمہیں ایشور کو سونپتی ہوں۔ وہی تمہاری حفاظت کریں گے۔ اب تم دونوں بھی جلد بڑے ہو گئے۔ کمدنی کے نصیبوں میں پہلے ہی آگ لگ چکی ہے۔ اب تمہارا اس طرح ملنا جلنا نامناسب ہے۔"

پرمود چپ چاپ کچھ سوچتا ہوا گھر سے باہر نکلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اپنے دل سے بھی زیادہ پیاری کوئی چیز کہیں کھو آیا ہے۔ بیکس و مجبور کمدنی کو اس سے پہلے اتنا شعور نہ تھا۔ جب سمجھ آئی تو اسکا دل پرایا ہو چکا تھا۔ دوسرے دن سوشیلا دنیا سے رخصت ہو گئی جو بے کے انل سے پرانے تعلقات تھے۔ اسلئے ماں کی دائمی مفارقت پر کمدنی انل کے اصرار پر پرمدا کے ساتھ زمیندار کے گھر آ گئی۔

◆ ◆ ◆

غربت و عسرت میں دوسروں کی پسند ہی اپنی خواہش کہلاتی ہے۔ اُس دن انل کی کوٹھی میں ناچ تھا۔ پرمدا کی ضد سے کمدنی کو بھی یہ جلسہ دیکھنے جانا پڑا۔ لشکی جیسی نے انل کی آنکھوں پہ پٹی باندھ دی تھی۔ شرافت و شائستگی کا رہا سہا پاس دکھانا مشتعل جذبات کا طوفان اُڑا کر لے گیا پھر کیا تھا؟ وہ اس خوبصورت بلا پر جس کے حُسن کی رعنائیاں جنس سر بازار بنی اپنے

قدم قدم پر دعوت نگاہ دے رہا
نچے بے حجاب جلووں کو رقص کی لطافتوں میں چھپائے
میں۔ یہ جس انداز سے نثار ہو رہا تھا وہ شرمیلی آنکھوں کے دیکھنے کی بات نہ تھی۔ کمدنی ایک
نے میں سمٹی سمائی بیٹھی تھی۔ اس کا اس طرف دھیان بھی نہ تھا۔ مگر پرمدا کی آنکھیں ادھر
ہی لگی ہوئی تھیں۔ حسن کی شوخ و شگفتہ عریانیوں اور عشق کی مست و گستاخ بیباکیوں کی لگاوٹ
سے پرمدا کی شباب کی لطافتوں سے محروم، نیاز عشق کی بدمستیوں سے ناآشنا معصومیت
کے لطیف و پاکیزہ خوابوں کی مسرتوں میں کھوئی ہوئی حسین اور سرشار تمنائیں نادانستہ جاگ اٹھی
تھیں۔ اور انل اور اس کے ساتھیوں کا وحشیانہ اشتیاق دیکھ دیکھ کر حسن و جمال کی رنگین
اداؤں سے اپنی تاریک دنیا کو منور کرنے کا لالچ جوان بیوہ کو ٹھگ لینے کے لئے سنہرے جال
بچھانے لگا۔

وہ جنت کی حور سے
شیتل نے پرمدا کو اس سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ مگر آج نہ جانے کیوں
بھی زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اسکی پیاسی آنکھیں تجلی حسن کی ضیا پاشیوں میں چمنستان
شباب میں محو گل چینی تھیں۔ ادھر پرمدا کی دل کی دنیا میں رنگ و نور کے سینکڑوں طوفان
برپا ہو رہے تھے۔ اسلئے اس نے پہلے تو دیر تک شیتل کو دیکھا پھر چوٹ کھائی ہوئی ہرنی کیطرح
سنبھل کر بیٹھ گئی۔ لیکن باغی دل ہاتھ سے نکل ہی گیا۔ اور معصوم حیا کی ندامت طلب و تقاضہ
کی شوخیوں کے رنگین ریلے میں خاک کے تودہ کی طرح بہہ گئی۔

جلسہ برخاست ہوا اور سب لوگ چل دئے پرمدا بھی گئی۔ لیکن اسمیں اور دوسروں کی
حالت میں کتنا فرق اور کتنا تضاد تھا؟ جس سوزش سے اس کے تن بدن، روح اور قلب کے
ریشے ریشے میں آگ سلگ رہی تھی۔ کمدنی بھی اس کے ساتھ تھی پھر بھی اُسے اُس کی
آنچ تک نہ پہنچی۔ پرمدا شباب کی حسین مگر شعلہ بار مسرتوں۔ اور جنوں آفریں راحتوں سے
زبردستی محروم کر دی گئی تھی۔ کمدنی کی فطرت ان جھمیلوں سے بیگانہ ہو چکی تھی کیونکہ اس
نے دیدہ دانستہ جوان آرزوؤں کو ترک و ایثار کا زہر دیکر سُلا دیا تھا۔

پرمدا کو اس رات کوشش کرنے پر بھی نیند نہ آئی۔ دن نکلتے ہی وہ باغ میں تالاب پر
نہانے چلی گئی۔ پرمدا بھیگی ہوئی ساڑی میں اپنے مست و مسرور۔ سرکش و گستاخ شباب
کو چھپائے لوٹی آ رہی تھی۔ اس کی کالی اور لمبی زلفوں کے جال سے ٹپکتی ہوئی پانی کی
بوندیں سورج کی نورانی شعاعوں سے منور ہو کر سنہری موتیوں کی طرح جھڑ رہی تھیں۔ شیتل

بھی باغ ہی میں تھا۔ اُس نے پرما کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ صرف اُسے اپنی موجودگی سے مطلع کرنے کے لئے گانے لگا۔

"مگر گئی رے مورے ہاتھ سے کی بندیا"

شیتل کی کوئل جیسی میٹھی آواز پرما کے کانوں میں چبھتے ہوئے تیر کی طرح پہنچی۔ اُس نے پھر کر دیکھا اور غضب آلود آنکھوں سے اس کے گناہ گار دلبر جلال حُسن کی چنگاریاں برساتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ شیتل کی شیریں بیانی نے اس کے دل میں جو چرکہ لگایا تھا اُس سے اس کا جسم اور سارا کمرہ جل رہا تھا اور وہ اسے اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ جب شیتل سوکھے منہ سے پچھتاوے کا بہانہ لئے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور لجاجت سے پرما کا ہاتھ پکڑ کر رحم و کرم کی بھیک مانگنے لگا۔ تو بیکس ابلا کا مجبور دل بُو بُو کر کے رونے لگا اور اس کی خودداری اس کی دوشیزگی کا ماتم کرنے کے لئے شیطان کے سامنے مغلوب ہو کر جھک گئی۔ اسکی روح کی بغاوت اس کے ضمیر کی ندامت اور اس کے ارادہ کی پاکیزگی سب کی سب شیتل کے عالمگیر تپش سے جھلس کر رہ گئیں۔ اس کے مضمحل جسم کی اداسی اور آنکھوں کے آثار چڑھاؤ سے پہلے ہی سے اس کے دل کی کمزوری مترشح تھی۔ اب یکایک موقع پاکر نسوانی رحم کا چشمہ پورے زور کیساتھ اُبل پڑا۔ پرما ناقابل بیان شیرینی اور پیاس ناممکن التشریح حلاوت گھول کر بولی:- "جس بیدردی سے تم نے میرے مجروح دل کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اگر اُسے جانتے تو سمجھ سکتے کہ کتنے دنوں کی گھٹا ٹوپ خشک سالی کی آگ

میرے دل میں شعلہ زن ہو رہی ہے ......"

عشق و ہوس کی ہوائے سرد کے موافق جھونکوں سے بیخود و بدمست ہو کر شیتل نے ایک دوشیزہ کی فطری شرم و حیا کو جس گرمجوشی سے مسل ڈالا اس کے تپش اضطراب سے تڑپ کر اس کے ضمیر نے موت کے منہ سے بچ نکلنے کی آخری کوشش کی، عورت کی فطرت، اسکی حیا پرور معصومیت نے گناہ کی مہیب گرفت سے چھٹکارا پانے کے لئے فیصلہ کن جنگ کی۔ غیرت نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن مجبور دستور دل نے غداری کی اور بھاگنے کا موقع ملنے پر بھی پاؤں پکڑ لئے۔ پاکبازی و پارسائی کی محافظ شرافت مرگ ناگہاں کا شکار ہو گئی۔ اور اس کے بعد؟ ــ اس کے بعد گناہ کی مسرتوں کا جھوٹا انکار آنسوؤں کی صورت میں رونما ہو کر رہ گیا۔ جب کسی طرح بس نہ چلا تو پرما نے بھی تشنہ روح کی پیاس سے بیتاب

بر شرابِ شوق کی حلاوتوں سے لذت آشنا ہونے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔
دنیا کی اور سب باتوں کی طرح یہ سلسلہ بھی بہت دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکا ہے کرتو تیں
شیتل کی بہن نے بھی دیکھیں اور کُندنی نے بھی لیکن دونوں کے خاموش رہنے کی کوئی نہ
کوئی وجہ بھی ضرور تھی۔

(۳)

اور جا ہے جو ہو مگر پرائی روٹیاں کھانا بڑا مشکل کام ہے۔ کندنی بھی زمیندار کے گھر آکر
یہ بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اسلئے سارا گھر کا کام کاج اُس نے اپنے سر پر اوڑھ لیا۔ ویسے
تو اس کی عمر اس قابل نہ تھی کہ اتنے بڑے گھر کا بار اٹھا سکتی وہ بھی ناز و نعم کی پالی ہوئی تھی!
لیکن بُرے دن سب کرا لیتے ہیں۔ کھانا بنانا، کھلانا پلانا، نوکروں کی دیکھ بھال کندنی سبھی کچھ
کرتی۔ اس دن انل بہت رات گئے لوٹا۔ گھر کے سب لوگ سو چکے تھے۔ اسلئے کندنی ہی
کو تھالی لیکر جانا پڑا۔ انل کی آنکھ نجانے کب سے اُس پر لگ رہی تھی۔ موقع پاکر اس نے
کندنی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ کندنی پر انل کی نگاہِ التفات مصیبت کا پہاڑ بنکر
ٹوٹ پڑی۔ اس کے غم و غصہ کی انتہا نہ رہی۔ آنکھوں میں خون کا گھونٹا ہوا سمندر امنڈ
آیا۔ انل کے لئے یہ ایک نئی بات تھی۔ اسے کندنی کے اس خلافِ توقع برتاؤ پر بڑی حیرت
ہوئی۔ ابتک تو کبھی کسی نے ایسی جرأت نہ کی تھی۔ پھر عورت اور خباثت میں جو فرق ہے
وہ انل سمجھ بھی سکتا تھا؟ کندنی کے آغازِ شباب کی مستیوں نے اُسے پہلے ہی دیوانہ بنا دیا تھا۔
یہ خیال کہ ایک محتاج و لاوارث بے دست و پا لڑکی کا یہ حوصلہ! یہ ہمت؟ کندنی کی ناسپاسی
و احسان فراموشی دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ کتنی سی بات تھی؟ جس کے لئے طوطے کی
طرح آنکھیں پھیر گئی! لیکن یہ بات کندنی کے لئے کتنی بڑی بات تھی انل اسکو کچھ نہ سمجھ سکا۔ ڈری
سہمی ہوئی کندنی اس سے بچنے کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگی۔ لیکن جب انل کی ناشائستگی حد سے
سوا ہوتی گئی تو کندنی بھی ایکبار پاؤں سے دبی ہوئی ناگن کی طرح مچل کر سنبھل گئی! اور اس کی
گرفت سے نکلنے کے لئے زور سے دھکا دے کر پیچھے ہٹ گئی۔ بیخود و متوالا انل لڑکھڑا کر زمین
پر آ رہا۔ اس کا سر چوکھٹ سے ٹکرا کر لہولہان ہو گیا۔ کندنی یہ دیکھ کر سہمے کی طرح تھرتھرانے
لگی۔ جب ذرا حواس ٹھکانے ہوئے اور تمام باتیں آنکھوں کے سامنے آئیں تو وہ بیکسوں کے
مددگار کو شاہد کر کے اپنی جان سے زیادہ عزیز عصمت کی حفاظت کیلئے پر ہود کے گھر کیطرف بھاگی

دوسرے دن وقت چاہا بھان شیتل دھیر وکا لیکن پرمود کے گھر آ دھمکا اور اپنی پیاری بچی کے آئے دن وہ بھڑک رہے تھے وہ واقعی جانے لگا لیکن بھان کی دماغ کھولنے کی یہ تمام کوشش فضول گئی۔ پرمود نے اس کی یاوہ گوئی پر کان تک نہ دیئے۔ آخر کار بک جھک کر آپ ہی چلا گیا۔ جس وقت ان پرمود پر جھوٹا الزام تھوپ کر نفرین کر رہا تھا کمدنی ممٹی ہوئی بیٹھی اپنی پھوٹی قسمت کو رو رہی تھی۔ اور اس کے آنسوؤں کے تارے نگاہوں کے دور سے طوفان آسمان کی لا انتہا پہنائیوں میں تاریکی گناہ کے دل بادل اُمنڈ رہے تھے۔

—×۴×—

مدن مراری شرما آجکل کے پنڈتوں کی طرح نہ تھے۔ اُنہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ ان کی شرارت، پرمود کی بے گناہی اور کمدنی کی بے بسی انکی دوررس نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہی۔ اُنہوں نے دونوں کو بہت کچھ سمجھایا بجھایا۔ کمدنی اسیوقت کہیں دور چلی جانے کیلئے مُصر تھی۔ لیکن پرمود کسی طرح اسپر راضی نہ ہوتا تھا۔ مدن مراری پرمود اور کمدنی کے دل کا حال بھی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے زبان دبا کر بولے۔ "بیٹی! سوچو تو سہی۔ کس طرح تمہاری حفاظت ہو سکے گی؟ ان کے ان جھوٹے الزامات کے اوچھے واروں سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ گندی اور اندھی دنیا کے سامنے تمہاری کون سُنے گا؟ کیسے تمہاری بے گناہی پر اعتبار آئیگا؟ خود اپنے تجربہ سے سبق لو کیا سماج کے بھوکے شکاریوں کو اپنی حفاظت کا بار سونپ کر تم کبھی مطمئن رہ سکوگی"؟

کمدنی کو چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ ایک سرد آہ بھر کر اس نے کہا:۔ "کیا اس وسیع دنیا میں صبر و سکون کیساتھ سانس لینے کے لئے ایک مجبور و بیکس بیوہ کو تل بھر جگہ بھی نہیں مل سکتی؟"

پرمود کا نازک مجروح دل کسی برقی رو کے چھو جانے سے کانپ کر رہ گیا۔ بوڑھے پنڈت نے بھی ملول ہو کر کہا:۔ "ایسی کوئی بات نہ ہونے پر بھی ایک طرح سے تمہارا کہنا ہی ٹھیک ہے۔ آہ! ہمارے سنگدل سماج کے آتشکدے میں نہ جانے کتنی معصوم ہلائیں جل کر خاک ہو چکی ہیں۔ پھر بھی ہمارے گندم نما جو فروش اور شہرت طلب رہنماؤں کی جہالت سے ظاہر ہے:

کمدنی آنکھوں میں امڈے ہوئے زبردست طوفان کو روکتے ہوئے آہستہ سے بولی :-
- بھگوان! ہندو عورت اگر آبرو کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی تو اپنی شرم کی حفاظت کے لئے
مر تو سکتی ہے۔ میں بھی عورت ذات ہوں۔ جہان دنیا بھی جانتی ہوں۔ اور کچھ نہیں تو
اس ظالم سماج کی توقیر و تشفی کے لئے اتنی قربانی ضرور کر سکوں گی...."
پنڈت جی کا چہرہ غرور و مسرت کے نشہ سے تمتما اُٹھا۔ سنبھل کر بولے :- "یہ تو ٹھیک
ہے۔ لیکن اس سے حفاظت کہاں ہوئی؟ اگر حفاظت کا یہی مطلب ہے تو ہندو قوم کے مٹ
جانے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ پھر جان دے دینا ہی تو ہمت و شجاعت کی آخری منزل نہیں
ہے۔ بیٹی! اندھے سماج کی بہتری و بہبودی کے لئے کوشش کرنے ہی سے تمہارا بھلا
ہوگا۔ اس کے علاوہ اس زندگی پر تمہارا اختیار ہی کب ہے؟۔ پرائی دی ہوئی چیز کو مٹا دینا
کس مذہب میں جائز ہے؟ ایسا خیال کرنے سے بھی گناہ ہوتا ہے۔ صرف ذرا سی ہمت کرو۔
مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہوگا وہ بالکل شاستروں کے مطابق ہے۔ اس
میں کہیں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اس بارے میں دنیا کے تھوکنے کا بھی اندیشہ نہیں ہے۔ پھر بابوجی
کی رضامندی کا بار میں اپنے سر لیتا ہوں"
کمدنی چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ اُسے اپنی ماں کی آخری نصیحت یاد آئی۔ پھر پرمود
کی بے لوث محبت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔
مدن مراری نے پھر کہا :- "بیٹی! کیا اب بھی کوئی اعتراض ہے؟ ایک بار پرمود کی
طرف دیکھ کر بتاؤ کیا اس کی مسرت و شادمانی کی حسرت تمہیں کبھی بے چین نہ کرے گی؟ تمہاری
کم ہمتی سے اسکی زندگی تباہ اور اسکی دنیا اُجاڑ ہو سکتی ہے۔ میں تم سے پرمود کی مسرت و
کامرانی کی بھیک مانگتا ہوں"
کمدنی کے عزم و ارادہ میں اس بار ایسا دھکا لگا کہ اس کے صبر و تحمل کے باندھ ٹوٹ کر
رہ گئے۔ اور اس کے خیالات کے سمندر میں ایسا خوفناک طوفان آیا کہ اُس نے اپنی بے کیف
زندگی کو پرمود کی عشرت و شادمانی کی رنگین موجوں میں گم کر دیا..... یہی عورت
فطرت اور عشق کی حقیقی معراج ہے۔!
جس دن کمدنی اور پرمود کے دل دنیا کی نگاہ میں لافانی محبت کے مضبوط رشتہ میں بندھے
جا رہے تھے۔ اُسی دن پرما اور شیل اپنے گناہ کا بھاری بوجھ لئے بنارس چھوڑ کر بھاگے

رجا رہے تھے۔ گھر گھر ان کی بے حیائی کا چرچا ہو رہا تھا۔ لیکن کمدنی کے کانوں میں اس
اس کی بجائے ایک پرانا گیت رہ رہ کر گونج رہا تھا۔

مل گئی ہے مورے ماتھے کی بندیا!

قدرت کا انتقام کتنا زبردست ہوتا ہے! اب ان کی آنکھیں اچھی طرح کھل گئیں۔
وقوف ہاتھ ملنے کے سوا اور کر کیا سکتا تھا۔ اسکی روح کو جو چوٹ پہنچائی گئی تھی اس کا
نتقام لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ غم ندامت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ لیکن کمدنی
کے معصوم حیا کی گلابی سرخی سے رنگیں و حسین چہرہ پر "ماتھے کی بندیا" نے چار چاند لگا
یے تھے۔

نمازِ جمال

اختر ولوی فضل الدین صاحب اختر۔ بی۔ اے

ہوتی ہے محویت جو نمازِ جمال میں
سو عرش جھومتے ہیں فضائے خیال میں

ممکن ہے پھر یہ لمحۂ صبر و سکون نہ آئے
رنگِ دوام بھر مری تصویرِ حال میں

ہو عمر اے تصورِ جاناں تری دراز!
انگڑائی لے رہی ہے جوانی خیال میں

یہ چیز اب بہتنے کے قابل نہیں رہی
دنیا کو غرق کر مرے جامِ سفال میں

اک آشنائے راز سے خود داریاں فضول!
تم بن بلائے آئے ہو اکثر خیال میں

ظرفِ نظر میں ہمتِ پروانہ چاہیئے
ہم لاکھ بار آئیں گے بزمِ جمال میں

اللہ رے کرم کی معاصی نوازیاں!
شوخی پروئے نگہِ انفعال میں

انکا وجود حاصلِ ایجادِ کائنات
وہم و خیال ہوں تو وہ آئیں خیال میں

موضوعِ شعر سامنے بیٹھا ہوا ہو تو،
اور میں غزل پڑھوں تری بزمِ جمال میں

ممکن نہیں مجاز و حقیقت کا امتیاز
تم ہو خیال میں تو جہاں ہے خیال میں

زندہ سا ایک شعر تڑپتی سی ایک نظم
شاعر جمال میں! ترے شاعر جمال میں!!

کچھ فرق ہو تو ان کو بتاؤں میں اے اختر
بجلی کے اضطراب میں اور دل کے حال میں

لطفِ سخن

از پنڈت آنند نرائن ملا ایم-اے-ایل ایل بی

عمر کے دریا کے دریا بہہ گئے — ہم جہاں ڈوبے وہیں پر رہ گئے
آپ سے آنکھیں ملا کر رہ گئے — چاہتے تھے کچھ کہیں اور کہہ گئے
تم نے چھیڑا ہی نہ سازِ التفات — مرے نغمے دل ہی دل میں رہ گئے
خوفِ محشر اور غمِ دنیا کے بعد — وہ بھی سہہ لیں گے جب اتنا سہہ گئے
سیکڑوں نے پی کے توڑے جامِ مے — ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے
پھول بہتر ہے یہی چن لے کوئی — سوکھ کر ڈالی پہ کتنے رہ گئے

(از جناب جیوا دیسرٹی)

روانی دیکھ کر تیغِ قضا کی — کھنچی ہے تیغ ابرو کس بلا کی!
نہ سنبھلا حالِ دل مرضی خدا کی — ہزاروں منتیں مانیں دعا کی
بہا مقتل میں جب خونِ تمنا — مہک آنے لگی بوئے حنا کی
اڑا لاتی ہے سوئے زلفِ پُرخم — ذرا چالاکیاں دیکھو صبا کی
الجھ جاتی ہے زلفِ پرشکن سے — ذرا گستاخیاں دیکھو صبا کی

(جذباتِ سروش)

یارب اگر جہاں میں عیش کی جا نہیں نہ ہو — صدمۂ رنج و غم سے دل میرا کبھی حزیں نہ ہو
راہِ وفا میں ہمنشیں دل کی یہی مراد ہے — سنگِ درِ حبیب سے دور مری جبیں نہ ہو
جینا وہ جینا کیا ہے جو موت کے ڈر سے ہو سہی — موت وہ موت کیا ہے جو ننگ کا سبب نہ ہو
لذتِ وصل کیلئے مضطرب اے جگر ہے کیا — لذتِ وصل ہی تری دشمنِ جاں کہیں نہ ہو
کوچۂ ذوق و شوق میں اتنا بلند ہو کے چل — اپنے لئے جادۂ طلب گنبدِ نیلگوں نہ ہو
فکرِ مآلِ کار میں شانِ بشر کا راز ہے — کاش کہ ہو شکست جلنے وہ آگہی نہ ہو

سخنِ حق کا نام ہی شاعری اے سروش ہے
شاعر وہ کفر گو ہے جو راہنمائے دین نہ ہو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بڑوں اور … اوقات کے بہترین …

… سال بھر تک دیکھ سکتے ہیں ۔

[illegible]

… کیمیں ڈیا ۔

[illegible]

اردو ادب میں [illegible]

[illegible]

[illegible] کو بند کیجیے

[illegible]

زمانہ

جلد ــــ جون سنہ ۱۹۳۶ء نمبر ــــ

لکھنؤ سے خطاب

(از حضرت وصل بلگرامی)

(یہ وقار آفریں و سبق آموز نظم انجمن بہار ادب لکھنؤ کے ادبی جلسہ میں جو عالیجناب مسٹر سید امام صاحب بہادر، بالقابہ پریسیڈنٹ فارسی کونسل صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی صدارت میں رفاہ عام کلب لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، پڑھ کر سنائی گئی تھی۔ ایڈیٹر)

اے صدرِ بزم! اے سببِ افتخارِ بزم! اے شمعِ بزم! آئینۂ اقتدارِ بزم!
اے حاضرینِ بزم! شکوہ و وقارِ بزم اے نازشِ بہارِ ادب! اے بہارِ بزم!
اس سے زیادہ آپ کو ذوقِ ادب ہے
جو کچھ ہے کائنات میں وہ سب کا سب ہے

ارشاد ہو تو اپنا فسانہ سناؤں میں جذبات اپنے نظم کے قالب میں لاؤں میں
پھر منزلِ حیات کے نزدیک آؤں میں جو کچھ ہے رازِ زندگیِ دل بتاؤں میں
حسنِ خلوص، حرفِ شکایت کے ساتھ ہو
شکوہ بھی ہو اگر، تو محبت کے ساتھ ہو

روئے سخن ہو عام مخاطب بھی عام ہو شہرت سے ہو غرض نہ نمائش سے کام ہو
نے تکلف، اور نہ کوئی اہتمام ہو ہر شعر واقعات کا رنگین جام ہو
کیونکر ہوں ناشناسِ شراب و سبو سے میں کتنا جدا ہوں کیوں کہوں لکھنؤ سے میں

اے لکھنؤ بہارِ ادب! بوستانِ ہند! — اے لالۂ شگفتہ و روحِ روانِ ہند!
اے تاجدارِ علم! امیرِ زبانِ ہند — خاموش کیوں ہے جلسۂ عرب کاروانِ ہند!

یادش بخیر! اوجِ سپہرِ امکاں تھا تو!
دنیا، زمینِ علم تھی اور آسماں تھا تو!

تو، شہریارِ کشورِ ہندوستاں بھی تھا — جانِ ہنر، ادب کی تو روحِ رواں بھی تھا
اُردو پہ فتحیاب بھی تھا، حکمراں بھی تھا — دلّی کی طرح، مرکزِ اہلِ زباں بھی تھا

تیری زباں میں چشمۂ صد انگبیں بھی تھا
تو حاملِ ترانۂ روح الامیں بھی تھا

کتنے تری نگاہ نے کامل بنائے تھے — کانٹے، چمن کے مدِ مقابل بنائے تھے
تو نے، درونِ بحر بھی ساحل بنائے تھے — کتنے نئے دماغ، نئے دل بنائے تھے

تھیں علم کی صفیں، ترے ایواں کے سامنے
پریاں ہوں جیسے، تختِ سلیماں کے سامنے

تیرا، وہ دورِ فضل بھی کیا کامیاب تھا — جب زندگی کی بزم میں تو بازیاب تھا
جو ذرہ تھا، وہ اپنی جگہ آفتاب تھا — تو، نوعروسِ علم و ادب کا شباب تھا

تیری ہر اک صدا تھی، ترنم لئے ہوئے
ہر خار تھا، کلی کا تبسم لئے ہوئے

خوشبوئیں تیری پھیلی ہوئی تھیں چمن چمن — ڈوبے ہوئے تھے تیرے رنگ میں، نسرین و نسترن
پاتے تھے پرورش ترے حجروں میں علم و فن — اب تک ہیں یاد، وہ ترے تیور، وہ بانکپن

پارینہ انجمن کا فسانہ بھی یاد ہے
معیار[1] کے وہ دن، وہ زمانہ بھی یاد ہے

اُس انجمن کا حسن ابھی تک نظر میں ہے — میٹھا ہوا وہ تیر ابھی تک جگر میں ہے
اب تک مِنا اسی کی، دلِ باخبر میں ہے — اب تک وہ شمع، حلقۂ اہلِ ہنر میں ہے

آئی وہ پھر "معین ادب"[2] بن کے سامنے
خیرہ تھی ہر نظر، رخِ روشن کے سامنے

[1] انجمن معیار الادب سے مراد ہے۔ [2] انجمن معین الادب سے مراد ہے۔

ہر اک طرف سے اس کی ہوئیں قدردانیاں — اب تک دو ہیں ہیں کہ ہیں اُس کی نشانیاں
اب اس کی داستانیں ہیں گیا بھولی کہانیاں — اب بھی ہے تذکرے ہیں اگر میں زمزمہ خوانیاں

اک اور انجمن نظر آئی تھی شان سے
معراج ادب نے پائی تھی کس کی زبان سے

ظاہر ہوئی تھی بہار ادب کی بہار بھی — اپنی جلو میں لے کے گل و برگ و بار بھی
پُرکیف ہو گیا، دلِ امیدوار بھی — لے لے کے اپنے جام بڑھے بادہ خوار بھی

کچھ دن تو، خوب دورِ شراب کہن رہا
جوشِ نمو و خروشِ نغمۂ چمن در چمن رہا

جلوے نئے دکھاتے رہے انجمن میں جام — چلتے تھے رنگ رنگ کے بزمِ سخن میں جام
دیکھا، تو پھول پھول لئے تھا چمن میں جام — گردش کناں رہے مگر اہلِ فن میں جام

لیکن یہ انجمن نہ کسی طرح جم سکی
طوفان کے تھپیڑوں میں کشتی نہ تھم سکی

پھر کیا تھا، اک جمود کا عالم تھا ہر طرف — بیزاریوں کا، پھر وہی ماتم تھا ہر طرف
چھایا ہوا گھٹا کی طرح، غم تھا ہر طرف — ذکرِ مزاج کا گل برہم تھا ہر طرف

تدبیرِ زندگی کا سہارا نہ ہو سکی
شرکت بھی انجمن کی گوارا نہ ہو سکی

اب پوچھیے، بہارِ ادب کا ہے حال کیا؟ — کہیئے تو، ہونے والا ہے اُس کا مآل کیا؟
سُونی رہے گی خلوتِ حسنِ خیال کیا؟ — پھر کبھی اب نہ دیکھیں گے اہلِ کمال کیا؟

کیا، انجمن کا نام، نہ باقی رہے گا اب؟
کیا، کوئی بادہ نوش، نہ ساقی رہے گا اب؟

کیا اب بھی کوئی ہوگی نہ تصنیفِ انجمن؟ — دیکھیں گے کیا، نہ ایک بھی تالیفِ انجمن؟
گونجا کرے گی کانوں میں تعریفِ انجمن؟ — ہوگی شاعروں ہی میں توصیفِ انجمن؟
دیگی جواب کیا، انجمنِ شہر کیں کوئی — افسوس لکھنؤ کا لغت تک نہیں کوئی

ا مراد ہیں انجمن ... کے ... سے ... ہے۔ نظم پڑھی گئی ۔ ۲ انجمن معراج الادب سے مراد ہے۔
۳ مراد انجمن بہار ادب لکھنؤ سے مراد ہے۔

اے لکھنؤ! یہ حال ترا ہو گیا ہے کیا؟ سرمایۂ حیات ترا، کھو گیا ہے کیا؟
سینے سے تیرے ذوق کوئی دھو گیا ہے کیا؟ اب حشر تک کے واسطے تو سو گیا ہے کیا؟
اوجِ افق پہ غلغلہ ہے آفتاب کا
بیدار ہو کہ وقت نہیں ہے یہ خواب کا

کیوں اُس ادا سے جام میں ڈھلتی نہیں شراب مینا کو کیا، سبو سے نکلتی نہیں شراب
پہلو، صراحیوں میں بدلتی نہیں شراب بوتل بھی کھول دیں تو اُبلتی نہیں شراب
اب میکدے میں دھوم، نہ جوش و خروش ہے
"اِک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے"

دنیا پہونچ گئی ہے کہاں سے کہاں تک اب اُس کا گزر زمین سے ہے آسماں تک اب
جانے ہی کو فلک سے ہے وہ لامکاں تک اب پرواز کا ملے گا نہ اُس کی نشاں تک اب
تجھ کو سنا رہا ہوں، یہ سننے کی بات ہے
قبضے میں جدّ و جہد کے کل کائنات ہے

ہر دل میں موجزن ہے، ترقی کی آرزو ہر آنکھ کو ہے آج، تجلی کی آرزو
ہر قلب، ہر نفس کو، تشفی کی آرزو ہر لَے کو ایک طرزِ نو مغنی کی آرزو
جذبات کو ہے حافظِ شیراز کی تلاش
ہر سامعہ کو، غیب کی آواز کی تلاش

اب بھی ہے اِس کا کچھ تجھے احساس یا نہیں؟ باقی ہیں کچھ حیات کے انفاس، یا نہیں؟
پھولوں میں تیرے اب بھی ہے بُو باس یا نہیں؟ کچھ غیرت و حیا ہے ترے پاس، یا نہیں؟
ہشیار ہو، کہ وقت ہے یہ، پُر خطر ترا
رکھا ہوا ہے موت کے زانو پہ سر ترا

کیا تجھ کو ہو گیا ہے، سنبھلتا نہیں ہے کیوں؟ یہ بے حسی کا رنگ، بدلتا نہیں ہے کیوں؟
فاسد جو خون ہے، وہ نکلتا نہیں ہے کیوں؟ نشترِ رگِ جمود پہ چلتا نہیں ہے کیوں؟
کیوں بزمِ نا و نوش میں آتا نہیں ہے تو؟
یہ وقت اور ہوش میں آتا نہیں ہے تو؟

لے سورمے ہاتھ میں، تیغِ فتح و ظفر دکھا   میدانِ کارزار میں اپنا ہنر دکھا
سیفِ قلم کا جوشِ عمل سے اثر دکھا   دنیائے علم و فن کو نئی رہ گزر دکھا
طوفاں ترقیوں کا بپا ہو، وہ کام کر
تو با کمال ہو کے، زمانے میں نام کر

اُستاد خود ہی بن، کبھی ایسی خطا نہ کر   شاعر بن، اور اس کا کبھی ادّعا نہ کر
صرف اک غزل کے کہنے پہ تو اکتفا نہ کر   اس طرح، ذوقِ شعر کو ہرگز فنا نہ کر
ہر صنفِ شاعری میں تو پیدا کمال کر
حاصل متاعِ زندگیٔ لازوال کر

اُستاد بن کے صاحبِ نخوت نہ بن کبھی   اُستاد بن کے، طالبِ شہرت نہ بن کبھی
اُستاد بن کے، بزم کی زینت نہ بن کبھی   اُستاد بن کے، رہینِ ندامت نہ بن کبھی
شاگردوں کو، نہ باعثِ شہرت کبھی سمجھ
اس ننگ کو، نہ موجبِ عزت کبھی سمجھ

مطلب نہیں ہے یہ، کہ غزل ہی کہی نہ جائے   یعنی، شرابِ عشق و محبت ہی پی نہ جائے
ایسی یہ شے ہے اس پہ توجہ ہی کی نہ جائے   یہ راستہ ہی بند ہو، اس پر کوئی نہ جائے
اُستاد کا لغت میں، کہیں لفظ ہی نہیں
یا، ہے لغت میں لفظ، تو معنی کوئی نہیں

حاشا، مری غرض یہ نہیں، مدعا نہیں   کیونکر کہوں، غزل کا کوئی مرتبہ نہیں
کیونکر کہوں، غزل سے کوئی فائدہ نہیں   کیونکر کہوں، غزل میں کوئی ارتقا نہیں
کیونکر کہوں، ضرورتِ استاد ہی نہیں
تحصیلِ علم کی کوئی بنیاد ہی نہیں

میں مانتا ہوں یہ، کہ غزل ہے زبانِ عشق   یہ گفتگوئے حسن ہے، یہ ہے بیانِ عشق
یہ ہے فسانہ حسن کا، یہ داستانِ عشق   یہ ہے تمام حسن، یہ روحِ روانِ عشق
اُستاد کے بغیر ہنر آئے، یہ محال
بے روشنی کے کچھ بھی نظر آئے، یہ محال

لیکن میں کیا کروں، کہ زمانہ بدل گیا   مفروضہ حسن و عشق کا کس بل نکل گیا

دَورِ جدید آ کے، نئی چال چل گیا   اب وہ قدیم طرز، وہ رنگِ غزل گیا
اُستاد کا وقار، دلوں میں نہیں رہا
پہلا سا اعتبار، دلوں میں نہیں رہا

اب، وہ غزل میں، ذکرِ جفائے بتاں نہیں   نالے نہیں، وہ آہ نہیں، وہ فغاں نہیں
وہ تنکے، وہ چمن نہیں، وہ آشیاں نہیں   وہ برق، وہ چمک نہیں، وہ آسماں نہیں
اُستاد کا وہ ناز، وہ پندار اب نہیں
شاگرد کا وہ رنگ، وہ معیار اب نہیں

اب وہ حنا نہیں، وہ ہتھیلی نہیں کہیں   وہ ناگنیں نہیں رہیں، وہ چوٹی نہیں کہیں
وہ بکھرے بال، اور وہ کنگھی نہیں کہیں   وہ یاد، وہ خیال، وہ ہچکی نہیں کہیں
اب وہ رگوں کا کھنچنا، وہ مدفن نہیں رہا
پوشیدہ مال، اور وہ جوبن نہیں رہا

میّت نہیں رہی، وہ جنازہ نہیں رہا   تعبیر میں، وہ خوابِ زلیخا نہیں رہا
موسیٰ کے ذکر میں، یدِ بیضا نہیں رہا   ایمن میں، بجلیوں کا تماشا نہیں رہا
لیلےٰ کے ساتھ، قیس نہ محمل ہے آجکل
قاتل کوئی رہا ہے، نہ بسمل ہے آجکل

سینی سی اب، وہ آگ کہاں، وہ شرر کہاں   وہ طور، وہ کلیم کہاں، وہ نظر کہاں
وہ دل کہاں، وہ قلب کہاں، وہ جگر کہاں   صندل کے ساتھ ساتھ، وہ اب دردِ سر کہاں
معدوم جو ہو، آج وہ نازک کمر نہیں
وہ کوہِ قاف، اور وہ پریوں کا گھر نہیں

اب وہ چھری نہیں ہے، وہ تلوار اب نہیں   معشوق کوئی ظالم و خونخوار اب نہیں
بوسوں کا سائل، اور خریدار اب نہیں   عاشق نحیف و لاغر و بیمار اب نہیں
وہ غنچہ جی سے چھیڑ، وہ اب پھبتیاں کہاں
مرغِ سحر کا شور، صدائے اذاں کہاں

فرضی شباب کی، وہ اب انگڑائیاں نہیں   وہ چلتی پھرتی وہم کی پرچھائیاں نہیں
اب وہ لحد، وہ قبر کی تنہائیاں نہیں   وہ ظاہری خیال کی گہرائیاں نہیں

اُستاد کا وہ رُعب، وہ اصلاح اب کہاں
شاگرد میں وہ قدر، وہ خوفِ ادب کہاں

اب، وہ محاورات کی کثرت نہیں رہی — امثال کی بیان میں حاجت نہیں رہی
خاموشی نبضیں، نزع کی حالت نہیں رہی — ان چیزوں کی غزل کو ضرورت نہیں رہی

اُستاد کا تخیلِ ناسور اب کہاں
وہ زخم خوردہ عاشقِ مجبور اب کہاں

وہ قرض کی شراب، وہ ناداریاں کہاں — تلچھٹ کا وہ سرور، وہ سرشاریاں کہاں
وہ روسیہ رقیب کی مکاریاں کہاں — ہر وقت دلبروں کی دل آزاریاں کہاں

اب، وہ عدو، وہ گورِ غریباں نہیں کہیں
وہ سازِ مرگ و تارِ رگِ جاں نہیں کہیں

اگلے مشاعروں کی وہ صحبت بھی یاد ہے — صف بندیوں کا زور، وہ قوت بھی یاد ہے
تحسینِ ناشناس کی رغبت بھی یاد ہے — "آداب عرض ہے" کی نزاکت بھی یاد ہے

بھولا نہیں ہے خندۂ پنہاں کا، وہ سماں
اب بھی نظر میں ہے رُخِ تاباں کا، وہ سماں

اک ایک شعر پر وہ تفاخر، وہ نازشیں — اُن کے سنوارنے میں وہ محنت، وہ کاوشیں
تعریف کی، ہر ایک طرف سے، وہ بارشیں — پھر بھی، وہ بار بار ستائش کی خواہشیں

پہلے تو پیش طرح سے، محفل کو خوش کیا
سہ غزلہ کہہ کے طرح میں، پھر دل کو خوش کیا

یہ اگلی صحبتیں تھیں، غزل کا یہ حال تھا — الفاظ کا بچھا ہوا ہر سمت جال تھا
مختل دماغ، اور پریشاں خیال تھا — یہ شاعری تھی، اور یہ اُس کا مآل تھا

وہ وقت اور تھا، وہ زمانہ ہی اور تھا
وہ قصّہ اور تھا، وہ فسانہ ہی اور تھا

تھی اصل بات یہ، ترا دورِ کہن تھا اور — تیرے عنادل اور تھے، تیرا چمن تھا اور
تیرا اسیرِ زلف شکن در شکن تھا اور — تیرا سبو و جامِ شرابِ کہن تھا اور
تیرا مذاق اور تھا، انداز اور تھے — نغمے ترے جدا تھے، ترے ساز اور تھے

مجبور ہوگیا تھا، فضائے زمانہ سے   معذور ہوگیا تھا، ہوائے زمانہ سے
مسرور ہوگیا تھا، ادائے زمانہ سے   مسحور ہوگیا تھا، نوائے زمانہ سے

جذبات تیرے دل کے اُبھرنے نہ پاتے تھے
جلوے تری نظر میں ٹھہرنے نہ پاتے تھے

پھر بھی جہاں ہے سب پہ تری فیض گستری   اب بھی ہیں قدرداں ترے جوہر کے جوہری
مانا، کہ اعتراض سے تو بھی نہیں بری   اے مایہ دار حسن و جمالِ سخنوری!

"سُن تو سہی، جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟
کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا، غائبانہ کیا؟"

تیرے قدیم رنگ پہ پھبتی ہیں سب   تخئیل پاسبق پہ تری نکتہ چیں ہیں سب
لگے مذاقِ شعر سے تیرے حزیں ہیں سب   خود اہلِ لکھنؤ ترے قائل نہیں ہیں سب

اُن کو، وہ طرز اور وہ تخئیل نہیں پسند
فرضی فسانۂ گل و بلبل نہیں پسند

کہتے ہیں جس کو شعر، ہے تفسیرِ زندگی   الفاظ کے لباس میں، تصویرِ زندگی
اُتری ہوئی دماغ سے، تنویرِ زندگی   طرزِ بیاں کے دام میں تاثیرِ زندگی

آورد کی، نہ قصۂ باطل کی بات ہے
کہتے ہیں جس کو شعر، فقط دل کی بات ہے

اب تو غزل میں، بادۂ عرفاں ہے موجزن   اب تو غزل میں، شمعِ حقیقت ہے ضوفگن
اب تو غزل ہے نازشِ اصحابِ علم و فن   اب تو غزل ہے وجہِ طرب، نغمۂ سخن

جذبات دل کے صاف نمایاں غزل میں ہیں
حسن و تجلیات کے ساماں غزل میں ہیں

کہتے ہیں جسکو عشق و محبت، غزل میں ہے   اب دل کا درد، درد کی لذت غزل میں ہے
اب کیف و انبساط و مسرت، غزل میں ہے   اب تو ہر ایک طرح کی جدت غزل میں ہے

ہے فلسفۂ حیات کا عنصر غزل میں آج
پنہاں ہیں طرح طرح کے جوہر غزل میں آج

پھر اس کے ساتھ ساتھ کی جو ہر نمائیاں　　عالم پہ اس کی چھائی ہوئی خوش ادائیاں
شاعر کی اس چمن میں وہ نغمہ سرائیاں　　جن پر فدا بلبل کی شیریں نوائیاں

اک تازہ روح پھونک رہی ہیں جہاں میں اب
تاثیر آرہی ہے کچھ آہ و فغاں میں اب

اے لکھنؤ! یہ تو نے سب افسانہ سُن لیا　　سب حالِ جوشِ ساغر و پیمانہ سُن لیا
سب ماجرائے لغزشِ مستانہ سُن لیا　　جو کچھ تھا راز، وہ سب بیگانہ سُن لیا

رُخ ہے ترقیوں کی طرف کائنات کا
اِس وقت ہے سوال حیات و ممات کا

صد شکر، رنگ تیرا بدلنے لگا ہے اب　　تو اصل شاہراہ پہ چلنے لگا ہے اب
دل تیرا طرزِ نَو سے بہلنے لگا ہے اب　　قیدِ رسوم سے، تو نکلنے لگا ہے اب

تو نے غزل سے آگے بڑھایا ہے اب قدم
تیرا عمل کی راہ میں آیا ہے اب قدم

نظموں کی ابتدا ہے، مبارک ترے لئے　　تخئیل انتہا ہے، مبارک ترے لئے
بیشک، یہ سلسلہ ہے مبارک ترے لئے　　یعنی، نئی فضا ہے، مبارک ترے لئے

شاید، کمالِ ذوق کی تجدید تجھ سے ہو
شاید، امیدِ دہر کی تائید تجھ سے ہو

آ، زندگی کی بزم میں، زینت لئے ہوئے　　میدانِ ارتقا میں، شجاعت لئے ہوئے
اقلیمِ شاعری میں حکومت لئے ہوئے　　دنیائے رنگ و بُو میں، محبت لئے ہوئے

ہاں، پھر دکھا دے اپنے کمالات دہر کو
مسحور کرلیں تیرے خیالات دہر کو

ہر صنفِ شاعری ہے پریشاں، ترے بغیر　　بستی ہے علم و فضل کی ویراں ترے بغیر
بزمِ ادب ہے، بے سر و ساماں ترے بغیر　　جو ہر سخنوری کے ہیں پنہاں، ترے بغیر

جلوہ دکھا دے اپنا، مہِ عید کی طرح
پُر نور کر دے دہر کو خورشید کی طرح

استاد کوئی چیز نہیں، ذی کمال بن / پندار چھوڑ، صاحبِ جاہ و جلال بن
ہاں، اپنے ملک و قوم کا تو ہم خیال بن / جس کی کوئی مثال نہ ہو وہ مثال بن
ناظمؔ کی طرح، تو نہ تصنّع سے کام لے
اُستادیوں کے وہم سے اب انتقام لے

استاد و ناظم ایک ہیں جنکی ادا ہے ایک / جن کا کلام ایک ہے، ذہن رسا ہے ایک
لے ایک، ساز ایک ہے، لحن و صدا ہے ایک / مطلب ہے ایک، ایک غرض مدعا ہے ایک
اُستاد وہ، کہ فن کا معمّا کہیں جنھیں
ناظم ہیں وہ، ہنر کا تماشا کہیں جنھیں

جن کے سخن میں، بادۂ گلفام ہو ضرور / جن کے سخن میں میکدہ و جام ہو ضرور
جن کے سخن میں صحنِ لبِ بام ہو ضرور / تشبیہ و استعارہ و ایہام ہو ضرور
کچھ ہو، مگر عروض کی انگڑائیاں بھی ہوں
صنعت کے ساتھ قافیہ پیمائیاں بھی ہوں

شاعر کو اس سے کوئی سروکار ہی نہیں / شاعر کے گلستاں میں کوئی خار ہی نہیں
نام و نمود کا وہ طلب گار ہی نہیں / اُس کے دماغ و دل پہ کوئی بار ہی نہیں
اُس کا وجود، چشمۂ حیواں لئے ہوئے
ہر سانس ہے ہزار گلستاں لئے ہوئے

استادِ فن پہ راز نہیں ہے یہ آشکار / شاعر، زمیں کا ناز ہے گردوں کا افتخار
باغِ جہاں میں، ایک ابدی موسمِ بہار / الفاظ کا رسول، معانی کا کردگار
ناظمؔ، فقط ہے حسنِ لسانی لئے ہوئے
شاعر، ہے اک جہانِ معانی لئے ہوئے

شاعر ہے زلفِ دل کو پریشاں کئے ہوئے / اُستادِ فن ہے اپنا گریباں سیئے ہوئے
شاعر، شرابِ درد و محبت پیئے ہوئے / اُستاد، قافیوں کے کھلونے لئے ہوئے
شاعر کا دل ہے آئینہ سازی کے واسطے
اُستاد صرف شعبدہ بازی کے واسطے

اے [illegible]! خدا کے لئے، ہوشیار ہو — سلطانِ علم، شاعرِ فطرت نگار ہو
اے مہرِ آسمانِ ادب، آشکار ہو — اے گلشنِ بہار، سراپا بہار ہو

آفاق میں نوائے کیانی، بلند کر — ثانی
آوازۂ فروغِ معانی، بلند کر — نشانی

ہاں، دیکھ، چشمِ مہر سے، اے ناخدا اسے — کشتی ادب کی ڈوب رہی ہے، بچا اسے
لگنے نہ پائے، تند بھنور کی ہوا، اسے — اب، قوتِ خیال سے، ساحل پہ لا اسے

تیری حدود میں، موت کا فرمان کچھ نہیں
واللہ تیرے سامنے، طوفان کچھ نہیں

اے لکھنؤ! بنی ہے زباں، تیرے واسطے — ہے حسنِ نو عروسِ بیاں، تیرے واسطے
دل، سوز و ساز کا ہے تپاں تیرے واسطے — پُرخوں ہے چشمِ کون و مکاں، تیرے واسطے

فیضِ نگاہِ لطف سے، خاروں کو پھول کر
اے لکھنؤ! یہ وصل کا تحفہ قبول کر

چراغِ عظمت

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

تھا سکوں جب کارفرما عالمِ اسباب میں — مَیں نے دیکھا ہمنشیں! پچھلے پہر یہ خواب میں
رہ گزر میں بادِ صرصر کے بصد شانِ فراغ — جل رہا ہے طاقِ زر میں ایک شہری کا چراغ
خندہ زن ہے صبح پر جسکی درخشانی سے رات — نور سے جسکے فروزاں ہے جبینِ کائنات
تند و بے پروا ہوائیں جس کو پا سکتی نہیں — چل رہی ہیں آندھیاں لیکن بجھا سکتی نہیں
دل میں یہ آیا مری محفل میں جل سکتا یہ کاش — پاس جاتا تھا کہ اک آواز آئی دُور باش
ہے یہ تیرا ہی چراغ اے شاعرِ رنگیں صفات — لیکن اس سے فیض اٹھا سکتی نہیں تیری حیات
اس کو پا سکتا نہیں تو بزمِ عشرت کے لئے — یہ تو ہے نادان تیری لوحِ تربت کے لئے
ہوگی تیری تیرہ قسمت زندگی جب خواب میں — جگمگائے گا یہ تیری موت کے محراب میں

(ماخوذ)

سلاطین اسلام کا نظام عدالت

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بی اے ایل ایل بی)

مسلمانوں کا نظام حکومت ضابطۂ قانون اور مجموعۂ تعزیرات اپنے ساتھ لیکر حدود ہند میں داخل ہوئے۔ ظاہر ہے کہ فاتحین کو زیردست اور ہزیمت خوردہ اقوام سے کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی۔ اسلئے اس جدال وقتال کے عہد میں جو کم وبیش محمد بن قاسم کے اولین جارحانہ اقدام سے لیکر غوری کے آخری حملہ تک حاوی ہے مسلمان اگر اہل ہند کے تحفظ حقوق سے بے نیاز ہوکر انکی پامالی حقوق کے درپے رہے اور اگر مفتوح ہندوستانی عدل وانصاف کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند ہونے کے بجائے فاتحین کے بے پناہ جبر وتشدد کا شکار ہوئے تو مسلمانوں کو بدیں وجہ قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ ان دنوں صرف مشرق ہی نہیں بلکہ دنیائے مغرب بھی شیطان کی حلقہ بگوش تھی اور اسکے اشاروں پر حمایت مذہب کی آڑ میں بنی نوع انسان کے گوشت وخون کا بازار گرم کیئے رہتی تھی۔

اس دوران میں بھی بعض مسلم تاجدار ایسے ہیں جنھوں نے اپنی شرع کے مطابق داد جہانبانی دی اور عمال حکومت کو مطلق العنانہ کارروائیاں کرنے سے باز رکھا۔ لیکن شریعت اسلام کی پابندی سے بھی غیرمسلم اقوام کیساتھ انصاف کی بجائے ظلم ہی ہوا۔ بات یہ تھی کہ شرع محمدی ایک ایسی سرزمین میں خاص حالات کے تحت معرض وجود میں آئی تھی جسکی فضا آتش جہالت کی امن سوز چنگاریوں سے لبریز تھی۔ لیکن اسکے برخلاف ہندوستان ان ایام میں تہذیب وتمدن کے انتہائی مدارج طے کرکے روحانیت کا گہوارہ بن چکا تھا۔ اسلئے ریگستان عرب کے قوانین کی ہوا اہل ہند کو راس نہ آنا قدرتی بات تھی۔

اگر کسی ملک کے قوانین کی ساخت وپرداخت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف النسل اقوام اپنے اپنے معیار اخلاق ومذاق کو پیش نظر رکھ کر ضروریات وقت کے مطابق وضع قوانین کی فکر میں سرگرم کار رہا کرتی ہیں۔ لیکن مسلمان فاتحین کے جہل وبربریت سے اس باریکی کو ذہن نشین کرسکنے کی توقع کرنا حماقت کے مرادف ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندو محمود غزنوی جیسے لٹیرے کی معدلت گستری کی قائل تھے چنانچہ اسکی انصاف پسندی کی صدہا حکایتیں ہنوز زبان زد خلایق ہیں۔ لیکن اسکے عارضی قیام کے باعث

مسلمانوں کے نظام عدالت پر اسکا مستقل طور پر کوئی اثر نہ ہوسکا۔ مسلمان حکمرانوں میں ایسے کتنے ہی نومسلم ہیں گے جو کسی نہ کسی وجہ سے قبول اسلام کرنے کیلئے معذرہ ہوئے ہوں۔ انھوں نے ہندو شاستروں کا تھوڑا بہت علم ہونیکے باعث وقتاً فوقتاً اسپر عمل درآمد کرنیکی کوشش کی۔ اسکا بھی جدید نظام عدالت پر گہرا اثر پڑا اور نہ مغلوں تک نے وہ بات نہ سوچی جو انگریزوں کو ابتدا ہی سے سوجھ گئی۔ اسلامی حکومت کے زوال وادبار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں نے دیگر اقوام کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی فاش غلطی کی۔

ڈاکٹر فرمنگر (FIRMINGER) کا خیال ہے کہ مغلوں کے نظام عدالت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس بارے میں اہل الرائے کے بیانات متضاد ہیں۔ یہ مشکل اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے جب ہم مسلمانوں کی آمد کے وقت کی کیفیت کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوستان" INDIA UNDER MOHOMEDAN RULE" کے مصنف مسٹر ردئی (RULE) کا قول ہے کہ اس معاملہ کی تحقیق کیلئے کافی مواد دستیاب نہیں ہوتا تاہم جسقدر ذرائع اب تک محفوظ رہ سکے ہیں۔ وہ یہ ہیں:-

(۱) ترک اور شاہان اسلام کے خود نوشت سوانح مثلاً تیمور، بابر اور جہانگیر کی تصنیفات یا اُنکے ملازمین واقارب کے بیانات مثلاً آئین اکبری اور گلبدن بیگم وجوہر وغیرہ کی تصنیفات

(۲) ہمعصر مورخین کی تصانیف جو بالعموم غیر ملکی حضرات تھے۔ یہ تمام تر کتب عربی اور فارسی زبانوں میں تصنیف ہوئیں اور انہیں سے بعض کے تراجم الیٹ اور داؤسن نے انگریزی بانوں کئے ہیں۔

(۳) ڈچ، اطالوی، فرانسیسی، انگریز اور عرب سیاحوں کے بیانات مثلاً منوچی MANNUCI سرطامس رو اور فرانسسکو پلز یریٹ FRANCISCOPELSARET وغیرہ کی تحریریں۔

(۴) شاہی فرمان، فتوے، قوانین، احکام اور مہریں وغیرہ

لیکن یہ تمامتر بیانات اسوقت تک ہرگز قابل قبول نہیں ہیں جبتک کہ تحقیق وتدقیق کی شعاعوں میں انکی تصدیق نہ ہوجائے۔ انہیں سے بعض کتب میں حقایق ووقایع کا صحیح اندراج ہونیکی بجائے فحش اور لغو بیانات موجود ہیں۔ ہولڈن نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستان کے مغل شہنشاہ" میں تیمور کی توزک کو مجموعۂ خرافات لکھا ہے۔

الیٹ اور ڈاؤسن کے نزدیک ہندوستانی تواریخوں میں برائے نام حقیقت ہے۔ منوچی کی نوشتہ کو تو اہل الرائے لغو اور واہیات قصص وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر اس عہد کا قانون

ضابطہ تحریر میں آجاتا تو شاید یہ مرحلہ آسان ہو جاتا۔ لیکن مقامی حکومتوں کے نظام میں سانیث ہونے کے باعث شاید کوئی مستقل مجموعۂ قوانین مرتب نہ کیا جا سکا جیسا کہ سر طامس رو کے بیان سے ظاہر ہے، "یہ لوگ کوئی تحریری قانون نہیں رکھتے۔ بادشاہ کا حکم ہی بمنزلہ قانون ہے۔ اسکا فیصلہ قطعی اور ناطق ہوتا ہے۔ بالعموم نہایت صبر و استقلال کیساتھ معاملات پر غور کرکے بصلہ سنایا جاتا ہے۔ معاملات کی نوعیت کے اعتبار سے سزا و جزا تجویز کی جاتی ہے خواہ اسکے کہ مقدمہ فوجداری کا ہو یا دیوانی کا۔ کبھی کبھی ملزموں کو ہاتھیوں سے روند واکر مروا دیا جاتا ہے۔ خونخوار ہاتھیوں کو خون میں لت پت دیکھ کر بادشاہ وغیرہ نہایت خوش ہوتے ہیں۔ گورنر شاہی فرمان کے مطابق صوبجات پر حکمران ہوتے ہیں۔ اور اپنی مرضی کے مطابق رعایا کے جان و مال پر ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں"۔

آگرہ کے دربار میں قاضیوں کو قانون کی کتابیں استعمال کرتے دیکھ کر فرانسسکو پلزیرٹ ڈچ جہانگیر نامی مشہور کتاب میں رقمطراز ہے کہ "قوانین پر شاذ و نادر ہی عملدرآمد ہوتا ہے۔ حکومت قطعاً مطلق العنان اور قانون و ضابطہ کی پابندی سے مبرا ہے۔ لیکن قاضیوں کے پاس قانون کی کچھ کتابیں محفوظ ضرور ہیں۔ یہ کتابیں ظاہر ہے کہ قرآن، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور دوسرے مسلم مجتہدوں کی تفاسیر وغیرہ کے علاوہ دوسری نہیں ہو سکتیں۔ اسکا مزید ثبوت پلزیرٹ کا بیان ہے جو محولہ کتابوں کی فہرست سے متعلق ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ قوانین ہر بات کا ترکی بہ ترکی جواب تھے۔ ان سے عدل و انصاف کی بجائے جذبۂ انتقام کی بو آتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ اس امر کی شہادت ہے کہ شاہان اسلام نے ملک کے طول و عرض میں۔ شرع۔ کے احکامات ہی کا نفاذ کر رکھا تھا۔

در اصل فتاوائے عالمگیری ہی صرف ایسی کتاب ہو جسے مستند ضابطۂ قانون کہا جا سکے۔ "مغل نظام حکومت" کے مصنف مسٹر سرکار کے خیال کے مطابق اورنگ زیب کے ایماء سے مسلمانوں کی جمعیت العلماء نے مرتب کی تھی۔ اور اسکی ترتیب و تکمیل پر شاہی خزانہ سے دو لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ لیکن فتاوائے عالمگیری اُس قانون کا مجموعہ نہیں ہے جو مغلوں کے عہد میں فی الواقعی رائج و نافذ تھا۔ بلکہ ان تجاویز کا مجموعہ ہے جن پر اورنگ زیب کے نقطۂ نگاہ سے ہر مسلمان بادشاہ کو عمل پیرا ہونا چاہئے تھا۔

نظام سلطنت کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانے میں جو دقتیں حائل ہیں۔ اسکی ایک وجہ یہ

بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمانی عہد سلطنت میں قانون پیشہ وکلا نہیں ہوتے تھے جو قانونی ادبیات کی تحقیق و تدقیق اور مقدمات کی باقاعدہ پیروی کیا کرتے۔ مسلمان بادشاہوں نے اس نوع کی یونیورسٹیاں نہیں بنائیں جیسی کہ ہند قدیم میں عام تھیں یا جیسی کہ خود انہیں کے دورِ حکومت میں بغداد اور دمشق میں قائم ہوئیں۔ نہ ہی ایسے اداروں کے قیام کا بندوبست کیا جنہیں ابوحنیفہ، الغزالی، شافعی، مالک، اور دیگر علماء دین کا اجتماع ہوتا۔ اور علمی و قانونی مباحث پر بحث و تمحیص ہوا کرتی۔ اکبر نے اپنے اواخر ایام میں اس قسم کے مباحثوں میں دلچسپی لینا شروع کی۔ چنانچہ جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ :۔ "میرے والد کے عہد میں ادب و قانون کے طلباء، اور علماء کی دو ہزار سے تین ہزار تک کی تعداد کو خاص خاص شہروں میں حکومت کی جانب سے وظیفہ ملا کرتا تھا۔ جو انکے مصارف کیلئے بخوبی کافی ہوتا تھا۔ ان وظیفہ خواروں میں زیادہ تر لوگ غیر ممالک کے باشندے ہوتے تھے۔ جو طلبِ علم میں اپنی پیاس بجھانے کیلئے ایران، روم، بخارا اور آذربائیجان وغیرہ دور دراز مقامات سے مور و ملخ کی طرح جود و سخا کے اس چشمۂ شیریں پر اُمنڈے چلے آتے تھے۔"

بینی پرشاد نے اپنی کتاب جہانگیر میں وکلاء کے فقدان پر اظہار طمانیت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔ "اس عہد میں ایسے لوگ نہ تھے جو ناں و نمک کیلئے اپنا ضمیر اپنا دماغ اور اپنی قابلیت اِدھر اُدھر فروخت کرتے پھرتے۔ اور جنکا وجود سوسائٹی کیلئے بارِ گراں ہی نہیں بلکہ مضرت رساں بھی تھا۔" اس سے مسلمانوں کے نظامِ عدالت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

اگر اس زمانہ کی سیاسیات عالم کو پیش نظر رکھکر مسلمانی نظامِ عدالت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سندھ میں مسلمانوں کے دورِ سلطنت میں جو رواجات عام تھے وہ ہر دو اقوام کے اتحاد و اشتراک باہمی کی پیداوار تھے۔ یہ اختلاط و ارتباط ایسا گہرا تھا کہ اب قومی تفریقات کا امتیاز کرنا بھی محال ہے۔ سرکار نے اس امر حقیقت کی بایں الفاظ تائید کی ہے :۔ "پرانے اور نئے طریق معاشرت کچھ اس طرح مخلوط ہو گئے کہ عوام کی روزمرہ زندگی سے اجنبیت کا عنصر یکقلم خارج ہو گیا۔ اور مقامی ضرورتیں بلا تردد و تکلف رفع ہوتی چلی گئیں۔ رفتہ رفتہ عدل و انصاف کے نظریے کی اہم تبدیلیوں کے باعث حسب حال نئے قوانین بھی وضع ہوتے گئے۔"

مسلمانوں کی ابتدائی یورشوں کا منشاء حقیقی حکمرانی نہ تھا بلکہ مالِ غنیمت کی ہوس انہیں کشاں کشاں بلادِ ہند میں لائی۔ غالباً اس سے بھی پیشتر اہل ہند کے تجارتی تعلقات مسلمانوں

سے قایم ہوچکے تھے۔ بعض محقیقن کا خیال ہے کہ "مسلمان حملہ آوروں کے اسلاف کا مسلک تجارتی تھا۔ اور وہ ہندوؤں سے محض کاروباری مراسم پیدا کرنے کی نیت سے ہندوستان آئے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محمدؐ کی پیدائش سے ہزارہا سال پہلے ہندوستانیوں کے یونانیوں اور عربوں سے تجارتی تعلقات مستحکم ہوچکے تھے (LAW BEFORE MOSES) "موسیٰ سے قبل قانون" کے مصنف کو بھی متذکرہ حقیقت کا اعتراف ہے۔

ہسکیون اپنی مشہور کتاب THE FIRST OF THE EMPIRES "دولِ اولین" میں لکھتا ہے کہ ہمیں دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقہ میں ایک ایسی عظیم الشان اور بلند مرتبہ تہذیب کے آثار ملتے ہیں جو چار ہزار سال قبل مسیح کی ہندو تہذیب سے بعینہ مشابہ ہیں۔ اسٹین کی تحقیقاتی مہموں کے خوشگوار نتائج سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوگئی ہے۔ وادی ذہاب (ZHOB) واقع بلوچستان کی کھدائی کا ذکر کرتے ہوئے اسٹین نے لکھا ہے کہ:-

"موہنجو دارو (MOHENJODARO) اور ہندوستانی تمدن کی یگانگت و ہم رنگی کا ثبوت مٹی کا ایک (TERRA COTTA) بت ہے جس کے ساتھ ہندی مذاہب کے دیگر مخصوص نشانات بھی موجود ہیں۔ مصورہ مجلیٰ ظروف پر جو سینگ دار بھیڑوں کی تصویریں ہیں۔ ان کی وضع قطعاً ایرانی ہے۔ لیکن بتوں کی تراش بالکل ہندوستانی اور ہندو مذہب کی علمبردار ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے اپنی عالمگیر تہذیب و شائستگی کے بیج ایران کی سرزمین میں بھی بوئے تھے۔ اسی لئے کورانہ تعصب، عدم رواداری کے باوجود مسلمان حملہ آور ہندو تہذیب کے اثرات سے محفوظ و مامون نہ رہ سکے۔

سندھ پر مسلمانوں کے جتنے حملے ہوئے انکی محرک ملک گیری کی ہوس نہ تھی۔ یہ خیال تو بہت بعد میں پیدا ہوا جبکہ محمدؐ نے اسلام کی تلقین و اشاعت شروع کی۔ اور لوگوں کو دین اسلام پھیلانے کیلئے مشتعل کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا حملہ محمد بن قاسم نے کیا اور بزور شمشیر اسلام کی نشرو اشاعت کے خیال سے کشت و خون کا بازار گرم کیا۔ لیکن جب سلطنت جم بیٹھ گئی تو اس نے غیر مسلم رعایا پر جزیہ لگایا۔ اور اُسے رسولؐ کے مجوزہ قوانین پر عامل ہونے کیلئے مجبور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جیسی کہ توقع کیجاتی تھی اُسے اپنی اُن مصروفیات میں نمایاں کامیابی نہ ہوئی۔

"الادریسی کے (ALIDRISI.) "نزہۃ المشتاق" میں درج ہے کہ قاسم نے بقائے سلطنت کیلئے مجبور ہوکر یہی قرین مصلحت سمجھا کہ ہندوؤں کا اتحاد و اعتماد حاصل کیا جائے۔

چنانچہ اُس نے بہت سے برہمنوں کو بلا کسی ضمانت کے محصل لگان کے عہدہ پر فائز کیا۔ اور صلح خود پیشدستی کر کے ہندوؤں کی جانب صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ قاسم کے اس اقدام کو اسکے آقا نے بھی پسند کیا۔ حجاج سے اس کے نام جو پیغام موصول ہوا اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ملکی قوانین کے احترام و پابندی کے ضمن میں تم نے عوام کی جو حوصلہ افزائی کی ہے قابل ستائش ہے۔ اسی سے اسلامی حکومت کی بنیاد ہے

اگر مسلمان گورنر قرآن کے احکام کی خلاف ورزی کیا کرتے تو بغداد کے حکمران ان سے باز پرس کرنے کی بجائے اُنکی پیٹھ ٹھونک دیا کرتے تھے۔ اُنھوں اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ملکی رسوم بہت قدیم ہیں اور انھیں کیسطرح مٹایا نہیں جا سکتا۔ محمد یافع "جامع الحکایات" میں رقمطراز ہے کہ نوشیرواں نے اپنے ایک گورنر کو ھدایت کی تھی کہ ہندوستانی رعیت کیلئے مناسب ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے طور و طریق، رسم و رواج اور دیگر قوانین کی پابندی کرے۔ لہذا نئے قوانین ہرگز جاری نہ کئے جائیں چنانچہ سندھ میں پرانے رواج بدستور قائم و برقرار رہے۔ اور دیہات کا قدیمی نظام ردّ و منسوخ نہ ہوسکا۔ لیکن شہروں میں مُلّاؤں کے فتووں کی سختیاں برابر محسوس کیجاتی رہیں۔ الیٹ اور ڈاؤسن نے ساری کیفیت یوں بیان کی ہے:۔ "سندھ جیسے ملک میں جہاں کی بیشتر آبادی اپنے آبائی مذہب کی پیرو تھی عدالتیں نہیں تھیں۔ جہاں مظلوم رعایا نسلی قضیوں کی دادخواہی کر سکتی۔ ہر وہ سردار جو ذرا بھی آزاد و مختار تھا موت تک کی سزا دے سکتا تھا۔ امیروں کو بھی یہی حقوق حاصل تھے لیکن وہ لوگ ضابطہ کی کچھ نہ کچھ پابندی ضرور کرتے تھے۔ حالانکہ انکے ہاتھوں انصاف کا خون ہونا ایک معمولی بات تھی۔ امیروں کے ہاں قاضی مقرر ہوتے تھے۔ جو قرآن کے احکام کو مشعل ہدایت مان کر مقدمات فیصل کیا کرتے تھے۔ قاضی ذرا سے لالچ میں اپنے ضمیر کو فروخت کر سکتے تھے۔ جس سے ہندوؤں کی سخت حق تلفی ہوتی تھی۔ سیاسی نوعیت کے جرائم کی سزا امیر خود تجویز کرتے تھے۔ لیکن جائداد و املاک اور وراثت وغیرہ کے جھگڑے بکھیڑے ہندو اپنی پنچائتوں میں خود طے کیا کرتے تھے فی الحقیقت ذات برادری سے خارج کئے جانے کا ڈر ہی ایک ایسی چیز تھا جو ہندوؤں کا محافظ تھا۔ ورنہ عام قاضیوں کی عدالتیں تو تبلیغ اسلام کا ہی نہایت موثر ذریعہ تھیں۔ غیر مُسلم ملزمان کو قبولِ اسلام کا پروانہ بڑے سے بڑے جرم کی پاداش سے مخلصی دلا سکنے کو کافی تھا۔ ہندوؤں کا گھوڑے پر چڑھنا قانوناً ممنوع تھا۔ گھوڑے کی سواری کی ہندوؤں کو صرف اسی وقت اجازت تھی جبکہ وہ صاحبِ ریش ہوں اور اسلامی جامہ زیب تن کرنے کو تیار رہوں مسلمانوں کے خیال میں ڈاڑھی لگا لینے ہی سے آدمی مسلمان ہوسکتا تھا۔ ہندوؤں کے جلوس اور مذہبی جلسے خلاف قانون سمجھے جاتے تھے۔ انھیں باجہ تک بجانے کی اجازت نہ تھی۔

متذکرہ کیفیت سے ڈاکٹر بارنس (Barnes.) نے حسب ذیل نتائج اخذ کئے ہیں:-
(۱) مسلمانوں کے مسطورہ رویّہ کے باعث فاتح اور مفتوح، حاکم اور محکوم میں کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی
(۲) ہندو مسلمانوں سے ہمیشہ خائف و متنفر رہتے تھے۔ انھیں حکام کے انصاف پر اعتماد نہ تھا؛ لیکن بارنس کی مذکورہ بالا رائے ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ اور یہ اسلئے کہ انگریز مغلوں کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور انھوں نے اس وقت ملک کی جو حالت دیکھی اسی کے مطابق دیگر سلاطین اسلام کے نظام عدالت کے متعلق اپنی رائے قائم کرلی۔ لیکن انھوں نے اس بات پر مطلق غور نہ کیا کہ جو مسلمان سندھ کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے وہ عربی النسل تھے۔ اور اپنا جداگانہ نظام حکومت ساتھ لائے تھے۔ اُن پر اسوقت تک یونانیوں کا کوئی اثر نہ پڑسکا تھا۔ عربوں کی انصاف پسندی مسلم تھی۔ لیکن مغل اس کے برخلاف عیاش، تنگ دل اور ناخواندہ تھے۔

عربوں کو وقتاً فوقتاً خلیفہ بغداد سے ہدایات موصول ہوتی رہتی تھیں۔ مغل بالکل مطلق العنان تھے۔ خلیفہ کے مشورے بڑے بڑے سیاستدانوں اور علماؤں کی روشن خیالی، دوراندیشی، اور بالغ نظری کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اسی لئے مغلوں کی معدلت گستری اور اولین فاتحین اسلام کی عدل پروری میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اُمّی و ناخواندہ مغل تعصب مذہب کے بے پایاں جوش سے سرشار تھے ان کے پیشرو حکمران سندھ آتے بہت جلد علم و دانش کی روشنی میں کھوچکے تھے۔ مغل ہندوستان میں آنے سے پہلے کابل اور قندھار میں لڑتے بھڑتے اور دیگر سرحدی قبائل کیطرح لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ لیکن عرب اپنی چڑھائیوں سے پیشتر اپنی خوش معاملگی اور دیانتداری کی ساکھ ہندوستان کے بازاروں میں قائم کرچکے تھے۔ عربوں نے اپنی گمراہی کے ایام میں بھی تلاش حق کی ساعیِ جمیلہ کو خیرباد نہ کہا۔ انھیں ہمیشہ یہی فکر دامنگیر رہی کہ جہانتک ہوسکے کسی فرد واحد پر بلا امتیاز ملت بیداد نہ ہونے پائے جسطرح ممکن ہو اس کے حقوق کی حفاظت کیجائے۔ محمد قاسم کے بارے میں لکھا ہے کہ اُس نے برہمن آباد کے انتظام و انصرام کیلئے اور وزیر اور دیگر اہلکار مقرر کئے۔ اور ملک و جائداد کے متعلق تاجروں کے چار ارکین کی مجلس کو کلی اختیارات سونپ دیئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قاسم اور اسکے جانشینوں کے عہد میں سندھ کا جو حال تھا وہ مغلوں کے زمانہ جیسا نہ تھا۔

جب مغلوں نے اپنی حدودِ سلطنت کو وسعت دی تو حالات بالکل تبدیل ہوگئے اکبر اور جہانگیر نے بھی اوائل حکومت میں علاء الدین کیطرح اسی بوسیدہ نظام کی نشر و اشاعت کی۔

مغل شمال و مغرب کی جانب سے جو نظام اپنے ساتھ لائے وہ اتنا بلند و بالا نہ تھا جس کا مظاہرہ سندھ میں ان سے پیشتر ہو چکا تھا۔ انھوں نے ترکوں، ایرانیوں اور عربوں سے جو کچھ سیکھا تھا اسی کے برتے پر حکومت ہند کا بار گراں اپنے سر پر لے لیا تھا۔

مسلمان حملہ آور جو شمال و مغرب کی سمت سے ہندوستان آئے انکا مدعا لوٹ مار، قتل و غارت گری اور بزور شمشیر اسلام کی اشاعت کرنا تھا۔ یہ لوگ ملک میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہونے کے بجائے چند روز شر برپا کر کے اپنے اپنے وطن کو واپس ہو جاتے تھے کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے مفتوحہ علاقوں میں اپنے سرداروں کو ماتحت حکمران مقرر کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ ایک نئی اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ سکیں۔ ان لوگوں کا طریق حکومت بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ وہ اپنے وطن میں دیکھتے چلے آئے تھے اور جس کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ سرکار کا مقولہ ہے کہ ہمارے ترکی فاتح مصر اور عراق کا نظام اپنے ساتھ لائے۔

مغل بادشاہوں نے اپنے دربار میں ہمیشہ ایرانیوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ اور سلطنت کا سارا کاروبار انکے سپرد کر دیا خود اورنگ زیب معترف ہے کہ ایرانی ہندوستانی مسلمانوں سے بدرجہا بہتر ذہین اور قابل ہیں۔" مغلوں کی کامیابی کا راز ہندوؤں کی خانہ جنگی اور شیعہ مسلمانوں کے اتحاد عمل میں مضمر ہے۔ سترھویں صدی میں صفوی شاہوں کا زور و اقتدار زوال پذیر ہوا۔ اور ایران کی عنانِ حکومت انکے ہاتھ سے نکلتی دکھائی دینے لگی۔ سنیوں نے اس موقع کو غنیمت جانکر اورنگ زیب کو شیعوں کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا۔ ان ریشہ دوانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اورنگ زیب شیعوں کی بیخکنی پر آمادہ ہو گیا۔ اور سلطنت مغلیہ اہل تشیع کی مخلصانہ اعانت سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو گئی۔ اورنگ زیب کو شروع ہی سے تخت حاصل کرنے اور اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مذہب کی پناہ لینا پڑی تھی۔ لیکن اب شیعوں پر جو بے پناہ مظالم کئے گئے اسی کے کفارہ میں اُسے خود کو سنیوں کے رحم و کرم کے سپرد کر دینا پڑا۔ جنھوں نے اس کے کان بھر بھر کر اس کی غیرتِ اسلامی کو جوشِ دیوانگی کی حدود میں داخل کر دیا۔ اور ایک دن وہ آیا کہ اسی ادھیڑ بُن میں سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر کر رہا۔

تاریخ شاہد ہے کہ مغل بالعموم نہایت عیاش اور پست اخلاق تھے۔ انھیں کبھی کبھی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کٹر مسلمان بھی بننا پڑتا تھا۔ ان کی عیاشانہ ذہنیت کا انکی یکتائے روزگار یادگاریں جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ واقعات بتا رہے ہیں کہ ان کی لاثانی تعمیرات ان کی

تہائے حُسن پرستی کی غمازہیں جنانچہ تاج جیسے روضہ کا وجود بھی شاہجہاں کے جذبۂ عشق کا رہین ہے۔ اکثر ہندو خواتین کو ملقہ اسلام میں منسلک کرنے کے بہانہ سے حرم میں داخل کر لیا جاتا تھا۔

فتاوائے عالمگیری کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو قوانین عہد عالمگیر میں رائج تھے ان سے ہندوؤں پر کیسی کیسی سختیاں ہوتی ہونگی۔ مغلوں کا دیترہ تھا کہ وہ کرسئ عدالت پر بیٹھ کر ہمیشہ قرآن کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ لیکن وہ قوانین جو ریگستان عرب میں خاص حالات کے تحت اور ایک جداگانہ معیار اخلاق اور طرز معاشرت کے موافق مرتب کئے گئے ہوں۔ وہ اہل ہند کو کس طرح راس آسکتے تھے اور وہ بھی اسوقت جبکہ ہندو ہزاروں برس سے اپنا قانون اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن یہاں اس کی پرواہی کسے تھی؟

مسلمان بادشاہوں کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی قرآن کے قوانین ہند میں عام نہ ہوسکے ملیسن (Malleson) اپنی مشہور تصنیف "اکبر" میں بابر کے بارے میں رطب اللسان ہے۔ بابر جیسا بیدار مغز سیہ سالار بھی ایک لمحہ کیلئے یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ قرآن کے ان قوانین کی پابندی ترک کردے جن پر اس کے متقدمین افغانی جان دیتے تھے۔ بابر کی وفات کے بعد بیرم خاں نے بھی اسی غلطی کا اعادہ کیا۔ ایشری پرشاد اپنی "ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان" نامی کتاب میں لکھتے ہیں کہ فیروز کی نظر میں قانون اور انصاف کا مطلب تعصب اسلام کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تیمور کی توزک شاہد ہے کہ وہ ہندوؤں سے جبراً قرآن کی تعظیم اور شرح محمدی کے احکام پر عمل کرانا چاہتا تھا۔

ہندوؤں کے قوانین سے مسلمان ہمیشہ نفرت ہی کرتے رہے۔ ذیل کے ایک مستند تاریخی واقعہ سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ سدی مولا اور قاضی جلال الدین بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہوکر فیروز خلجی کے حضور میں پیش ہوئے۔ لیکن جب ان کے خلاف کوئی گواہ نہ ملا تو بادشاہ نے برہان پور کے میدان میں آگ مشتعل کرائی تاکہ ملزم آگ میں سے گذر کر اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کریں۔ واضح رہے کہ یہ وہی اگنی پریکشا ہے جس کا رامائن میں مذکور ہے۔ لنکا سے واپسی پر سیتا جی کیلئے بھی یہی سزا تجویز ہوئی تھی۔ جب شاہی مجرم آگ کی جانب بڑھے تو بادشاہ نے انہیں روک کر قاضیوں سے دریافت کیا کہ آیا یہ سزا خلاف شریعت تو نہیں ہے؟ جواب ملا کہ ان کافروں کے یہاں اس کا رواج ہونے کے باعث

یہ تجویز اسلام کے منافی ہے۔ چنانچہ جلال کو بدایوں میں اور مولا کو شاہی محل میں مقید کردیا گیا
(فرشتہ)

لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ یہ نظام صرف دارالسلطنت اور حکومت کے دیگر صدر مقامات ہی میں کامیاب رہ سکا۔ جہاں حکمرانوں کا اثر و اقتدار اور رعب و دبدبہ عام طور پر محسوس کیا جاتا تھا۔ دور دراز کے مقامات اور دیہی رقبہ میں اس کی دال نہ گل سکی۔ اس فقدان و کمزوری کا سبب یہ تھا کہ حکمرانوں کی رہنمائی غیر ممالک سے کی جاتی تھی اور مقامی حکومتوں کا دیہاتوں میں کوئی خاص اثر نہ تھا۔ آمد و رفت کے وسائل قطعاً ناکافی و نامناسب تھے علاوہ ازیں پرانی تہذیب کی دلدادہ اور زیور علم و فضل سے آراستہ ہندو قوم اس نئی طرز معاشرت و تہذیب کے گورکھ دھندے سے فطری طور پر متنفر تھی۔ ملک کا عرض و طول بھی اس نظام کو مستحکم بنانے میں حائل تھا۔ ان تمام دقتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی مسلمان بادشاہ کو گھڑی بھر کیلئے بھی رعایا کی بغاوت کے خطرے سے فرصت نہ ملی۔ اور اسلامی حکومت کے قدم مستقل طور پر نہ جم سکے۔

مسلمان بادشاہ مطلق العنان تھے اور ایک اجنبی و غیر قوم صرف اس لئے ان کے تابع تھی کہ وہ تاب مقاومت نہ لاسکتی تھی۔ ہندوؤں کو نظم حکومت میں منسلک کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ فاتح اجنبی و بیگانہ کی حیثیت سے آئے اور غیروں کی طرح رہتے رہتے چلے گئے۔

بابر اور بعدہٗ اس کے جانشینوں نے محسوس کیا کہ ملک پر شرع اسلام کے ماتحت حکومت کرنا محال ہے۔ انھوں نے اپنے طرز عمل میں بعض ضروری تبدیلیاں کرنے کی سعی بھی کی۔ رواداری سیاسی ضرورت تھی اور حکومت کا وقار قایم رکھنا اسوقت تک مشکل تھا جبتک کہ قوانین اسلام کی پابندی کا خیال ترک نہ کردیا جاتا۔

"ڈاکٹر ہولڈن نے اس حقیقت کو یوں پراگندہ نقاب کیا ہے: "اکبر نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ کثیر التعداد ہندوؤں کو قرآن کے زیر اطاعت نہیں رکھا جاسکتا۔ چنانچہ اس نے ایک نیا میدان عمل تلاش کیا۔" مگر اکبر کی ان مساعی جمیلہ سے سنی مسلمان برہم ہوگئے۔ اور انھوں نے جہانگیر کو اکبر کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرکے اس کے دست راست کو قتل کرادیا۔ اکبر کی رواداری کے متعلق جہانگیر رقمطراز ہے کہ "انھوں نے بت شکنی کو حکماً بند کردیا

جب میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو جواب ملا کہ ملک کی پانچ حصہ آبادی ہندوؤں اور غیر مسلموں کی ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں اپنی رعایا کو تہ تیغ کرادوں؟ بابر کی آمد پر ارسکن (Erskine) لکھتا ہے کہ شمالی ہند نے اپنے قدیمی نظام کو برابر قایم رکھا اور ان کا کاروبار اسی ڈھرے پر چلا گیا۔ رعایا کو اس کی وفاداری کا نعم البدل یہ ملا کہ حکومت نے قدیم رواج کی پابندی میں اس حد تک کوئی دخل نہ دینا ہی مناسب سمجھا جہاں تک وہ اسلامی قواعد و ضوابط کے منافی نہ ہوں۔ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ مسلمانی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب جو برائے نام مسلمان بادشاہ رہ گئے ان کی حکومت محلوں کی چہار دیواری ہی کے اندر مقیّد رہی۔

"داستانِ خموش"

(برج لال تگی رعنا۔ راولپنڈی)

غنچۂ گلشن میں ہے دہانِ خموش
اور سوسن ہے اک زبانِ خموش

بات دل کی کہی نگاہوں نے
اُف محبّت کی یہ زبانِ خموش!

داغ دل کا ہے شمع کی تصویر
عہدِ الفت کا اک نشانِ خموش

میری حالت کو دیکھکر بولے
یہ ہے پردہ یہ داستانِ خموش

درد دل میں ہے اشک آنکھوں میں
یہ ہی گونگے کی اک فغانِ خموش

میرے خونِ جگر کا ہے شاہد
رنگ لالہ بھی اک بیانِ خموش

کون رعنا۔ وہی گہر صورت
فکر میں غرق اک جوانِ خموش

موسمِ گرما اور بازار کا دن

(از شاعرِ اعظم حضرت جوش ملیح آبادی)

دوپہر بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور — خون کی پیاسی شعاعیں، صبح فرسا لُو کا زور
آگ کی رَو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب — تُند شعلے، سُرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب
گاڑیاں، گھوڑے، مویشی، آندھیاں، گرد و غبار — عورتیں، بچے، جواں، ڈلیے، قطار اندر قطار
عورتوں کے سر پر، کاندھوں پہ بچے، مٹکے — ہر نظر گردش میں مٹی کے کھلونوں کے لئے
آگ کی ہلچل، دُھند کی یورشیں، بجلی کی رَو — کملیوں پر سرخ چاول، ٹاٹ کے ٹکڑے پہ جَو
بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے — ہر نفس اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرّات سے
دل پریشاں، جسم مرجھائے ہوئے، رُخ ہیں نڈھال — جھگڑوں کی چین پیشانی، بگولوں کا جلال
قافلے گردش میں، چیلوں کی صدا سنتے ہوئے — چلچلاتی دھوپ کی رَو میں چنے بُھنتے ہوئے

سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں جس طرح سے بے مروت کی نگاہ

انسان

کوئی جا کر یہ کہدے افسرِ مردم شماری سے — عجب کیا ہے کہ میرا عقدۂ خاطر بھی کھل جائے
کہ از راہِ کرم مجھ نیم جاں کو بھی خبر کر دے — اگر اس کوچہ گردی میں کوئی انسان مل جائے

(جوش ملیح آبادی)

برقؔ مرحوم

(از شیوکماری دیوی صاحبہ دختر حضرت جگر بریلوی)

حضرت رواںؔ کی بے وقت موت سے جو صدمۂ جانکاہ دنیائے ادب کو پہنچا تھا وہ ابھی کم نہ ہونے پایا تھا کہ جناب برقؔ کی دائمی مفارقت سے صد گونہ سوز و گداز کے ساتھ تازہ ہو گیا اسے قوم کی بدبختی کہیے یا ستم روزگار کہ سال بھر کی قلیل مدت میں دو ایسے مایۂ ناز شاعر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ افسوس محفلِ ادب سے ایک ایسا شخص اٹھ گیا جس کی جگہ پُر نہیں ہو سکتی۔

منشی مہاراج بہادر برقؔ کے بزرگوں کا وطن سکیٹ ضلع ایٹہ تھا لیکن کئی پشتوں سے آپ کے بزرگوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کے دادا منشی خوب چند آخری شاہ دہلی کے زمانہ میں شاہی وکیل تھے۔ والد کا نام منشی ہرنراین المتخلص بہ حسرت تھا۔ جناب برقؔ کا سنہ پیدایش ۱۸۸۴ء تھا۔ ذوقِ شاعری ابتدائے عمر سے تھا مگر جب تک آپ نے انٹرنس نہ پاس کر لیا آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھنے سے باز رکھا۔ غالباً اس کا سبب یہ ہوگا کہ اُس زمانہ میں شاعری کا پایہ معیارِ تہذیب سے گر چکا تھا، اور وہ رکیک و گندے مضامین کی جولانگاہ بن گئی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں آپ کے والد ماجد نے رحلت فرمائی اور بارِ خانہ داری آپ کو اُٹھانا پڑا جس کے باعث تعلیم نا تمام رہ گئی۔ لیکن آپ نے اُمید کا دامن نہ چھوڑا اور ہمت نہ ہاری گھر پر مطالعہ جاری رکھا۔ آخر کار ۱۹۱۶ء میں منشی فاضل کے دوسرے سال ایف۔اے اور ۱۹۱۸ء میں بی۔اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی طبعی ذہانت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تین سال میں تین امتحانات پاس کر گئے۔ ۱۹۲۲ء میں سب آرڈینیٹ اکاؤنٹس سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ہندوستان کے ممتاز شعرا میں آپ کا شمار تھا اور اکثر اصحاب آپ سے اصلاحِ سخن لیتے تھے، خودداری جو شاعروں کا خاصہ ہونا چاہیے آپ کی طبیعت میں حد سے زیادہ تھی آپ نے کسی سے تلمذ حاصل کرنے کا احسان نہ اُٹھایا۔ ابتدا میں چند غزلیں جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی

کو دکھائیں، لیکن یہ بھی بار رہا۔ بقول جناب جگر

نہ کرے ترک پیروی جب تک — راہبر راہبر نہیں ہوتا

آپ کا مجموعۂ کلام "مطلع انوار" اردو ادب میں ایک نیا اور نادر اضافہ اور طرز جدید کی شاعری کا مخزن ہے۔ تاثیر، فصاحت، سلاست، نادر تشبیہات، روانی، زبان کی شستگی و برجستگی آپ کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نیچرل نظموں میں "کرمک شب تاب" نہایت دلکش نظم ہے۔ زبان نہایت نفیس و سلیس ہے۔ اس پر نادر اور لطیف تشبیہات نے نظم کی آب و تاب کو دوبالا کر دیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

خندۂ جام بلوریں ہے ہماایں تپاں — گرم پرواز ہے یا پر تو شاخ مرجاں

محو پرواز ہے لعل یمنی ہے شاید — اڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید

ہیرے کی کنی کس قدر برمحل اور نادر تشبیہ ہے، اسی طرح ذیل کے شعر میں قطرۂ سیماب ہے۔

برق رفتار کا یا جلوۂ بیتاب کہوں — اس کو اڑتا ہوا اک قطرۂ سیماب کہوں

⁂

تجھ میں اے کرمک شب تاب چمک نور کی ہے — چشمک برق سے نسبت ہے مگر دور کی ہے

چشمک برق سے دور کی نسبت کس قدر معنی خیز ہے جو تخیل کو منتہائے تنویر تک پہنچا دیتی ہے

جلوۂ حسن ترا پردے سے مانوس نہیں — تو ہے وہ شمع کہ شرمندۂ فانوس نہیں

تیرے جلوے سے منور ہوا صحن گلشن — تو ہے وہ شمع کہ ہے موج ہوا پر دوشن

"حسن فطرت" میں جناب برق نے ثابت کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز حسن سے لبریز ہے، ذرہ سے آفتاب تک اسی ایک ذات حقیقی کا جلوہ پرتو افگن ہے۔ اگر آنکھیں ہوں تو کوئی شے حسن سے خالی نہیں ہے

اک جلوہ گاہ حسن ہے یہ عالم اسباب — نظارہ بہ اماں ہے رخ مہر جہاں تاب

ہے چادر مہتاب کہ اک نور کا سیلاب — ہر اختر تابندہ ہے رشک در نایاب

ہے وسعت داماں خلا حسن سے لبریز

آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حسن سے لبریز

رات میں ماہ کامل کی چاندنی کی چادر کا ساری دنیا پر پھیلا ہونا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور کے دریا میں سیلاب آگیا ہے جو کل کائنات پر امنڈتا چلا آتا ہے۔ کیسا منور خیال ہے۔

ہے چادرِ مہتاب کہ اک نور کا سیلاب

جھرمٹ میں ستاروں کے ہے کیا شانِ جمالی　　کس درجہ ہے دلکش شفقِ شام کی لالی
اُلجھے ہوں کہ بچھڑوں میں لپٹی ہوئی ڈالی　　دنیا میں کوئی چیز نہیں حُسن سے خالی
مینائیِ امواج میں بھی حُسن نہاں ہے
یہ جنبشِ پیہم کا سماں اور کہاں ہے

اس بند میں لفظ "جھرمٹ" نے ایک ایسا سماں پیدا کر دیا کہ کالی رات میں ستاروں کے جھرمٹ اور ان کے جھلملانے کا نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے جس کی تکمیل میں "شانِ جمالی" مزید اضافہ کرتی ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ اگر دل میں حسن پرستی کا ذوق ہو تو عالم کی ہر تصویر اور شکل حُسن ہے زمین سے آسمان تک نور ہی نور ہے، ہر ذرّہ خاتمِ قدرت کا نگیں ہے ؎

دل میں ہو اگر آرزوئے حُسن پرستی　　ہے عالمِ تصویر صنمخانۂ ہستی
ہے فرش سے تا عرش یہاں اوج کہ پستی　　انوار سے معمور ہے یہ حُسن کی بستی
جو ذرّہ ہے وہ خاتمِ قدرت کا نگیں ہے
جو شکل ہے اس آئینہ خانہ میں حسیں ہے

ذرّہ کو خاتمِ قدرت کا نگیں کہنا کس قدر نازک تخیل ہے۔

تجلّیٔ سحر میں طلوعِ آفتاب کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:-

تاروں کی اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں　　گُل ہیں چراغ مہرِ منوّر کے سامنے
چھٹتی ہیں ماہتاب کے رخ پر ہوائیاں　　کیا رنگ جم سکے خورِ خاور کے سامنے

ایک ایک لفظ ایسا جامع اور مانع ہے کہ اپنی جگہ سے اُٹھائے نہیں اُٹھ سکتا۔ سورج نکلنے سے چاند کی روشنی نہیں پھیکی پڑ گئی بلکہ آفتاب کی آب و تاب دیکھ کر اُس کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور تاروں کی رنگینی بھی غائب ہو گئی

جناب برق کے شعر میں معنی کا ایک دریا موجزن ہے جو حالت متذکرۂ بالا شعر میں بیان کی گئی ہے۔ اب دیکھیے اُس کا اثر کائنات کی اشیاء پر کیا پڑتا ہے ؎

زرتار ہو گئی ہیں پہاڑوں کی چوٹیاں　　سیماب پیرہن ہے ہر اک موجِ آبشار
پانی میں کوندتی ہیں شعاعوں سے بجلیاں　　غنچے حباب کے ہیں لبِ آبِ زرنگار

❊　❊　❊

ہیں نغمہ زن طیور سحر خیزیاں ہیں   محو سپاس حق میں ہیں طاعت گزار صبح
شبنم کی ہے شراب گلوں کے ایاغ میں   کتنی سرور خیز ہے سیر بہار صبح

* * *

انگڑائی لے کے سبزۂ خوابیدہ جاگ اٹھا   اترا خمار نرگس بدمست خواب کا
سورج مکھی کا اختر قسمت چمک گیا   کھولی جو آنکھ دیکھ کے منہ آفتاب کا

ایک ایک لفظ سے طلوع آفتاب کا منظر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ نسیم صبح سے پیڑوں کے آہستہ آہستہ جھومنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بدمست خواب کا خمار اتر رہا ہے اور سبزۂ خوابیدہ انگڑائی لے کے جاگ رہا ہے۔

صبح کے وقت، نسیم کا چلنا، پھولوں کا کھلنا، چڑیوں کا چہچہانا، یہ سب مناظر دل پر ایسا خوشگوار اثر ڈالتے ہیں کہ رنجیدہ طبیعتیں بھی ایک لمحہ کے لئے اپنا غم بھول کر قدرت کے دلکش مناظر دیکھنے میں محو ہو جاتی ہیں۔ نسیم کا ایک تازگی بخش جھونکا دلوں کو مست کر دیتا ہے۔ اس عالم کی منظر نگاری کا نمونہ "نسیم صبح" ہے۔ نسیم سے خطاب کرتے ہیں:۔

غم غلط کن زہے لئے خاطر افسردہ ہے
تیرا جھونکا تازگی بخش دل پژمردہ ہے

اور بند ملاحظہ ہوں:۔

تیری پیاری شوخیاں بھی کیسی دل آویز ہیں   گدگدانے سے ترے غنچے تبسم ریز ہیں
روح اے مشک بو تیری سرور انگیز ہیں   وہ شگوفے بھی ہیں خنداں جو ابھی نوخیز ہیں
تو نے چھیڑا نیم وا کلیوں کی باچھیں کھل گئیں
تیرے دم سے ان کو منہ مانگی مرادیں مل گئیں
تو چمن میں آئی عشق گل کا دم بھرتی ہوئی   چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی   پھر وہی برتیں ادائیں روز کی برتی ہوئی
گل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

کیسی صحیح منظر نگاری ہے، خصوصاً دوسرا بند تو لاجواب ہے۔ محاکات اسی کو کہتے ہیں۔ لفظ لفظ سے نسیم کی مستانہ اداؤں کا نقشہ کھنچ جاتا ہے: "چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی۔"

پہلے تو بادِ سحری آہستہ چلی پھر وہی روز کی برتی ہوئی ادائیں برتیں یعنی گلوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا" موزونیِ الفاظ اور صحیح منظر نگاری کے علاوہ ہر شعر کے پڑھنے سے موسیقی کا انداز پیدا ہوتا ہے ؎

لطفِ سیرِ بوستاں تجھ سے دوبالا ہو گیا　　تیری خوشی سے نیا رنگِ تماشا ہو گیا
شاخِ گل کو تازیانہ تیرا جھونکا ہو گیا　　اس طرح لچکی کہ اک اندازِ پیدا ہو گیا

قطرۂ شبنم رخِ گل سے ڈھلک کر گر پڑے
جیسے ساغر سے مے احمر چھلک کر گر پڑے

کیا خوب شعر ہے "شاخِ گل کو تازیانہ تیرا جھونکا ہو گیا" "اس طرح لچکی کہ اک انداز پیدا ہو گیا" بعض اوقات ایسا لفظ کسی شعر یا مصرعہ میں آجاتا ہے جس سے اُس حالت کا پورا نقشہ یاد آجاتا ہے جو شاعر نے بیان کی ہو۔ اسی کی ایک مثال لفظ "لچکی" ہے جس سے شاخِ گل کا جھونکا آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ آخر میں نسیم سحری خوابیدۂ کائنات کو پیغامِ بیداری دیتی ہے ؎

لے چکے انگڑائیاں۔ بس گیسوؤں والو اُٹھو!
روز کا تڑکا ہوا، اے شب کے متوالو اُٹھو!

بسنت رُت پر جناب برق نے چھ نظمیں لکھی ہیں، ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ بیان کرنا طوالت ہے اس لئے ہر نظم کے وہ اشعار جو دلکش، لطف انگیز اور قابلِ تحسین ہیں پیش کئے جائیں گے۔ بسنت کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب خزاں ختم ہو جاتی ہے اور بہار کی آمد شروع ہو جاتی ہے، نئی نئی کونپلیں نکلتی ہیں۔ چاروں طرف سرسوں کے کھیت لہلہاتے نظر آتے ہیں، آموں پر بور آجاتا ہے، طرح طرح کے پھول کھلتے ہیں جن کی بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیل کر دل و دماغ معطر کرتی ہے۔ ٹیسو الگ جنگلوں میں آگ لگاتا ہے۔ جاڑے کا شباب ڈھل چکتا ہے اور گلابی سردی ہوتی ہے۔

بسنت مست کیا جہاں میں آئی پیامِ دورِ بہار آیا　　نظر ہے مستِ شرابِ جلوہ کہ رُخ گل پر نکھار آیا
اچھوتی کلیوں کے بھی لبوں پر تبسم بیقرار آیا　　نئے شگوفے کھلا کے گویا یہ موسمِ خوشگوار آیا

نصیب سبزہ کے جاگ اُٹھے ہیں ستارہ ہے اوج پر چمن کا
جما ہے نقشہ روش روش پر شگفتہ پھولوں کی انجمن کا

سرسوں کے کھیت کی دلفریبی و دلکشی ملاحظہ ہو:-

سماں ہے سرسوں کے کھیت کا یہ کہ زعفراں زار کھل رہا ہے
فضا میں کندن دمک رہا ہے سرور آنکھوں کو مل رہا ہے

یہی خیال دوسری نظم میں یوں ظاہر کیا ہے:-

سرسوں کے کھیت کیا ہیں کیسر کی کیاریاں ہیں
قدرت کی، خاک پر یہ زیبا نگاریاں ہیں

یا

پھولی ہوئی سرسوں ہے تابندہ شرارے ہیں — یا خاک کے دامن میں چھٹکے ہوئے تارے ہیں

دوسرا بند ہے:-

کہاں ہے سرو کی سرد مہری شباب جاڑے کا ڈھل چکا ہے — ہوا ہے آغاز دورِ نو کا زمانہ کروٹ بدل چکا ہے
کھلی ہے خوابیدہ چشمِ نرگس روش پہ سنبل سنبھل چکا ہے — قبائے غنچہ ہے چاک خوردہ کلی کا دامن نکل چکا ہے
خزاں الم سے چراغ پا ہے کہ آتشِ گل بھڑک رہی ہے
بہار کی جو ہے آمد آمد چمن کی قسمت چمک رہی ہے

ایک اور بند ملاحظہ ہو:-

کھلے ہیں ٹیسو کے پھول بن میں ضیا فگن ہو شفق رنگ — جمے ہیں قدرت نے سبز شاخوں پہ شیشہ ہائے شرابِ احمر
جب ان پہ پڑتی ہیں ہلکی ہلکی شعاع سیمیں ماہِ انور — مرقعِ شانِ دلفریبی دکھاتا ہے جاں فروز منظر
لگائے صحرا کو لعل کس نے جو وجہ زیبائشِ چمن ہے
نہالِ فطرت کے فیض سے ہر زمین گلزارِ ہو کر بن ہے

کس قدر دلکش تشبیہیں ہیں کس قدر رنگین خیال ہے۔ الفاظ کی شوکت سے تصویر جمالی میں ایک جلالی شان پیدا ہو گئی۔ دوسری نظم کی ایک بیت ہے ؎

گلہائے اشرفی کا سکہ چلا چمن میں
شبنم نے ہر کلی کے موتی بھرے دہن میں

کیا خوب شعر ہے، کیسی بلند پایہ تشبیہ ہے "شبنم نے ہر کلی کے موتی بھرے دہن میں"
بہر حال بسنت رت میں ہر طرف قدرت کی شگوفہ کاری کا ظہور ہے ؎

شگوفہ کاری فطرت کا ہر طرف ہے ظہور — شگفتگی سے چمن زاید ہر ہے معمور
وفورِ جلوۂ گل سے برس رہا ہے نور — نگاہیں کیف میں ڈوبی ہوئی ہیں مست سرور

کلی کلی گرہ رنگ و بو ہے گلشن میں
بسنت رت میں یہ شانِ نو ہے گلشن میں

گنگا جی کی دلکش لہریں ملاحظہ ہوں:-

رنگت میں چاندنی سے اجلا بدن ملا ہے — آبِ رواں کا ہلکا سا پیرہن ملا ہے
ہر موج کا ہے دعویٰ مہتاب کی کرن ہوں — آئینۂ صفا ہوں سیماب پیرہن ہوں
ہر لہر کہہ رہی ہے اک موجِ نور ہوں میں — ہے ہر حباب گویا جامِ بلور ہوں میں
پانی کے آئینہ میں تارے ہیں عکس افگن — یا جلوۂ چراغاں ہے تیرے زیرِ دامن

دریائے گنگا کا رتبہ ہر بحر سے بڑا ہے اسی کے فیض سے سمندر بھی فیضیاب ہوتا ہے یا یوں کہئیے:-

بھارت کی سرزمیں کے تجھ سے نصیب جاگے — پانی بھرے نہ پھر کیوں ہر بحر تیرے آگے

اس شعر میں معنی کا ایک خزانہ بھرا ہے محاورے کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ گنگا جی کی عظمت اتنی بلند ہے کہ اس کے آگے سمندر پانی بھرتا ہے۔ دوسرے معنی میں گنگا جی کا پانی سمندر اپنے میں لیتا ہے کیا خوب شعر ہے۔

بھارت کی سرزمیں کے تجھ سے نصیب جاگے
پانی بھرے نہ پھر کیوں ہر بحر تیرے آگے

چند شعر اور ہدیۂ ناظرین ہیں:-

اے منبعِ تقدس گہوارۂ تمدن — تجھ سے فیضیاب تجھ سے آوارۂ تمدن
مسکن ہے تو قدیمی اسلاف کا ہمارے — ڈالے ہوئے ہیں ڈیرے صدیوں ترے کنارے

÷ ÷ ÷

تھا شاندار کیسا دورِ کہن ہمارا — فردوس بر زمیں تھا گویا وطن ہمارا
مہرِ عروج اپنا نصف النہار پہ تھا — واقفِ خزاں یہ گلشن اپنی بہار پہ تھا
ہے تجھ کو یاد از بر وہ داستان ساری — لہریں تری ورق ہیں تاریخ کے ہماری

÷ ÷ ÷

دامن میں تیرے پنہاں خاکسترِ سلف ہے — گنجِ گہر نہاں ہے جس میں تو وہ صدف ہے
تو عظمتِ گذشتہ کی آج تک امیں ہے — جاہ و جلال تیرے پہلو میں تہ نشیں ہے

÷ ÷ ÷

آپ گہر خجل ہے تجھ میں ہے وہ صفائی | قطروں میں بس رہی ہے تاثیر جانفزائی
وحدانیت کا نغمہ مرغوں کے ساز میں ہے | اعجاز حق نوائی رنگ عجب زمیں ہے

نظم "تارے" میں فرماتے ہیں:-

کہکشاں ہے کہ جادۂ زرّیں | یا فلک پر ہے جدول سیمیں
تابش اختر اہے جلوا رنگیں | بہر گردوں ہے مایۂ تزئیں

دستِ فطرت کے نقش سارے ہیں
مہر و مہ کہکشاں کہ تارے ہیں

"تاروں بھری رات" کا کیسا اچھا سماں باندھا ہے:-

کیا گل ہیں کھلے دامن گلزار فلک پر | صدقے ہیں زر و سیم و گہر جن کی چمک پر
لیلائے شب اوڑھے ہوئے تاروں کی ردا ہے | کیا حسن ضیا پاش ہے دل جس پہ فدا ہے

÷ ÷ ÷

قندیلیں سر شام سے روشن ہیں فلک پر | کیا گنبدِ گردوں پہ چراغاں کا ہے منظر
دامان فلک میں گل خوش رنگ پڑے ہیں | یا سقفِ زمرد میں زر و سیم جڑے ہیں
تاریک کوئی، ماند کوئی، کوئی درخشاں | ثابت کوئی سیارہ کوئی کوئی ہے رقصاں

÷ ÷ ÷

ہم بھی غور یدوں کے ہیں رنج و تعب میں | دل ان سے بہل جاتا ہے تنہائی شب میں
گردوں پہ عجب محفل انجم کا ہے عالم | آتا ہے نظر دور سے اک مجمع برہم

لیکن یہ سب دلکش مناظر رات بھر کے مہمان ہیں صبح ہوتے ہی یہ مجمع منتشر ہو جاتا ہے ان سب چراغوں کو جو چرخ پر روشن تھے بادِ سحری کا ایک جھونکا گل کر دیتا ہے:-

شب ڈھلتے ہی رنگ بزم انجم ہوا پھیکا | گل کر گیا جھونکا انہیں بادِ سحری کا

آیا ہے دم صبح یہ فرق ان کی چمک میں
مرجھائے ہوئے پھول ہیں دامانِ فلک میں

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا سے ہمارے یہاں کی قومی یا مذہبی قصص و روایات کسی قسم کے تاریخی نظموں کی طرف بہت کم توجہ کی گئی جس کے باعث اردو ادب ابتک اپنی ناداری کے لئے بدنام ہے۔ نیچرل شاعری کے آغاز کے ساتھ ساتھ شعرا کی توجہ اس طرف بھی

ساتھ ساتھ عرب و فارس کے قصص کے ساتھ ہندوستانی ہوئی۔ مسرت کا مقام ہے کہ اب عرب و فارس کے قصص کے ساتھ ساتھ ہند کی بھی عظیم الشان روایات وغیرہ نظم ہونے لگی ہیں۔ جناب برق نے اکثر منظومات ایسی لکھی ہیں جن کو یا کسی تاریخی واقعہ سے تعلق ہے یا کسی مذہبی روایت کے مطابق ہیں مثلاً "پدمنی کا جوہر" "پریم کا تحفہ" یا "بھیلنی کے بیر" "راجکماری پنا" "بھگتی بان" "مہارانا پرتاپ کی تلوار" وغیرہم۔ یوں تو یہ سب ایک خاص رنگ رکھتی ہیں مگر ان میں سے بعض ایسی ہیں جن کے مطالعہ سے دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً "میراں بائی" میں پریم اور بھگتی کا وہ دریا موجیں مار رہا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں بجلی کوند جاتی ہے۔ ایسی سلیس، پرجوش، دلکش اور موسیقی سے معمور نظمیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

بھگوان کرشن کے مندر میں	ہے محو ثنا میراں بائی
اک بین ہے دست نازک میں	لب وقف نغمہ آرائی

÷ ÷ ÷

کیا راگ ہے کیا کاری ہے	اک وجد کا عالم طاری ہے
جو سر ہے پریم کٹاری ہے	جو زخم ہے زخم کاری ہے
ہے چرخ سے بارش ابر قمر	ہے سطح زمیں اک تختۂ ند
دامان شب مہتاب ہے تر	نغموں کی تراوش سے کیسر
احساس خودی کا فور ہوا	عرفاں سے دل معمور ہوا
پیکر جگ پرپیی پر میتم ہیں	اب پردۂ حایل دور ہوا

÷ ÷ ÷

اے دیوی کرشن مراری کو	ہم بھینٹ چڑھانے آئے ہیں
تیرے روحانی نغموں سے	کھنچ کر دیوانے آئے ہیں
لے یہ ہیروں کی مالا ہے	یہ ادنےٰ نذر ہماری ہے
کر ارپن اس کی سیوا میں	تو جس کی پریم پجاری ہے

زبان کی برجستگی و شستگی کے علاوہ بعض ہندی الفاظ اس طرح با موقع استعمال کئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے سونے کی انگوٹھی میں ہیرے جڑ دیئے ہیں۔ خط کشیدہ الفاظ غور طلب ہیں۔ مہا؛ کی نظم بھی خوب ہے سہ

حیرت سے زمیں میں گڑ گئے پاؤں — سکتہ سا ہوا سبک ہو گئے پاؤں
گم ہوش ہوئے یہ دم زدن میں — کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

پہرے پہ کھڑے تھے ہر طرف بھیل — شہ زور سیاہ رو گراں ڈیل
اک بھیل کو آنکھ سے بلایا — راز دل مضطرب سنایا

کتنا ہی کوئی جری نہ کیوں ہو — ہوتے نہیں وار ایک سے دو

"نالۂ بیوہ" اور "یتیموں کی فریاد" دو پُر درد نظمیں ہیں۔ خصوصاً "یتیموں کی فریاد" کے ایک ایک شعر سے مایوسی اور حسرت ٹپکتی ہے ؎

ہم سر سے پاؤں تک ہیں اک نقش نامرادی — تصویر بیکسی ہیں رونا و بیکساں ہیں

یتیموں کو "نقش نامرادی" کہنا جناب برق کی ہی فکر بلند کا معجزہ ہے سچ ہے حسرت اسی کا نام ہے ؎

سایہ سے ہم پدر کے محروم ہیں سراسر — جس گود میں پلے تھے سنتے ہی نوحہ خواں ہے
نظروں سے گر چکے ہیں مانند اشک حسرت — کون ہم کو اٹھا کے دیکھے ہر سو دل ملال ہیں
پرسان حال کوئی اپنا نہیں جہاں میں — بے وقعت کس مپرسی وہ جنس رائگاں ہیں

غربت نصیب ہیں ہم خود اپنے ہی وطن میں
جل جائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں

کس قدر پر درد اور دلگداز مصرعہ ہے "جل جائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں"۔ دولتمندوں کی بے پروائیوں اور عشرت پسندیوں کو دیکھکر یتیم کہتے ہیں ؎

تن ڈھانکنے کو ہم کو کپڑا نہ ہو میسر — پوشاک کے ہوں اُن کے فیشن نئے نرالے

ہندوستانیوں کی موجودہ حالت کا کیسا صحیح نقشہ ہے۔ سچ ہے کہ ہمارے لاکھوں بھائی ایسے ہیں جو بھوکوں مرتے ہیں اور جنہیں تن ڈھانکنے کو پھٹا کپڑا بھی مشکل سے نصیب ہوتا ہے اور ہم ہیں کہ کروڑوں روپیہ نئے نئے فیشنوں پر پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ واقعات کی بدیہی مثال ہے۔

تن ڈھانکنے کو ہم کو کپڑا نہ ہو میسر
پوشاک کے ہوں اُن کے فیشن نئے نرالے

"فلسفۂ گیتا" اس نظم میں رموز گیتا کا انکشاف کیا ہے، گیتا کا اصول ہے کہ دنیا میں رہ کر

یاد الٰہی میں مصروف ہونا چاہیئے۔ دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں میں دھونی رمانا فضول ہے، کیونکہ

جب تک ہے گرسانس عمل کی ہے ضرورت
آزاد نہیں کرم سے ہستی کی یہ مورت

اس لئے انسان کو دنیا میں اس طرح رہنا چاہیئے کہ

بے لوث کنول بن کے تو رہ بحر جہاں میں
کثرت میں ہو وحدت کی تجلی دل وجاں میں

اگر انسان دنیا میں ہر نیک کام بے غرض کرے، اس کے ثمر سے بے پروا رہے، اگر اس کی حق شناس آنکھوں نے حق کو تلاش کر لیا ہو تو وہ آواگون سے چھوٹ جاتا ہے اور خالق ومخلوق میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا ہے

تنکام کا آدرش اگر پیش نظر ہو
دامن ترا آلائش عصیاں سے منزہ ہو
وا دیدۂ حق بین ہو حق کی خبر ہو
بازیچۂ فانی میں دوبارہ نہ گزر ہو

پھر قطرۂ دریا میں نہ پردہ رہے باقی
مٹ جائے دوئی ایک ہی جلوہ ہے باقی

افسوس ہم نے اس رفیع الشان آدرش کو طاقِ نسیاں پر رکھدیا۔ شاعر کس حسرت سے دعا کرتا ہے اور ہم بھی آمین کہتے ہیں:۔

اے کاش ہو یہ فلسفہ آدرش ہمارا
جنت سے بدل جائے جہنم کا نظارا
شمشیر حوادث سے نہ ہو قلب دوپارا
پھر اوج پہ آئے برق ہو بھارت کا ستارا

ہنگامۂ ہستی میں ظفریاب رہیں ہم
روشن صفت مہر جہانتاب رہیں ہم

رُباعی

از جناب قمر فرخ علوی کاکوروی

دُھن فکر معیشت کی لگی رہتی ہے
ہر وقت کچھ ایسی ہی پڑی رہتی ہے
جو شخص ہے بس وہ اپنی ہی فکر میں ہے
حالت دنیا کی کیا یہی رہتی ہے

ماتم برق

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی اے ایل ایل بی)

صد حیف آج بزم میں خالی ہے جائے برق — باغِ جہاں سے اب نہ اُٹھے گی صدائے برق
بزمِ ادب میں کیوں نہ شبِ غم کا جوش ہو — گُل ہو گیا چراغِ تجلی فزائے برق
اسرارِ حسن و عشق کا اب ترجماں ہے کون — خاموش ہے زبانِ ترنم سرائے برق
حیراں تھے سن کے زمزمہ سنجانِ بوستاں — باغِ سخن میں نغمۂ عشرت فزائے برق
افسوس اب کہاں وہ بلاغت، وہ اوجِ فکر — وہ گل فشانیٔ لبِ رنگیں نوائے برق
خجلت سے برق ابر کے دامن میں چھپ گئی — دیکھی جب اس نے چرخِ سخن پر ضیائے برق
دلّی کو اس کی ذاتِ گرامی پہ ناز تھا — لیلائے شاعری تھی جہاں میں فدائے برق
کیا کیا ملے ہیں خاک میں ارمان اے اجل — پہلو میں درد اُٹھ کے یہ کہتا ہے ہائے برق
اے آسماں وہ مخلصِ صادق کدھر گیا — تڑپا رہی ہے قلب کو یادِ وفائے برق
کل ماتمِ رواں تھا چمن زارِ ہند میں — روتے ہیں آج اہلِ گلستاں برائے برق

سب کو اجل کے دام میں آنا ہے ایک دن
مہماں سرائے دہر سے جانا ہے ایک دن

حکمِ خدا ہی ہو تو انساں کیا کرے — کیسے عروسِ دہر کسی سے وفا کرے
مرجھا کے رہ گئے گلِ رعنائے بوستاں — شکوہ مگر نہ بلبلِ خونیں نوا کرے
م آفریں ہے گرچہ فراقِ رواں و برق — اس دردِ لا دوا کی کوئی کیا دوا کرے
ں نہیں ہے قالبِ مردہ میں روح پھر — انساں ہزار نالۂ و آہ و بکا کرے
نیائے بے ثبات میں مجبور ہے بشر — جو دل میں آئے خالقِ ارض و سما کرے
وتے نہیں ہیں چاکِ جگر کے رفو کبھی — ہر چند کوئی صبر کی تلقیں کیا کرے
نہائے روزگار سے کس کو ملی اماں — کہہ دو اجل سے جامۂ ہستی قبا کرے
عمال کھینچ لاتے ہیں دنیا میں ورنہ روح — زنہار رُخ نہ جانبِ دارِ فنا کرے
ے رہروانِ ملکِ عدم شادماں رہو — قربِ خدا نصیب ہو تم کو خدا کرے
آواگون کی قید سے حاصل نجات ہو — جنت میں بے نیازِ حیات و ممات ہو

سر راماچندر راؤ مرحوم

افسوس کہ ۵ مئی ۱۹۳۶ء کو صوبہ مدراس کے مشہور و معروف لیڈر سر موچرلہ راماچندر راؤ کا ۶۸ سال کی عمر میں بنگلور میں انتقال ہو گیا۔ آپ کی صحت کچھ دنوں سے اچھی نہیں تھی چنانچہ پار سال بھی خون کے دباؤ کی زیادتی سے آپکی حالت تشویش انگیز ہو گئی تھی، مگر اُس وقت علاج معالجہ سے آرام ہو گیا تھا۔ امسال موت نے آپ کو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھڑا لیا۔

سر راماچندر راؤ ضلع گوداوری کے متمول زمیندار اور کامیاب وکیل تھے۔ جب اضلاع کے جدید بندوبست کے سلسلہ میں ضلع گوداوری کے دو حصے کر دیئے گئے تو آپ ایلور میں پریکٹس کرنے لگے۔ اور اپنی قانونی قابلیت کے باعث مقامی بار کے لیڈر بن گئے۔ آپ کی پبلک لائف کی ابتدا لوکل بورڈ سے ہوئی۔ آپ اپنی قابلیت اور ہر دلعزیزی کی بدولت ایلور میونسپلٹی کے چیرمین ہو گئے، اور اس منصب پر سالہا سال تک قائم رہے۔ اس کے بعد آپ ایلور ڈسٹرکٹ بورڈ کے بھی چیرمین نامزد ہو گئے۔ چنانچہ اس ضلع کے سب سے پہلے غیر سرکاری نامزد شدہ چیرمین آپ ہی تھے۔ انگلستان میں لوکل سلف گورنمنٹ کے تجربات کو پارلیمنٹری زندگی کا پہلا زینہ خیال کیا جاتا ہے، یہی بات مرحوم کے متعلق بھی صحیح ثابت ہوئی کیونکہ آپ نے ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں میں کام کر کے بہت جلد لوکل سلف گورنمنٹ کا تجربہ حاصل کر لیا۔ اور اپنی خوش انتظامی کی بدولت بہت ہر دلعزیز ہو گئے۔ یہ ہر دلعزیزی آگے چلکر بہت کام آئی۔ اور آپ منٹو مارلے اسکیم کے ماتحت مدراس کونسل کے ممبر ہو گئے۔

سر راماچندر راؤ ذات کے برہمن تھے، اس زمانہ میں احاطہ مدراس میں غیر برہمن تحریک یا جسٹس پارٹی کا جسم کے ضنم داتا سر تھیاگرو یہ چیٹی تھے، بڑا زور تھا۔ صوبہ بھر میں برہمنوں کے خلاف منافرانہ جذبات بڑھ رہے تھے۔ انھیں دنوں مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے ماتحت تمام برٹش صوبوں میں قانونی کونسلیں قائم ہوئی تب آپ بھی ضلع کشنا سے کونسل کے امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ اکثر جگہ غیر برہمن امیدوار کو شاندار کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ آپ کا مقابلہ بھی ایک غیر برہمن امیدوار سے تھا لیکن آپ کو اس حلقے کی کثیر تعداد کے ووٹ حاصل ہوئے۔ اسی واقعہ سے عوام میں آپ کی عزت و توقیر و ہر دلعزیزی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غرض آپ ۱۹۲۳ء تک مدراس کونسل کے ممبر رہے۔ اور اپنی قابلیت اور دستہ

ذریعہ جلد ہی کونسل کے غیر سرکاری ممبروں میں ایک امتیازی پوزیشن حاصل کرلی۔ آپ کی تمام تقریریں ہمیشہ مدلل اور پُرازمعلومات ہوا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے لوگ آپ کو مدراس کا گوکھلے کہنے لگے تھے۔ بات یہ ہے کہ آپ اپنی تقریروں میں اس قدر تفصیل اور اعداد و شمار سے کام لیتے تھے کہ زیر بحث مسئلہ بالکل آئینہ ہوجاتا تھا۔

۱۹۲۳ء کے بعد آپ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوگئے۔ اور جن اوصاف و خوبیوں کی بدولت آپ کو مدراس کونسل میں امتیازی حیثیت حاصل ہوئی تھی انھیں کی وجہ سے آپ اسمبلی کے بھی ایک نہایت قابل و معزز ممبر شمار ہونے لگے۔

آپ لبرل خیالات کے مدبر تھے۔ آپ کئی ضلعوں کی سیاسی کانفرنسوں اور ایک مرتبہ مدراس پروانشل کانفرنس کے صدر بھی منتخب ہونے تھے۔ ایک آئین پسند مدبر کی حیثیت سے آپ عدم تعاون سول نافرمانی اور ستیاگرہ کے سخت مخالف تھے اور ہمیشہ تخریبی پالیسی کی مذمت کرتے رہے۔ اور انھیں خیالات پر آپ آخر دم تک قائم رہے۔ آپ نے ۱۹۲۱ء ہی میں پیشگوئی کردی تھی کہ گورنمنٹ کے خلاف براہ راست کارروائی کارگر نہ ہوگی۔ آپ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ تمام کارروائیاں بالکل بے نتیجہ ثابت ہونگی اور متعدد ناکامیوں کے بعد لوگوں کو پھر آئینی جدوجہد کی طرف رجوع ہونا پڑیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔ خود مہاتما گاندھی کا خیال ہے کہ اب پارلیمنٹری ذہنیت کو فروغ ہو رہا ہے اور یہی ذہنیت باقی رہیگی"۔ چنانچہ کانگریس کے ممبر آئندہ قانونی کونسلوں میں داخل ہو رہے ہیں اور کیا عجب ہے کہ سرکاری عہدے بھی قبول کرنے لگیں

بہرحال سر راجیندر راؤ بڑے پکے لبرل تھے۔ چنانچہ تین سال ہوئے جب کلکتہ میں نیشنل لبرل فیڈریشن کا چودھواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو اس کی صدارت کے لئے آپ ہی منتخب کئے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں جدید انڈیا ایکٹ کے سلسلہ میں بھی آپ لبرل ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے انگلستان گئے تھے اور جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دی تھی۔ آپکی اعتدال پسندی، معقولیت اور تجربہ کاری کے بڑے بڑے لوگ معترف تھے۔ کیونکہ آپ کے سب کام ہمیشہ پُرخلوص اور ذاتی نفع و نقصان کے خیال سے بے لوث ہوا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے صلاح و مشورہ کی مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اور لارڈ منٹو جیسے عظیم القدر لوگ بھی قدر فرمایا کرتے تھے۔

سر راجیندر راؤ ملکی جدوجہد کے سلسلے میں کئی مرتبہ انگلستان تشریف لے گئے۔ ایک مرتبہ آپ ہندوستانی طلبا مقیم انگلستان کے متعلق تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر بنکر گئے۔ دوسری مرتبہ آپ نے ریاستی

جا کانفرنس کے وضع کی رہنمائی کی، آپ اس کانفرنس کے پریسیڈنٹ بھی تھے۔ پہلی اور دوسری ں میز کانفرنس کی ممبری کے لئے بھی آپ کا انتخاب ہوا تھا۔ ہندوستان میں بھی آپ مسلسل کیلئے ے سرگرم بسر تھے۔ غرض آپ ہمیشہ کچھ نہ کچھ مفید کام کرتے رہتے تھے۔

ملکی مسائل کے بعد سر راچندر راؤ کو امداد باہمی کے کاموں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ آپ کو آپریٹو تحریک کے عظیم الشان امکانات کے تہ دل سے قائل تھے، اور اس تحریک کی ترقی و نشو و نما میں اپنی انتہائی قابلیت صرف کرتے رہتے تھے۔ آپ نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بعض یورپین ملکوں میں بھی جاکر کوآپریٹو کاموں کا بغور مطالعہ فرمایا تھا۔ کوآپریشن کے معاملہ پر آپ کو اس قدر زبردست عبور حاصل ہوگیا تھا کہ ملک کے ماہرین فن آپ کو اس بارہ میں مسلم الثبوت اور قابل استناد استاد تسلیم کرنے لگے تھے۔ پار سال آپ کو گورنمنٹ نے "سر" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ عام خیال ہے کہ جب آپ کو یہ خطاب اسی تحریک کے متعلق کارگزاریوں کی بدولت ملا تھا۔

سر راچندر راؤ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ مدراس میں لینڈ مارگیج بینک "(اراضیات رہن رکھنے والے بنک) کا قیام تھا۔ جس کے آپ عرصہ دراز تک آنریری پریسیڈنٹ رہے۔ اسی بنک کی دیکھا دیکھی ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی اب اس طرح کے بنک قائم ہورہے ہیں۔ آپ ریزرو بینک آف انڈیا کے بھی ڈائرکٹر تھے۔

آپ کی سیرت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ اہل ملک کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لیا جائے۔ اگرچہ اس طرف آپ کی صحت اچھی نہ تھی اور تھوڑی سی محنت سے تکان محسوس ہونے لگتا تھا، لیکن جب مدراس کونسل میں اس مطلب کا مسودۂ قانون پیش ہوا کہ صوبہ کے انعامداروں کا منصب بغیر کسی معاوضہ کے ضبط کر لیا جائے تو آپ بیقرار ہوگئے، اور آپ نے انعامداروں کی وکالت میں اپنی پوری قابلیت صرف کردی اور اُن کی طرف سے کئی یادداشتیں مرتب کرکے بھیجا کیں۔ آپ کی بیش بہا زندگی کے اس کارنامے سے بھی بہ طرف بے حد قدر ہوئی۔

ایک عرصہ سے آپ نے وکالت چھوڑ دی تھی، اور پیرانہ سالی کی وجہ سے دوسری مصروفیات سے بھی کنارہ کش ہوگئے تھے لیکن آپ کا دل و دماغ ہمیشہ وطن کی بہترین خدمت کے لئے وقف رہتا تھا۔ آپ بہت صاف باطن اور سچے محب وطن تھے۔ آپ کی سب سے بڑی آرزو بھی یہی تھی کہ وطن عزیز کی ہر ممکن خدمت انجام دیں۔ سیاسی حیثیت سے آپ کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ آپ کا

خیال آرائیوں یا نعرہ بازیوں سے کام نہ لیتے تھے، بلکہ ہمیشہ دانشمندی کے ساتھ ہر معاملہ کے عملی پہلو پر غور کرتے تھے۔

آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں آپ کو ہندوستانی ریاستوں کی رعایا کے حقوق سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اسی لئے آپ ریاستی پرجا کانفرنس کا وفد لیکر انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ لیکن جب آپ گول میز کانفرنس کے سلسلے سے انگلستان گئے اور وہاں کے مدبروں کی باتیں سنیں تو آپ کو محسوس ہو گیا کہ دیسی ریاستوں کے موجودہ نظم و نسق کے ردو بدل میں سخت قانونی اور آئینی دقتیں لاحق ہونگی۔ اور ریاستوں کی رعایا کے سیاسی حقوق کے متعلق کوئی جدید قانون بنانا سخت دشوار ہوگا۔

بہرحال آپ نے اپنی تمام زندگی اہل وطن کی بے لوث اور پُرخلوص خدمت کے لئے وقف کردی تھی۔ نجی حیثیت سے آپ ایک سچے دوست، مہمان نواز بزرگ، شگفتہ مزاج یار، اور مکمل جنٹلمین تھے اور صوبہ اندھرا کے لیڈروں میں آپ کو بہت ممتاز درجہ حاصل تھا۔ افسوس آپ کے بعد آپ کی جگہ پُر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی!

غزل

از جناب جہاد میرٹھی مرحوم

ہزار پردوں میں جبتک رہیگا تو باقی — رہے گی تشنگی ذوق جستجو باقی
شرار خاک میں جب تک ہے آرزو باقی — رہے گی عالم امکاں کی ہاؤ ہو باقی
اگرچہ دل میں ہے ابتک وہ آرزو باقی — نہ جام و مے ہے نہ ساقی ہے نے سبو باقی
خودی نے چاک کئے کائنات کے پردے — نہ پیرہن رہا نے حاجت رفو باقی
خزاں کا خوف کسے ہے؟ ہمارے سینے میں ابھی — وہی ہے جوش وہی لذت نمو باقی
صدائے غیر میں گم ہو چلا ہے دل تیرا — کہاں ہے رندوں میں اگلی سی ہاؤ ہو باقی

کسے دماغ کہ اب سیر گلستاں دیکھے
کسی کلی میں نہیں بانکپن کی بو باقی

سیّد ماجد علی مرحوم

(از مسٹر طالب الہ آبادی)

خاں صاحب سید ماجد علی صاحب مرحوم ایڈوکیٹ و گورنمنٹ پلیڈر الہ آباد ۱۸۹۰ء کے آخری مہینوں میں پیدا ہوئے، غریب مگر شریف گھرانا تھا، والد سید صاحب علی صاحب حکیم بھی تھے اور عالم بھی۔ تھوڑی سی زمینداری تھی اور کچھ کھیتی باڑی بھی ہوتی تھی، حیثیت معمولی مگر آن بان بہت تھی، انکی طبابت، غریب نوازی، خودداری، کنبہ پروری اور خداترسی کے ڈنکے اٹھ گنواں اور مہائیں میں بجتے تھے، سپوت بیٹا ان تمام صفات میں اپنے باپ سے ملتا جلتا تھا ۱۸۹۵ء میں خاندانی رسم کے مطابق بسم اللہ ہوئی، کلام پاک، اردو، فارسی کی درسی کتابیں مولوی مراد علی صاحب سنڈوری سے پڑھیں، ان کا سایہ پانچ ہی سال کی عمر میں اٹھ چکا تھا، بھاوج اور بہن نے پانچ برس کی جان کو اپنی اولاد سمجھ کر پالا۔

۱۹۰۴ء میں الہ آباد میں انگریزی شروع کی، اسکول میں داخل ہوئے ۱۹۱۲ء میں بی اے پاس کیا، ذہانت کا یہ حال تھا کہ کسی کتاب، لکچر یا مضمون کو کبھی دہرانے کی ضرورت نہ ہوئی، حافظہ اتنا غیر معمولی تھا کہ صفحے کے صفحے اور لکچر کے لکچر ذہن میں حرف حرف محفوظ رہتے تھے، مشہور ہے کہ میور سنٹرل کالج میں فلسفے کے آتش بیان مقرر ریڈفورڈ (Radford) صاحب پورے گھنٹے بھر پچاس لفظ فی منٹ کی رفتار سے تقریر کرتے تھے اور ختم تقریر کے بعد ماجد صاحب لوگوں کو چھوٹے ہوئے جملے لکھا دیا کرتے تھے اور یہ تو کوئی بات ہی نہ تھی کہ مجلس عزا میں ڈیڑھ دو سو بند کا مرثیہ پڑھا گیا اور ماجد صاحب نے ختم مجلس کے بعد شائقین کو پورے بند اسی ترتیب سے لکھوا دئیے، اکثر امتحانات میں امتیازی شان سے کامیاب ہوئے، کہتے ہیں کہ ایک بار ڈن صاحب نے سات صفحات کے نوٹ لکھائے بیچ میں مرحوم کی پنسل ٹوٹ گئی بورڈنگ ہاؤس پہونچ کر یاد سے نوٹ کر لئے ایک حرف کا فرق نہ تھا، ۱۹۱۴ء میں وکالت پاس کی سال بھر تک بڑے بھائی سید صاحب مرحوم "ایڈوکیٹ" کے ساتھ مل جل کر کام کرتے رہے اس کے بعد ۱۹۱۵ء سے ان کے سایہ عاطفت میں علحدہ وکالت کرنے لگے، بھائی کی وکالت معراج پر تھی طوطی بولتا تھا، ضلع کے وکلا

تو نے کیسے کیسے گھر ویراں کئے واحسرتا

قعرِ خاکی میں جو رکھا تو نے اے ظالم قدم　　دل کے نقطے نقطے میں پیدا ہوئی تصویرِ غم
اشکِ حسرت کی تراوش نے کیا آنکھوں کو نم　　ہچکیاں آنے لگیں کھنچنے لگا رگ رگ سے دم
غیر حالت ہو چلی ظاہر ہوئے آثارِ حشر
گرم آخر کو سرِ بالیں ہوا بازارِ حشر

مرنے والے کے الم میں کوئی مضطر سینہ چاک　　سوزِ پنہاں کے اثر سے دل کسی کا جل کے خاک
غم سے کوئی سخت جاں کرتا ہے اپنے کو ہلاک　　پیٹتا ہے سر کوئی حسرت زدہ اندوہ ناک
عرش کے پائے ہلا دیتا ہے کوئی آہ سے
دل تلاطم میں کسی کا نالۂ جانکاہ سے

سنگِ فرقت سے کسی کا شیشۂ دل چور ہے　　دردِ حرماں سے کوئی فریاد پر مجبور ہے
کاوشِ غم سے کسی کے قلب میں ناسور ہے　　کوئی طالب ہے ترا تو اس سے لیکن دور ہے
رنج سہ کر کسی کے لب پہ ہے مہرِ سکوت
کوئی پابندِ رضائے پاک حیّ لا یموت

جو گیا دنیا سے پھر اس کا پتہ مفقود ہے　　سامنے سر منزلِ ملکِ عدم موجود ہے
غافلو آئینۂ عبرت یہ ہست و بود ہے　　غور بیں نظارۂ رنگِ چمن بے سود ہے
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

چشمِ عبرت وا ہو اور آثارِ عبرت خیز دیکھ　　واقعاتِ جانگداز آیاتِ حشر انگیز دیکھ
ہوکِ جاں کے لئے اک نشترِ سر تیز دیکھ　　پنجۂ مژگانِ اہلِ درد کو خوں ریز دیکھ
ذرہ ذرہ انقلابِ دہر کی تصویر ہے
صبح کچھ اور شام کچھ انداز چرخِ پیر ہے

ایک ہم ہیں اور ہزاروں حسرتیں جانکاہ ہیں　　رو میں سیلابِ حوادث کی یہ خشک کاہ ہیں
مبتلائے رنج و پابستۂ الم صد آہ ہیں　　رہ نوردانِ سبیلِ عشق کے ہمراہ ہیں
کون غمخواری کرے دل خستگانِ ہجر کی
ہے دلوں میں نوک پیوستہ سنانِ ہجر کی

موت[1]

(از جناب سید محمد جعفر قدسی جائسی)

اے اجل سروِ قبرِ دارِ فنا ہے تیرا نام — تجھ سے آثارِ قیامت ہیں نمایاں صبح و شام
کچھ تجھے پروا نہیں برہم ہو دنیا کا نظام — کھینچ کر لاتی ہے مرغِ روح کو تو زیرِ دام
جاں بلب اشکوں سے ہو یا بندِ غم یا آہ سے
کیا غرض تجھ کو کسی کے نالۂ جانکاہ سے

پیچ و تابِ نزع کی تو پھینکتی ہے جب کمند — پیکرِ ذی روح میں ہوتا ہے لرزاں بند بند
زندگی بھر تو رہا غافل دلِ غفلت پسند — جو تکتا تھا خوابِ غفلت سے کر دیکھی آنکھ بند
ڈوب کر قعرِ فنا میں کوئی گھبرایا تو کیا
سر سے پانی چڑھ گیا پھر ہوش میں آیا تو کیا

تیرا آنا باعثِ بربادیِ کاشانہ ہے — منزلِ آباد میں تجھ سے عیاں ویرانہ ہے
گو یہ دنیا رہگذر ہے اور مہماں خانہ ہے — اس پہ بھی ہر سو تری بیداد کا افسانہ ہے
رحم سے ناآشنا کچھ اس طرح دل ہے ترا
عاجزوں کا ذکر کیا سرکش بھی قائل ہے ترا

توڑ دے رگ رگ بدن کی تجھ میں وہ تاثیر ہے — جسمِ انسانی تجھی سے پیکرِ تصویر ہے
روح کھنچ آتی ہے اتنی قوتِ تسخیر ہے — تیرے آگے سرد ساری گرمیِ تدبیر ہے
گو بظاہر تو نے زائل کی بصارت آنکھ سے
اٹھ گئے غفلت کے پردے درحقیقت آنکھ سے

لوٹ لے جاتی ہے دم میں کاروانِ عیش کو — خون کے آنسو رلاتی ہے جہانِ عیش کو
خاک کرتی ہے بہارِ بوستانِ عیش کو — کلبۂ احزان بناتی ہے مکانِ عیش کو
تیرے دستِ ظلم سے نالاں ہیں سب شاہ و گدا

[1] یہ نظم سید ماجد علی صاحب گورنمنٹ پلیڈر الہ آباد کی وفاتِ حسرت آیات کے سلسلے میں لکھی گئی تھی (م-ا)

اکثر شاعروں سے ماجد صاحب کے ہاتھ رہتے تھے مگر انھوں نے کبھی کسی شاعر سے مقابلہ کا خیال بھی نہ کیا۔ "تو بڑا کہ میں" کا عام قضیہ ان کے نزدیک آدابِ محفل کے خلاف تھا کہ ورت یا کسی سے میل رکھنا انکی فطرت کیلئے اجنبی باتیں تھیں وہ ہر شخص سے محبت اور ہر فرد کی عزت کرتے تھے۔ نہ ان کے کلام میں آپ کو کبھی تعلی طنز تعریض یا چشمک کے اشارے ملیں گے نہ ان کی حیات کے کسی شعبے میں ان چیزوں کا پتہ چلیگا کیا شاعرو اور کیا غیر شاعرہ کیا خلوت اور کیا جلوت ہر جگہ وہ ایک سے تھے صاف پاک اور دلچسپ کوئی انکو بہت اچھا شاعر سمجھے یا نہ سمجھے مگر اچھا آدمی سمجھنے پر ایک مجبور ہو جاتا تھا۔ یہاں پر انکی حیات کے بعض واقعات کا ذکر میں نے صرف اس لئے کر دیا ہے کہ اشعار میں ذاتی عنصر کا ہر جگہ غلبہ ہے کلام کو ذرا سا کریہ کر دیکھئے تو ان کا خون شعر کی رگوں میں موجزن ملیگا یہ دوسری بات ہے کہ "پیتی نہیں ہے ساغر و مینا کئے ہوئے" ہے۔ وہ بھی مجبور تھے۔ شراب اور اسکے اثرات و متعلقات کا ذکر بھی اردو غزل گوئی کا زیور ہے مگر صرف آرائش کے لئے۔ اظہار مضمون کے واسطے۔ ماجد صاحب میکدۂ حسن و عشق کے پہونچے ہوئے رند تھے مگر میرے علم میں انھوں نے شراب کبھی نہیں پی۔ انکے شعر ان کی حیات کا آئینہ ہیں جن کا ثبوت ان کے مجموعہ کلام کے ہر تیسرے شعر سے مل سکتا ہے ؎

موت سے ڈرنا بھی کوئی بات ہے — آخری ایک اور انگڑائی سہی

یہ انگڑائی ماجد صاحب مرحوم کو نصیب نہیں ہوئی کیونکہ وہ بولتے بولتے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ گر ایام بیماری میں جب صرف ہڈیوں کی مالا رہ گئے تھے اس وقت بھی آن بان کا یہ عالم تھا کہ فصد کھلوائی، سوئی لگوائی اور زبان سے ہوش میں سی بھی نہیں کہا۔ علالت کے زمانہ میں بار ہا کہتے میں ہائیں اور درد سے بےچین ہیں۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا ہے کروٹ نہیں لے سکتے مگر سب کو تسکین دیے جاتے ہیں۔

زمین و آسمان میرا ہے یہ کون و مکان میرا — وہیں منزل بناؤں گا میں جی چاہے جہاں میرا

قصیدوں میں یا مرثیہ اسلام میں کوئی خاص بات نہیں اعتقادی نظموں میں لطف و اثر ضرور ہے کیونکہ انکے کے تمام جذبات گہرے لطیف اور اثر انگیز تھے۔ لوگوں کو ان کے اعتقادی کلام میں بہت کچھ سامان عقیدت ملے گا

کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے مگر بہت کم فارسی میں بھی جذبات اور اثر کا وہی عالم ہوتا تھا۔

از ہستیِ خود عالم چیزے نہ خبر دارم
قلب من و یاد تو چشم من و روئے تو

انسان بھی ہے اور دل بھی رکھتا ہے۔ صرف شاعری کی تخلیق اور حسن بیان کا پتلا نہیں ہے۔ آپ بھی دیکھ لیجئے۔

دل دھڑکتا ہے الٰہی خیر دیوانے کی ہو ؏ آج وہ دن ہے صدا موقوف ہے زنجیر کی

نیچی نگاہیں کوئی بے اختیار اٹھا دے ؏ دیکھیے آج لے دل اتنی تو داستاں ہو

ماجد صاحب کے کلام میں اکثر کھلی اور مندی شوخیاں ملیں گی مگر ابتذال کی چھاؤں بھی نظر نہ آئے گی۔ مرحوم عرفان اور علم الٰہی کی کتنی منزلیں طے کر چکے تھے اس کا اندازہ صرف ایسے مزا پرست شارحین کر سکتے ہیں جو غالب کے ہر شعر میں تصوف کی ایک درسگاہ دیکھ لیتے ہیں۔ میں تو معمولی بوجھ کا آدمی ہوں، اتنا ہی جانتا ہوں کہ ماجد صاحب کا بھی عالم تھا جس میں ہم سب تھے اور وہ ایسی ہی کیفیات کی تصویریں کھینچتے ہیں جیسی آئے دن ہم لوگوں پر گزرتی رہتی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی لہجے میں شوخی اور بے تکلفی آ جاتی ہے۔

وہ لڑکپن کا تھا حسن اور یہ جوانی کی بہار ؏ تل ہی پہلے بھی تھا رخ پر مگر قاتل نہ تھا۔

مگر ماجد صاحب کی شاعری کے اصلی جوہر اس وقت کھلتے ہیں جب آپ ان کے وہ شیریں نغمے سنیں جو درد میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جن کی ہر لے کے ساتھ خون جگر کی چھینٹیں اڑتی ہیں۔

سانس بھی جیسے ہو تھمی نبض بھی جیسے ہو رکے ؏ آہ کچھ ایسی کیفیت ہوتی ہے انتظار میں

دہر کی آبادیاں آبادیاں ہیں نام کی ؏ جن پہ تھا آبادیاں صدقے وہ ویرانے کہاں

اٹھ گیا آج زمانے سے مریض غم ہجر ؏ سو گیا جاگنے والا شب تنہائی کا

تاریکی اس کے آگے کیوں کر نہ اک جہان ہو ؏ جس کا کہ شام ہوتے برباد آشیاں ہو

آپ نہ کبھی رعایت لفظی کے پیچھے پڑے نہ صنعتوں کے گورکھ دھندے میں گرفتار ہوئے۔ اسی لئے ان کے کلام میں آپ کو محنت، جستجو، تلاش یا آورد کی جھلک کہیں نہیں ملیگی۔ یہ ضرور تھا کہ نظم کرنے کے وقت لفظوں کا انتخاب ترنم کے اعتبار سے کرتے تھے اور اکثر گنگنا کر شعر کہتے تھے جو ادا سب سے زیادہ پسند آئی وہ چھانٹ لی۔ فن موسیقی سے واقف ہی تھے۔ بڑے بڑے گانے والوں کو سن چکے تھے، کن رس تھے، انتخاب بحر و قوافی میں بھی نغموں سے مدد لیتے تھے، لفظوں کے نیچے اور مصرعہ کے بہاؤ میں بھی لے اور تال سے چولی دامن کا ساتھ رکھتے تھے۔ اور جگر صفی جوشش اور اقبال کی طرح صرف اپنی آواز کے خداداد و درد اثر سے کام لیتے تھے۔ پڑھنے میں اچھل کود تاؤ بھاؤ اور ایکٹنگ بھی نہ تھی نہ بلاوجہ ہر مصرعہ یا شعر کو دہراتے تھے۔

کے بعد چودھری سید عترت حسین صاحب رئیس بھور نے شائع کی تھیں آپ نے کبھی نام و نمود یا اعلان افتخار، یا اظہار کمال کے لئے شعر نہیں کہے۔ حساس فطرت، موسیقی سے گہرے ربط کے علاوہ مزاج میں شوخی اور طبیعت میں مسلسل رومان کا عنصر تھا۔ شعر کہنے کے لئے مجبور تھے جب جذبات کی فراوانی برداشت سے باہر ہو جاتی تھی تو شعر موزوں کر کے سکون قلب حاصل کرتے تھے۔ حسن و عشق کی گلیوں میں ہر وقت پھیرے ہوا کرتے تھے۔ وصل و ہجر کے مزے اٹھائے جاتے تھے پھر غزل نہ کہتے تو کیا کہتے۔

اُن کی غزلوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے صرف قافیہ پیمائی یا خامہ فرسائی نہیں کی جو بات کہی معنے اور اثر کے لحاظ سے نئی کہی ارکان میں وہ قدما کی پوری تقلید کرتے تھے۔ نہ انکی غزلوں میں درس عمل کی تلاش ہے نہ دور از حال فلسفے کا پیام۔ روزمرہ کی باتیں ہیں فطری حادثات کی تصویریں ہیں البتہ حسن بیان شاعرانہ اور انداز تحریر میں تغزل کا رنگ ہے۔ زود گو ہونے کے باوجود پُرگو نہ تھے۔ کبھی شاعرے میں بیٹھ کر غزل کی غزل کہہ لی کبھی گھر سے شاعرے تک جاتے ہوئے شعر کہہ لئے۔ یا یوں ہی شعر کہنے بیٹھے تو گھنٹے آدھ گھنٹے میں جتنا کہنا تھا کہہ کر اٹھ گئے۔ یہ نہیں کہ گھنٹوں بحر شعر میں غوطے لگا رہے ہیں۔ ۲۰ برس تک شعر و سخن سے ذوق رہا مگر کیٹس اور وحید کی طرح کل کائنات ڈیڑھ دو سو صفحات سے زیادہ نہیں ہے۔

غزل پڑھتے وقت انکو درد بھری آواز کا ترنم اور حسن ادا کا ایسا رنگ جمتا تھا کہ لوگ مسحور ہو جاتے تھے۔

نیساںؔ صاحب سے خوشہ چینی رہی وہ ان کے تلمذ رہا ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۲ء تک جو کچھ کہا جذبات سے مجبور ہو کر کہا۔

یہی بس اک سماز منتل ہو جہاں یہ جو کچھ ہو یہیں وصل ہے — جو کچھ بھی ہو دل جگر دی کے وہ صرف ال کے گلہ میں ہے

اثر کے سامنے لفظوں کی نشست، ترکیبوں کا انوکھا پن، اور فن کی نزاکتیں کسی چیز کی کوئی وقعت ان کی نگاہ میں نہ تھی۔

شعر کہنا ہے جو ماجد تو اثر نے کے کہو — ورنہ کیا لطف فقط قافیہ پیمائی کا

وہ دور جدید کے ممتاز غزل گو تھے مگر نہ اقبال کا پیام عمل ان کے یہاں ہے نہ جوش کا طوفان بیان، نہ جگر کی والہانہ باتیں ہیں نہ اصغر کی اچھوتی ترکیبیں۔ انکی غزل گوئی میں صفی، ثاقب، جلیل اور اثر کا سا انداز ہے۔ ماجد صاحب کا معشوق گوشت اور پوست کا مادی معشوق ہے وہ

ماجد صاحب کو ۲۹۔ ذی الحجہ سے بار بار چاند کی رٹ لگی ہوئی تھی معلوم ہوا کہ ہلال محرم دکھائی دیا تو بیمار عاشق نے کانپتے اور سوکھے ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹا اور خواہش کی کہ مجھے بھی چاند دکھا دو۔ پھر مسرور ہو کر کہا کہ اب محرم والوں میں میرا بھی شمار ہو جائے گا جب میں چاند رات کے دن عشرہ کرنے کے لئے گھر سن کی طرف چلنے لگا تو مرحوم نے کہا، جاؤ اور سب بچوں کو ساتھ لئے جاؤ میں بھی دو ایک دن میں آجاؤں گا دوسری تاریخ کو لاش آئی اور کربلا میں بھائی کے پاس دفن ہوئی۔

جیسا سونے ہے زندہ جاوید کیا دوا نے نے موت پائی ہے

طالب

—(۲)—

مرحوم فطری شاعر تھے چنانچہ آپ نے اس لطیفہ اور وہبی ملکہ کو نہ تو کتابیں پڑھ کر حاصل کیا نہ کسی اُستاد کے در پر جبیں سائی کی۔ وزن کا احساس سات آٹھ سال کی عمر ہی سے تھا کہ ایک دفعہ الہ آباد سے گاؤں جاتے ہوئے ہنومان گنج میں ڈاک خانہ کا بورڈ دکھائی دیا تو فوراً زبان پر جاری ہو گیا۔ "پوسٹ آفس ڈاکخانہ ڈاک گھر + ڈاکخانہ پوسٹ آفس ڈاک گھر" آپ نے سب سے پہلے ۱۹۱۴ء میں مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد میں اپنی غزل پڑھی اس زمانہ میں وہ اپنا کلام میر علی عبد صاحب مرحوم ضیاؔ الہ آبادی کو دکھاتے تھے، ضیاں صاحب کا سلسلہ منشی منیر کے ذریعہ ناسخ تک پہونچتا ہے چنانچہ ان کے یہاں منیر اور ناسخ اسکول کی اکثر خوبیاں موجود ہیں۔ ماجد صاحب کی غزل کا صرف ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے، غزل اُستاد کی دیکھی ہوئی تھی۔ کہیں ضائع ہو گئی۔

یہ کس نے چاندنی کی سیر میں رُخ سے نقاب اُلٹی چکوروں کی پھری جاتی ہیں نظریں ماہ کامل سے

یہ ابتدا تھی۔ انتہا یہ ہے۔ کہ ۱۹۲۵ء میں یورپ کے سفر میں دختر میں کیں اور بستر بیماری پر یہ شعر کہا

یا رب اتنے پوچھنے والے ہوں جس بیمار کے * اس کی بیماری پہ صحت کا یقیں کیونکر نہ ہو

آپ نے کل ۵۰ غزلیں کہی ہیں، کچھ قصیدے اور کچھ اعتقادی نظمیں اور سلام ہیں ایک مرثیہ ہے اور بعض خاص موقعوں کی نظمیں ہیں۔ ادبی کلام کا منتخب مجموعہ جس کا انتخاب میں نے مرحوم کی فرمائش سے کیا تھا کتابی شکل میں انڈین پریس میں زیر طبع ہے۔ اس کی ترتیب آپ خود اپنی علالت کے دوران میں پسند کر چکے ہیں۔ اعتقادی نظمیں سات نشتر کے نام سے سفر کربلا

ہیں اور بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔

مرحوم نے دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی ہے۔ لڑکی ان کے چھوٹے بھتیجے سید غالب علی صاحب ایڈوکیٹ اور ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ الہ آباد کی بیوی ہے۔ بڑا لڑکا اٹھارہ برس کا اور چھوٹا سات برس کا ہے۔

مرحوم ایک معمولاً صاف سادے اور ہندوستانی وضع کے کپڑے پہنتے تھے۔ ترکی ٹوپی خاکی سلک یا سیاہ الپکے کی شیروانی قمیص کرتے اور چوڑی دار پاجامہ کبھی کبھی کسی خاص موقع پر یا ٹینس کھیلنے کے وقت کوٹ پتلون اور انگریزی ٹوپی بھی پہن لیتے تھے مگر شاذ و نادر۔

مزاج میں تعصب نام کو بھی نہ تھا، خوشامد کی بو اور غرور کی چھاؤں بھی نہ تھی، بوڑھا ہو یا بچہ امیر ہو یا غریب عورت ہو یا مرد ہندو ہو یا مسلمان، اپنا ہو یا غیر، ہر شخص سے اس طرح ملتے کہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہی سب سے زیادہ مرحوم کی نگاہ میں عزیز ہے۔

بوٹا سا قد، صاف رنگ، مسکراہٹ میں تھا طلسمی اثر تھا جس سے لوگ بے اختیار کھنچے تھے ہنستا ہوا مکھڑا۔ تبسم ریز آنکھیں۔ ہونٹوں کی گلابی پنکھڑیاں ہر وقت کھلی رہتی تھیں۔

کبھی اپنے قابو بھر کسی کو تکلیف نہیں دی۔ جلد بازی بہت تھی، آن تھی، شان تھی، غصہ بھی جلد آتا تھا کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی تیور پر بل آگیا، چہرے کا رنگ بدل گیا، مگر جتنا تیز غصہ آتا تھا اتنا ہی جلد اتر جاتا تھا ادھر غصہ اترا اور ادھر ماجد صاحب جس پر غصہ آیا تھا اُسے منانے لگے۔ میں نہیں جانتا کہ اڑتالیس برس کی زندگی میں کبھی کوئی شخص مستقل طور پر ان سے ناخوش رہا ہو۔ بات یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی اصلی قیمت اور ہر شخص کی حقیقت کو پہچانتے تھے اور اپنے برتاؤ سے کبھی کسی کو شکایت کا کوئی موقعہ نہ دیتے تھے۔

مذہباً وہ شیعہ مسلمان تھے اور اپنی آزادی، عیش طلبی اور روا داری کے باوجود بھی حسین رضؑ شہید کے شیدائی تھے، کربلا میلے ہو آتے تھے، مرثیہ کہا، سلام کہے، عشرہ بھر جو کی روٹیاں اور ساگ کھاتے تھے۔ کالا کرتہ پہنتے تھے۔ محرم میں گاؤں کے تمام کاموں میں حصہ لیتے تھے اور پورے جوش کے ساتھ۔ خوش گلو تھے سوز پڑھتے تھے، نوحے پڑھتے تھے، آواز میں درد تھا، تحت خوانی کرتے تھے صاحب نظر تھے کبھی کبھی حدیث بھی پڑھتے تھے، جناب عباس علمبردار کا بڑا علم اٹھاتے تھے۔ موسیقی سے ایک خاص ربط تھا، طبلہ بھی بجا لیا کرتے تھے۔ خوش اعتقادی سمجھئے یا حسن اتفاق موت بھی ملی تو ایسے دنوں میں جو شیعوں کے نزدیک نہایت متبرک سمجھے جاتے ہیں یکم محرم کا دن گذر کر شب کو انتقال ہوا گویا اُن کی روح بھی حسینؑ غریب کی پیشوائی کو کربلائے معلےٰ ہو چکی،

چنانچہ ان کو بھی ان کے ذات سے پوری پوری مدد ملی سال ہی دو سال میں یہ بھی چمک اٹھے
تنگ گلیوں سے محل کر ۱۹۲۲ء میں سول لائن میں بنگلہ لے لیا اور رہنے لگے جہاں سے یکم جنوری
کو چوک پر سید رضی الدین حسن صاحب وکیل کے مکان میں اٹھ آئے۔ یہی زمانہ افاقہ مرض کا
۲۱ر جنوری ۱۹۳۶ء کو تیسرا حملہ ہوا تو پھر سنبھل ہی نہ سکے ۱۹۲۱ء میں ضلع کے گورنمنٹ پلیڈر ہو
اور مرتے دم تک سرکاری وکیل رہے۔ انھوں نے اپنی فرض شناسیوں کی ایسی اچھوتی مثال
ہی ہے کہ وہ تک پبلک اور حکام عزت و محبت سے یاد کریں گے۔ ادائے فرض کے پہلو بہ
احمد صاحب نے سماجی تعلقات کا توازن بھی اس طرح قائم رکھا کہ فریقین ہمیشہ خوش رہے
مئی ۱۹۳۵ء میں مرحوم کو سرکار سے اعتراف خدمات کے صلہ میں خان صاحب کا خطاب ملا۔ آپ
یت میں تھے۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۳۵ء کو رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو پی سی کے ساتھ یورپ
سیر کو گئے ہوئے تھے۔ ۹ر جولائی ۱۹۳۵ء کو موصوف ہی کے ساتھ ہندوستان واپس آئے ۱۱ اگست
۱۹۳۵ء تک کام کرتے رہے ۱۲ر اگست کو صبح چھ بجے سے ایک بجے دن تک منھ سے خون آیا، سوا سیر
الم نہ نکلا ہوگا، کھاٹ سے لگ گئے۔ آٹھ مہینے پڑے رہے، ایلوپیتھی طب اور یونانی کے بہترین
اور ڈاکٹر معالج رہے مگر مرض بڑھتا ہی گیا، تین دفعہ فصد کھولی گئی ہر مرتبہ آدھ سیر تین پاؤ
ن نکالا گیا، دو بار خود فطرت نے منھ سے خون نکالا مگر بلڈ پریشر میں کوئی مستقل کمی نہیں ہوئی،
ٹر سید محمد مصطفےٰ صاحب آخر تک ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ دن میں کئی کئی بار معاینہ
تے تھے۔ ڈھانچہ رہ گیا تھا مگر دل دھونکنی کی طرح چلتا رہتا تھا اور دماغ کی پوری قوتیں اپنا اپنا
م کئے جاتی تھیں۔ سر تیج بہادر سپرو، سر وزیر حسن، سر شاہ محمد سلیمان، اور ملا صاحب سے لیکر کچہ
لے تک برابر خیریت پوچھنے اور دیکھنے آیا کرتے تھے، ہر مذہب ہر ملت اور ہر عمر کے لوگ دست
عا تھے مگر وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

ذرا سی تکلیف میں بھی دھڑکا ہوتا تھا کہ قلب کی حرکت یکایک رک جائیگی، چنانچہ ۲۴ر اپریل
۱۹۳۶ء کی بھیانک رات کو کائنات حیات کا رہا سہا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔ رات کو پون بجے تک
تیں کرتے رہے۔ یکایک بارہ بجکر ۴۵ منٹ پر خاموش ہوگئے اور پھر نہ بولے۔ نہ ہاتھ پاؤں کھینچے نہ
آئی نہ سکرات کا عالم ہوا پھر بھی قیامت آگئی، بیوی رانڈ اور بچے یتیم ہوگئے۔ منجھلے بھائی جو
ں برس مرحوم سے بڑے ہیں فطرتاً بذلہ سنج اور جوان طبیعت ہیں۔ آٹھ مہینے کی مسلسل بیماری
سایہ کی طرح مرحوم کے ساتھ رہ کر انتھک تیمارداری کرتے رہے مگر اب وہ نیم مردہ سے ہوگئے



سید ساجد علی مرحوم

آزاد

(افسانہ)

(از جناب سید علی احمد ایم۔ اے)

شمس الحسن صاحب گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھے۔ ہر سال چھ مہینہ دلی اور چھ مہینہ شملہ پر رہا کرتے۔ پہاڑ پر جانے کا بھتہ ملتا تھا، سرکاری کوارٹر کا کرایہ بہت کم تھا، اسلئے اوپر نیچے آنے جانے کی زحمت کے علاوہ کوئی اور تکلیف نہ تھی۔ پھر وہ افسران اور رؤسا کے ساتھ ہر سال پہاڑ پر جاتے تھے۔ گھر پر اور دوستوں و جاننے والوں میں انکی عزت زیادہ تھی۔ ہر شخص کا بس ہوتا نہیں کہ ہمیشہ پہاڑ پر جایا کرے۔ پہاڑ کی اور نیچے کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ شملہ پر لوگوں کے لئے تو سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مکانوں کے کرایہ حد سے زیادہ۔ دوسرے زندگی بڑی مہنگی۔ ہر شخص بار بار شملہ کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا۔ دوسرے مرادآباد سے شاید ہی کوئی ہر سال پہاڑ پر جایا کرتا ہو۔ سر محمد یعقوب البتہ ہر سال جایا کرتے تھے۔ ان کے بعد پھر مسٹر شمس الحسن۔ چنانچہ لوگوں کی نگاہوں میں مسٹر شمس الحسن، جو اب اپنے آپ کو ایس۔ حسن، لکھنے لگے تھے، سر یعقوب کے بعد دوسرا درجہ رکھتے تھے۔ شاید اگر اُن کے پہلے بھی سر لگا ہوتا تو وہی بازی جیت جاتے۔

بہر کیف، جو کچھ ہو۔ اب تو مسٹر ایس۔ حسن تھے اور شملہ و دلی کی رہائش۔ یا دوستوں میں جو دفتر ہی کے لوگ تھے، مسٹر حسن کافی ہر دلعزیز تھے۔ لیکن بس ملاقات وہ ہی کی تھی۔ البتہ کبھی کبھی چاء وغیرہ کی دعوت کر دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اسمیں کوئی زیادہ خرچ نہیں ہوتا تھا۔ بیوی سلیقہ والی تھیں، سب کچھ گھر ہی میں تیار ہو جاتا تھا۔ تاہم مسٹر حسن بازار سے بھی کچھ منگوالیا کرتے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اچھا ہوتا تھا، بلکہ اس لئے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ صرف گھر کی بنی ہوئی چیزاں پر ٹالدیتا ہے۔

انکی شادی ہوئے چھ برس ہو چکے تھے، اور اب ایک لڑکی اور ایک لڑکا موجود تھا۔ بچے ہوتے تو اس سے بھی زیادہ، لیکن اتفاق سے شملہ کے بازار میں ایک کباڑی کی دوکان سے اُنہیں میری سٹوپس کی ایک آدھ کتابیں سستے داموں مل گئیں۔ ان کتابوں کا اُن پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے علاوہ وہ برابر اس بات پر بھی غور کیا کرتے تھے کہ آخر انگریزوں کے اتنے کم بچے کیوں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے انکی بیویاں تندرست و توانا اور خوش و خرم رہتی ہیں۔ انکے جسم کیسے سبک اور سڈول ہوتے

ہیں۔ اس وجہ سے اُنھوں نے بھی طے کر لیا کہ میری سٹوپس کی تمام ہدایتوں پر پورے طور پر عمل کر کے اپنی بیوی کو بھی تندرست اور خوبصورت بنائے رکھیں گے۔ یہ بچے بھی بس غلطی سے ہو گئے بہرحال اب ان بچوں کیوجہ سے مسٹر حسن کی فکروں میں تو اضافہ ہو گیا لیکن اُن کی بیوی کی حیثیت بڑی حد تک ان بچوں کی آیا کی ہو گئی۔ ہر وقت ان کی وجہ سے بیچاری کچھ نہ کچھ سنا کریں۔ مسٹر حسن کے سپرنٹنڈنٹ نے اپنے بچوں کے لئے ایک گھوڑا رکھ چھوڑا تھا۔ وہ خود اتنا تو خرچ نہ کر سکتے تھے لیکن اُنھوں نے ایک گدھا پال لیا جس پر اُن کے بچے بھی ہوا خوری کو جاتے تھے۔

مسٹر حسن کو قدرت نے نفرت تانتول اور اطمینان دے رکھا تھا۔ اُن کو اپنے سوائے کسی اور چیز سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ گھر میں بچے بیمار پڑتے تو اُن کو پروا نہ ہوتی۔ حالانکہ بڑا بچہ انکا بڑا لاڈلا تھا بیچاری بخار میں جلا کریں تب بھی اُن پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ البتہ انکی تکلیف اور بھی اور بڑھ جاتی اسلئے جب سے شام کو گھر میں گھستے اور دوسرے دن جبتک دفتر نہ چلے جاتے ہر وقت بڑ بڑاتے رہتے۔ نہ کھانے کا ٹھیک ہے، نہ بیٹھنے کا۔ سارے گھر میں بچوں کے پوتڑے پڑے رہتے ہیں۔ یہاں ایک نے پیشاب کر دیا، وہاں دوسرے نے گندہ کر دیا۔ ڈرائنگ روم میں منوں خاک جمع ہے کوئی آ جائے تو کیا کہے گا؟

غرض یہ خراب ہے، وہ خراب ہے۔ بہرحال انھیں اپنی تکلیفوں کا تو پورا احساس ہوتا تھا لیکن بیوی بیچاری کی مدد کرنی اور کتار الٹ کر پوچھتے بھی نہ تھے۔ وہ غریب بخار میں جلتی رہتیں لیکن یہ ہل کر کبھی پانی بھی نہ دیتے۔ ایسی حالت میں بھی بیچاری میاں کی ہر آسائش کا برابر خیال رکھتیں۔ اور صبح سے شام تک بچوں، ناشتہ، کھانے وغیرہ میں لگی رہتیں۔ یوں بھی مشکل سے کوئی گھڑی فرصت کی ملتی تھی جو اپنی پڑوسنوں سے جا کر ملتیں۔ اس پر بھی اکثر فضیحتی ہوتی رہتی۔ میاں کسی بات سے بھی خوش نہ ہوتے تھے۔ اُنکو کام صرف اتنا تھا کہ صبح کو بڑے دن چڑھے اُٹھتے، اور دیر تک آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے دانتوں، آنکھوں، بال غرض ہر چیز کا بغور معائنہ کرتے گھنٹہ بھر تو صرف کپڑے پہننے میں لگا دیتے پھر چھڑی ہاتھ میں لیکر، مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے، سیٹی بجاتے، دفتر روانہ ہو جاتے۔

دفتر میں کسی کو "ہلو" کسی کو "گڈ مورننگ" کرتے ہوئے گھستے۔ پھر ذرا ٹائپ کرنیوالی لڑکیوں کی طرف سے گذرتے۔ اگر کسی نے نظر اُٹھا کے دیکھ لیا تو باچھیں کھل گئیں۔ وہیں سے "ہلو" "گڈ مورننگ" بہر قرآن کرتے، اور خوش خوش اپنے میز پر بیٹھتے مگر سویا ہوا تو کسی اور کی میز پر بیٹھ جاتے اور پھر وہاں دفتر کی باتیں چھڑ جاتیں، یعنی کام کے کثرت کی شکایت یا کسی کی بُرائی۔

فقیر سنگھ کو دیکھو۔ کس قدر بنتا ہے۔ جس دن سے فرسٹ ڈویژن ملا ہے سیدھے منہ بات
بھی نہیں کرتا۔ کام تو آتا نہیں لیکن اپنے آپ کو فرعون بے سامان سمجھتا ہے۔ کل ہی میرے
پاس فائل لے کے دوڑا ہوا آیا۔ مسٹر حسن ذرا یہ تو بتانا کہ کیا نوٹ لکھوں۔ اور اگر میرا کوئی کام
ہو تو ٹکا سا جواب دے دیتا ہے۔ میاں قسمت کی کھاتا ہے۔ میں تو اس جیسے دس کا کام ایک دن
میں نکال کر پھینک دوں۔ مگر میاں خوشامد کچھ کرنی آتی ہے۔ اسے دیکھو تو صبح سے شام تک
ڈارون کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ مگر ڈارون (سپرنٹنڈنٹ) کو ڈالیاں نہ چڑھاتا تو مر کے
بھی فرسٹ ڈویژن نہ ملتا۔ مگر بھئی ہم سے تو اس طرح خوشامد ہو نہیں سکتی۔ اسکو دیکھو تو دفتر
کے بعد اٹھ کے میم صاحب کے پاس سلام کرنے کو پہونچ جاتا ہے۔ اور ہمارے سو ملکٹیے
میں ملازمیں۔ انھیں وحشی ہندوؤں نے تو ہم سب کا ستیاناس مار رکھا ہے۔ یہ بیچارے
اینگلو انڈین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم اُن کے جوتے ہی صاف کیا کریں۔ اور سب انھیں خوشامد
کی بدولت۔ اور اوپر سے بڑے پیٹریاٹس بنتے ہیں۔ یہاں تو دن بھر جی حضور کرتے ہیں۔ باہر
نکلتے ہی کھدر پہنتے ہیں۔ وہ لعنتی ملک کی آزادی کے گیت گاتے ہیں جیسے گویا
ملک کو آزاد ہی کر لیں گے لیکن انگریز ہی دبتے ہیں تو انھیں لوگوں سے۔ اور یہ تو دیکھو
کہ ایک دوسرے کو کیسے گھسا لیتے ہیں۔ بس ایک کے پہونچنے کی دیر ہے۔ پھر تو چاروں طرف
ہندو ہی ہندو دکھائی دیتے ہیں۔ رائے صاحب جناداس نے دیکھو سپرنٹنڈنٹ ہوتے
ہی اپنی برانچ میں دو ہندو بھر لئے۔ ہم لوگ تو پتی کا گو ہیں۔ منصور صاحب ڈپٹی سکریٹری
ہو گئے لیکن ایک آدھ مسلمان کو رکھوا لینا کیا ہم لوگوں کی بھی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیسے منہ
کرتے تھے۔ لیکن جب کام پڑا تو کہنے لگے کہ سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ میں ہے ہی کیا؟ میں مجبور
ہوں۔ میرا حق کاٹ کے سنگھ کو فرسٹ ڈویژن تو دیدیا۔ لیکن اُس سے کام نہیں سنبھلتا!"

غرض اسی طرح کی باتوں میں وقت کٹتا۔ دوپہر کو ٹفن کے وقت جب چھٹی ہوتی تو ٹفن روم سے چاء
ٹوس، سینڈوچ وغیرہ منگا کر کھا لیتے۔ بیوی برابر کہتی تھیں کہ ناشتہ ساتھ لیجایا کیجئے۔ اور لوگ
بھی تو لیجاتے ہیں۔ لیکن یہ تکلیف کون گوارا کرتا۔ شروع شروع میں ٹکیاں اور شامی کباب لے
گئے۔ پھر کچھ روز تھرماس میں چائے، کچھ توس اور انڈا وغیرہ لیجانے لگے۔ لیکن یہ تجربہ بھی کچھ
کامیاب نہیں ہوا۔ دفتر میں جتنے انگریز اور اینگلو انڈین تھے ان کے گھروں سے نوکر ٹفن لے آتے
تھے۔ کچھ اینگلو انڈینوں کے نوکر اپنے ساتھ ان کے کھانے بھی لے آتے تھے۔ کچھ لوگوں نے دفتر ہی میں

انتظام کر لیا تھا۔ مسٹر حسن نے بھی دفتر ہی میں انتظام کر لیا۔ مگر پوری چیزیں لینے میں کافی خرچ تھا، اس لئے چاء اور توس پر ہی اکتفا کی۔ کھا پی کر میز پر پاؤں رکھ کے کرسی میں بیٹھ جاتے اور چھت کی طرف دھواں اُڑا اُڑا کے بڑی آسودگی سے سگرٹ پیتے، یا پھر اور لوگوں سے وہی دفتر کی باتیں۔ شام کو مال روڈ کا چکر لگا کے، عورتوں کو گھورتے، اور ٹہلتے ٹہلاتے، اپنا بھاری جسم لئے ہانپتے ہوئے بہت دیر میں گھر آتے۔ پہاڑ پر چڑھائی اُتار کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی۔ چاء پی اور جی چاہا تو کچھ دیر بیوی سے بات چیت کی یا بچوں سے کھیلے، نہیں تو ڈرائنگ روم میں کوئی پرانا سا یا انگریزی کا کوئی معمولی ناول جو کسی کباڑی کے ہاں سے خرید لاتے تھے، لیکے بیٹھ جاتے۔ وہ بیوی سے اکثر کہا کرتے تھے کہ۔

"ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں بیٹھتیں؟ انگریزوں کی عورتوں کو دیکھو کتنے آرام اور عیش سے رہتی ہیں۔ شام کو کھانے کے بعد، ہمیشہ ڈرائنگ روم میں سب بیٹھتے ہیں۔ کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تم تو سنتی ہی نہیں"

بیوی بیچاری ذرا پرانے خیال کی تھیں ان سے کرسیوں پر چڑھ کے نہ بیٹھا جاتا تھا۔ ایک آدھ بار انہوں نے کوشش کی لیکن اُن کی ٹانگیں ہمیشہ اُٹھکر کرسی پر آ جاتیں اور وہ آلتی پالتی مار لیتیں۔ لیکن مسٹر حسن کو یہ برا معلوم ہوتا تھا۔

"کوئی دیکھے گا تو مذاق اُڑائے گا' انہیں کرسی پر بھی بیٹھنا نہیں آتا!"

بیوی بیچاری عادت سے مجبور تھیں۔ دوسرے جب کبھی وہ اس کمرے میں بیٹھتیں تو خواہ مخواہ مسٹر حسن کو اس بات کا خیال آتا اور وہ اپنے بیوی سے کہتے۔

"دیکھو تو انگریزوں کی بیویاں کیسے اپنا سب کام خود کرتی ہیں۔ کپڑے دھونا، بازار سے سودا لانا۔ آخر تم بھی کیوں نہیں کرتیں۔ اس سے صرف کفایت ہی نہیں ہوتی بلکہ سامان بھی اچھا آ جاتا ہے، اور صحت بھی اچھی بنی رہتی ہے۔ مسٹر نائن کی میم کو دیکھو۔ آخر وہ بھی تو انگریز ہے، لیکن میاں کے لئے سگرٹ تک خود ہی بازار سے لاتی ہے"

آخر کو بیوی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ آئے دن ذرا ذرا سی بات پر میموں کے حوالے دئے جاتے اور تکرار فضیحتی ہوتی۔ کبھی صفائی پر، کبھی بچوں پر کبھی بیوی کی ہندوستانی عادت پر۔

آخر کار بیچاری کو دق ہو گئی۔ کچھ روز تو وہ اپنے بخار کو چھپائے رہیں، جوشاندہ وغیرہ

پڑی رہتیں لیکن مرض بیں روز بروز زیادتی ہی ہوتی گئی۔ مسٹر حسن روز کہتے۔

"یہ کیا منحوس بیماری لگ گئی ہے، کام دام کچھ نہیں کرتیں۔ بچے الگ رُلتے پھرتے ہیں۔ نہ بے وقت پر ناشتہ ملتا ہے نہ کھانا۔ مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ دن بھر دفتر کی بیٹھوں، اور گھر پر یہ اور مصیبت"

جب تک بیگم بیچاری کرتی رہیں۔ ہندوستانی بیوی کی بھی کیا زندگی ہے! اپنے آپ کو میاں کا غلام سمجھتی ہے۔ مصیبتیں اُٹھائے، بُرا بھلا سنے، بچے جنے، انکو پالے، میاں کی لاتیں کھائے اور منہ سے اُف تک نہ نکالے۔

غرض بیگم حسن کا حال ابتر ہی ہوتا گیا۔ اب تو مسٹر حسن کو بھی خیال آیا، اور ایک معمولی ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دیا۔ اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے، اور پھر ڈاکٹر سے حال کہنے کے لئے بھی کوئی نہ گیا۔ غرض دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب اُن کا حال یہ ہو گیا کہ چارپائی پر پڑی رہتی تھیں آنکھوں میں حلقے پڑ گئے اور رنگ سیاہ ہو گیا، بخار سے جسم تپتا رہتا اور کھانسی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ اکثر تو اُنہیں ایسی کھانسی اُٹھتی کہ معلوم ہوتا اب آنکھیں باہر ہی نکل پڑیں گی۔ لیکن مسٹر حسن دفتر سے آتے تو چڑچڑ ہی کرتے رہتے۔

"ایک تو ویسے ہی کونسا آرام ملتا تھا، اور اب یہ مصیبت آن پڑی ہے۔ کسی بات کا بھی ٹھیک نہیں"

بیوی بیچاری تو مردہ ہو ہی رہی تھیں، یہ سنکر اور بھی سہم جاتیں۔ جو کچھ ہو سکتا پلنگ پر ہی پڑے پڑے کرتیں، میاں کے ناشتہ کے لئے کہیں انڈا ملتا، انڈا پکا لیا یا حلوا بنا لیا۔ مگر اپنے لئے کچھ نہیں۔ بچے بیچارے دن بھر مارے مارے پھرتے۔ گھر میں ایک مرد اور ایک لڑکا نوکر تھا۔ جب بیوی کا یہ حال ہوا تو نوکروں نے بھی لاپروائی شروع کر دی۔ بچوں کو کپڑے بدلے ہوئے کئی دن گذر جاتے مگر نہاتے۔ شام کو مسٹر حسن اس پر بھی کہتے۔

"بچوں کا تو ذرا حال دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے اُن کی ماں مر گئی اور وہ یتیم ہو گئے ہیں۔ کس قدر میلے کپڑے پہنے ہیں۔ نوکروں کے بچے بھی اتنے گندے نہ رہتے ہوں گے"

بیوی کا یہ حال تھا کہ پانی پینے کے لئے اُٹھنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ میاں کو یہ توفیق کہاں کہ نام ہی کے لئے سہی گھر کے کام میں ذرا ہاتھ تو بٹائیں۔ اُن کو اپنے آپ سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔

آخر کار بیوی نے اپنی حالت کا حال اپنے گھر لکھ دیا۔ اُن کی ماں تو بچپن ہی میں مر چکی تھیں۔ والد نے سُنا تو بہت پریشان ہوئے، اور خود آ گئے، اُن کی خالہ بھی جنھوں نے اُن کو پالا تھا، ساتھ بھاگی ہوئی آ گئیں۔ دونوں والد اور خالہ اُنکی حالت دیکھ کر رونے پیٹنے لگے۔ لیکن مسٹر حسن مسکرا کر بولے۔

"ارے صاحب آپ لوگ ناحق اسقدر پریشان ہو رہے ہیں۔ تھوڑے دن کی کیا بات ہے معمولی بخار ہے ڈاکٹر کو دکھا ہی چکا ہوں۔ کچھ روز میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ نہ معلوم انہوں نے آپ کو لکھ ہی کیوں دیا۔"

اب چونکہ گھر میں اور آدمی آ گئے تھے مسٹر حسن اور بھی بے فکر ہو گئے۔ شام کو مال روڈ کے بجائے ایک چکر کے دو چکر لگاتے، رات گئے گھر آتے، اور بغیر بیوی کے کمرے میں جھانکے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ اگر بہت ہوا تو اتوار کے دن جیسے مکان کی صفائی کی جاتی ہے، مسٹر حسن کوئی دس منٹ یا پندرہ منٹ کے لئے بیوی کے پاس جا بیٹھتے، لیکن تمام وقت اس طرح کا لیکچر دیتے کہ بیوی کے کنو بنے گئے، چلنے پھرنے پر، بچوں کی دیکھ بھال پر۔ وہ کہتے "کام کاج میں دل لگاؤ۔ نہ کہ یوں نہیں بیٹھ جاتیں۔ ذرا ٹہلو، طبیعت ٹھیک کیسے ہو۔ پڑے پڑے کھانا بھی ہضم نہیں ہو سکتا" اور بیوی کا یہ حال تھا کہ پلنگ پر بھی مشکل سے اُٹھ کر بیٹھ سکتی تھیں۔

جب کبھی سسرے سے بات چیت ہوتی، کام کی شکایت کر دیتے۔

"آج کل کیا حال ہے! مجھے تو آجکل کام کی وجہ سے سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہیں ہوتی۔ اتنے کیسیز آ گئے ہیں، کہ ڈھیر اکٹھا ہو گیا ہے۔ اسقدر کام ہے کہ اب جا کر فرصت ملی ہے"

پھر کھانا کھا کے اگر بہت خیال آیا تو بیوی کے پاس ایک آدھ منٹ کو کھڑے ہو گئے، اور اس کے بعد بستر میں لیٹ جاتے، اور کتاب پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔

ایک روز رات کو اُنہیں بیوی کی کچھ ایسی محبت آئی کہ تھوڑی دیر کے لئے اُن کی چارپائی کے پاس جا کے بیٹھ گئے۔ ان کے سُسر اُسی وقت کہیں چلے گئے تھے۔ بیوی کی خالہ دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ مسٹر حسن کی بیوی چارپائی سے لگی مردے کی طرح پڑی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں چھت پر گڑی ہوئی تھیں۔ سانس کے چلنے کی آواز خر خر آ رہی تھی، جیسے بھاڑ کی چھوٹی دھونکنی میں ہوا کا سناٹا۔ مسٹر حسن نے بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سامنے میز پر بوتلوں، ڈبوں اور گدڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مسٹر حسن کی نگاہیں ان چیزوں پر پڑیں اور ان کی تیوری پر بل آ گئے۔ وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بیوی کے کمزور جسم کو جنبش ہوئی، اور گڑگڑا کر کانپتی ہوئی، نحیف آواز میں کہنے لگیں۔

"میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ اور شادی کر لیجئے۔ میں بچوں گی نہیں۔"

میرا خیال ہے آپ تکلیف نہ اٹھائیے:

ان کی آواز بھرا گئی، اور ایک گرم آنسو ان کے گال پر بہتا ہوا تکیے پر گرا۔ مسٹر حسن نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ سامنے اونچے پہاڑ کا سلسلہ رات کی تاریکی میں، سیاہ اور مدھم، آسمان تک چلا گیا تھا۔ پہاڑ کے دامن پر یکایک ایک الاؤ کی آگ بھڑکی، لیکن فوراً ہی دب گئی اور اندھیرے کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔

بیوی کے ان مایوس کن الفاظ نے مسٹر حسن پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ اپنا غصہ بھول گئے، اور بیوی کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر بولے۔

"نہیں اس طرح کی باتیں مت کرو۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ اتنی ہراساں کیوں ہوتی ہو۔ کل میں ڈاکٹر سینکلین کو بلا کر تمہیں دکھا دوں گا۔ بڑا ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔"

ان جملوں نے ان کی بیوی کے اندر غلامی کے اس احساس کو ابھار دیا جو صدیوں سے ہندوستان کی عورتوں میں موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ان جملوں نے ان کے اندر نئی جان ڈال دی۔ ان کے چہرے پر اس خوشی کے آثار نمایاں ہونے لگے جو ایک غلام کو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس کا آقا اس سے کبھی اچھی طرح بات کرے، یا کتے کی وہ وجدانہ کیفیت جو اپنے مالک کے پیار کرنے اور چمکارنے سے اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت بیگم حسن کا جی یہ چاہتا تھا کہ بڑھ کر اپنے میاں کے قدم چوم لیں۔ وہ بستر ہی پر پڑے پڑے اپنے اچھے ہونے اور میاں کی خدمت کرنے کے خواب دیکھنے لگیں۔

صبح اٹھ کر مسٹر حسن نے ڈاکٹر سینکلین کو ٹیلیفون کیا۔ اسے دس بجے سے پیشتر فرصت نہ تھی، اسلئے اس نے دس اور گیارہ کے درمیان آنے کا وعدہ کیا۔ مسٹر حسن کو تو دفتر جانا تھا اسلئے اپنے خسر سے کہہ کر چلے گئے.... شام کو دفتر سے ذرا جلد واپس آئے، اور خلاف معمول اپنے بیوی کے کمرے میں چلے گئے، اور خسر سے پوچھا کہ ڈاکٹر کیا کہتا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"وہ دیکھ گیا ہے۔ دوا بھی تجویز کر دی ہے۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ میں ان کے شوہر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس پر مسٹر حسن بولے۔

"کیوں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ وہ کچھ انجکشن وغیرہ دینے کو کہتا تھا۔"

"تو مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتا ہے؟"

"میاں تم آخر کو شوہر ہو۔ اس خیال سے کتا ہوگا کہ تم تو شعار ہو؟"

"میں کیا کرونگا؟ وہ اسکے لئے کہتا ہوگا کہ بازار سے لا دو۔ اور کیا۔ لیکن مرض کیا بتاتا تھا؟"

"یہ تو مجھ سے کہا نہیں۔ غالباً۔ وہ کہتا تھا انشاء اللہ آرام ہو جائے گا۔"

"تو آخر مرض کیا تجویز کیا؟"

پہلے تو خسر خاموش رہے مگر کچھ دیر بعد بولے۔

"شاید تم سے اسی کے بارہ میں بات چیت کریگا؟"

"تو صاحب میں کیا کروں گا۔ کیا آپ سے نہیں کہ سکتا تھا؟"

"میاں تم آخر شوہر ہو۔"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کرونگا۔ آپ آخر چھپا کیوں رہے ہیں؟ کہ کیوں نہیں دیتے کہ دق بتاتا تھا..."

خسر ویسے ہی فکر اور پریشان تھے۔ یہ سنکر غصہ سے لال ہو گئے۔ مریض کے منہ پر صفائی سے کہدینا تم کو دق ہو گیا ہے! لیکن وہ بیچارے بھی کیا کہہ سکتے تھے۔ آخر کو بیٹی دے چکے تھے۔ اب تو صبر کے سوائے کچھ اور چارہ نہ تھا...

مرض جڑ پکڑ چکا تھا۔ اور ڈاکٹر مینکین کے علاج سے بھی بیوی کو کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ چنانچہ انکی خالہ اور والد نے یہ صلاح کی کہ انکو دلی لے جا کر حکیموں کو دکھائیں۔ پہلے تو مسٹر حسن نے کہا "دق کے مریض کو گرمی میں لیجانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ دوسرے حکیموں کے علاج میں دھرا کیا ہے۔ صرف بھر بھر کے قدحے پلاتے ہیں۔ نہ مرض پہچانیں، نہ ٹھیک علاج کریں..." لیکن ان لوگوں کے اصرار پر راضی۔

اتوار کا دن ان لوگوں کے دلی جانیکے لئے مقرر ہوا۔ ہفتہ کی رات کو چونکہ خسر اور خالہ ساس اسباب وغیرہ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے، مسٹر حسن اپنی بیوی کے پاس جا بیٹھے۔ وہ چارپائی کے پاس خاموش بیٹھے تھے پچھلی آسائشوں کا خیال کر کے ایک حد تک مغموم تھے۔

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کڑک کی آواز ہوتی تھی۔ بادلوں میں تیزی سے بجلی چمکتی اور پھر پہلے کی نسبت زیادہ تاریک اور اندھیرا ہو جاتا۔ بجلی کی چمک میں بیوی کا چہرہ سفید اور مرجھایا ہوا چمک اٹھتا، اور آنکھوں کے گڑھے اور چہرہ کی ہڈیاں اور نمایاں ہو جاتیں۔ باہر درختوں میں ہوا کا چلنا ایک کرۂ سرد کی طرح مایوس کن معلوم ہوتا تھا۔

مسٹر حسن کی بیوی نے انکی طرف کئی دفعہ غم اور یاس سے دیکھا اور وہ بھی بیوی کو تسلی دینے لگے۔ لیکن ی نے میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ نحیف ہاتھ بالکل سرد تھا۔ وہ تھپکی اپنے میاں کا ہاتھ بھینچے رہیں، جیسے اب انکو پنپنے کی کوئی اُمید نہ تھی الغرض انہیں سہارے کے لئے انکے پاس اپنے میاں کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس مصورانہ حرکت میں وہ درد اور گداز تھا، زندگی میں وہ احساسات انتہا جو انسان موت سے کرتا ہو، وہ حسرت بھری خواہش جو کوئی مرتے وقت اپنے محبوب سے کرتا ہو کہ مجھے اس آخری وقت میں نہ چھوڑنا۔ اسمیں موت کی ہولناکی تھی اور وہ ڈر جو موت کے سامنے انسان پہ غالب آجاتا ہو۔ وہ دلگیر حسرت جو دنیا کی چیزیں چھوڑتے وقت اپنے جیبوں سے جدا ہوتے ہوئے انسان کو اس بات کا احساس دلا دیتی ہے کہ ہم رخصت ہو رہے ہیں اور اب پھر کبھی واپس نہ آئینگے۔ یہ زندہ رہنے، ہنستے بولتے، محبت کرنے اور محبت کئے جانے کی مبہم خواہش تھی مگر اُسوقت وہ ناامید تھیں کہ اب انہیں موت سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس ذرا سی درد بھری حرکت میں وہ دریائے محبت موجزن تھا جسنے مسٹر حسن کو بھی افسردہ کر دیا۔ انکا ہاتھ کانپنے لگا، اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں ٹپک پڑیں۔۔ ایک بھٹکا ہوا جگنو کمرے میں آگیا، لیکن ایک لمحہ چمکنے کے بعد پھر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ زور سے بجلی چمکی، اور پہاڑوں تک ہوا کا سناٹا بڑھ گیا۔۔

مسٹر حسن کالکا تک اپنی بیوی کو پہونچانے گئے۔ اور دلی کی گاڑی میں سوار کرانیکے بعد شملہ واپس آگئے۔ گھر انکو اکیلا اور سونا معلوم ہوا، لیکن ایک آدھ روز میں وہ اُس کے عادی ہو گئے۔

دلی سے روزانہ بیوی کی خیریت کے خط آتے رہے۔ لیکن حکیموں کے علاج سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا گیا، جادو ٹونکے، گنڈے، تعویذ کئے گئے لیکن کسی چیز سے افاقہ نہ ہوا۔ روز بروز حالت خراب ہی ہوتی گئی۔ آخرکار ایک روز مسٹر حسن کے پاس تار آگیا کہ تمہاری بیوی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئیں اور آپ آزاد ہیں۔

کچھ روز تو مسٹر حسن افسوس میں رہے۔ گھر کی بربادی اور آرام کے ختم ہونے کا خیال دس پندرہ روز تک ان پر نمایاں اثر کئے رہا۔ اور بچوں کے خیال نے انکی پریشانی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد ہی وہ نئی زندگی کے خواب دیکھنے لگے۔

اور اب وہ دوسری شادی کرنیکی فکر میں ہیں۔ کئی ایک پیغام آچکے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے طے کر لیا ہے کہ لڑکی دیکھے اور اُس سے ملے ہوئے بغیر شادی نہ کریں گے۔۔۔

تنقید کتب

کلیم عجم

جناب سیماب اکبرآبادی کی تازہ کتاب ہے۔ جو نثر اور نظم دونوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں مولانا سیماب کے چودہ خطبات ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف مشاعروں کیلئے لکھے گئے تھے - یہ خطبات تاریخی ، جغرافیائی اور علمی معلومات سے معمور ہیں ۔ اور انہیں جگہ جگہ دلچسپ نکات بیان کر کے اُردو کو نشو و نما و ترقی دینے کی ترکیبیں بتائی گئی ہیں مثلاً آپکی رائے میں -

(۱) قومی انجمنوں کے دوش بدوش قومی مناظمے منعقد ہونا چاہییے جنمیں شاعر لوگ کسی خاص موضوع پر نظمیں پڑھی جائیں۔

(۲) مبتدی شاعروں کو مشاعروں میں غزل پڑھنے کے بجائے بزرگان وطن اور شاہیر شعرا کا کلام خود فکر کے ساتھ سنکر انکی کہنہ مشقی تجربہ کاری سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

(۳) اہل قلم کو تقلید چھوڑ کر اجتہاد کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے ، ایران میں زلفوں پر مقراض چل چکی ، بند قبا ٹوٹ چکے ، کجکلاہی کا دور ختم ہو چکا ، مگر ہندوستانی شاعر ایرانی ایران کی تقلید میں ، ابتک خیالی زلفوں کی درازی سے طول شب ہجر کی پیمائش کرتا ہے اور کہتا ہے

جب طبع الشاعر فہم سے بڑھیں دل کی وحشتیں
سایہ سمجھ لیا تری زلفِ دراز کا

مولانا سیماب کا دل جذبات محبت وطن اور اُردو علم ادب کی محبت سے تڑپ رہا ہے انکی خواہش ہے کہ اُردو شعرا غیر قوموں خصوصاً ایرانیوں کی کورانہ تقلید کو چھوڑ کر فطرت کی صحیح ترجمانی کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں مولانا سیماب لکھتے ہیں -

(۱) خدا کے لیئے اپنی شاعری کو آلۂ کار بنائیے اور اس الزام کو شاعری سے دور کر دیجیے کہ وہ ملک کیلئے مفید نہیں ہے۔

(۲) شاعری ایک بہترین عطیہ فطرت ہے ایک لطیف ترین روحانی جذبہ ہے۔ جو خصائص انسانیہ میں وسعت پیدا کرتی ہے شاعری میں جو امور ہیں وہ بیک وقت قدرت نے اُردو شاعری کو ودیعت فرمائے ہیں۔ موجب اپنی عدم بخلوص کے لیے

مشہور ہے۔ مغرب اپنی فطرت نگاری پر نازاں ہے، ہندی شاعر جذبات کا شائق ہے۔ یونان فصاحت کا ملجا ہے، جرمنی نفسیات کی تحلیل پر حاوی ہے، ایران دو تو میات کی تبلیغ کا علم بردار ہے، مگر میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اُردو شاعری میں مذمت بھی ہے، بزم بھی، فطرت نگاری بھی ہے، رومان بھی، تحلیل نفسی بھی ہے اور جذبات کی ترجمانی بھی، قومی تبلیغ بھی ہے اور سیاسی تلقین بھی۔ صرف ہماری سہل پسندیاں اور غفلت کاریاں ہیں کہ اُردو شاعری روبزوال نظر آتی ہے۔ ہم قافیہ پیمائی، معاملہ بندی، جوش، مبالغہ، تکلف اور آورد کی دلدل میں اس طرح پھنس گئے ہیں کہ ہمیں نکلنے کے لیے راستہ نہیں ملتا۔ اگر ہم فکر و تامل سے کام لیں تو اسی خارزار قدامت و تقلید سے ایجاد و اختراع کے پُر بہار چمن پیدا ہو سکتے ہیں۔

۳۔ صاحبو! زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب فرضی عشق و محبت جتانے کا وقت باقی نہیں رہا۔ اب مجازی جذبات وصل و فراق کی نقالی کا موقع نہیں رہا۔ حقیقی موضوعات اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت بھی نہ ملنی چاہیے۔ ہم شاعر ہیں، ہمیں فطرت کے الہام کدے سے ایک فلک رس ذہن عطا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے خیالات میں ترفع پیدا کرنا چاہیے، ہمیں کاغذ پر ذہن سے وہ چیز لانی چاہیے جو ہمارے بعد کاغذ سے ذہنوں میں منتقل ہو سکے اور جو ہمارے لیے، ہمارے ملک کے لیے، اور فرزندانِ وطن کے مستقبل کیلئے ایک ابدی پیام بن سکے۔ اگر ہم من حیث الشاعر دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور اگر ہمیں اپنی شاعری کو ایک زندہ قوم کی شاعری بنانا منظور ہے تو ہمیں اپنی ذہنیت، موجودہ تخیل، اور موجودہ قول و ضوابط میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ موجودہ شاعری اپنے موضوعات، قواعد اور رسمی فوائد و عوائد کے ساتھ نہ صرف خود فنا ہو جائیگی بلکہ ایک دن اپنے ساتھ ہمیں بھی فنا کر دیگی

۴۔ تقلید ہی ہمارا نصب العین کیوں ہو؟ ہم اپنے ذہنوں کو دوسروں کے دل و دماغ سے نکلی ہوئی پیداوار کی جگالی کے لیے مجبور کیوں کیے ہوئے ہیں اور ہم بیگانوں کے نقش پر چلنے کو مدبر منزل کیوں سمجھے ہوئے ہیں؟ کیا ہندوستان کا ماحول ہماری شاعرانہ تخیل تشنگی کو نہیں بجھا سکتا؟ کیا ہندوستان کا سواد شعریت آفریں اور شعر نگار نہیں ہے۔ کیا گنگا جمنا کی موجوں میں نغمے نہیں، کیا تیل اور نہر رکن آباد کا پرکیف تموج نہیں پایا جاتا؟ کیا ہمارے ملک کے جنت فریب باغوں میں بلبل سے بہتر کوئی خوش الحان طائر موجود نہیں؟ کیا ہم کوئل اور پپیہے کو محض اس تعصب کی وجہ سے اپنی شاعری میں دعوت شرکت دینا نہیں چاہتے کہ ہندی یا بھاشا شاعری میں اُنکے نغمے گونج چکے ہیں؟ کیا جمالیاتی ذوق کی نشو و نما تکمیل اور معرفت صحیح کے لیے احساسِ نظر پر موج اُترنے والا جمال، اس سرزمین میں حسن و محبت میں موجود نہیں؟ کیا ایران کے فرہاد و شیریں، نجد کے قیس و لیلیٰ، مصر کے یوسف و زلیخا، اور عراق کے وامق و عذرا سے بہتر رومان، کنک اور تارا، نل اور دمن، ہیر اور رانجھا کی دلفی

انسانوں میں نہیں ملتا ؟ کیا منارِ تجلی کے لئے صرف موسیٰ بن عمران اور طور سینا مخصوص ؟ اور بودھ، یا کرشن یا ایسے ہی دوسرے عرفان یافتہ انسانوں کا ذکر کرنا معیوب کلام کی کوئی شان ہے ؟ اور کیا دار و رسن کی روایات زندہ کرنے کے لئے ابن منصور حلاج کے علاوہ کوئی مثال کسی ملک میں نہیں ملتی!

مولانا سیماب کے خطبات اسی قسم کے جواہر پاروں سے بھرے ہوئے ہیں جنکا تعلق دیکھنے سے ہے۔ البتہ مولانا کے بعض خیالات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، مثلاً آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

اگر آج ساری دنیا کا ایک لشکر عظیم تیار کیا جائے۔ تو شعرا بطور مقدمۃ الجیش اسکے آگے آگے ہوں گے۔ اور اس کی فتحیابی و کامرانی، حرکت، روانی، صرف شعرا کی اثر آفرینی اور گرم نوائی پر موقوف ہوگی ؛

آجکل کی لڑائیوں میں کڑکے یا رجز کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اگر شعرا مقدمۃ الجیش بنکر آگے بڑھینگے تو مشین گنوں اور زہریلے گیس کے بموں سے قافیہ درکنار عرصۂ حیات تنگ ہی ہوجائیگا۔

خطبات کے آخر میں مولانا سیماب نے اپنی مختصر سی خود نوشت سوانحعمری بھی لکھدی ہے۔ اور اُن الفاظ کی فہرست دیدی ہے جو آپ کے نزدیک متروک ہیں۔

کلیم عجم کا حصۂ نظم تین حصوں میں منقسم ہے۔ جن کے نام علیحدہ علیحدہ (۱) نشید نو (۲) بادۂ دوشین۔ اور (۳) صہبائے کہن ہیں۔ پہلا نام یعنی "نشید نو" غرابت سے خالی نہیں اس حصہ کی تمام غزلیں تاریخ وار بقید مقام مشاعرہ درج ہیں جس سے آپ کے کلام کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

مقدمات کے سلسلے میں مولانا نے اُردو شاعروں سے دریافت کیا ہے کہ کیا ایران کے فرہاد و شیرین، نجد کے قیس و لیلےٰ، مصر کے یوسف و زلیخا، اور عراق کے وامق و عذرا سے بہتر سوہان کنک اور تارا، نل و دمن اور ہیر رانجھا، وطنی انسانوں میں نہیں ملتا؟ کیا منارِ تجلی کے لئے صرف موسیٰ بن عمران اور طور سینا مخصوص ہیں؟ ان سوالات کے جواب میں خود مولانا سیماب لکھتے ہیں :۔

طور موسیٰ

مری رسائی سے دور ہے تو مگر ابھی مجھکو یاد ہوگا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں اُلٹ دیا تھا نقاب تیرا

طور موسیٰ، دلِ طائف، چمنستانِ خلیل
یادگاریں ہیں یہ تری جلوۂ جانان کیا کیا

جب تجلی ان کی برق آثار یوں بن آگئی
آبلے سے دل کے پیدا طور سینا کردیا

جاکر جو میں نے کل اَرِنی طور پر کہا — آواز آئی موسیٰ عمران نہیں ہیں آپ!

لیلیٰ مجنون:-

نجد کے ہر ذرے سے اعجاز محبت پوچھیے — پڑ گئی جس پر نگاہ قیس لیلےٰ ہو گیا
خراب رہگذار قیس کر اپنی نگاہوں کو — جو لیلےٰ بن کے نکلیگا اسی محمل سے نکلیگا
قیامت میں نہ ہو پردہ دری حسن و محبت کی — سنا ہے قیس اے لیلیٰ ترے محمل سے نکلیگا
جلوہ کوئی نگاہ میں باطل نہیں رہا — اب امتیاز لیلیٰ و محمل نہیں رہا

قیس و فرہاد:-

وہ عبا قیس کی، فرہاد کا وہ جامۂ تنگ — دشت و کہسار نے دیکھے ہیں گریباں کیسے کیسے

یوسف:-

تعبیر ہیں میری یوسف ثانی تو آپ ہیں — آنکھوں میں میری خواب پریشاں نہیں ہیں آپ

محمود و ایاز:-

پیکر غزنوی میں روح دی عشق نے داد بندگی — حسن نے کیں کرامتیں بندگیٔ ایاز میں
یہی راز تھا کہ حقیقتیں رہیں راز بزم مجاز میں — وہی غزنوی کی نظر میں تھی جو گرہ تھی زلف ایاز میں

مولانا کی شاعری پر ہم اس سے قبل "کاروان امروز" کے سلسلے میں ریویو کر چکے ہیں۔ اب مزید تعارف نویسی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے پختہ کار، کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت آپ کا کلام تعریف سے مستغنی ہے۔ بہرنوع یہ کتاب اس قابل ہے کہ اردو ادب کے فدائی اسکا ضرور مطالعہ کریں۔

لکھائی چھپائی سب عمدہ۔ ضخامت چار سو صفحات۔ سائز بڑا۔ مجلد۔ کتاب میں مولانا کی جوانی اور موجودہ عمر کی تصویریں بھی ہیں قیمت غالباً تین یا چار روپیہ ہونگے۔ ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت قصر الادب آگرہ

حدیث حسن

یہ سید شمیم احمد صاحب فطرت واسطی کی پچاس نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ فطرت صاحب اردو کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ انکی نظمیں زمانہ۔ اور اردو کے دیگر نامور رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں ابھی وہ ماشاءاللہ جواں سال ہیں۔ اسلیے انکے کلام میں حکمت کا فلسفہ یا تصوف و اخلاقیات کے خشک مضامین کے بجائے وہی جذبات زیادہ نظر آتے ہیں جن کا عہد شباب متقاضی ہے خیالات میں بلندی و الفاظ میں روانی و ترنم، بندشوں میں چستی بھی موجود ہے۔ غرضکہ کلام پڑھنے سے

طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے، گو اسکا اثر زیادہ دیرپا نہیں ہوتا۔ مناظر فطرت سے متاثر ہو کر جب وہ الفاظ میں انکی تصویر کھینچتے ہیں تو دلچسپ اور موزون الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ شروع میں مسٹر اقبال سہیل نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے اور حضرت صاحب کے کلام کی تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ مقدمہ واقعی قابل قدر ہے۔

اس کتاب میں واصفی صاحب کا فوٹو بھی ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، چھوٹی تقطیع کے ۱۱۲ صفحات، مجلد قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ:۔ شاہکار بکڈپو، گورکھپور

کلام ٹیگور

یہ ہندوستان کے شاعر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے اکیسوں گیتوں کا اردو نثر میں ترجمہ ہے۔ جو موصوف کی قائم کردہ آورش یونیورسٹی شانتی نکیتن میں عموماً گائے جاتے ہیں۔ اس مختصر سے مجموعہ کو "مشتے نمونہ از خروارے" سمجھنا چاہیے کیونکہ ڈاکٹر صاحب ممدوح کے صرف گیتوں کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے اور کل منظوم کلام انکا اتنا ہے کہ پندرہ ضخیم جلدوں میں سما سکتا ہے۔ حال میں ڈاکٹر ٹیگور کی پچھترویں سالگرہ منائی گئی تھی جسکی خوشی میں ہم نے گذشتہ نمبر میں ان کی دو نظمیں شائع کی ہیں، غرض ابھی آپ کی تصانیف کا سلسلہ جاری ہے۔ اور خدا کرے عرصہ تک جاری رہے۔

ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے عموماً وہ خوبیاں اکثر زائل ہو جاتی ہیں جو اصلی کلام میں موجود ہوتی ہیں تاہم محمد ضیاء الدین صاحب پروفیسر شانتی نکیتن مبارکباد دینے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے گیتوں کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ گو اصلی گیتوں کی تازگی، دلبستگی تخیل کی بلندی الفاظ کی موزونیت اور روانی اور مصرعوں کا ترنم اور موسیقیت کا کسی نثر ترجمے میں قائم رہنا ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی مترجم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو بہت پسندیدہ الفاظ اور پاکیزہ ترکیبوں کا لباس پہنایا ہے۔

ٹیگور کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اسکی الہامی سادگی اور بیساختگی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر لکھتے وقت دماغ پر بالکل زور نہیں دیتے بلکہ جو کچھ دل پر وارد ہوتا ہے اسے برجستگی کے ساتھ موزون الفاظ میں بے تکلف بیان کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انکا ہر شعر واردات قلب کی مسکراتی تصویر ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی کلام میں حریت و آزادی اور وطن پرستی کے جذبات بھی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

ٹیگور فطرت کے دربار سے دنیا کے لئے ایک پیغام لائے ہیں اور وہ پیغام یہ ہے کہ ہر قوم وقت کو

ہو دوسری قوم و ملت کی حیثیت انسان میل جول اور اتحاد کرنا چاہیے۔"

آپ کا چہرہ پیغمبرانہ جلال اور آپکا کلام اعجاز عیسوی لیے ہوئے ہے ہمارے نزدیک ہر محب وطن اور جذبات عالیہ کے ہر شیدائی کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اور اُن مبتدی شاعروں کیلئے تو اسکا پڑھنا قطعی ناگزیر ہے۔ جو ابھی معمولی حدود سے باہر نہیں نکلے ہیں اس کتاب کے شروع میں ڈاکٹر ٹیگور کا فوٹو اور اسکے بعد چودہ صفحات پر مترجم صاحب کی فاضلانہ تمہید ہے جسمیں ڈاکٹر صاحب کے کلام کی خصوصیات پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔

لکھائی چھپائی ٹائپ، کاغذ عمدہ اور قیمتی، ضخامت ۲۲ × ۱۸ سائز کے ایکسو تیس صفحات، کتاب مجلد ہے قیمت ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- وشوا بھارتی بک شاپ ۲۱۰ کارنوالس اسٹریٹ کلکتہ۔

ٹیگور اور اُن کی شاعری

اس چھوٹی سی کتاب میں مولانا مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے۔ نے ڈاکٹر ٹیگور کے سوانح حیات پر روشنی اور انکے کلام اور تصانیف پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ آجکل کی دنیا میں جبکہ ہر شخص علم الموت، ہر زندگی کی دوا دوش میں مبتلا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے مطالعہ سے بہت فائدہ ہوگا۔ کالج اور اسکول کی بڑی کلاسوں کے طلبا کو یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہیئے۔

لکھائی چھپائی کاغذ معمولی، ضخامت چھوٹے سائز کے آٹھ جزو۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ۔ جو ہمارے نزدیک بہت زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد۔ دکن

ہمارے افسانے

ملک کے نوجوان ادیب سید وقار عظیم ایم۔ اے۔ کی یہ تازہ تصنیف فن افسانہ نویسی کی مختصر تاریخ ہے جسکے پہلے حصہ میں فن افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں مثلاً ابتدا اور ارتقا، مقامی رنگ، اخلاقی مقصد، ترجمے، عورت کا تخیل، محبت اور نفسیات، نیز افسانہ نگاری کے مستقبل پر بحث کی گئی ہے۔ اور دوسرے حصہ میں ملک کے مشہور افسانہ نگاروں مثلاً منشی پریم چند، سدرشن، نیاز فتحپوری، سید سجاد حیدر، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی، ڈاکٹر اکبرلوی وغیرہ وغیرہ ستائیس افسانہ نگاروں پر تنقید کی گئی ہے۔ اور انکے طرز تحریر کے خصوصیات پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملک کے مبتدی افسانہ نگار اس کتاب کے مطالعہ سے

کچھ مستفید ہو سکتے ہیں۔
لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۹۰ صفحات، قیمت سوا روپیہ ۱؎
ملنے کا پتہ :۔ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد

افسانہ نگاری

ہندوستان کا کوئی رسالہ یا اخبار اٹھا کر دیکھ لیجئے، اُسمیں آپ کو مختصر افسانے ضرور ملینگے، گویا افسانہ نگاری آجکل کی ادبی دنیا کے فیشن میں داخل ہے۔ لیکن اُنکے لکھنے والوں میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں، جو یہ بھی نہیں جانتے کہ افسانہ کیا چیز ہوتی ہے؛ کیونکر لکھا جاتا ہے؟ اور کس مقصد کے لیے لکھا جاتا ہے، نوجوان ادیب سید وقار عظیم ایم۔ اے۔ نے مندرجہ عنوان کتاب لکھکر ہندوستانی افسانہ نگاروں کے لئے شاہراہ ہدایت قائم کردی ہے۔ یہ کتاب ابواب میں تقسیم ہے (۱) افسانہ کی حقیقت (۲) پلاٹ (۳) شرفی (۴) فنی ترتیب (۵) ابتدا و خاتمہ (۶) کردار نگاری (۷) افسانہ اور حقیقت (۸) افسانہ اور محبت (۹) افسانہ اور اتحاد اثر۔ ان جملہ امور پر فاضل مصنف نے بہت خوش اسلوبی سے بحث کی ہے۔
لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، ضخامت دوسو صفحات۔ قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد

ساقی دہلی کا جاپان نمبر

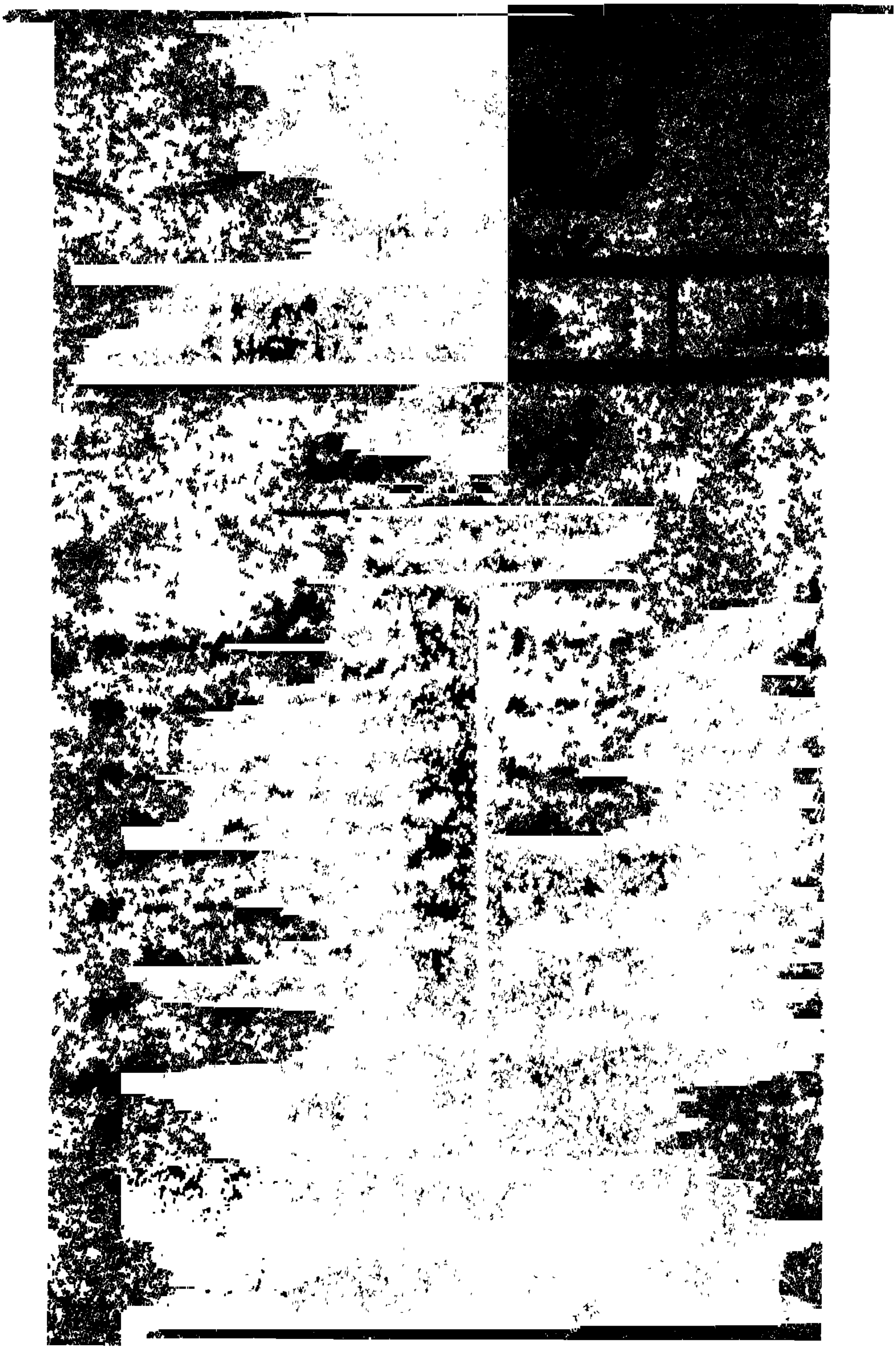
یوں تو ملک کے بہت سے رسالے سال میں کوئی خاص نمبر نکالنے کا شوق رکھتے ہیں۔ لیکن معاصر ساقی دہلی کے خاص نمبروں کی خصوصیت اکثر نمایاں ہوتی ہے۔ چنانچہ اسکے جاپان نمبر میں تقریباً تمام مضامین جاپان کے متعلق شائع کیے گئے ہیں جن میں سے بعض مضامین جاپانیوں کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ مضامین کی فراہمی میں پروفیسر نورالحسن برلاس استاد اردو یونیورسٹی ٹوکیو جاپان اور انکی محترمہ بیگم صاحبہ نے بہت زیادہ حصہ لیا ہے۔ درحقیقت اگر انکی امداد و اعانت شامل حال نہ ہوتی تو پردازان رسالہ ساقی کیلئے اسقدر عمدہ جاپان نمبر نکالنا مشکل ہوتا۔ اس نمبر کی دلاویز خصوصیت اسکی متعدد تصاویر ہیں جو مجموعی حیثیت سے جاپانی زندگی کا مکمل مرقع پیش کرتی ہیں۔ مضامین میں فلسفہ، سیاست جاپان " ٹوکیو اسا ہی " شکورا کا پھول " جاپانیوں کا معیار زندگی " " جاپانی شادی " نہ صرف دلچسپ بلکہ پر از معلومات ہیں۔ ہم اس اعلیٰ نمبر کی اشاعت پر اپنے محترم معاصر کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔
یہ نمبر لکھائی چھپائی کے ... صفحات پر چھپا ہے۔ قیمت صرف سوا روپیہ ۱؎ شائقین منیجر صاحب ساقی کھاری باؤلی دہلی سے طلب فرمائیں۔

فہرست مضامین زمانہ جلد ۶۶ بابتہ جنوری لغایتہ جون سنہ ۱۹۳۶ء

تصاویر:۔ ہز مجسٹی شہنشاہ جارج پنجم مرحوم۔ ہز مجسٹی ایڈورڈ ہشتم۔ ملکہ معظمہ بحیثیت ولیعہد ملکہ معظمہ کے گھر میں۔ حضرت جگر مرادآبادی۔ مولانا راشد الخیری مرحوم۔ حضرت برق دہلوی مرحوم۔ مہاتما گاندھی
لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند۔ پنڈت جواہر لال نہرو صدر لکھنؤ کانگرس۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم
ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ سید ماجد علی مرحوم

حصہ نثر

۷۳- لطفِ سخن:-



مزید صناعی کی ضرورت نظر نہ آئی۔ مگر بعض تلفظ اضافتا اس قناعت کا مستعمل ...
لیکن اور قوموں کا تلفظ اضافہ ظاہر کرتا ہے کہ اس باب میں دنیا بھر کی دانش مشترک ہیں۔

اس وقت روئے زمین پر تین طرح کے خطوں کو فوقیت حاصل ہے۔ رومن۔ براہمی یا ناگری اور عربی یا سامی۔ ان میں سے اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ رومن نے اپنے ابتدائی ایجاد کو صرف کتابوں کے لئے مخصوص کر کے تحریر کے لئے حرفوں میں اس قسم کی ترمیم کی کہ بوقت تحریر سہولت ہو اور خیال واحد کے مدلول جتنی علامات اصوات ہیں وہ ایک ہی رشتہ میں منسلک ہو جائیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے مرور ایام کے ساتھ ترقی کی مگر اس میں پھر بھی کسر رہی۔ جس نے لفظوں کی آوازوں کی علامتیں ایجاد کیں اُس نے بلاشبہ پہلے ایک اساسی آواز متعین کر کے اس کے لئے ایک علامت بنائی اور پھر اس اساسی آواز کی مختلف شکلوں کو ظاہر کرنے کی فکر میں پڑ گئے۔ اس میدان میں اسے کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی کیونکہ پانچ علامتوں سے زیادہ ایجاد نہ کر سکا۔ حالانکہ ایک اساسی آواز کی جتنی مختلف شکلیں ہیں ان کے لئے پانچ سے کہیں زیادہ علامتیں وضع کرنا چاہئے تھیں مثلاً اس وقت a کی مدد سے اساسی آواز کے چار یا پانچ طرح کے اتار چڑھاؤ بتائے جاتے ہیں لیکن اس نے صرف ایک علامت کے ایجاد پر قناعت کر لی۔ اس لئے رومن رسم تحریر میں اور جو کچھ عیب ہوں یا نہ ہوں مگر ایک بڑا عیب یہ ہے کہ وہ صحیح صحیح تلفظ نہیں بتاتی۔ اسی واسطے غیر ملکیوں کا تلفظ اکثر غلط ہوتا ہے اور وہ اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ صحیح تلفظ لغات کی کتابوں یا خود اہل زبان سے سیکھیں۔

ناگری یا براہمی خط بھی اگر اس کا ماخذ وہ نہ مانا جائے جو مستشرقین یورپ مانتے ہیں بلکہ وہ مانا جائے جیسے علمائے ہنود تصور کرتے ہیں تو رومن خط سے سبقت نہ لے جا سکا۔ حرفوں کی شکل میں اس نے ضرور ترقی کی اور رفتہ رفتہ حسین بن گیا لیکن اس کی ساخت اس کی مانع رہی کہ لفظ کی کل آوازوں کی علامتیں اس طرح ملا دی جائیں کہ آنکھ اور خیال فوراً سمجھ جائیں کہ کتنی علامتیں خیال واحد پر دلالت کرتی ہیں۔ اس میں عام طور سے دو ہی حرف ملائے جاتے ہیں۔ اگرچہ بعض لفظوں میں پانچ حرف تک ملے ہوئے پائے جاتے ہیں ([illegible]) اس خط میں اساسی آواز وہ آواز مانی گئی ہے جو عربی میں اساسی آواز پر فتحہ لگا کر ظاہر کی گئی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حرف کی پوری شکل مفتوح مانی گئی ہے اور بیشتر حرفوں میں جو ایک کھڑی لکیر ہے

لہ ملاحظہ ہو ... گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کی تالیف "مہابھارتی پراچین لپی مالا" جس میں اس پر ایک پُرلطف بحث ہے۔

[illegible] اظہار حاصل ہے اور اس کے گرا دینے سے وہ حرف ساکن ہو جاتے ہیں۔ حرف ساکن دکھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے نیچے ایک ترچھی لکیر کھینچ دیتے ہیں لیکن یہ بھی کرتے ہیں سب کو کوئی مجبوری ہوتی ہے جیسا کہ اس [illegible] سے ظاہر ہے۔ [illegible]

ہمارا یہ خیال مسلمات کے خلاف ہے کیونکہ علمائے ہنود ناگری کے حروف صحیح کو اصطلاح والوں کی طرح ساکن تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حرف علت کے بغیر آواز نہیں دیتے لیکن حرفوں کو ساکن کرنے کے جو دو طریقے ایجاد کئے گئے ہیں وہ ہمارے خیال کی تائید کرتے ہیں۔ اگر ناگری کے حروف صحیح بوقت ایجاد ساکن ہوتے تو ان کی صورت میں تبدیلی کی ضرورت پیش آتی اور عربی و رومن حرفوں کی طرح بحال خود قائم رہتے۔ ہمارے نزدیک اس کے حرف مفتوح ایجاد کئے تھے کہ جس آواز کی وہ علامت ہیں اس کے آتار چڑھاؤ بتانے کے موقعوں پر ساکن مانے گئے اگر ہمارا یہ خیال غلط ہے اور اصلیت وہی ہے جسے آج تک سب مانتے چلے آئے ہیں تو پھر اس خیال سے مفر نہیں کہ اساسی آواز کی علامت سے دوہرا کام لیا گیا۔ یعنی جس آواز کے لئے وہ بنائی گئی تھی اس کے علاوہ اس آواز کو بھی ظاہر کرتی ہے جو عربی میں فتحہ اور رومن میں (a) وغیرہ لگا کر ظاہر کی جاتی ہے۔ اساسی آواز کے اور اتار چڑھاؤ جن کو فتحہ ظاہر نہیں کرتا۔ ان کے لئے علامتیں وضع کی گئیں۔ ان میں سے بعض اس قسم کی ہیں جو حرف کے پہلو ہی میں رکھی جا سکتی ہیں۔ بعض اس طرح کی کہ وہ نیچے لگائی جا سکتی ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ جنہیں اوپر ہی رکھ سکتے ہیں۔ ناگری خط کے وضع قطع کی وجہ سے یہ ناممکن ہے کہ خیال واحد کی مظہر علامتوں کو آپس میں اس طرح ملا دیں جس طرح تحریری رومن یا عربی خط میں ملا دیتے ہیں۔ اس کے حرفوں میں زیادہ ملنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے ایک دقت یہ بھی ہے کہ اگر لفظوں کے بیچ میں فاصلہ نہ چھوڑا جائے تو عبارت آسانی سے نہیں پڑھی جا سکتی۔ ہندی میں تو خیر لیکن سنسکرت میں "سندھی" (सन्धि) کی کرشمہ سازیاں بعض بعض وقت بڑی بڑی سطریں نظر کے سامنے لاتی ہیں جن کا دیکھتے ہی پڑھ دینا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

عربی خط بھی انہیں اصولوں پر بنا ہے جن پر کہ رومن اور ناگری۔ لیکن اس کے موجد نے محض اتفاق سے کچھ اس طرح کی علامتیں مقرر کیں کہ جن میں فطرۃً عام طور سے گھل مل جانے کی صلاحیت ہے۔ اور جو چند مستثنیات کو چھوڑ کر کسی لفظ کی سب آوازوں کو بتانے کے لئے آپس میں

بے تکلف مل جاتی ہیں۔ اس نے اساسی آ[illegible]ی جو صوت متعدد کی وضع [illegible]

ہے کیونکہ اس میں ہر تبدیلی کے لئے کچھ بڑھانا پڑتا ہے جیسے کہ رومن خط میں۔ اس کی صورت

اس قسم کی ہے کہ جب تک اس میں اضافہ نہ کیا جائے وہ ادا نہیں کی جاسکتی اور اسی وقت

ظاہر ہوتی ہے جب کسی اور آواز سے ملکر نکلتی ہے۔ اس باب میں رومن حروف عربی حروف

سے ملتے ہیں۔ علامتوں کے ملنے میں اس سے بھی سہولت پیدا ہوتی ہے کہ اتار چڑھاؤ دکھانے

کو جو علامتیں بنائی گئیں، وہ حرفوں کے اوپر یا نیچے رکھی جاتی ہیں۔ ان سے ملائی نہیں جاتیں۔

اساسی آوازوں کا تعین بھی کسی خاص ذہانت کا طالب نہیں۔ میرے نزدیک یہ خط ان خطوں

سے ایک منزل آگے نکل گیا جو صرف صوتی منزل میں رہ گئے یعنی جن میں آوازوں کے لئے علامتیں

تو ہیں مگر وہ ایسی علامتیں ہیں جو خیال واحد کو بیک نظر نہیں ظاہر کرسکتیں۔

تحریر کی ابتدا تصویروں سے ہوئی جن سے صرف "دلالت وضعی" ہی ظاہر نہیں کی جاتی تھی

بلکہ "مجازی و استعاری" معنی بھی لئے جاتے تھے۔ یہ طریقہ ناقص نظر آیا تو تصویروں کا مدلول ہی

بدل دیا گیا یعنی وہ مجموعہ ہائے اصوات کا کام دینے لگیں، اور اصلی معنی و مفہوم سے غرض ہی

نہ رہی۔ اس میں بھی کسر نظر آئی تو مجموعۂ اصوات کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کی علامتیں مقرر کی

گئیں، رفتہ رفتہ فن تحریر صوتی ہو گیا۔ یہ سب باتیں محض ضرورت نے پیدا کیں اور ایک کو دوسری

سے اچھا سمجھ کر اختیار کی گئیں۔ لیکن خط تصوری اور خط اجزائی کے ترک کا باعث فقط یہی نہ تھا

کہ وہ ضرورت کو کامل طور سے پورا کرنے سے قاصر تھے بلکہ ان کا لکھنا بھی طول امل تھا۔ اور سہل انگار

فطرت انسانی عرصہ تک ان کی بقا کی روادار نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جب لفظوں پر ہاتھ صاف

کرتے نہ جھجکی تو آواز کی علامتوں کو کب چھوڑنے والی تھی۔ انھیں بھی بدلتی رہی۔ لیکن سہولت

کے نقطۂ نظر سے وہ علامتیں اب بھی ناقص تھیں جو خیال واحد پر دلالت کرنے والی تمام آوازوں

کی علامتوں کا ایک گلدستہ بنا کر نہ پیش کرسکتی تھیں۔ یہ بات تحریری رومن اور عربی کے خطوں

ہی کے حصہ میں آئی کہ وہ ایک گلدستہ بنا سکتی ہیں۔ یہ ان خطوں سے ایک منزل آگے نکلے

ہوئے سمجھے جانے چاہیئے جن میں یہ بات نہیں کیونکہ یہ دونوں خط فطرت انسانی کی خواہش

کو زیادہ پورا کرتے ہیں۔ یہ سہل انگاری ہی تھی جس نے مختصر نویسی[1] پیدا کی۔ مختصر نویسی کی

بنیاد آوازوں پر رکھی گئی، جو آوازیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں (K.C.Q) ابجد

سے نکال دی گئیں۔ حرکات و سکنات کے لئے بھی علامتیں مقرر کی گئیں۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن

---

[1] short-hand

ان سے بہت کم اس طرح کام لیا گیا جس طرح عام رسم خط کی علامتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اختیار نہ کیا جاتا تو طوالت بڑا ئے نام ہی کم ہوتی۔ اس لئے لفظوں کی علامتیں مقرر کی گئیں جن میں لفظ کی تمام آوازوں کی جگہ اس کی کسی خاص آواز کی علامت کو اس کا قائم مقام متعین کر دیا۔ اس پر بھی صبر نہ آیا تو کئی کئی لفظوں کی علامتوں کو ملا کر ایک علامت بنائی۔ مختصر نویسی میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ الفاظ اور مجموعہ ہائے الفاظ دونوں کی علامتیں یاد ہوں۔ صرف اس کے حرفوں کی علامتیں یاد ہونے سے کام نہیں چل سکتا۔ اس طرز عمل سے مختصر نویسی کے ڈانڈے چینی خط سے جا ملے۔ جس میں ہر خیال کے لئے ایک خاص علامت یا تصویر مقرر ہے اور جب تک اس زبان کی تمام تصویریں یاد نہ ہوں چینی زبان لکھی نہیں جا سکتی۔ اس کے علاوہ اگرچہ یہ خیال محال و مجنون ہے کہ لوگ خط صوتی کو چھوڑ کر مختصر نویسی اختیار کر لیں لیکن اس دنیا کو عالم امکان بھی کہتے ہیں، اس لئے بفرض محال اگر ایسا ہو جائے تو پھر یہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ اپنا اعادہ کر رہی ہے۔ کیونکہ مختصر نویسی باوجود صوتی ہونے کے خط تصور کی رفتری منزل سے اس لحاظ سے ملتی جلتی ہے کہ وہاں تصویریں خیال، چیز اور فعل کو ظاہر کرتی تھیں تو یہاں محض لکیریں انھیں ظاہر کرتی ہیں۔

غزل پنڈت آنند نراین مُلّا

جفا صیاد کی اہل وفا نے رائیگاں کر دی
قفس کی زندگی وقف خیال آشیاں کر دی

یہ دل کیا ہے کسی کو امتحان ظرف لینا تھا
تن خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی

بھرم کھلنے نہیں دیتا کوئی حسن حقیقت کا
نظر جب سامنے آئی تجلی درمیاں کر دی

تری بے مہریاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں
کہ اپنوں کی محبت بھی طبیعت پر گراں کر دی

اسیر آنکھیں کہاں سے سیر گلشن کیلئے لائیں
نظر جتنی بھی تھی صرف تلاش آشیاں کر دی

لہ Grammalogues
ٹہ Phraseography

ساون

(از جناب آتش صدیقی)

کبھی ہندوستانِ گل فشاں کی عید تھا ساون
نشاطِ زندگانی کے لئے تجدید تھا ساون

وہ زلفِ مشکبارِ ابر کا حسنِ پریشانی
فضائے خلد ساماں کی ادائے خلد سامانی
حکایاتِ گل افشاں، اور بعنوانِ گل افشانی
متاعِ جاں نوازِ عشرتِ امید تھا ساون
کبھی ہندوستانِ گل فشاں کی عید تھا ساون

وہ جھولے، وہ حسیں۔ وہ شام وہ فردوس آوارہ
وہ ہر لمحہ نشاط آگیں، نشاط افزا، نشاط آرا
تجھے کچھ یاد ہے اے چاند! وہ معصوم نظارہ!
سنا ہے! زندگی افسردۂ ذوقِ دید تھا ساون
کبھی ہندوستانِ گل فشاں کی عید تھا ساون

ہر اک وادی تجلی گاہ تھی اُن نوبہاروں کی
ہر اک محفل فضائے ناز تھی اُن ماہ پاروں کی
کہ اب تک ڈھونڈتی ہیں جن کو آنکھیں چاند تاروں کی
ضیا افروزِ چشمِ انجم و خورشید تھا ساون
کبھی ہندوستانِ گل فشاں کی عید تھا ساون

وہ گھوارے، وہ کاشانے، وہ رنگینی، وہ مدہوشی
مسرت آفرینی، عیش پیمائی، طرب کوشی
نشاطِ خود نمائی میں سرورِ خود فراموشی
حیاتِ جنت الفردوس کی تمہید تھا ساون
کبھی ہندوستانِ گل فشاں کی عید تھا ساون

وہ گلگشتِ غزالاں، وہ روانی آبشاروں کی
وہ جھولوں کی اُمنگیں، وہ جوانی آبشاروں کی
وہ سناٹا، وہ راتیں، وہ کہانی آبشاروں کی
حریفِ بزم ہائے زہرہ و ناہید تھا ساون
کبھی ہندوستانِ گل فشاں کی عید تھا ساون

نہ اب وہ رنگ و بوئے جنتِ شاداب باقی ہے
نہ اب وہ آب و تابِ محفلِ احباب باقی ہے
تخیل میں مگر اس عہد کا اک خواب باقی ہے
کہ جب ہندوستانِ گل فشاں کی عید تھا ساون
کبھی ہندوستانِ گل فشاں کی عید تھا ساون

رُباعی

زاہد کو بہشت و حور و کوثر دینا
ارباب ہوس کو سیم و گوہر دینا
یارب تجھے تیری بے نیازی کی قسم
مجھ کو غمِ عشق و قلبِ مضطر دینا

(ادبی دنیا)

فنون لطیفہ کے اقسام

(از منشی جگیشور ناتھ صاحب بیتاب بریلوی۔ بی اے ایل ایل بی)

قدرت نے کائنات کے ذرہ ذرہ کو بے پایاں حسن عطا کیا ہے جس کا تتبع "فن" یا "کلا" کہلاتا ہے۔ ہر فنی تخلیق حسن ذاتی کی مظہر ہوتی ہے یا اس سے کچھ نہ کچھ متابعت ضرور رکھتی ہے۔ اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ انسانی فن میں تقاضائے بشریت سے تکلف و تصنع کا عمل دخل ہو جاتا ہے۔ لیکن جن اصولوں کے ماتحت اُن کی ترتیب ہوتی ہے وہ انسانی جودت طبع کا نتیجہ ہونے کے باوجود بذات خود مکمل اور بے عیب ہیں۔ یوں تو کائنات کا حسن ہی ہماری فن کاریوں کا محرک ہوتا ہے۔ فکر رسا نے سارا رنگ و روپ اسی سے مستعار لیا ہے۔ لیکن جہاں تک جمالیات کا تعلق ہے نیچر فطرتاً آزاد ہے اور کسی رسمی قاعدہ یا مقررہ دستور العمل کی پابند نہیں ہے۔

دنیا کے تمام مادیات کسی نہ کسی صورت میں ہمارے لئے مفید و کار آمد ہیں۔ فطرت نے ایسی کوئی شے نہیں بنائی جو بیکار، لغو اور فضول کہی جاسکے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صانع ازل کی تخلیق ظاہری و باطنی ہر دو صفات سے متصف ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ فطرت کا دامن صرف محاسن کا خزینہ ہے اور اسمیں معائب کی گنجائش نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو بدصورتی اور بعض چیزوں کے غیر مفید اور مضرت رساں ہونے کے کوئی معنی ہی نہ ہوتے۔ دراصل ایک چیز خاص حالات میں اہم اور ضروری ہو جاتی ہے لیکن اس سے پیشتر وہی چیز کسی کام کی نہیں ہوتی۔ ورنہ قدرت کے اہتمام میں حسن و قبح کا بیک ساعت ظہور ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ قباحت ملاحت کا جزو لاینفک ہے اور ان میں سے ایک کے بغیر دوسرے کے وجود کا ادراک ہی ناممکن ہے۔

بنی آدم کی تخلیقی کوششوں کی بھی یہی کیفیت ہے مثلاً کوئی معمار ایک عمارت بنا کر تیار کرتا ہے۔ اس کی ساخت میں کچھ ایسا توازن کچھ ایسی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو

اُسے ظاہری خوبصورتی سے مزین کردیتی ہیں۔ لیکن اس تعمیر کی اس کے علاوہ کچھ اور بھی غایت ہوتی ہے۔ مثلاً اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے مکینوں کو سردی کی شدت اور آفتاب کی تمازت وغیرہ سے پناہ ملے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ کارآمد چیز خوبصورت بھی ہو۔ لیکن چونکہ انسان فطرتاً حسن پرست واقع ہوا ہے، اس لئے وہ ہر چیز کو حتی الامکان خوبصورت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سی مفید چیزیں خوبصورت بھی ہیں چنانچہ ان کا شمار للت اور اُپ یوگی دونوں کلاؤں میں ہوتا ہے۔ بعض اشیاء ایسی بھی ہیں جو مفید ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کے نظر فریب ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

جو مصنوعات اپنی ساخت کے اعتبار سے ہماری مادی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں "اُپ یوگی کلا" سے متعلق سمجھی جاتی ہیں۔ اور جن کا مقصد محض نشاطِ روح ہے وہ للت کلا یا فنونِ لطیفہ کے تحت میں آتی ہیں۔ یہی "للت کلا" ادب یا لٹریچر کا مبحث ہے۔

فنونِ لطیفہ کی سات قسمیں یہ ہیں:-

(۱) "مورتی کلا" (بت سازی)، دوم "واستو کلا" (صنعت تعمیر)، سوم "سنگیت" (موسیقی)، چہارم "نرت" (رقص)، پنجم "کاویہ" (شاعری)، ششم "چتر کلا" (مصوری)، اور ہفتم ایکٹنگ (Acting) اداکاری "اُپ یوگی کلائیں" روزمرہ ضروریات کی تکمیل کے لئے معرضِ وجود میں آتی ہیں، لیکن جوں جوں تہذیب کی ترقی کے ساتھ انسانی ضروریات میں بھی ترمیم و تنسیخ ہوتی جاتی ہے، انسان ہر چیز میں حسن و نمود کی جستجو کرنے لگتا ہے۔ جس کی بدولت فنونِ لطیفہ کی بنیاد پڑنا شروع ہوتی ہے اور چونکہ مختلف افراد و اقوام کی طبائع و مذاق میں اختلاف ہوتا ہے اس لئے حسن و فنون کے نظریے بھی مختلف اور ان کے معیار جداگانہ قائم ہو جاتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ کی ضرورت اور اہمیت

ڈاکٹر ایمرسن کا خیال ہے کہ فنونِ لطیفہ روح کی ترجمانی اور تخلیق عالم کی علت غائی کی وضاحت کے لئے معرضِ وجود میں آئے۔ اس فلسفیانہ نظریہ کی تشریح و توضیح کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بعض فنون ذوقِ نظر کے محرک ہوتے ہیں اور بعض سامعہ نوازی کا دم بھرتے ہیں۔ مگر سب کا مقصد ایک ہوتا ہے یعنی مختلف حواسوں کے ذریعہ دل پر اثر انداز ہو کر حظِ روح کا باعث ہوں۔ روح کے اسی عالمگیر پیغام اور تکوین عالم کے اسی فلسفۂ لطیف کی طرف ایمرسن نے اشارہ کیا ہے۔

ماہرینِ علم النفس کی رائے ہے کہ فنونِ لطیفہ انسان کے نفسانی و شہوانی جذبات کے

اخراج کا بے ضرر پیرایہ مہیا کرتے ہیں۔ انسانی دل و دماغ طرح طرح خواہشات اور محسن تحریکات کا آماجگاہ ہے جو ہر لحظہ اپنی تسکین و تشفی کے لئے بیتاب رہتی ہیں۔ فنون لطیفہ کی بدولت اس فطری بیقراری کو روح پرور سکون و سکوت نصیب ہوتا ہے۔ چنانچہ جو قومیں فنون لطیفہ کی تربیت سے بے بہرہ و نابلد رہتی ہیں، وہ اسفل جذبات کا شکار ہو کر پست اخلاقی کے تاریک غار میں پڑجاتی ہیں۔

فنون لطیفہ دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ جن سے مادہ مخلوط ہوتا ہے، مثلاً رقص، مصوری وغیرہ اور دوسرے وہ جو ساتھ کے اثر انداز ہوتے ہیں، جیسے موسیقی، وغیرہ۔ پہلے صیغہ میں تمثیل یا آدھار کی خاص ضرورت ہوتی ہے لیکن دوسرا صیغہ اس سے معرّا رہتا ہے۔ سنسکرت ادب میں اسی آدھار کی کمی و بیشی کے لحاظ سے فنون لطیفہ کے اُتم (اعلیٰ) اور مدھم (اوسط) مدارج مقرر کئے گئے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ جس فن میں یہ آدھار جتنا کم ہوگا اسے اتنا ہی اونچا درجہ حاصل ہوگا۔ اسی وجہ سے شاعری کو امتیازی اہمیت حاصل ہے اور فن تعمیر ادنیٰ درجہ کی صنعت شمار کی جاتی ہے۔

صنعت تعمیر عمارت بنانے میں اینٹ پتھر لوہا۔ لکڑی وغیرہ درکار ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں مورت (مورت) یا کثیف ہیں جو دیکھی یا محسوس کی جا سکتی ہیں۔ فن تعمیر کا فنون لطیفہ میں صرف اسی وجہ سے شمار ہے کہ اس میں بھی انسانی جذبات کا اظہار ہوتا ہے مثلاً مندر، مسجد، گرجا، محل اور مقبرہ ہر ایک کی ساخت مختلف ہوتی ہے۔ اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی عمارتوں کے نقشے جداگانہ ہوتے ہیں۔ "شلپ رتن" میں اس موضوع پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور صنعت تعمیر کے ماہر یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ فلاں عمارت ہندی، مغلی، ایرانی یا یونانی وضع قطع کی ہے۔ گنبد، محرابوں، جالیوں، اور جھروکوں وغیرہ کی تراش میں مختلف قوموں نے اپنے اپنے عقیدوں کے بموجب جداگانہ طرز اختیار کیا ہے۔

بُت سازی بُت سازی کی ابتدا سنگ تراشی سے ہوئی ہے، اس صنعت کا آدھار جسد و پیکر ہے۔ چنانچہ بت ساز کسی خاص شے کے نمونے پر پتھر، لکڑی، مٹی اور دھاتوں کے ٹکڑوں پر نقوش ابھار کر مجسمے تیار کرتا ہے۔ چونکہ اس میں جذبات کے اظہار کے خاص موقعے درپیش ہوتے ہیں اسی لئے بت سازی کا درجہ صنعت تعمیر سے زیادہ بلند ہے۔

مصوری مصوری بت سازی سے بھی کہیں زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ وہ رنگ و روغن کے

مزید تفصیل کیلئے راقم الحروف کی تصنیف تجلیات تخیل ملاحظہ ہو جو جنوبی ایشیا بانی آمنس ریلیف... میں مل سکتی ہے

آدھا اپنے نقش و نگار بناتا اور اپنے کردار کی ذہنی کیفیات بھی خط و خال کے ذریعہ نمایاں کرتا ہے۔ اسی میں اس کے ادراک اور کمال فن کی آزمائش ہوتی ہے۔ اسی باعث مصوری کا پایہ بت سازی سے بلند مانا گیا ہے۔

رقص و ایکٹنگ مصوری کے بعد رقص و ایکٹنگ کا نمبر آتا ہے۔ نرت یا رقص اظہار جذبات و روحانی کیفیات کا اولین و بہترین ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ عقیدت و محبت کی توضیح کا جس قدر سلیقہ اس فن کو حاصل ہے کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ اس میں حرکات و سکنات اور ادا و انداز کے ذریعے محسوسات و واردات کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی جاتی ہیں اور بتاوے کے ساتھ قلبی احساس و ذہنی ادراک کے ہر پہلو کو نمایاں کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ رقص کی ہندو ماہرین فن نے بہت سی قسمیں بتائی ہیں (مثلاً میور، تانڈو، بھنگڑا، شو اور لسیہ وغیرہ) جن کا تعلق مختلف احساسات و واقعات نیز راگ راگنیوں سے ہے۔

نرت یا رقص موسیقی سے بے نیاز مانا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ اس کا موسیقی سے خاص تعلق ہے۔ بلکہ رقص کو موسیقی کی زندہ تصویر کہنا بجا ہوگا۔ تال، سُر اور لَے موسیقی (سنگیت) کے خاص اجزا ہیں۔ نرت تال سے خاص طور پر وابستہ ہے۔ چنانچہ رقص میں گھونگرو سے تال کی مطابقت رکھی جاتی ہے جس طرح موسیقی میں تذکیر و تانیث (راگ و راگنی) کا امتیاز رکھا گیا ہے، اسی طرح نرت میں بھی اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بعض ناچ اس قسم کے ہیں جو نسائی جذبات کی ترجمانی کے لئے مخصوص ہیں، اور بعض مردانہ اطوار و خصائل کے۔ رقص کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو بات الفاظ و زبان سے ادا نہیں ہو سکتی اس کی صحیح ترجمانی اس کی بدولت ہو جاتی ہے۔

دنیا کی تمام اقوام میں ناچ کا رواج بہت قدیم ہے لیکن ہندی نرت کلا کو جو کمال حاصل ہوا ہے وہ کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ کم از کم مغربی فن رقص کا کوئی خاص اصول نظر نہیں آتا ہے اور اس کا مقصد صنف نازک کے قرب و اتصال اور حسین ترین اعضائے جسمانی کی نمائش کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا۔

ایکٹنگ کا ماخذ بھی رقص ہے۔ اکثر اوقات ایکٹر اپنے جذبات کے اظہار میں زبان کی امداد بھی لے لیتا ہے۔ گو اس کے لئے ایسا کرنا ضروری نہیں۔ لیکن نرت میں زبان کی امداد لینا ممکن نہیں اس طرح ایکٹنگ کی اہمیت ناچ کے مقابلہ میں کچھ کم رہتی ہے۔ رقص کا انداز ہمیشہ خصوصیات لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ایکٹنگ میں عامیانہ رنگ جھلکتا ہے، پھر بھی ایکٹنگ جذبات کی ترجمانی میں قوت بیان اور انداز گفتگو سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ ایکٹنگ میں تصنع اور نقالی کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔

لیکن نرت حقیقت کے بالکل قریب رہتا ہے۔

موسیقی یا سنگیت موسیقی عطیۂ قدرت ہے، جو روز ازل سے انسانی ضمیر میں داخل ہے۔ موسیقی
کے لغوی معنی ہیں بال کی کھال نکالنا۔ فی الحقیقت اس علم و فن کے عمق و رفعت نے اسے اسم
بامسمیٰ بنا دیا ہے۔ موسیقی کو شاعری کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ کا بھی سرتاج مانا گیا ہے۔ دیگر
فنون لطیفہ کی طرح موسیقی کو بھی قومی خصوصیات حاصل ہیں۔ اس کا دارومدار ناد یا صوت مانا
گیا ہے۔ سُروں کے اتار چڑھاؤ (زیر و بم) میں مختلف سازوں یا گلے سے لوچ اور سوز کے ساتھ
خاص قسم کی آواز نکالنا ضروری ہے۔ مختلف اقوام دنیا کے لب و لہجہ کے اختلافات بھی اس
فن میں بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

یوں تو ہندوستان تمام فنون لطیفہ کا منبع ہے لیکن جس شان کے ساتھ موسیقی کی
ایجاد ہوئی اسکی مثال تمام دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اہل ہند نے اس فن کو بڑی خوش
اسلوبی کے ساتھ معراج کمال تک پہونچا دیا ہے۔ ہر وقت اور ہر موقعہ کے لحاظ سے راگ اور
راگنیوں کی تقسیم کر دی ہے۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا اور نی، انھیں سات سُروں سے متعین
اصولوں پر اس فن کے تمام قواعد و ضوابط مرتب کر دیئے گئے ہیں، اور ہر راگ کا جداگانہ
ٹھاٹھ باندھا گیا ہے۔ سا اور پا دو سُروں کو قائم مانا گیا ہے جن کی ملاوٹ سے کھرج نکلتی ہے
یہ ایک ایسا مرتب اصول ہے کہ دنیا ہزار کوشش کرنے پر بھی آج تک اس قسم کا کوئی دوسرا
عالمگیر قانون نہیں بنا سکی۔ جس طرح مصرعوں کی تقطیع کی جاتی ہے اسی طرح متذکرہ بالا ہفت
پر ہر راگ کے سُر کئے جاتے ہیں۔
کے سے مختلف ذہنی و قلبی حالتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً بسنت راگ کو لیجئے اس
لَے میں کچھ ایسی مٹھاس ہے کہ چھیڑتے ہی آنکھوں کے سامنے بہار کا سماں بندھ جاتا ہے
خاص قسم کے تاثرات پیدا کرنے کے لئے ناٹکوں میں اسی لَے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ شعر کے
بحر کی جو اہمیت ہے وہی بات نغمہ کے لئے لَے میں ہوتی ہے۔ اور جس طرح شاعر اوزان
پابند ہوتا ہے اسی طرح مغنّی کو تال کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ ہر راگ کی جداگانہ لے ہوتی
جس میں ایک خاص رَس ہوتا ہے۔ ٹھیک وہی بات تال میں ہوتی ہے۔ راگوں کی طرح
تالیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً دھمار۔ تین تال۔ چار تال۔ جھپ۔ آڑا۔ چوتالہ۔ اکتالہ وغیرہ
جب کبھی راگ اور راگنیاں اپنے وقت سے الاپی جاتی ہیں تران کے لطف

ں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، مثلاً صبح کے وقت بھیرویں گائی جاتی ہے، پہلے دوپہر کو لدی سر شام، شیام کلیان اور دیپک رات کے وقت اور [illegible]ک کا مود وغیرہ آدھی رات وغیرہ دیتی ہیں۔

تال کا کام راگ کا ضابطہ باندھنا ہے۔ یہ لے کی رفتار کو اس انداز سے مقید کر دیتی ہے ماتراؤں کے حساب و شمار میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہونے پاتی ہر نغمہ کا سم مقرر ہے۔ تال ا کام یہی سم بتانا ہے تاکہ راگی محدود وقت میں سم پر آ جائے اور راگ کی ادائیگی میں غلطی ہونے پائے۔ تال اور لے کے توازن ہی سے راگ پیدا ہوتا ہے۔ سنگیت کی لازوال رتوں کی تفصیل ممکن نہیں، روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اس ے آگ لگائی جا سکتی ہے اور پانی برسایا جا سکتا ہے، طوفان اُٹھانا، بہتا دریا روک دینا لین و غضبناک کرنا، تسکین و مسرت کا مینہ برسانا، موہنی ڈالنا، اور انسان کیا وحشی و خونخوار انوں کو بھی بے حس کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ سپیروں کو سانپ پکڑتے، ہ نچاتے اور بکھادیوں کو جنگلی ہاتھی کو مست کر کے پکڑتے تو بہت لوگوں نے دیکھا ہوگا سب موسیقی ہی کے کرتب ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک بار اکبر کے اصرار پر تان سین نے دیپک راگ گایا تھا جس سے چراغ ساتھ ساتھ وہ خود بھی جل گیا تھا۔ دیپک راگ کی یہی خاصیت مشہور ہے۔ چنانچہ جب ن سین کو کسی دوا سے افاقہ نہ ہوا تو اُس کے ایما سے ملاریں گائی گئیں جس سے اُسے تسکین نصیب ی۔ بقول پروفیسر جی۔ جی۔ برولے انسان حیوان اور نباتات سب کی زندگی کا انحصار خاص ں سروں پر ہے، چنانچہ اگر انھیں چھیڑ دیا جائے تو ان کی زندگی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اکثر لوگ سنتے سنتے وجد میں آ کر دیوانہ و سرشار ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی کسی کسی کی موت بھی واقع ہو جاتی۔ بہر حال موسیقی ایک زندہ جادو ہے، لیکن یہ تاثیر صرف ہندی موسیقی کا حصہ ہے۔

ہندی صناعوں نے وقت کے علاوہ راگ راگنیوں کے رنگ اور روپ بھی قائم کئے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ راگ کی صحت کا معیار یہ ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ ں ماہرین نے جملہ امراض کا علاج مختلف راگوں کے ذریعہ سے تجویز کیا ہے۔ بہر حال سنگیت کا ت رفیع و سیع اور عمیق ہے۔ مغرب کے بڑے بڑے مبصروں نے بھی ہندی موسیقی کو دنیا میں ر دیا ہے۔ "نورسوں" کے اظہار کی جو قدرت موسیقی میں ہے وہ شاعری کو چھوڑ کر کسی دوسرے

فن کو نصیب نہیں ہوئی۔ نرت کا موسیقی کے ساتھ تعلق ناگزیر ہے۔ سنگیت سے انداز تکلم نہایت مؤثر ہو جاتا ہے اور جذبات کا سیلاب سامعین کو اپنی رو میں بہائے جاتا ہے۔

قدما کو سُروں سے اس قدر واقفیت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ جانوروں کی بولیاں آسانی سے سمجھ لیتے تھے، اور ان سے انہیں کی زبان میں گفتگو بھی کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ موسمی انقلابات کا پرندوں کو سب سے پیشتر علم ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ بعض قدیم تحریریں شاہد ہیں کہ ہندی ماہرین پرندوں سے یہ تمام راز قبل از وقت معلوم کر لیا کرتے تھے۔ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی بعض ایسے ایسے صاحب کمال موجود ہیں جو طبلے پر سانپ کی چال دکھاتے اور ریل کی رفتار اس حسن وخوبی کے ساتھ بتاتے ہیں کہ بیساختہ داد نکل جاتی ہے۔

کاویہ یا شاعری شاعری کو جملہ فنونِ لطیفہ پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ موسیقی شاعری کی روح ہے بلکہ اُسے ترنم مجسم کہنا بھی بیجا نہ ہوگا۔ حروف تہجی اور اشارات لفظی اسکا آدھار ہیں۔ ورنہ تمثیل کا جس قدر فقدان یہاں نظر آتا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ مشاہدات اور محسوسات کو شاعری کا موضوع مانا گیا ہے۔ شاعر کی رنگین تخئیل جذبات کے جسد و پیکر میں جان ڈال دیتی ہے جس کی بدولت یہ خاکدان گلکدہ بن جاتا ہے۔ اور اس میں ایسے حسین و رنگین پھول کھلتے ہیں کہ جنکی خوشبو سے مشام جاں معطر ہو جاتا ہے۔

تاثرات کے اعتبار سے شاعری کسی دوسری چیز کی محتاج نہیں ہے۔ درحقیقتاً موسیقی سے بھی بے نیاز ہے۔ شاید اسی بنا پر نثر شاعری یا ادب لطیف کا شاعری میں شمار ہے۔ جس طرح موسیقی کا سروں کی ہم آہنگی وارتباط پر انحصار ہے اُسی طرح شاعری کا الفاظ و محاورات پر دارومدار ہے شاعر کمیسر زبان کا محتاج ہے یہی اس کے اظہار خیال کا ذریعہ ہے۔ دراصل شعر موسیقی ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ شاعری سے پہلے موسیقی کا موجود ہونا یقینی ہے۔ اس لئے زبان کا ظہور ہوتے ہی موسیقی اظہار جذبات کا آلہ بن گیا۔ اور اس طرح یہ موج ترنم تغزل کے ریلے سے ہمدوش ہو کر نظم بن گئی۔ بہر حال شعریت بھی موسیقی کی طرح عطیۂ ازلی ہے۔

شاعر اپنے محسوسات و مشاہدات اور دیگر نقوش خیالی کے علاوہ جو اس کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں دوسروں کے تجربات سے بھی مستفید ہوتا ہے، لیکن اس کے طرز بیان میں اس کی انفرادی حیثیت بدرجہ اتم نمایاں رہتی ہے اور اسی کے بدولت وہ دوسرے معاصرین سے ممتاز رہتا ہے۔ فی الحقیقت شاعری کا تعلق جس قدر باطن سے ہے اتنا ظاہر سے نہیں۔ یہ نرالی

خصوصیت مصوری، بت سازی وغیرہ (آرکی ٹیکچر) سے ہے۔ انجنیئری بھی اسی زمرے میں آ سکتا ہے۔ مگر اس لحاظ سے رقص اور موسیقی کو بھی شاعری کا ہم پلہ ہم پایہ تسلیم کرنا پڑیگا۔ مولانا حالی نے اپنی مشہور تصنیف میں اس بات کو بخوبی واضح کر دیا ہے کہ شاعری کا پایہ دوسرے تمام صنائعیوں سے بلند در فیع واقع ہوا ہے کیونکہ جتنا زود اثر شعر ہوتا ہے اور جس قدر مستحکم دیرپا اثر وہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہ کسی دوسرے فن میں ممکن نہیں۔

سنسکرت علما نے شاعری کے دو اصناف بتائے ہیں (۱) درشیہ (दृश्य काव्य) اور شرویہ (श्रव्य काव्य)

(۱) درشیہ کاویہ سے اس قسم کی شاعری مقصود ہے جو دیکھی اور دکھائی جا سکے۔ ناٹک چھایا ناٹک (متکلم فلم) کالے اور سوانگ وغیرہ اسی ذیل میں آتے ہیں۔

(۲) شرویہ (श्रव्य) کاویہ کا مطلب صاف ہے۔ اس قسم میں شاعری کی ہر وہ صنف داخل ہے جو سنی اور سنائی جا سکے۔ ناول، افسانہ، داستان، لطیفے، ہنسنے چٹکلے اور انشائے لطیف وغیرہ سب اس کے ذیل میں آئیں گے۔ اب صرف ایک چیز اور باقی رہ جاتی ہے جو ادب کا نہایت اہم اور وسیع جزو ہے۔ یہ فن انشا پردازی ہے۔ مجموعی طور پر تمام علمی و تنقیدی مقالے اور تمام تاریخی اور سوانحی مضامین انشا پردازی میں داخل ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ خود اس فن کا کس مد میں شمار کیا جائے ذرا مشکل ہے۔

جیسا اوپر کہا گیا ہے شاعری کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں:۔ (۱) نظم (۲) نثر۔ ہر چند کہ انشا پردازی سے مراد نثر نگاری ہے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ماننا پڑتا ہے کہ نثر کا ہر مضمون اس قابل نہیں ہے کہ نثر شاعری میں شمار کیا جا سکے۔ اس لئے اسے ایک آزاد اور مستقل فن قرار دینا پڑے گا۔

جذباتِ بسمل

(از جناب بسمل الہ آبادی)

دستِ جنوں نے بے سروساماں بنا دیا — دامن کو چاک کر کے گریباں بنا دیا
اب میں ہوں اور رات دن احساسِ نیک و بد — مجھ کو یہ کس قصور پہ انساں بنا دیا
اک نقطے سے بیاں ہوئی شرحِ کتابِ زیست — قدرت نے اس میں موت کا عنواں بنا دیا
ہر شے جنوں نے عالمِ وحشت میں چھان لی — تارِ نفس کو تارِ گریباں بنا دیا

بہار

(از منشی گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری بی اے۔ ایل ایل۔ بی)

خاک کے ذرّوں میں پنہاں تھا جو امکانِ بہار — چھا گیا عالم پہ بنکر ابرِ نیسانِ بہار
ایک اک نقشِ چمن ہے ایک عنوانِ بہار — ایک اک برگِ گلِ گلشن گلستانِ بہار
گل سے ہے اذنِ وداعِ ہوش و ایمانِ بہار — اہتمامِ رنگ و بو ہے شانِ شایانِ بہار
روئے تاباں پر نظر، ہاتھوں میں دامانِ بہار — پھر بہار آئے مرے گھر بھی بعنوانِ بہار
پھول گیندے کے کھلے سرسوں ہوئی عالم فروز — زرد پوش آئے جہاں میں پھر حسینانِ بہار
پھر بسنتی ساریاں پہنے ہوئے ہیں کھیتیاں — ہو گیا پھر غیرتِ فردوس دامانِ بہار
ہر بنِ خارِ چمن سے ہے نظامِ رنگ و بو — ہر گل و لالہ ہے اک نقشِ فروزانِ بہار
حسن کا سیلاب ہے یا ہے طلسمِ رنگ و بو — آج بڑھتا ہی چلا آتا ہے طوفانِ بہار
پھر تلاطم خیز ہے ہنگامۂ حسن و جمال — پھر نظر میں کھب چلا حسنِ درخشانِ بہار
پھر دھڑک کر رہ گیا سینۂ زمینِ باغ کا — بلبل و گل میں ہوا پھر عہد و پیمانِ بہار

ہے کماں کی جاذبیت نالۂ بلبل میں آج
دل دھڑکتا ہے مرا نبضِ رگِ گل میں آج

پھر بہار آئی چمن میں پھر ہے جوشِ رنگ و بو — ساقیِ فطرت نے سیدھے کر دیے جام و سبو
ہے چمن میں زرد پھولوں سے ہجومِ رنگ و بو — ہر رگِ گل سے ٹپکتی ہے بسا آرزو

جامِ گُل سے پھر چھلک اٹھی شرابِ تُند خو ۔۔۔ پھر اٹھا میخانۂ گلشن سے شورِ ہاؤ ہو
ذرّہ ذرّہ ہی چمن کا اک جہانِ رنگ و بو ۔۔۔ پھر سے دلہن بن کے آئی ہے بہارِ آرزو
پتّی پتّی سے ٹپکتا پڑتا ہے پھر جوشِ نمو ۔۔۔ ہر رگِ گل ہے رگِ ابرِ بہاری مو بمو
پھر سے دیتی ہے ہر اک شے روح کو دعوتِ نمو ۔۔۔ ہے مگر جوشِ جنوں وجہ بہارِ آرزو

پھر زمیں پر آسمانوں کے فرشتے آئے ہیں
گلشنِ فردوس کے تحفے سجا کر لائے ہیں

گنجِ فطرت کھل گیا ہے لٹ رہی ہیں بالیاں کی گل ۔۔۔ دیدۂ بینا کو ہے جوشِ نمو، درسِ عمل
غنچہ و گل باغ میں جام و سبو سے کم نہیں ۔۔۔ بادۂ صافی ہے ان میں قطرۂ شبنم نہیں
بڑھ چلی پھر سبزۂ بیگانہ کی بیگانگی ۔۔۔ پھر دلِ وحشی نے پایا مژدۂ دیوانگی
پھر لبِ غنچہ کو یارائے سخن حاصل ہوا ۔۔۔ پھر جمالِ حسنِ جاناں زینتِ محفل ہوا
چاند کی تابانیوں میں پھر بہار آنے لگی ۔۔۔ پھر مجھے ہر رنگ سے بوئے نگار آنے لگی

تم نہیں تو کچھ نہیں یہ ساز و سامانِ بہار
اے بہارِ قلب فرحت اے گلستانِ بہار

یہ کس کا تبسم ہے فضا میں ساقی ۔۔۔ یہ کس کی جوانی ہے گھٹا میں ساقی
یہ کون بجا رہا ہے شیریں بربط ۔۔۔ بھیگی ہوئی بارش کی ہوا میں ساقی

(کلیم) ۔۔۔ (جوش)

ٹھاکر ودیاپت

پیدائش سنہ ۱۳۵۰ء - وفات سنہ ۱۴۴۰ء

(از جناب تکیم اعظم گڈھی)

جس طرح ہندوستان کے اور مشاہیر کے واقعات اکثر پردۂ خفا میں ہیں اسی طرح ٹھاکر ودیاپت کے واقعات زندگی بھی کہیں مفصل نہیں ملتے۔ البتہ بعض تذکروں اور قرائن سے اُن کی سوانح عمری پر مختصراً روشنی پڑتی ہے۔ آپ کا نام ودیاپت باپ کا نام پنڈت گنپت ٹھاکر ماں کا نام ہانسنی دیوی تھا۔ ٹھاکر خاندانی لقب ہے آپ قوم کے میتھل برہمن تھے۔ آپ کے والد بزرگوار راجا گنیشور کے دربار کے پنڈت تھے۔ آپ نے پنڈت ہری مشر سے علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ درباری تعلقات سے دربار میں برابر آیا جایا کرتے تھے۔ کیرت سنگھ کے دربار میں بھی رسائی تھی۔

ودیاپت کے وطن کے متعلق بھی لوگ مختلف الخیال ہیں، مگر اجماع اس پر ہے کہ آپ موضع بسپی ضلع دربھنگا کے رہنے والے تھے۔ جو کمتول اسٹیشن سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے یہ موضع راجا شیو سنگھ کی طرف سے جاگیر میں ملا تھا۔

آپ کی لکھی ہوئی ایک کتاب موضع سبرونی ضلع دربھنگہ میں ابتک محفوظ ہے تحریر تال پتر پر ہے جو لمبائی میں دو فٹ اور چوڑائی میں ۱½ انچ کے قریب ہے۔ تحریر دونوں طرف ہے۔

کیرت سنگھ کے دربار میں آپ نے ایک کتاب کیرت لتا نامی لکھی۔ یہ کتاب جو عنفوان کے عالم شباب کی یادگار ہے ابتک نیپال کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کی زبان سنسکرت اور پراکرت سے ملو ہے جس کو آپ بقول خود اَوہٹھا کہا ہے۔

۱؎ ہندی دوستی کا سلسلہ ناظرین ندیم کی نظر سے گذر چکا ہے، ادھر میرے دوست پنڈت ملو ناتھ صاحب ایم اے نے ٹھاکر ودیاپت کے کلام سے روشناس کرایا۔ طبیعت نے تنہا لطف اندوز ہونا مناسب نہیں سمجھا اسلئے ناظرین ندیم کو بھی شریک کر لیا۔ ٹھاکر ودیاپت کے کلام اور ہندی کے ابتدائی دور پر نظر کرتے ہوئے ان کو دوسرا دور کا ترجمان کہنا غیر مناسب نہیں۔ اگر زبان کی اہمیت خصوصیت ترقی ہونے میں مانع ہے تو چند بھاٹوں کا نام ٹھاکرون کی جگہ ان کو دینا چاہیئے کیونکہ پرتھی راج راسو سے کہیں زیادہ اُن کی زبان بہتر ہے۔ (تکیم)

देसल बअन सब जन मिट्ठा
دیسل بنیا سب جن مٹھا

ते तैसन जम्पओ अवहट्ठा
تے تیسن جمپو او ہٹھا

دیسی زبان سب کو پیاری لگتی ہے، اس لئے میں نے اس کتاب کو اوہٹھا یعنی مادری زبان میں لکھا ہے۔ ٹھاکر ودیاپت نے ہندی کے علاوہ سنسکرت میں بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کی زندگی ہی میں اُن کا کلام اتنا مقبول ہوا کہ سوامی چیتنیہ دیو جن کو ہندو اوتار مانتے ہیں اس کو پڑھتے پڑھتے بے خود ہو جاتے تھے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ اُن کے شاگردوں میں ودیاپت کا کلام وظیفے کے طور پر پڑھا جانے لگا۔ اس طرح ودیاپت بنگالیوں کی رگ رگ میں پیوست ہو گئے۔ چونکہ ان کے کلام سیکڑوں برس تک بنگال میں گائے گئے اس لئے اس کی شکل بھی بنگالی ہو گئی۔ متقدمین میں چند بروائی کے بعد یہی مشہور شاعر ہوئے۔

نمونۂ کلام | آپ کے کلام میں تشبیہات کی ندرت زیادہ پائی جاتی ہے جس طرح مثنوی میں مختلف عنوان سے مضمون کی ابتدا کی جاتی ہے آپ کے یہاں بھی یہی اسلوب بیان ہے۔ رادھا جی کو فرضی معشوق اور کرشن جی کو فرضی عاشق مان کر شاعری کی گئی ہے۔ پہلے پہل رادھا جی کو دیکھ کر کرشن جی فرماتے ہیں

आज देखल धनि जाइत रे
آج دیکھل دھنی جایت رے

मोहि उपजल रंग
موہی اوپجل رنگ

कनक लता जनि संचर रे
کنک لتا جنی سنچر رے

महि निर औलम्ब
مہی نر اولمبھ

(مطلب) آج میں نے ایک نازنین کو جاتے ہوئے دیکھا جس سے محبت پیدا ہوئی، وہ اس طرح جا رہی تھی گویا سونے کی بیل بغیر کسی سہارے کے جا رہی ہو۔ حسینہ کے کندنی رنگ اور لچکیلی چال کو سونے کی بیل سے تشبیہ دینا انھیں کا کام ہے

ہندی شاعری میں واردات محبت کو جس طرح انھوں نے ادا کیا ہے کسی نے ادا نہیں کیا محبت عملی صورت میں جس طرح ظاہر ہوتی ہے اس کی ترتیب آپ کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ رادھا جی کو بھی کرشن جی کی محبت نے بیقرار کیا اور طرفین سے نامہ و پیام کی نوبت آئی بالآخر رادھا جی کرشن جی کے پاس پہونچتی ہیں۔ کرشن جی رادھا سے محبت کے متعلق دریافت فرماتے ہیں:۔

सुमरवि पुछौं तोहि सरुपि कहसि मोहि
سو مکھی پوچھوں تو ہی سروپ کہس موہیں

सिनेह क कत दुर ओर
سینہک کت دور اور

ठामहिं रहिये घुमि परसि चिनिहि भूम
ٹھامیں رہیئے گھوم پرس چینی بھومی

दिग मग उपज संदेह
دِگ مگ اوپجے سندیہ

اے حسینہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ محبت کے حدود کیا ہیں۔ جواب میں رادھا فرماتی ہیں کہ میں تو گھوم گھوم کر ایک ہی جگہ پر چلی آتی ہوں، زمین کو بھی صرف چھونے سے سمجھتی ہوں اور راستہ اور سمت کو تو گویا بھول ہی گئی ہوں۔

اس انداز سے عاشقانہ بیخودی کا اظہار شاید ہی کسی نے کیا ہو

سراپا

चंद सार लए मुरव-घटना करु-लोचन चकित चकोर
چاند سارے لے مکھ گھٹنا کرو۔ لوچن چکت چکور

अमिय धोव आचंर धनि पोछलि-दहदिसि भेल उंजोर
امی دھو آنچر دھنی پوچھل دہ دِس بھیل اوجور

(مطلب) برہمانے چاند کا مکمل حصہ لیکر رادھا کے منہ کو بنایا ہے جسے دیکھتے ہی چکور کی آنکھیں حیران ہوگئیں۔ رادھا نے اپنے چاند ایسے چہرے کو آنچل سے پونچھ کر جو آبحیات بہایا ہے وہی چاندنی بنکر دسوں سمت میں پھیل گئی ہے۔

रूप गुनि के बिहि निरमिल बाला
سو صا گنی کے بہی نرمل بالا

अपरुब रूप मनो भव मंगल
اپروپ روپ منو بھو منگل

त्रिभुवन बिजयी माला
تربھون بجئی مالا

सुन्दर बदन चारु अरु लोचन
سندر بدن چارو ارو لوچن

काजर रंजित भेला
کاجر رنجت بھیلا

कनक कमल माँझ काल भुजंगिनी
کنک کمل ماجھ کال بھوجنگنی

स्रीयुत खजंन खेला
سری جُت کھنجن کھیلا

کس برہما نے تینوں لوک جیتنے والی مالا کی طرح خوبصورت اور کام دیو کے مانند حسین آبیات برسانے والی عورت کو بنایا ہے۔ یہ حسینہ خوبصورت چہرہ رکھنے والی ہے۔ آنکھیں حسین ہیں، جس میں کاجل لگے ہوئے ہیں۔ جس کو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سونے کے کمل میں قضا ناگن کے مانند ہے کھیل رہی ہے۔

तिन बान मदन तेजल तिन भुवन
تن بان مدن تیجل تین بھون

अवधि रहल दओ बाने
اودھ رہل دو بانے

बिधि बड़ दारुन बधए रसिक जन
بدھ بڑ دارون بدھئی رسک جن

सोंपल तोहरे नयाने
سونپل تہرے نیانے

رکی کہتے ہیں کہ عشق کے دیوتا کامدیو کے پاس پانچ تیر ہیں۔ تین تیر تو اس نے تینوں لوک کو مغلوب کر لیا وہ باقی تھے، بر ہا ئیرے ظالم ہیں جنھوں نے یہ بچے ہوئے دونوں تیر عاشقوں کے بسمل کرنے کے لئے تمھاری آنکھوں کو دیدئے۔

कामनी करए सनाने
کامنی کرے اسنانے

हेरितहि हृदय हनए पंच बाने
ہیرت ہردے ہنے پنچ بانے

चिकुर गरए जल धारा
چکور گرئے جل دھارا

जनि मुख ससि डर रोअए अंधारा
جنی مکھ سسی ڈر روے اندھارا

وہ حسینہ نہا رہی ہے دیکھتے ہی کامدیو کی تیروں سے زخمی کرتی ہے۔ اس کے بال سے جو پانی کی بوندیں گر رہی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند کے مانند چہرے کی تابناکی سے خوفزدہ ہو کر گیسوؤں کی تاریکی رو رہی ہے۔

مذکورہ بالا نمونۂ کلام سے ناظرین کو ندرت تشبیہ کا انداز معلوم ہو گیا ہو گا۔ زبان کی سلاست ابتدائی دور کو مدنظر رکھتے ہوئے قابل داد ہے۔ غرض ان کا جتنا کلام ہے سب کا سب ترنم کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال میں سب کی زبان پر چڑھ گیا اور ہر محفل میں گایا جانے لگا۔

جذبات شایق

(از مسٹر کیلاش ورما شایق بنگالی)

عشق کی مدہوشیاں تھیں حسن کا افسانہ تھا — وہ بھی عالم تھا کہ عالم ہوش سے بیگانہ تھا
حسن خود ہی رازدار عشق تھا ہر رنگ میں — شمع کی لو میں نہاں سوز پر پروانہ تھا
جس پہ صد بتخانہ صدقے جس پہ صد کعبہ نثار — خود پرستی میں نہاں وہ جلوۂ جانانہ تھا
رنگ محو حسن بتاں تا ماہ شمس و قمر — فرش سے تا عرش نور جلوۂ جانانہ تھا
رہروان کوچۂ الفت کی یہ سرمستیاں — بے خبر کوئی۔ کوئی بیخود، کوئی دیوانہ تھا

کتب خانہ حبیب گنج میں غالب کی چند یادگاریں

مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی الملقب بہ نواب صدر یار جنگ صاحب نے حبیب گنج میں جو کتب خانہ قائم کیا ہے اس میں مجھے غالب کی چند چیزیں نظر آئیں۔ مولانا موصوف کا ایشیائی مذاق اور تنقیدی نقطۂ نگاہ اُن کی مرتب کی ہوئی فہرست اور اس کے عنوانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھکر واقعی خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستان میں بھی مشاہیر فن کی یادگاریں اکٹھا کرنے کا شوق بتدریج پیدا ہو رہا ہے۔ یوروپین ممالک میں تو مشاہیر کی ہر چھوٹی سے چھوٹی یادگار کی بھی غیر معمولی قدر کی جاتی ہے۔ ابھی حال میں ہی آسٹریلین گورنمنٹ نے کپتان کک کے گھر کا کل سامان انگلستان سے آسٹریلیا منگوا لیا ہے۔ عجائب خانہ لندن میں شکسپیر کا لکھا ہوا ایک رہن نامہ ابھی تک محفوظ ہے۔ ملٹن کا وہ معاہدہ بھی نہایت احتیاط سے رکھا ہوا ہے جس کی رُو سے اس شاعر اعظم نے اپنی مشہور کتاب (Paradise Lost) (فردوس گم شدہ) کا نسخہ ایک کتب فروش کے ہاتھ پانچ پاونڈ کی حقیر رقم کے عوض فروخت کیا تھا۔ انگریزی ادب کے قدردان ان کے لئے گولڈسمتھ کے درزی کا بل بھی ایک بیش بہا یادگار ہے۔

بہر حال میں بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی لائبریری سے غالب کا ایک کاروباری خط جو اُن کی مہر سے مزین ہے قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ مرزا صاحب تمام عمر مالی مشکلات میں مبتلا رہے۔ علم و ہنر کی بے قدری اور اہل کمال کی تنگدستی جس کی شکایت مرزا صاحب ہمیشہ کرتے رہے ہیں ہر زمانہ کے اہل ہنر کے حصہ میں آتی رہی ہے۔ مرزا صاحب حساب کتاب کی اُلجھنوں سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتے رہتے تھے جیسا کہ اُردوئے معلیٰ سے ظاہر ہوتا ہے یہ کام اُنھوں نے دوسرے شخص کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن کے ہاتھ کی ایسی تحریریں جو کاروباری معاملات سے متعلق ہیں بہت ہی کم ہوں گی۔ مندرجہ ذیل خط آگرہ کے اس خاندان سے حاصل کیا گیا ہے جن سے مرزا صاحب کے خاندان کے کاروباری تعلقات تھے۔ خاص چیز اس خط میں مرزا صاحب کی مُہر ہے جو خاتمہ تحریر پر لگی ہوئی ہے۔ اصل خط یہ ہے :-

"خاں صاحب مشفق مہربان خداداد خاں صاحب و ولی داد خاں صاحب سلامت۔
از اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ بعد سلام معلوم فرمایند کہ چوں آں صاحبان
با جناب والدہ صاحبہ قبلہ و کعبہ حضرت عزت النسا بیگم صاحبہ مد ظلہا العالی
ہم بہ طریق رہن حویلی و ہم بہ سبیل دست گرداں طرح داد و ستد درمیان دارند۔
و بلحاظ امر ناگزیر کہ لازم نفوس بشری است دل جمعی خود ازیں جانب مے خواہند
لہذا نوشتہ مے شود کہ خدائے جہاں آفریں جناب بیگم صاحبہ قبلہ یعنی والدہ صاحبہ
را دیر گاہ سلامت دارد۔ بہ ذات خود مالک آں ہر دو حویلی اند۔ و دیگرے را
دراں ہیچ گونہ شرکت و انبازی نیست۔ و اگر احیاناً خدانخواستہ باشد امر ناگزیر
کہ لازم ذات انسان است پیش خواہد آمد آنچہ از املاک ملوکہ و مقبوضہ
جناب ممدوحہ بہ تصرف ایں کنہ گار خواہد آمد۔ ازاں مجموع اول ادائے قرضہ آں
صاحبان کردہ خواہد شد و اگر ناگاہ وجہ قیمت آں مجموع بہ ادائے قرضہ آں صاحبان
کفایت نخواہد کرد بقیہ قرضہ آں صاحبان را از نزد خود ادا خواہم کرد۔ لیکن ایں معنی
بخاطر باشد کہ چوں جناب والدہ صاحبہ نوشتن و خواندن مے دانند لہذا قرار داد
آنست کہ مہر جناب والدہ صاحبہ کہ بے دستخط جناب ممدوح خواہد بود۔ از پایۂ
اعتبار ساقط متصور خواہد شد۔ خلاصہ اینکہ آں صاحبان ہر زرے کہ بجناب والدہ
صاحبہ قبلہ بہ سبیل قرض دہند تمسک مہری جناب ممدوحہ مزین بہ دستخط جناب ممدوحہ
حاصل کردہ نزد خود دارند۔ ہر تمسک کہ ایں چنیں خواہد بود زر مندرجہ آں اگر بسبب
اتفاق بذمۂ جناب ممدوحہ باقی خواہد ماند۔ از جناب ممدوحہ ادائے آں زر خواہ از املاک
متروکہ خواہ از جاداد خاص خود من فک الوجوہ بذمۂ من خواہد بود۔ ہرگز دریں
امر تردد نہ فرمایند و ایں خط را کہ من بدست خود در حالت ثبات حواس بے جبر
و اکراہ بہ رضائے خود نوشتہ ام دست آویز کامل شناسند۔ فقط نگاشتہ
سی ام جنوری سنہ ۱۸۴۲ عیسوی۔

خط کے خاتمے پر ایک مربع مُہر ہے جو صاف اور روشن ہے۔ اس کا حاشیہ نفیس گلکاری کا ہے بیچ میں اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ سنہ ۱۲۳۱ درج ہے۔

اِس خط سے کئی دلچسپ باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اول تو مرزا غالب کی والدہ نہ صرف لکھی پڑھی تھیں

کرتی تھیں۔ معاملات میں بذاتِ خود نوشت و خواند کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں تن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نام کی ایک مہر بھی تھی، نیز وہ اہم کاغذات پر اپنے دستخط کرتی تھیں اور مہر بھی لگاتی تھیں اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ پابندِ قید و پردہ کر بھی ایک ہندوستانی خاتون کس احتیاط کے ساتھ اپنے خانگی انتظامات انجام دیتی ہے۔ مغرب میں ہندوستانی عورت کو حرم سرا کا تبے زبان قیدی سمجھا جاتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے ابوالفضل کے رقعات میں مریم مکانی، شکرالنسا بیگم وغیرہ کے نام خطوط پڑھے ہیں وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملکی امورات میں بھی بیگماتِ حرم کہاں تک دلچسپی لیتی تھیں۔ مرزا کی والدہ خواجہ غلام حسین کمیدان کی بیٹی تھیں جو میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ عرف دولھا بیگ مرزا کے والد نے بطور خانہ داماد اپنی تمام عمر سسرال ہی میں بسر کی۔ یادگارِ غالب میں ایک خط کا کچھ حصہ درج ہے جو مرزا نے منشی شیونراین رئیس آگرہ کو لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے وہ بے شمار حویلیاں اور املاک گنائی ہیں جو آگرے میں اُن کے نانا کی ملکیت میں تھیں۔ اس جائداد کا کچھ حصہ ضرور مرزا کی والدہ کو ملا ہوگا جس کا انتظام وہ خود کرتی ہونگی۔ مگر سب سے دلچسپ چیز مرزا غالب کی مُہر ہے۔ میرے خیال میں یہ مہر اُس وقت کی ہے جبکہ مرزا صاحب نے ابھی غالب تخلص اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کا سنہ ۱۲۳۱ھ ہے۔ اور مرزا صاحب نے بقول صاحب آبحیات اپنا تخلص ۱۲۴۵ھ میں بدلا۔ مہر کی موجودگی کے لحاظ سے بھی یہ خط اہم ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے رسالہ ہندستانی ماہ اپریل ۱۹۳۳ء میں جو غالب کے لفافوں کے عکس دیئے ہیں اُن میں سے ایک پر غالب کی مُہر بھی ہے جس پر "غالب ۱۲۷۸" کندہ ہے۔

مرزا صاحب کے ہاتھ کی ایک اور تحریر بھی کتب خانہ کی زینت ہے جو مولوی صاحب موصوف کو مارہرہ سے دستیاب ہوئی ہے۔ یہ اُردو میں ہے مگر اس کا کاغذ بے احتیاطی اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے فرسودہ ہو کر خراب ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے بہت جگہوں سے کچھ بھی پڑھا نہیں جاتا۔ مضمون خط شاعری اور طرزِ کلام پر تنقید ہے۔ اور وہ مزاحیہ طرزِ بیان جو ان کے خطوط کا امتیازی نشان ہے اس میں بھی نمایاں ہے۔

مرقعات کے حصے میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے جو مولوی صاحب موصوف نے آج سے اُنتالیس سال پہلے دہلی میں خریدی تھی۔ یہ تصویر اس لحاظ سے خصوصیت رکھتی ہے کہ اس میں مرزا صاحب ایک ہندوستانی وضع کے لباس میں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ کلاہ ترکی

کی بجائے عمامہ زیب سر ہے، گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے، ایک پہلو میں تین کتابیں اور قلمدان ہے، مکان جس میں بیٹھے ہیں ایک کھلا ایوان ہے، اور تصویر کا پس منظر ایک پائیں باغ ہے جو ایشیائی تصویروں کی عام خصوصیت ہے۔ تصویر کے اوپر طلائی حروف میں یہ شعر لکھا ہے :-

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ٭ ہم اسد اللہم و ہم اسد اللّٰہیم۔ ۱۲۰۲ھ

غالب کی وفات ۱۲۸۵ھ میں ہوئی۔ لہذا یہ تصویر اُن کی عین حیات کی ہے۔ مگر حالت پیری کی نہیں بلکہ ڈھلتی جوانی کی ہے۔ داڑھی کے بال کچھ کچھ سفید ہو چلے ہیں۔ عمر ۴۵ یا ۵۰ کے لگ بھگ ہوگی۔ مولوی صاحب نے یہ دلچسپ بات اس کے متعلق بیان فرمائی کہ انھوں نے یہ تصویر مولانا حالی کو بھی دکھائی تھی، اُن کے خیال کے موجب بھی یہ تصویر مرزا صاحب کی ادھیڑ عمر کی ہے۔

چوتھی یادگار مرزا غالب کا وہ دیوان ہے جو مطبع نظامی سے ۱۲۷۸ھ میں چھپا۔ یہ دیوان غالب کی وفات سے آٹھ سال قبل شائع ہوا اور جیسا کہ اس کے خاتمہ میں لکھا ہے یہ نسخہ مصنف کا خود صحیح کیا ہوا ہے۔ اس میں غالب کا مختصر فارسی دیباچہ بھی ہے۔ غزلیات کے بعد چار قصائد ہیں قصیدہ اول حضرت علی کی منقبت میں ہے۔ اس میں تخلص اسد ہے۔

اس کتب خانہ میں اُردو دواوین مطبوعہ و قلمی کا اچھا خاصہ ذخیرہ بھی موجود ہے۔ جس کا مفصل تذکرہ مولوی صاحب ممدوح نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو رسالہ ہندستانی الہ آباد بابت جنوری ۱۹۳۶ء میں چھپ چکا ہے۔

جذباتِ منوّر

از منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

پھر اُن تراوشِ نغمہ بنا مجھے ۔۔۔ جو ہو گیا شکست وہ پردہ ہوں ساز کا
کب دُور ہوگی بحرِ حقیقت سے تشنگی ۔۔۔ ہوں اک فریب خوردہ سرابِ مجاز کا
سجدہ گزارِ جلوہ گہِ نازِ حسن ہوں ۔۔۔ پایہ بلند ہے مرے فرقِ نیاز کا
اُن کی نگاہِ لطف ہوئی چارہ گر مری ۔۔۔ درماں ہوا نصیب غمِ جانگداز کا

اس کا وجود تیری نظر پر ہے منحصر
محرم ہے کون تیرے سوا دل کے راز کا

ایک غریب الوطن کی برسات

(از سید مقبول حسین صاحب احمد پوری بی اے)

کالے کالے بادلوں سے بھر گئی ساری فضا ‏ ‏ ‏ ‏ ناچتی پھرتی ہو خوش خوش ہر طرف پُروا ہوا
گھمگھماہٹ اور گرج سے ابر میں باجا بجا ‏ ‏ ‏ ‏ آسماں والوں میں شاید آج ہے اندر سبھا
وہ گھٹا چھائی پپیہا بول اُٹھا پیتم کہاں؟
آہ یہ موسم، یہ بادل، تم کہاں اور ہم کہاں؟

کالے بادل چھا گئے ہر سو شبِ غم کی طرح ‏ ‏ ‏ ‏ ابرِ باراں جوش پر ہے چشمِ پرنم کی طرح
ہو گیا وہ مینہ جاری اشکِ پیہم کی طرح ‏ ‏ ‏ ‏ تم نہیں تو ہے یہ موسم بودِ شبنم کی طرح
وہ گھٹا چھائی پپیہا بول اُٹھا پیتم کہاں
آہ یہ موسم، یہ بادل، تم کہاں اور ہم کہاں

وہ ہوا کی سرسراہٹ برق کی تابندگی ‏ ‏ ‏ ‏ آہ وہ قوسِ قزح اور اُسکی خوش آئندگی
ننھی ننھی بوندیاں لائیں پیامِ زندگی ‏ ‏ ‏ ‏ تم نہیں تو زندگی سے بھی ہے اک شرمندگی
وہ گھٹا چھائی پپیہا بول اُٹھا پیتم کہاں؛
آہ، یہ موسم، یہ بادل، تم کہاں اور ہم کہاں؛

ہے شفق پھولی ہوئی اور مہرِ مغرب خشمگیں ‏ ‏ ‏ ‏ سرخ ہے ساری فضا اور آسماں ہے آتشیں
رشکِ جنت ہے جہاں اور پاس اپنے تم نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ تم نہیں تو آسماں سے بڑھ کے ظالم ہے زمیں
یہ گھٹا چھائی پپیہا بول اُٹھا پیتم کہاں
آہ، یہ موسم، یہ بادل، تم کہاں اور ہم کہاں

اِک زمانہ ہو گیا ہم کو وطن چھوڑے ہوئے ‏ ‏ ‏ ‏ آشیاں چھوڑے ہوئے باغ و چمن چھوڑے ہوئے
ہند کو چھوڑے ہوئے گنگ و جمن چھوڑے ہوئے ‏ ‏ ‏ ‏ وادیاں چھوڑے ہوئے کہسار، بن چھوڑے ہوئے
وہ گھٹا چھائی پپیہا بول اُٹھا پیتم کہاں
آہ یہ موسم، یہ بادل، تم کہاں اور ہم کہاں

جان اپنی سخت ہو کر سنگ خارا ہو گئی — کیوں تمھیں احباب کی دوری گوارا ہو گئی
ہاں تمھاری یاد جینے کا سہارا ہو گئی — زندگی جب یاد آئے تم، دوبارا ہو گئی

وہ گھٹا چھائی، پپیہا بول اُٹھا تم کہاں؟
آہ، یہ موسم، یہ بادل ہم کہاں اور تم کہاں؟

برسات ہے، برسات

آ، دیکھ تو ساون کے برستے ہوئے لمحات — ہو جائے گا کل خاک یہ مجموعۂ ذرات
کرتا نہیں کیوں عشق و جوانی کی مدارات — اِس رُت میں عبادت ہے حسینوں کی ملاقات

ساحل پہ نئی آن ہے ہر ماہ لقا کی — ہر گام پہ کھلتی ہے گرہ زلف رسا کی
اللہ رے کرامت اثر لغزش پا کی — رہ رہ کے جھکتی ہے کمر ارض و سما کی

گرداب میں بادل کے ہے خورشید کا بیڑا — کھاتا ہوا پھرتا ہے تھپیڑے پہ تھپیڑا
کس فصل میں چھیڑے گا جواب اگ نہ چھیڑا — نوخیز امنگیں ہیں کہ پانی کا دڑیڑا

ہر ذرۂ ناچیز ہے اس وقت شرابی — ہر رند خوش اوقات کا چہرہ ہے شہابی
اربابِ شریعت کو مبارک ہو خرابی — پیمانہ چھلکتا ہے، دمکتی ہے گلابی

میدان میں رقصاں ہے برستا ہوا پانی — یاروں کی طبیعت میں ہے دریا کی روانی
پہنے ہے کوئی سرخ لباس، اور کوئی دھانی — ہر چہرۂ رنگیں سے اُبلتی ہے جوانی

انبوہ حسینوں کا ہے دریا کے کنارے — طوفان ہے، تلاطم ہے، ترانے ہیں، ترارے
پھرتے ہیں نظرباز بھی سینوں کو اُبھارے — جھولے ہیں، جھما جھم ہے، جھماجھم ہے، اشارے

آ مست گھٹاؤں کی طرح دشت میں جھومیں — چھلکائیں مئے ہوش رُبا، جام کو چومیں
کیا دہر، دو عالم کو کریں غرق سبو میں — ہستی سے گزر جائیں مچلتے ہوئے دھومیں

رنگین فضاؤں میں گھٹا جھوم رہی ہے — دریا میں تلاطم ہے، ہوا جھوم رہی ہے
لہروں پہ طاروں کی صدا جھوم رہی ہے — ساغر میں مئے ہوش رُبا جھوم رہی ہے

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

جوش

(کلیم)

میکسم گورکی

افسوس کہ ۱۹ جون ۱۹۳۶ء کو روس کا مشہور معروف افسانہ نگار میکسم گورکی جس کا دنیا کے صفِ چند بہترین ادیبوں میں شمار ہوتا تھا رگرائے عالم جاودانی ہوگیا۔ اس کا اصلی نام الگزی میکسم وِچ پیشکوف تھا لیکن چونکہ اس کی تمام زندگی دنیا میں بہت تلخی کے ساتھ گذری تھی اس لئے اس نے اپنا ادبی نام "گورکی" رکھ لیا تھا جس کے لغوی معنی "تلخ" ہیں۔ "میکسم گورکی" ۲۶ مارچ ۱۸۶۸ء کو بمقام نژنی نگلاؤ پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک معمولی سازگر تھا، ماں بھی ایک معمولی کسان کی لڑکی تھی۔ ابھی یہ نو برس کا بھی نہ ہوپایا تھا کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا، کچھ دنوں بعد باپ بھی ملک عدم کو سدھار گیا جس سے یہ بچہ دُرِّ یتیم ہوگیا۔

دنیا میں یتیموں کا اللہ ہی والی ہوتا ہے۔ ماں باپ نے مدرسہ میں پڑھنے بٹھایا تھا مگر پانچ مہینہ بھی تعلیم نہ ہوپائی تھی کہ دونوں اس بچے کو اپنی محبت و شفقت سے محروم کرگئے۔ بہرحال اس نے کچھ دنوں نانا نانی کے گھر پر بسر کی۔ بالآخر مجبور ہوکر دس برس کی عمر میں ایک موچی کی شاگردی اختیار کی، مگر اس پیشے میں اس کا دل نہ لگا اور چند دنوں بعد اس نے نقشہ نویسی کا کام سیکھنے کی کوشش کی، تھوڑے دنوں بعد یہاں سے بھی علیحدہ ہوکر اس نے ایک ایسے کاریگر کے یہاں ملازمت کی جو عیسائی مذہب کی مقدس تصویریں اور مورتیں بنایا کرتا تھا۔ لیکن میکسم یہاں سے بھی اکتا کر بھاگا اور دریائے وولگا کے ایک جہاز میں باورچی کے یہاں نوکر ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور پھر موچی کا کام کرنے لگا۔ پندرہ برس کی عمر میں میکسم نے ایک اسکول میں داخل ہونا چاہا، لیکن جب اس کا بندوبست نہ ہوسکا تو نانبائی بن گیا، مگر جلد ہی اس کو یہ کام بھی چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد وہ چوکیدار رہا۔ کبھی آوارہ گردی میں زندگی بسر کی، کبھی محرر وکیل ہوگیا، اور چند روز کے لئے فوج میں اسٹور کیپر ہوگیا۔ غرض ۱۸۹۰ء تک یوں ہی اس کی زندگی بسر ہوتی رہی۔ آخرکار ۱۸۹۱ء میں اس نے دنیا کی سیر و سیاحت کا ارادہ کیا اور خانہ بدوش قلندروں میں شامل ہوکر تمام قلمروئے روس کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کر ڈالا۔ اس آوارہ روی

سے دل بھر گیا تو شہر طفلس میں جاکر ریلوے ورکشاپ کی ملازمت کرلی۔ اس اثنا میں اُس کا ذوق کتب بینی ترقی کرتا گیا۔ کیونکہ جو کتاب اس کے ہاتھ لگ جاتی تھی اُسے وہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا۔ اسی سلسلۂ میں اسے اپنی گوناگوں زندگی کے حالات کتابی صورت میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنے حالات لکھنا شروع کر دئے۔ اور طفلس کے ایک مقامی اخبار نے انھیں مسلسل شائع بھی کرنا شروع کر دیا۔ یہ گورکی کی سب سے پہلی تصنیف تھی۔

اس کے بعد وہ اپنے شہر دعرنی (واگراڈ) کو واپس آگیا اور متعدد مضامین شائع کئے۔ یہاں اس کو مشہور روسی افسانہ نگار ولادیمیر کوروتنکو کی صحبت سے فیض اُٹھانے کا موقع ملا۔ جس نے گورکی کی خداداد قابلیت کو بخوبی سمجھا اور اسکی مدد کرنا شروع کر دی۔ اسی اُستاد شفیق کی تربیت اور سفارش سے گورکی کا "سلکاس" نامی افسانہ ایک مشہور روسی رسالہ میں شائع ہوا۔ گورکی کے افسانوں میں اس کے تلخ تجربات اور دنیا کی واقفیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اُس نے روس کے ادنیٰ طبقہ کے لوگوں، خانہ بدوشوں، قلندروں اور فقیروں وغیرہ کی نہایت موثر اور دردناک تصویر کھینچی ہے۔ اسی وجہ سے "سلکاس" اور اس کے دوسرے افسانے اسقدر لوگوں کو بہت پسند آئے کہ وہ بہت جلد روس میں بہت زیادہ ہردلعزیز اور مشہور ترین افسانہ نگار ہوگیا۔

۱۸۹۵ء میں گورکی کا پطروگراڈ کے اخبار "زھسن" سے معاہدہ ہوگیا۔ جس کے روسے اس کے تمام افسانے اسی اخبار میں شائع ہوئے۔ اسی سال اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ بھی دو جلدوں میں شائع ہوا۔ مگر ابھی تک گورکی کی شہرت صرف روس تک محدود تھی ۱۹۰۲ء میں اُس نے "شب بھر کے لئے پناہ" نامی ایک ڈرامہ لکھا جس کے بدولت اُسے عالمگیر شہرت حاصل ہوگئی۔ اس ڈرامہ کے ہردلعزیزی کا یہ حال ہوا کہ جب جنوری ۱۹۰۳ء میں اسے برلن کے اسٹیج پر دکھایا گیا تو وہاں اسقدر مقبول خاص وعام ہوا کہ پانسو راتوں تک مسلسل یہی تماشہ جاری رہا۔

میکسم گورکی کے طرز بیان نے روسی سوسائٹی کے خیالات میں عجب انقلاب برپا کر دیا۔ اسکی تحریروں سے لوگ روسی گورنمنٹ سے بدظن ہونے لگے۔ درحقیقت میکسم گورکی کی تصانیف ہی نے روس میں سیاسی انقلاب کی بنیاد ڈالی اور بالشویک حکومت کے لئے راستہ صاف کیا۔ چنانچہ حکومت کی توجہات گورکی کی طرف مبذول ہوئیں اور ۱۹۰۵ء میں اس پر انقلاب پسندی

سے ہمدردی رکھنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور جیل کی سزا دی گئی۔ چنانچہ اس سزا سے اس کی ہردلعزیزی میں اور بھی چار چاند لگ گئے۔

جیل سے چھوٹتے ہی وہ روس سے ترک وطن کرکے امریکہ چلا گیا جہاں اس نے زار کی حکومت کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کیا۔ لیکن بدقسمتی یہاں بھی سامنے آئی دراصل جو عورت گورکی کے ساتھ امریکہ گئی تھی وہ اس کی جائز بیوی نہیں تھی۔ چنانچہ اس پر ارباب حکومت نے بہت شور وشر مچایا۔ جس کی وجہ سے گورکی کو مجبور ہوکر یوروپ واپس آنا پڑا۔ بہرحال جنگ عظیم تک وہ یورپ کے مقام کیپری میں سکونت پذیر رہا۔ ۱۹۱۳ء میں اس نے اپنی طویل سوانحعمری شائع کی اور جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی وہ روس کو واپس چلا گیا۔ اور فوج میں بھرتی ہوکر گلیشیا کے میدان جنگ میں داد شجاعت دی، اور زخمی بھی ہوگیا۔ اس کے بعد وہ علانیہ بالشویک تحریک میں شامل ہوگیا۔ اور اس کی حمایت میں ایک اخبار جاری کیا۔ جس میں وہ بالشویزم کی تائید وحمایت میں دھواندھار مضامین لکھتا رہا۔ لیکن جب اسے لینن کی مطلق العنانی اور خودسری کا حال معلوم ہوا تو وہ اس کے خلاف ہوگیا اور اس پر شدومد کے ساتھ حملے کرنے لگا۔ اس جرم میں اس کا اخبار حکماً بند کردیا گیا لیکن اس کی ہردلعزیزی کی وجہ سے مخالفین کو اس پر ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

کچھ دنوں بعد گورکی کو محسوس ہوا کہ بالشویزم کا مقابلہ کرنا بے سود ہوگا۔ اسلئے وہ بھی ارباب حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ حکومت نے اس کے صلے میں گورکی کو نادار ادیبوں اور سائنسدانوں کے مفاد کی حفاظت کرنیکی اجازت دیدی۔ اور دنیا کی عمدہ عمدہ کتابوں کا ترجمہ کرکے ان کے سستے ایڈیشن شائع کرنے کا کام اس کے سپرد کردیا۔ چنانچہ گورکی نے پٹروگراڈ میں مصنفوں کی انجمن قائم کی۔ جس کے لئے بڑی بڑی رقمیں اس کے حوالہ کی گئیں۔ اور روس کے بڑے بڑے مصنفین اور ادیبوں نے اس کی امداد کی۔

گورکی کے قلم میں اس وقت بہت زور تھا اور وہ اس وقت بھی حکومت سے نہیں ڈرتا تھا۔ چنانچہ جب سوویٹ حکومت نے بہت سے روسی علماء کو

گولی سے اُڑا دیا تو اس نے موسیو لینن کو ایک خط لکھکر پُر زور درد ناک اپیل کی۔ جس میں اس نے انقلاب انگیز سوشلسٹوں کی پامالی اور سختی پر اظہار بیزاری کرتے ہوئے لکھا کہ حکومت کا یہ فعل روس کے لیے ایک بدترین اخلاقی دھبہ ہے۔

۱۹۲۱ء میں گورکی روسی فاقہ کشوں کی امداد کے لئے اپیل کرنے دورہ پر نکلا۔ لیکن ایک طرف تو اس کی صحت نے جواب دیدیا۔ دوسری طرف اس کی راہ میں ایسی مشکلات حائل ہوگئیں کہ اس کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔ اور وہ مایوس ہو کر واپس آگیا۔ اور کچھ دنوں کے لئے اٹلی جا کر رہا جہاں اس نے پریگ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہیں اس کو پھیپھڑوں کی بیماری ہوگئی۔

۱۹۲۶ء میں جب اس کی صحت کسی قدر اچھی ہوئی تو وہ پھر اٹلی سے واپس آکر جنوبی روس میں رہنے لگا۔ سات برس کی غیر حاضری کے بعد مئی ۱۹۲۸ء میں وہ ماسکو گیا۔ جہاں اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن اس مرتبہ روس میں اسکی تندرستی اچھی نہیں رہی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں وہ پھر اٹلی آگیا۔ روسی گورنمنٹ کی خواہش تھی کہ وہ موسم سرما میں اپنی صحت درست کرکے "ہمارے کارنامے" نامی ایک سرکاری اخبار اپنی ایڈیٹری میں شایع کرے

عجیب بات تھی کہ میکسم گورکی کے مختصر افسانوں کو تو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی لیکن وہ کوئی طویل ناول نہ لکھ سکا۔ طویل ناولوں میں "فارما گارڈیف" اس کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ناول بے ربط واقعات کا ایک طومار ہے۔ اس کے مختصر افسانے روسی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس کے تقریباً تمام افسانے مختصر سوانحعمریاں ہیں جس میں جذبات سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ ہر جگہ واقعات زندگی بیان کئے گئے ہیں اور موجودہ سوسائٹی کی سخت مخالفت کی گئی ہے جو دنیا میں آلام و مصائب اور ناداری و افلاس کا باعث بن گئی ہے۔ اس کے افسانوں سے اسکی سوانحعمری بہتر خیال کی جاتی ہے جس میں اس نے روس کے ادنیٰ طبقوں کی زندگی کی دلچسپ مگر دردناک تصویریں کھینچی ہیں۔ اس کا طرز تحریر شاعرانہ اور وہ منظر کشی میں کمال رکھتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے ایک کارخانہ دار کے متعلق ایک ... کا

جس طرح انگلستان میں برنارڈشا۔ فرانس میں اناطول فرانس اور روما رولینڈ صاحب طرز مانے جاتے ہیں۔ اسی طرح میکسم گورکی بھی روسی ادب کا صاحب طرز مصنف مانا جاتا ہے۔ اس کے تمام افسانوں میں ایک ہی چیز یعنی جذبات عشق و محبت اور تہور و شجاعت کی روح جاری و ساری

معلوم ہوتی ہے۔ اس کے افسانوں کے تقریباً سبھی افراد کی زبانوں پر اس قسم کے فقرے جاری رہتے ہیں۔

"(۱) عشق اور بھوک دنیا پر حکمراں ہیں۔ (۲) لوگ علم کے خواہاں نہیں ہیں، بلکہ کمائی یا معاش کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ (۳) انسان کی ضروریات کس قدر کم ہیں! نان فاقہ گداز اور محبوبہ دلنواز۔ اور بس!"

ایک مرتبہ گورکی کا دماغ خراب ہوگیا اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ میں مخالف قوتوں کے بھنور میں پھنسا ہوا بیٹھا ہوں وہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ ان توہمات میں مبتلا ہوکر اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اور ایک ریوالور بھی خرید لیا۔ جس سے اپنے پھیپھڑوں میں گولی مار لی۔ لیکن اسکی زندگی ابھی باقی تھی۔ اسلیے بچ گیا۔ اور کچھ دن تکلیف اٹھاکر پھر اپنا کام کرنے لگا۔ اس کے کچھ دنوں بعد اسکی منچلی طبیعت نے پھر پلٹا کھایا اور وہ دیہات میں گھومنے لگا اور ایک کتاب میں لکھا کہ روسی دہقان اپنی عورتوں سے سخت بیہمانہ برتاؤ کرتے ہیں۔

میکسم گورکی کو بیس سال کی عمر میں ایک خوبصورت لڑکی سے محبت ہوگئی جو بدقسمتی سے اس کے ہاتھ نہ لگی بلکہ ایک بیش دراز روسی دہقان کے پلے بندھ گئی۔ چنانچہ ایسے کامیاب رقیب کی داڑھی کی ہجو کرتے ہوئے گورکی لکھتا ہے کہ "اسکی داڑھی کے بالوں میں ڈبل روٹی کے ریزے لٹکتے رہتے ہیں۔"

میکسم گورکی موجودہ زمانہ کی ادبی دنیا کا ایک مسلم لیڈر مانا جاتا تھا۔ وہ فرش سے اٹھ کر عرش پر پہونچا تھا۔ عمر بھر اس نے غریب طبقہ کا ساتھ دیا اور آخر دم تک ان کی نجات و آزادی کے لیے لڑتا رہا۔ زار کی حکومت کا اس پر عتاب نازل ہوا۔ مقدمے چلائے گئے۔ جیلخانہ بھیجا گیا۔ اور جلاوطن کرکے سائبریا میں نکال دیا۔ اسکی کتابیں ضبط کرلی گئیں۔ غرض ہر صورت سے اسکی زندگی دشوار کردی گئی۔ مگر اس مردمیدان کے پائے ثبات واستقلال کو جنبش نہ ہوئی۔ آخر میں اس نے انسداد جنگ اور فسطائیوں کی مخالفت میں باقاعدہ جہاد شروع کردیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں پیرس میں موسیو ہنری باربسے اور رومین رولینڈ کی شرکت میں میکسم گورکی نے دنیا کے علم و اخلاق و ادب کی حفاظت کی غرض سے مصنفین عالم کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالی تھی اگر کچھ دن اور اسکی زندگی وفا کرتی تو یقیناً وہ اس اہم مقصد کی تکمیل کیلیے بہت کچھ کرتا۔

حال میں برنارڈ شا نے اپنی اسی سالہ سالگرہ کے موقع پر میکسم گورکی کی وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ "دنیا میں میکسم گورکی کی ایک عظیم الشان ہستی تھی۔ درحقیقت اس وفات سے آج بیسویں صدی کے مصنفین کا ایک بہت بڑا رکن دنیا سے اٹھ گیا۔"

جس روز روسی اخباروں میں میکسم گورکی کے بیمار ہونے کی خبریں شائع ہونے ہوئیں اُسی روز سے تمام ملک کے قدر دانان علم و ادب کے قلوب پر مردنی سی چھاگئی کیونکہ مریض کو اہل روس اپنی قوم کا سب سے بڑا ادیب خیال کرتے تھے۔ اس وقت روس میں سب سے بڑا شخص جوزف اسٹالین ہے جو موسیو لینین کا جانشین اور حکومت کا سردار اعلیٰ ہے گورکی کی ہردلعزیزی اور عظمت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اسکی علالت طبع کی خبر سنتے ہی اسٹالین دو مرتبہ مزاج پرسی کے لیے گیا۔

میکسم گورکی ایسا شخص تھا جس کی تمام عمر زندگی کی جدوجہد میں گذری۔ لیکن آخر میں کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے اسقدر ہردلعزیزی اور شہرت حاصل کی کہ جس گاؤں میں وہ رہتا تھا اس کا نام ہی گورکی پڑ گیا۔

غرض اٹھتر سال کی زندگی کے بعد ۱۸۔ جون ۱۹۳۶ء کو میکسم گورکی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس کی لاش اسی ایوان چہل ستون میں رکھی گئی۔ جہاں دو برس پیشتر موسیو لینین کا جنازہ رکھا گیا تھا۔ یہ ہال معمولی حالت میں بہت شگفتہ منظر اور دلفریب ہے، لیکن گورکی کی میت رکھتے ہی روسیوں نے سے سیاہ پوش بنا دیا۔ تمام ہال اور اسکی غلام گردش گل دستوں اور پھولوں کی چادروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اور ۱۹ جون کو زائرین کا اسقدر تانتا لگا رہا گویا تمام روس ٹوٹ پڑا ہے۔ گورکی کی میت ایک بلند چبوترہ پر رکھی ہوئی تھی اور چاروں طرف فوج کے اعزازی سپاہی اسٹالین موسیو مولوتاف اور دیگر ارباب حکومت ادب کے ساتھ سرنگوں کھڑے ہوئے تھے۔ تقریباً دس لاکھ سے زائد آدمیوں کا ہجوم تھا۔ حکومت کا بینڈ درد انگیز سُر دُھن سے فضا میں رقت انگیز اثر پیدا کر رہا تھا۔ اور لوگ اس اہل کمال کی وفات حسرت آیات پر آنسو بہا رہے تھے۔

رات کو ماسکو کے قبرستان کے قریب اس کی لاش پھونک دی گئی۔ اس کے پھول ایک بلوریں مرتبان میں بند کر کے پھر چہل ستون میں لا کر رکھ دیے گئے اور یہ مرتبان ۲۰۔ جون کو پورے احترام کے ساتھ لینن کے مقبرہ کے سامنے ایک بلند چبوترہ پر زیارت کے لیے رکھا گیا۔ بعد میں روس کے وزیر اعظم موسیو مولوتاف اور دیگر معززین نے موثر تقریریں کیں۔ تقریروں کے بعد یہ مرتبان قصر کریملن کی ایک دیوار میں چن دیا گیا۔ اور اس مقام پر سنگ موسیٰ کی ایک لوح نصب کر دی گئی جس پر گورکی کی تاریخ ولادت اور وفات کندہ ہے۔ بعد ازاں قصر کریملن سے اکیس توپوں کی سلامی اتاری گئی۔ اور فوج نے مارچ پاسٹ کیا۔

میکسم گورکی کا دماغ لاش جلانے سے پہلے نکال لیا گیا تھا اور تحقیقات اور مطالعہ کیلئے ماسکو کے دماغی انسٹی ٹیوٹ میں بھیج دیا گیا۔ گورنمنٹ روس نے ایک کمیشن قائم کر کے گورکی کی تصانیف کی اشاعت کا کام اسکے سپرد کر دیا ہے۔

بان گنگا (کانگڑہ)

از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ایم۔ اے

خوردو بان گنگا! کس شان سے ہے بہتی
نکلی ہے پربتوں سے ہے وادیوں میں بہتی

ٹکر سے پتھروں کی رہ رہ کے ہے اچھلتی
گر گر کے ہے سنبھلتی چل چل کے ہے مچلتی

کیفِ سرورِ مستی دنیا کو ہے دکھاتی
مارے خوشی کے گویا پھولی نہیں سماتی

اک نعرہ لگا کر ہو بہ حال کھیلتی ہے
ساحل سے چھیڑ کر تو دھارا کو ریلتی ہے

ہے کانگڑے کی وادی پُر آب تجھ سے ہر دم
دھانوں کی کھیتیاں ہیں شاداب تجھ سے ہر دم

منظر ترا ہے خوشتر کیفیتِ چمن سے
بہتر ہیں بیل بوٹے نسرینِ نسترن سے

دونوں کنارے تیرے اشجار جھومتے ہیں
صف باندھے میکدے میں مے خوار جھومتے ہیں

پانی کی تُندی ہے یا لہر ہے خوشی کی
ہستی تری سراپا ہے موجِ بیخودی کی

قدرت کا ساز کس کس دُھن میں بجا رہی ہے
کس بیخودی میں مسرت کا راگ گا رہی ہے

اہلِ جہاں کی خاطر ملکِ عدم سے آئی
درگاہِ ایزدی سے پیغامِ لطف لائی

خالق سے یہ دعا ہے بہتی رہے سدا تو
اور یوں ہی رازِ ہستی کہتی رہے سدا تو

ناشاد بینوا کو تو شاد کام کر دے
پیمانۂ دل اُس کا مئے سے خوشی کی بھر دے

الہامِ سحر

دیکھ اے شاعر زمانے بھر کے خشک و تر کو دیکھ
وقت کی آواز سُن۔ حالات کے تیور کو دیکھ

پستیوں کے رہنے والوں کو یہ پہنچا دے پیام
سر بسر ترمیم کے قابل ہے دولت کا نظام

ٹھوکریں کھاتے ہیں گلیوں میں بصد حالِ خراب
لیتا ہے جن کے پسینے سے مہک قلبِ گلاب

رات کو فاقے سے سو گئے ہیں وہ مردانِ خدا
پرورش پاتی ہے جن کی گود میں مہر و وفا

(ادبی دنیا)

احسان دانش

پی کہاں

(ایک بیوہ کے درد بھرے جذبات)

از مولوی محمد زبیر صدیقی الہ آبادی

ہم تم چاندنی راتوں میں باغ کی سیر کیا کرتے تھے۔ گل چاندنی اور گل شبو توڑتے تھے۔ درختوں کے کنج میں رازونیاز کی پُرلطف باتیں ہوتی تھیں۔ اسی عالم میں کبھی کبھی پپیہا چلا اٹھتا۔ پی کہاں، پی کہاں۔ اس صدائے دردسے میں تڑپ جاتی۔ نہ معلوم اس کی دلخراش آواز میں کیا سحر تھا کہ میں کانپ اٹھتی۔ گھبرا کر تم سے پوچھتی۔ کیا اس کا پی اُس کے پاس نہیں ہے؟ کیا یہ فرقت زدہ ہے؟ کیا اس کو نیند نہیں آتی؟ ان پیہم سوالوں کا جواب تم کچھ نہ دیتے مسکرا کر نگاہیں نیچی کر لیتے۔ چند لمحوں کے بعد اک آہ سرد بھر کر تم اپنی یاس وحسرت بھری نظریں میرے چہرے پر ڈالتے۔ مگر میں ابھاگن کچھ نہ سمجھتی۔

آہ۔ آج اس خواب کی تعبیر سمجھ میں آئی۔ تم بیمار پڑے دن بدن تمہاری حالت غیر ہوتی گئی۔ کرب تکلیف سے تم تڑپتے تھے۔ راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔ میں سرہانے بیٹھی ہوئی تمہاری حالت زار پر آنسو بہاتی تھی۔ شافی مطلق کی جناب میں گریہ وزاری کی۔ تمہاری صحت کے لئے رو رو کے دعائیں مانگیں۔ آہ! سب بے سود۔

میں بدنصیب آج یہ کیا دیکھ رہی ہوں۔ اُف کیسا قیامت خیز منظر ہے آہ تم میرے سرتاج میرے دلی خاموش پڑے ہو۔ آنکھیں بند ہیں۔ زبان بولنے سے قاصر ہے صرف تمہاری سانس حیات مستعار کا پتہ دیتی ہے۔ مگر روح زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ اے بدقسمت عورت، تیرا شریک زندگی، تیرا رفیق حیات، تیرا پریمی تجھسے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے والا ہے۔ ابھی نہ رو۔ ساری عمر پڑی ہے رونے دھونے کو۔ تیری چیخیں اس کے اضطراب میں اضافہ کردینگی۔ تیرے آنسوؤں کا طوفان اس کے نحیف وکمزور جسم کو اور بھی زیادہ مضمحل کردیگا اور نزع کی تکلیف حد سے فزوں ہوجائے گی۔

ہائے تمہارا یہ عالم دیکھکر میں تمہیں پکارتی ہوں تم کچھ نہیں بولتے۔ لیکن آنکھیں کھول دیتے ہو جس سے میری اُمیدوں کی دنیا روشن ہو جاتی ہے پھر دل ذرا شگفتہ ہو جاتا ہے اور مسرتوں کے باغ میں پھر بہار آتی ہوئی معلوم دیتی ہے جب بدلی سے چاند نکل آتا ہے تو چکورکی بے تابی دُور ہو جاتی ہے اور پیاسا ہرن جب دُور سے سراب دیکھتا ہے تو خوش ہو جاتا ہے اسی طرح جب تم آنکھیں کھول دیتے ہو۔ تو میرے غمکدۂ دل کا گوشہ گوشہ دنیائے انبساط بن جاتا ہے۔

مگر اب تم میری آواز پر بھی آنکھیں نہیں کھولتے۔ اشارے سے بھی کچھ نہیں بولتے۔ یہ شانِ بے نیازی یہ بے اعتنائی یہ خاموشی مجھے تا زندگی رُلائیگی۔ دل سیماب وار بیقرار ہے ہائے اس بیجا بنیں آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ میں گھبرا گھبرا کر اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ سے تمہارا شانہ ہلاتی ہوں تمہیں جگاتی ہوں۔ مگر تم بیدار نہیں ہوتے۔

سہیلیاں میرا ہاتھ پکڑ کر چارپائی کے نیچے بٹھا لیتی ہیں اور رو رو کر کہتی ہیں تا دلی یہ کیا کرتی ہے وہ کہاں۔ وہ تجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ اُنکی رُوح پرماتما کی گود میں سکھ کی نیند سو رہی ہے؛

مالک! اے میرے مالک۔ رحم! دل خون ہو کر آنکھوں کی راہ بہا جاتا ہے۔ کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ دنیا اور دنیا کی ہر ایک شئے ماتمی لباس پہنے ہوئے ہے کائنات کا ذرہ ذرہ ماتم کر رہا ہے میرے اُمید دل کی دنیا پر غم کے سیاہ بادل چھا گئے۔ میری شمع آرزو گل ہو گئی۔ کچھ نہیں سوجھتا۔ اے میرے اللہ اب کدھر جاؤں۔ کس کو اپنا کلیجہ چیر کے دکھاؤں کسکو اپنی داستانِ غم سناؤں۔ موت کی تند ہوا نے میری محبت کے شگفتہ کنول کو پژمردہ کر دیا۔ میرا چمن تاراج ہو گیا۔ میری زندگی کی بہار رخصت ہو گئی۔ میری آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ میری مسرتوں کی دولت لٹ گئی میرا بیش بہا موتی گم ہو گیا۔ میرا سہاگ اُجڑ گیا۔ رنگین کپڑے اب میرے جسم زیب نہ دیں گے۔

تمہاری ارتھی تیار ہے۔ ماں باپ۔ عزیز و اقارب تمہارا آخری دیدار کر چکے اب میں بدنصیب تمہاری بالین پر بال بکھرائے کھڑی ہوں۔ آہ کیسا روح فرسا منظر ہے۔ کتنا حسرت خیز نظارہ ہے۔ میری اشکبار آنکھیں تمہارے چہرے پر آنسوؤں کے چھینٹے دے رہی ہیں گرداب ناکامی تم

بیدار نہیں ہوتے۔ کان تمہاری زبان سے افسانۂ محبت سننے کے لئے گوش برآواز ہیں آنکھیں تمہارے لبوں پر مسکراہٹ کی بجلیاں دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ مگر آہ تمہیں کسی کی پرواہ نہیں اسلئے یہ تمہیں کیا ہو گیا میں جو کبھی تم سے روٹھ جاتی تھی تو تم گھنٹوں مجھے مناتے تھے۔ میری دلدہی اور دلداری کرتے تھے۔ مگر آہ آج تم خود ایسے روٹھے ہو کہ کسی کے منائے نہیں منتے۔

تمہارا سکوت اور تمہاری محویت پتہ دے رہی ہے کہ اسوقت ایک پُرسکون دنیا کا نقشہ تمہارے پیش نظر ہے اور تم اسکی رعنائیوں میں کھوئے ہوئے ہو مجھ بدنصیب جسے تم کبھی ایک منٹ کے لئے جدا نہ کرتے تھے مگر آہ! آج مجھے محبت کی بھکارن بنا کر چھوڑے جاتے ہو آہ برکھا رُت آتے ہی تم مجھ سے جدا ہو گئے۔

آہ! ساون کی اندھیری راتوں میں جب جھینگر بولتے ہیں۔ گھنگھور گھٹا چھائی ہوتی ہے میں دکھیاری تنہا اٹاری پر پڑی ہوں بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے تڑپ جاتی ہوں میرے آنسوؤں کی جھڑی کو دیکھ کر بادل رو رہے ہیں۔ مگر تمہیں میری بیکسی کی پرواہ نہیں وہ تمہاری محبت کیا ہوئی جب میں بجلی کی تڑپ سے ڈر کر تمہاری جانب بھاگ کر آتی تھی اور تم مجھے ہنس کر اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دیتے تھے۔ اپنی آغوش محبت میں لے لیتے تھے۔ آج کیوں بے خبر ہو تم کہاں روپوش ہو گئے؟ کیا میری دکھ بھری آواز وہاں تک نہیں پہونچتی۔ کیا میرے درد انگیز نالوں کی وہاں تک رسائی نہیں۔

میں تمہارے لئے کونل اور پپیہا بنوں گی جنگل اور پہاڑوں میں ڈھونڈھتی پھروں گی پھولوں اور پتوں سے تمہارا پتہ پوچھوں گی۔ راتوں کی خاموش فضا میں جسوقت "پی کہاں" "پی کہاں" کی رٹ لگا دوں گی تو سونے والوں کے دل ہل جائیں گے۔ تمام عالم میں زلزلہ آ جائیگا۔ آخر قدرت کو میرے حال زار پر رحم آ ہی جائیگا اور اس کی رہنمائی سے میں وہاں تک پہونچ جاؤں گی جہاں تم ابدی زندگی کی بہاریں لوٹ رہے ہو۔

اِنسان کی کہانی، کُتّے کی زبانی

(از پروفیسر ایل۔ سی۔ کمار، ایڈیٹر "جنگ بلاد" کراچی)

میرے ایک معزز دوست کتّوں کے بڑے شائق ہیں۔ عرصہ سے آپ کتّوں کی سیرت، ذہانت اور زباندانی کے مطالعہ میں مصروف ہیں، اور آپ نے کتّوں کے متعلق اپنی تحقیقات کے نتائج کئی نامی رسالوں اور ضخیم کتابوں میں شائع فرمائے ہیں، جس سے سائنس کی دنیا میں ایک تلاطم پیدا ہو گیا ہے۔ پس اگر ان کو "ماہر علم الکلب" کا خطاب دیا جائے تو عین موزوں ہوگا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں رات کے وقت پنسل اور کاغذ لیکر کچھ لکھنے لگا تھا۔ میرے دوست پاس ہی ایک آرام کرسی پر دراز، کچھ سوچ رہے تھے کہ اتنے میں میرا کتا ڈِک جو میرے پاؤں کے پاس بیٹھا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا جھٹ لپک کر باہر دوڑ گیا اور برآمدے میں جاکر زور سے بھونکنے لگا۔ کتّے کا بھونکنا تھا کہ میرے دوست نے "آؤ دیکھا نہ تاؤ" آرام کرسی سے کود کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور میرے ہاتھ سے پنسل اور کاغذ چھین کر نہایت عجلت سے لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ اِدھر کتا بھونکتا جاتا تھا اُدھر آپ کی پنسل اسے لکھتی جاتی تھی۔ یہ دوگانہ عمل برابر آدھ گھنٹے تک جاری رہا۔

جب سب کچھ ہو گیا، تو میرے دوست نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا:

"میں خود ہی آپ کے سوال کا جواب دے دوں، آپ کا کتا ایک تقریر دہرا رہا تھا جو اس کو کتّوں کی ایک میٹنگ (مجمع) میں بحیثیت چیرمین (صدر نشین) کرنا ہے۔ جیسا آپ جانتے ہیں میں عرصہ سے کتّوں کی زبان کا مطالعہ کر رہا ہوں، میں نے اس میں خاصی مہارت پیدا کر لی ہے۔ اسکے علاوہ مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) میں بھی مجھے خاص ملکہ ہے۔ لہٰذا جب آپ کا کتا باہر نکل کر اپنی تقریر دہرا رہا تھا، میں حرف بحرف اس کو شارٹ ہینڈ میں لکھتا گیا۔ تقریر بڑے مزے کی ہے، اگر اجازت ہو تو پڑھکر آپ کو سنا دوں۔"

میں ہمہ تن گوش ہو کر سننے کو تیار ہو گیا۔ میرے دوست نے اپنے نوٹ پڑھنے شروع کئے:-

دوستو! میں آپ سب بھائیوں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس اہم جلسہ کی صدارت کے لئے منتخب فرمایا۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہم آج یہاں پر اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ ہم اُن ناقابل برداشت مظالم کے خلاف متفقہ آواز بلند کریں جو کچھ عرصے سے ہمارے ابنائے جنس پر سائنس کے نام سے روا رکھے جا رہے ہیں اور جن کو سائنس دانوں کی اصطلاح میں "Vivisection" کہتے ہیں۔

لفظ "Vivisection" کے معنی زندہ جانوروں کو چاقو یا چھری سے چیرنا پھاڑنا ہے اور یہ عمل ہمارے بھائیوں پر اس لئے کیا جاتا ہے کہ چونکہ ہماری بناوٹ انسان سے ملتی جلتی ہے، اس لئے ہمارے رگ و ریشہ کو چیر پھاڑ کر ان پر مختلف قسم کی زہریلی دوائیوں کے استعمال سے جو نتائج اخذ ہونگے وہی نتائج انسانی امراض کے علاج میں بھی کام آ سکتے ہونگے دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ Vivisection کے حامی وہ ڈاکٹر ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ چونکہ انسان اور کتے کی بناوٹ ایک ہی ہے اس لئے جو دوا کتوں کے لئے مفید یا مضر ہوگی، وہ انسان کے لئے بھی ضرور نفع بخش یا نقصان رساں ہونی چاہیئے!

(نہیں نہیں کے نعرے)

"بے شک، آپ کے نعروں سے صاف ظاہر ہے کہ آپ اس خیال سے قطعی طور پر اختلاف رکھتے ہیں، اور بات بھی یہی ہے۔ ایک جاہل سے جاہل کتا بھی یہ جانتا ہے کہ ہمارے ابنائے جنس کو حضرتِ انسان سے کوئی نسلی تعلق نہیں ہے۔ انسان کی اصل بندروں سے ہے، اور ان کا یہ دعویٰ کہ ان کی بناوٹ ویسی ہی ہے جیسے ہمارے بھائیوں کی، محض ڈھکوسلہ ہے؛ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک"۔

یہ بات کہ انسان بندر کی اولاد ہے، ہماری اختراع نہیں ہے، خود ان حضرتِ انسان ہی کے ایک فرد نے (جس کا نام ڈارون تھا) اس مسئلہ کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔ چنانچہ اب سوائے معدودے چند دقیانوسی خیالات کے لوگوں کے باقی تمام مہذب انسان اپنی نسل کو بڑے فخر کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی کسی ماں کے لال نے اس وقت تک یہ کہنے کی بھی جرأت کی ہے کہ کتے بندر کی اولاد ہیں؟

(ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں کے نعرے)

ہرگز نہیں، ہمارے آباو اجداد بھیڑیے سے جو مہذب ہیں، کبھی بندر نہ تھے۔ "ایں خیال است و محال است و جنوں"۔ بیشک انسان مہذب بندر کہلانے کے حقدار ہیں لیکن کتوں کے ساتھ اُن کا دُور کا بھی کوئی رشتہ نہیں ہے

انسان کے مہذب بندر ہونے کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ بندر فطرتاً احسان فراموش اور فتنہ انگیز واقع ہوا ہے، اور یہی حال انسان کا ہے۔ چنانچہ جب اس کا قیام ابھی باغ عدن میں ہی تھا اُس نے اپنے خالق اور پروردگار کے احسانوں پر پانی پھیر کر بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اور جب وہ اس کے صلہ میں بہشت سے بیک بینی و دو گوش بدر ہوکر زمین پہ بھیجا گیا۔ اُس نے دنیا کے ہر کونہ اور ہر گوشہ میں فتنہ اور فساد کا بازار گرم کر دیا ہمارے ابنائے جنس کا کیا سوال، وہ اپنے ہم نسل بھائیوں کو غارت اور تہ تیغ کرکے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کا خطاب عطا کرتا ہے۔ وہ خون کی ندیاں بہاکر ایسی ہی ڈینگیں مارتا ہے جیسے مینڈک گندے پانی کے تالابوں میں نہاکر خوشی سے ٹراتے ہیں۔ ہلاکو اور چنگیز خاں کے قصے اب یورپ اور افریقہ کی جنگلوں میں تازہ ہو رہے ہیں۔ پُرانے فاتح پھر بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی قسم کے اخلاقی قانون کے پابند سمجھتے تھے، لیکن آجکل کے نئے مہذب انسان بے شمار معصوم بچوں، بے قصور بڈھوں اور بے بس عورتوں کو زہریلی گیسوں سے ہلاک کرکے غیر مہذب قوموں کو تہذیب سکھلانے کے دعوے کرتے ہیں۔ (شرم، شرم!)

بیشک، ایک نہیں، ہزار بار شرم شرم پکاریئے تو بجا ہے۔ جب خداوند عالم نے حضرت انسان کو اپنا خلیفہ بناکر زمین پر بھیجنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا تو ابلیس نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ خاک کا پتلا زمین پر وہ وہ مظالم ڈھائیگا، اور اس قدر فتنے برپا کریگا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ تاریخ عالم کے خون آلودہ صفحات دیکھکر کون کہہ سکتا ہے کہ ابلیس کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔

برخلاف اس کے انھیں صفحات سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی ہے کہ جہاں تک ہماری شریف نسل کا تعلق ہے، ہم ہمیشہ سے وفاداری، نمک حلالی اور شکر گزاری کے لئے ممتاز رہے ہیں، اور اپنی جانوں کو نثار کرکے اپنے آقاؤں کی زندگیاں بچاتے رہے ہیں۔ میرے مرحوم دوست مسٹر بومد (Bo[illegible]) نے (خدا اس کو جنت نصیب کرے) خود انھیں حضرت انسان کے لٹریچر کی چھان بین کرکے ہمارے ابنائے جنس کی وفاداری کے مضمون پر

ایک عالمانہ لیکچر کے دوران میں بتلایا تھا کہ کس طرح ہر زمانہ اور ہر ملک میں ہمارے بھائی اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ مثلاً جب جنگ ٹرائے (Troy) کے بعد یولیسیس اپنے وطن مالوف کو لوٹ کر آیا، تو اس کے کسی اہل شہر نے اُس کو پہچانا تک نہیں، مگر اس کے کتے نے جو اپنے آقا کی جدائی میں قریب المرگ ہو رہا تھا اُس کو فوراً پہچانکر فرط خوشی سے ایک چیخ ماری اور وہیں جاں بحق ہو گیا۔ آپ نے لیولن (Llewlyn) اور اُس کے کتے گلبرٹ کا قصہ بھی سنا ہے۔ گلبرٹ نے اپنے آقا کی غیر حاضری میں ایک موذی جانور سے اس کے بچہ کی جان بچائی تھی، مگر خود اپنے آقا کے ناجائز غیض و غضب کا شکار بنا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ شاہ رچرڈ دوم کے کتے ماتھے نے اپنے آقا سے بے وفائی کر کے اس کے دشمن بولنگ بروک (Bolingbroke) کی پناہ لی تھی۔ مگر یہ فقط اس بات کی مثال ہے کہ انسان کی بُری صحبت میں پڑکر شریف النسل کتے بھی خراب ہو جاتے ہیں۔

پسر نوح با بداں بہ نشست — خاندانِ نبوتش گم شد

حضرت انسان اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں، اور اپنے روزمرہ کے ایجادات اور اختراعات پر بہت اتراتے ہیں۔ لیکن اس سے بڑھکر اور کیا کم ظرفی اور کوتاہ نظری ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دنیا کی تمام دوسری مخلوقات سے جدا مان کر اُن پر آئے دن نئے نئے ظلم روا رکھتا ہے۔ کیا وہ یہ بات نہیں سمجھ سکتا کہ تمام مخلوقات ایک ہی لامتناہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ اور اگر ان میں سے ایک کڑی کو ضرب پہنچا کر کمزور کر دیا جائے تو ساری زنجیر کمزور ہو جائیگی کیا وہ ہر روز یہ نہیں دیکھتا کہ کاہ سے لیکر ماہ تک ہر چیز علت و معلول کے سلسلہ میں بندھی ہوئی ہے۔ اور اس کی اپنی تمام حرکات و سکنات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اور کوئی جاندار دوسرے جاندار کو اذیت پہنچا کر خود راحت حاصل نہیں کر سکتا۔ (ہرگز نہیں، ہرگز نہیں)

دوستو! میرا وقت ختم ہو چکا ہے، میں فقط یہ کہکر اپنی تقریر ختم کرونگا کہ تمام انسان ایک قبیل کے نہیں، اُن میں چند فرد ایسے بھی ہیں جو ہمارے ابنائے جنس سے محبت کرتے ہیں، اور اپنے ابنائے جنس کو ہم سے ہمدردی کرنا سکھاتے ہیں۔ آپ نے حکیم دیوجانس کا قصہ سنا ہوگا جس کی ملاقات کے لئے خود اسکندر اعظم تشریف لے گیا تھا۔ لوگ اس فلسفی کو حقارتاً دیوجانس کلبی کہتے تھے یعنی "سگ مزاج" لیکن وہ خود اس نام پر ناز کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک معصوم بچی نے اس سے سوال کیا کہ "بابو جی آپ کو کلبی کیوں کہتے ہیں؟

ڈیو ہانسن نے مسکرا کر جواب دیا "میری بھی"۔ ان کے ظرافت آمیز لفظوں میں سچی تعریف ہے:
حال ہی میں ایک مصنف مسٹر ایچ۔ وڈ۔ ایس مارٹن نے اپنے ہم جنس بھائیوں کو جانوروں کی مثال سے فائدہ اٹھانے کا حسب ذیل مشورہ دیا ہے۔

"اگر ہم لوگ بے زبان جانداروں سے زیادہ میل جول رکھیں تو یہ ہمارے لئے بہت مفید ہوگا وہ اپنے حال پر کس قدر قانع ہیں، اُن کو نہ اخبار بینی کی فکر ہے نہ ووٹ (Vote) دینے کا شوق مزید برآں اُن میں اور بھی کئی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ دیکھکر کہ وہ ہم کو اصلیت سے کئی گنا زیادہ نیک سیرت تصور کرتے ہیں، ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے۔ نیز ہماری خفیف سی دیکھ بھال کے عوض وہ ہم کو اس قدر زیادہ معاوضہ دیتے ہیں کہ ہماری فیاضی کو خجالت آتی ہے۔ میری رائے میں یہ خیال بڑا قابل قدر ہے کہ خدا نے اُن کو ہمارے لئے نمونہ نہیں تو کم از کم اشارہ کے طور پر بنایا ہے۔ (مستو۔ سنو)

جذبات کیفی

(از مولانا کیفی چریا کوٹی)

خود اس طرح کھینچا کہ مجھے دور کر دیا
قربانِ اختیار کہ مجبور کر دیا

جو ماجرائے دل تھا وہ نقشِ حیات تھا
مٹنا پڑا ہے اس پہ کہ مشہور کر دیا

طرزِ ادائے حُسن کی نیرنگیاں ہیں یہ
مجنوں اسے کیا اُسے منصور کر دیا

اڑنے لگا ہے ہوش بھی شوقِ نیاز کا
ایسا نگاہِ ناز نے مخمور کر دیا

اُس بے حجاب حسن کی ذرہ نواز یاں
جس پر پڑی نگاہ اُسے طور کر دیا

قرباں بناؤ کے ہوں کہ صدقے نگار کے
رکھ کر نظر میں دل سے مجھے دور کر دیا

اک اک ادائے مست پہ ساقی کے گم ہے ہوش
توڑا سبو کو اور مجھے چور کر دیا

اس اضطرابِ شوق میں جینا پڑا ہمیں
مرنا بھی اس نے خلق میں دستور کر دیا

کیفی کا اور کوئی ٹھکانا نہیں رہا
اچھا کیا جو آپ نے مجبور کر دیا

تنک مزاج بیوی کا علاج

افسانہ

(از رائے بہادر راؤ حارس صاحب بہادر)

تھوڑا عرصہ ہوا میرے ایک نیک نہاد دوست نے مجھے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔ میں ان کے مکان کے سامنے دروازہ کھلنے کے انتظار میں کھڑا ہی تھا کہ بعض خیالات میں محو ہو کر میں ایسی خود فراموشی کی حالت میں غرق ہو گیا جو اکثر اہلِ قلم پر طاری ہو جایا کرتی ہے۔ مگر اسکی وجہ سے بعد میں مجھے سخت پشیمان ہونا پڑا کیونکہ دروازہ کھلتے ہی جب میں اندر داخل ہوا۔ اور پائنداز سے آگے (جو اس صاف و شفاف سنگ مرمر کے فرش پر پڑا ہوا تھا) قدم بڑھائے۔ تو میرے خاک آلودہ پاؤں کے نشانات فرش پر پڑنے لگے۔ اسپر میں پیچھے ہٹا اور اپنے جوتوں کو پائنداز پر خوب رگڑ کر صاف کیا۔ لیکن مجھے اپنی بے احتیاطی پر ملال ضرور رہا۔ کیونکہ ذراسی احتیاط سے میں بدتمیزی کے الزام سے بچ سکتا تھا بہرحال مجھے فوراً ہی یہ محسوس ہوا کہ میری غلطی مالکِ مکان کی بیوی کی نگاہ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ میں نے خود اسے بڑبڑاتے سُنا۔ پھر اس نے اپنی خادمہ سے بآواز بلند کہا کہ فرش صاف کرنے کا برش لاکر فوراً ان نشانات کو مٹاؤ۔ اس کے بعد اس نے مجھے کھانے کے کمرے میں اپنے خاوند کے پاس پہونچا دیا۔ غرض میرے دوست کی بیوی نے بظاہر تپاک مگر دراصل قدرے سرد مہری کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ہر چیز صفائی اور قرینے سے رکھی ہوئی ہے اور کھانے کی میز پر ایک نفیس سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مالکہ کو اپنی خوشگوار صفائی پر بڑا ناز ہے اور شاید اسی لئے وہ مجھے کسقدر حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

بہرحال کھانے کے بعد میزبان نے میرے پیالہ میں تھوڑی سی سفید رنگ کی شراب ڈال کر اسکی بڑی تعریف کی۔ میں خود بھی اسکو ایک اعلیٰ قسم کی شراب سمجھتا تھا۔ اگرچہ اسکا ذائقہ مجھے کچھ پسند نہ تھا۔ میں نے ہر چند چاہا کہ میرے خیال کا اظہار نہ ہونے پائے لیکن میرے خلیق دوست نے فوراً ہی اس کو تاڑ لیا۔ اور اس نے اس سے پہلے کہ میں اپنا پیالہ خالی کر دوں ایک ملازم سے کہا کہ ارغوانی شراب لے آؤ شاید ہمارے مہمان اُسے زیادہ پسند کریں۔"

ارغوانی شراب کا نام سنتے ہی اسکی بیوی بہت ہی بے چین ہو گئی۔ اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں اس نے کہنا شروع کیا۔ پیارے! تمہارے دوست غالباً موسیل یا رینش Rhenish شراب کو زیادہ پسند فرمائیں۔ ہمارے یہاں نہایت عمدہ اور پرانی رینش موجود ہے۔ ذرا اسکو تو نوش کر کے دیکھو۔

یہ جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ملازم نے ارغوانی شراب کی بوتل لا کر میز پر رکھدی۔ اور میرے دوست نے آگے انڈیل کر میرا جام بھرنا شروع کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے کئی دور ہوں۔ اسمیں شک نہیں کہ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسی نفیس شراب نہ چکھی تھی۔ لیکن یہ مجھے ایسی خوفزدہ حالت میں ملی تھی کہ میں اپنی ابتدائی غلطی کیوجہ سے بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ بہرحال جب میں اپنا پیالہ ہاتھ میں اٹھاتا تھا تو میری دوست کی لیڈی صاحبہ کی نگاہ میرے ہی طرف رہتی تھی جس سے میرا دم اور بھی خشک ہو گیا۔ ہر مرتبہ جب میں اپنا جام منہ سے لگاتا تو کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھ لیتا تھا کہ مبادا اس کا کوئی قطرہ نفیس میز پوش پر گر جائے۔ اس اثنا میں میرے دوست نے جو ایک بیدار مغز آدمی ہیں بعض اہم معاملات کی گفتگو چھیڑ دی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں میرے احتیاط کرنیکی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ حتی کہ ہر دفعہ جب وہ پیالے میں شراب ڈالتے تھے تو ایک آدھ قطرہ شراب کا ضرور چادر پر گرا دیتے تھے۔ انکی بے احتیاطی سے ہر دفعہ انکی بیوی بہت پریشان ہو جاتی تھیں اور اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ گویا دفعتاً کسی نے اسکے سوئی چبھو دی یا چٹکی لے لی ہے۔ پہلے تو اس نیک بخت نے اسی پر اکتفا کی کہ چادر کے ہر دھبے پر جلدی سے کچھ نمک مل دیتی تھی مگر جب اس نے دیکھا کہ شوہر صاحب اپنی اس حرکت سے باز ہی نہیں آتے ہیں تو کسیقدر نرم لہجے میں یہ کہکر اپنی ناخوشی ظاہر کی کہ ذرا دیکھو تو تم کیا کر رہے ہو۔ اور اسقدر شراب کیوں گرا رہے ہو؟

میاں "بہت اچھا۔ احتیاط رکھونگا"

مگر اس "مزید احتیاط" کا یہ نتیجہ ہوا کہ لبالب بھرا ہوا پیالہ بوتل سے ٹکرایا اور ساری شراب چادر ہی کے اوپر آرہی۔ پھر کیا تھا۔ اس کی بیوی کو ضبط کی تاب نہ رہی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اس کی زبان سے بیساختہ یہ الفاظ نکلے:۔

"غالباً تم نے ارادتاً مجھے چڑانے کیلئے پیالہ کی شراب گرا دی۔ ایسا عمدہ میز پوش نصیب ہونا مشکل ہے۔ خیر! اب چاہے جتنی مرتبہ دوستوں کو مدعو کرو۔ اور پیالے انڈیلتے رہو۔ میں بھی جب موقعہ دیکھونگی ویسی ہی چادر بچھاؤں گی"

بیوی نے اسی خیال کو کئی مرتبہ مختلف ڈھنگ سے ادا کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ جب طیش میں

عورت کی فصاحت کا دریا اُمنڈتا ہے تو اُس کی لفاظی کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور وہ ایک ہی بات کو دس مرتبہ الفاظ بدل بدل کر کہتی ہے۔ خیر کچھ دیر تک تو میرا دوست اس شورش کو چپ چاپ نہایت سنجیدگی کے ساتھ برداشت کرتا رہا۔ اپنی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکالا اور نہ اپنے چہرے پر شکن آنے دی۔ البتہ بیوی کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسی کے بعد بوتل تھا کر نہایت متانت سے شراب کو میز پر انڈیلنا شروع کیا۔ اپنے آگے۔ میرے آگے اور پنی بیوی کے آگے۔ اور جب دیکھا کہ کافی مقدار میں شراب گر چکی ہے تو بوتل کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔

بیوی پہلے تو زبان بند کئے یہ تماشا دیکھتی رہی پھر چند ہی منٹ بعد وہ میز پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اُس کی آنکھیں غصہ سے سُرخ تھیں۔ غرض وہ ایک ڈائن کی طرح بپکی گویا اپنے خاوند کا منہ نوچ لے گی اس نے چلا کر کہا کہ بتاؤ! یہ ہو کیا رہا ہے۔ آخر تمہاری عقل ماری گئی ہے۔ یا سر پر بھوت سوار ہوا جب وہ کہتے کہتے تھک گئی تو ایک آرام کرسی پر جا بیٹھی اور اس کے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ مگر اس طوفان غیظ و غضب کے دوران میں اُسکا خاوند بالکل خاموش بیٹھا رہا اور ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا البتہ غصہ آمیز نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا رہا جب اُس نے یہ دیکھا کہ اب طوفان کا زور کچھ گھٹنے لگا ہے اور اس کی بیوی کمرے سے باہر جانا چاہتی ہے۔ تو اُس نے اُسکو رُوکا اور ایسے لہجے سے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے کو محض حکم دینے ہی کا مستحق نہیں بلکہ اپنے حکم کی تعمیل کرانا بھی لازمی سمجھتا ہے۔ اپنی بیوی سے اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔ وہ بد دلی کیساتھ بیٹھ گئی۔ جس پر میرے دوست نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے نہایت استقلال و متانت کیساتھ کہا مجھ کو اس کا افسوس ہے کہ یہ واقعہ ان دوست کی موجودگی میں ہوا۔ یہ افسوس مجھے نہ اپنی اور نہ تمہاری وجہ سے ہے۔ بلکہ محض اپنے خیال سے ہے۔ میں ان کے حسن اخلاق اور دانشمندی سے خوب واقف ہوں۔ مجھے افسوس اس کا ہے کہ اُنھوں نے آج پہلی مرتبہ میرے غریب خانہ پر رنجہ فرما کر ہماری عزت افزائی کی۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ نفیس سے نفیس شراب نوش جان کریں انھیں تلخ سے تلخ زہر کے گھونٹ اپنے حلق سے اتارنا پڑے۔ ابھی ہماری تمہاری شادی کو تھوڑا ہی زمانہ گذرا ہے۔ مگر تم چھوٹی چھوٹی باتوں میں کئی بار جائز اختیارات سلب کرنے کی کوشش کر چکی ہو لیکن میں نے ابتک اس کی کوئی شکایت نہیں کی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم شوہر کیساتھ اُس کے مرتبہ کے خلاف کس حد تک برتاؤ کر سکتی ہو۔ میں ایک موقع مناسب کا منتظر تھا کہ تم کو اس بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کر دوں۔ اس لئے آج اور آج سے آگے تم ہمیشہ کے لئے خوب سمجھ لو

کر چاہے جیسی سفید اور صاف چادر میری میز پر بچھائی جائے اور میری میز پر ہمیشہ سفید اور صاف چادر ہی بچھائی جاوے گی، میں وہی شراب پیونگا جو مجھ کو اور میرے دوستوں کو مرغوب خاطر ہوگی اور اسکو بلا کسی لحاظ و خیال کے جسقدر اور جس طرح چاہوں گا پیونگا۔ اور جب کبھی تم میری اس بات پر معترض ہوگی تو میں ویسی ہی حرکت کرونگا جو میں نے آج کی اور جس کی وجہ سے تم کو اسقدر طیش آیا۔ اس قسم کا غصہ کسی کنجڑن یا بھٹیاری کے شایاں ہو تو ہو لیکن ایک معزز خاتون کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ ابتدائے محبت میں محض صداقت و شرافت کو کام میں لایا۔ میں اپنی معقول پسندی اور راستبازی کے سوائے ہر چیز تم پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر جان من تم بدمزاجی اور خام خیالی سے کام لوگی تو تمہیں بہت سی پریشانی ہوگی۔ جس میں میرا کوئی قصور نہ ہوگا۔ بہرحال میں تم کو اپنی عزیز بیوی کی حیثیت سے ہر جائز طریقہ سے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے حقوق کو جو خدا اور دنیا کے روبرو میرے ہیں تمہیں اس طرح پامال کرنے دوں یہ بات بخوبی ذہن نشین کر لو کہ اپنے گھر میں میں ہی مالک و حکمران رہنا چاہتا ہوں اور رہونگا اس بات سے میں نے تم کو شادی سے پہلے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ بہرحال اب بھی تم میرے حقوق اور اپنے فرائض بخوبی سمجھ لو اور اس کے مطابق کاربند ہو۔ میری رائے میں اپنی زندگی بے لطف کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ تم میری چیزوں کے متعلق میری مرضی کو مقدم رکھو۔ اور اگر یہ ممکن نہیں تو تم اپنے جہیز کا تمام سامان لیکر اپنے والدین کے گھر واپس جا سکتی ہو اور وہاں جاکر تم کو خود اس بات کا تجربہ ہو جائیگا کہ وہ لوگ کس حد تک تمہاری بے تکی باتوں کو برداشت کر سکتے ہیں۔"

ان الفاظ کے کہتے ہوئے میرے عزیز دوست کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس تمام تقریر کے دوران میں میرے دوست کی کم سن بیوی کی آنکھوں میں ایک محبت آمیز جذبہ نمودار ہوتا جاتا تھا اور آہستہ آہستہ ان میں آنسو بھی بھر آئے جو غصے کے آنسو نہ تھے۔ بلکہ ندامت اور محبت کے آنسو تھے۔ اس نے ایک حرف بھی زبان سے نہیں کہا۔ وہ اٹھی اور اپنے شوہر کے گلے سے لپٹ گئی اور دونوں کے آنسو ایک دوسرے کے چہرے پر بہنے لگے۔ ذرا دیر کے بعد جب وہ علیحدہ ہوئی تو اپنے خاوند کے قدموں پر گرنے لگی مگر اس نے روک کر اسے سینہ سے لگا لیا۔ بالآخر وہ روتی روتی اور سسکیاں بھرتی ہوئی یوں گویا ہوئی:۔

"میں تم سے علیحدگی اختیار کر لوں! میں تم سے علیحدگی اختیار کروں! اس سے تو یہی بہتر ہوگا کہ تم مجھ کو اپنے ہاتھ سے ہزار مرتبہ قتل کر ڈالو۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں اس لائق نہیں ہوں کہ تم مجھ

سے محبت کرو۔ تاہم میری گذارش ہے کہ تم میری اس بیہودہ غلطی کا باعث میری ناتجربہ کاری کو سمجھو۔ میرے فرشتہ سیرت شوہر بے شک جو کچھ تم نے کہا ہے حرف بحرف صحیح اور درست ہے۔ تمہیں اپنے گھر کے کامل مالک ہو۔ اور ہمیشہ رہو گے اب میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آج کے بعد میں ہر بات میں تمہیں خوش رکھنا اور تمہارے احکام کی بلا تامل تعمیل کرنا ہی اپنی عزت اور مسرت کا سرمایہ سمجھوں گی۔ میں تمہاری بیوی ہوں مگر بالکل الھڑ اور نادان عورت ہوں۔ میں آج تک یہ نہیں جانتا کہ ضبط و تحمل کسے کہتے ہیں۔ مگر اب اتنی عقل مجھ میں ضرور آگئی ہے کہ آئندہ ہر بات میں تمہاری دانشمندی پر پورا بھروسہ کروں۔ میرے پیارے خدا کے لئے میری بات کا یقین کرو اور اپنے محبت بھرے دل سے خفگی دور کر دو۔ میرے اشک ندامت کو دیکھتے ہوئے میری افسوسناک غلطی پر ترس کھاؤ اور اب اپنے دل میں کسی قسم کا ملال باقی نہ رہنے دو۔ میری التجا ہے کہ میری چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو نظر انداز کرتے رہو گو میں اس قابل نہیں کہ میرے ساتھ نیک نہادی کا برتاؤ کیا جائے۔ مگر آپ اپنی طرف دیکھ کر میرا قصور معاف کیجئے:

اس کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ جناب عالی آپ کی طرف تو میں شرم سے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی جس طرح میں نے آپ کی ہتک کی ہے۔ وہ ہرگز معافی کے قابل نہیں ہے۔ تاہم مجھ کو آپ کی فیاضی سے اُمید ہے کہ آپ مجھے معاف کیجئے گو میں تو اس مہربانی کی مستحق نہیں ہوں۔ مگر آپ میرے شوہر کی دوستی کا خیال کر کے جن کے دل میں آپ کی بیحد تعظیم ہے۔ مجھے معاف کیجئے۔ آج آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اس سے آپ کے دل میں ضرور خیال پیدا ہوا ہوگا کہ میرے برابر دنیا میں کوئی قابل نفرین عورت نہیں ہے۔ مگر میں صدق دل سے آپ کی یہ رائے تبدیل کرنا چاہتی ہوں۔ اسلئے جب کبھی آپکو فرصت ہو تو آپ ہمارے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر ماحضر تناول فرمائیں اور بچشم خود اُس خوشگوار اصلاح کا مشاہدہ کریں جسکی بنا دآج سے میرے دل میں پیدا ہو گئی ہے اور جو میں اُمید کرتی ہوں ہمیشہ قایم رہے گی:

اس کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے شوہر کو ایک دفعہ اور سینہ سے لگا کر تیزی سے کمرہ کے باہر چلی گئی اور دوسری سفید چادر لے آئی اور آتے میز پر صفائی کیساتھ بچھا دیا۔ اور پہلی چادر کو حقارت آمیز انداز سے ایک گوشہ میں پھینک دیا۔ فوراً کھانا کھانے کے وقت میاں بیوی میں ایک اور تکرار شروع ہوئی مگر وہ تکرار بالکل دوسری قسم کی تھی۔ میرا دوست تو اسبات کے ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کی بیوی کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ اُسی نے اس ذراسے معاملے کو

ضرورت سے زیادہ طوالت دی مگر اس کے برخلاف .... اس کی بیوی ہر طرح کے دلائل سے یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ غلطی اُسی کی تھی۔ اور شوہر نے جو کچھ کیا بہت مناسب کیا اگر وہ چشم پوشی کرتا تو پھر اسے زندگی بھر اصلاح کا موقع نہ ملتا۔

غرض میاں بیوی دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ایسے رنج و راحت کے دن کا ان کو اس سے پہلے تجربہ حاصل نہ ہوا تھا۔ اور نہ کبھی انہوں نے اپنے باہمی محبت کا اظہار اسقدر جوش کیساتھ کیا تھا۔ اس طرح یہ معاملہ انجام بخیر ہوا۔ اس روز کے بعد میں قریب قریب روز آدان کے گھر جاتا رہا۔ اور نہایت مسرت کیساتھ اس بات کو دیکھتا رہا کہ وہ ننھی سی بیوی اپنے وعدے پر ثابت قدم رہی اور اب اس کو اپنی فرمانبرداری پر اسیقدر ناز ہے جیسا کہ بعض عورتوں کو اپنی خود رائی پر فخر ہوتا ہے۔ میں اس واقعہ کو اُسی کے اصرار سے ضبط تحریر میں لا رہا ہوں تاکہ نا تجربہ کار اور خود پسند عورتوں کو عبرت ہو اور اس مثال سے سبق حاصل کر سکیں کہ واقعی زندگی کا امن و آرام اپنے فرائض کے ادا کرنے کے طرز عمل پر مبنی ہے۔

(ترجمہ)

مشاہدات

(از جناب کاظم دہلوی)

لے آئی جلوہ گہ میں مری آرزو مجھے
اب اپنی کچھ خبر نہ تری جستجو مجھے

رگ رگ سے پھوٹ نکلے لہو کی طرح شباب
لیجائے اعتدال سے آگے نمو مجھے

کیا چاہتا ہوں، یاد نہیں انکے روبرو
کوئی ذرا بتائے مری آرزو مجھے

احباب بھی خلاف۔ زمانہ بھی منقلب
بدقسمتی سے تو بھی ملا حیلہ جو مجھے

جذبات میں دباؤں جوانی کے کس طرح
جب جوش کھائے خون ابھار نمو مجھے

کاظم وہ چال چلتا ہوں جس چال کی سبب
آنکھوں میں دیں جگہ کبھی دل میں عدو مجھے

اٹلی اور حبش

(از جناب اقبال ورما سحر ہتگامی)

مسولینی پہ چڑھا جن جو قیصریت کا
وہیں خیال ہوا اُسکو یوں بربریت کا

کہ ہو کے نفس سے مفتوح فتحمند بنے
خود اپنی روح کی پستی میں سربلند بنے

تو ناگہاں دلِ مضطر کو کچھ قرار مِلا
بلا تلاش شکاری کو اک شکار مِلا

نہ تھی درست کی یا نادرست کی پروا
ہوئی کسی کے نہ کچھ سخت سست کی پروا

دکھاتی ہی رہی آنکھیں جماعتِ اقوام
لیا نہ دیدہ دلیروں نے خیرگی کا نام

پہ یوں ہوئی تہذیب گستری کی مثال
ہوا کمال سے تہذیب کو نصیب زوال

دلیریوں کی ہوئی اِس قدر فراوانی
کہ قیمتوں نے دکھائی بلا کی ارزانی!

زیادہ زور کا یوں زد ایک ساتھ پڑا
دراز دست کا کمزور ہی پہ ہاتھ پڑا

بگاڑ کے یہ تھوڑا بہت بہانہ ہوا
خدنگِ جور کا آخر حبش نشانہ ہوا

مٹا سُراغ تک انصاف و حق کی راہوں کا
کہ مثلِ آب بہا خون بیگناہوں کا

جو تھی زیادہ خطرناک جنگ دست بدست
ہوئی ہوائی جہازوں سے پھر سبیلِ شکست

بڑھی تھی حد سے بھی رنگ ڈھنگ کی پروا
ذرا نہ دل کو تھی آئینِ جنگ کی پروا

سبھی پہ اصل میں گذری جو کچھ خدا جانے
نہ دے رہے کچھ تو جب شفا خانے

بموں کے گیس سے مسموم تھی فضا ساری
چہار سُو تھی ہلاکت کی گرم بازاری

بیان کیا ہو جوانوں پہ جو رہی تھی بَن
تڑپ تڑپ کے مرے جبکہ پیر و بچہ و زن

قضا کے رنگ میں ہر چیز تھی نہائی ہوئی
تمام خلق پہ تھی مُردنی سی چھائی ہوئی

فضائے ملک سے پیدا ہے سوگ کا انداز
ہوا کا شور ہے ماتم کی دُکھ بھری آواز

غرض گرہ یہ اب اک دلکشا دیار بنا
ہرا بھرا جو چمن تھا وہ خار زار بنا

جو اُستوار تھی صدیوں سے آب و شان گئی
قدیم و کہنہ تمدن کی آن بان گئی

وہ ایک نام کہ سچا تھا جس میں نور مٹا
جہاں کی لوح سے سونے کا ایک حرف مٹا

سنا رہا ہے حبش بن کے اب عزا خانہ
اطالیہ کے پٹ بزدلی کا افسانہ

شکست گو ملی اے باکشان حبش ۔۔۔ مگر تمیں تھے ہمیشہ سے پاسبان حبش
تو انتہا تک اسی فرض کو ادا کرتے ۔۔۔ اخیر تک بھی جو بھرتے وفا کا دم بھرتے
یہ سچ ہے تم نے کیا رن میں اپنا نام بہت ۔۔۔ یہ سچ ہے تم نے لیا ہمتوں سے کام بہت
ہے یہ بھی سچ کہ مقابل کی جنگ اگر ہوتی ۔۔۔ تمہاری قوم بلاشبہ جیت پر ہوتی
مگر یہی تھا فردی برائے آزادی ۔۔۔ ہر ایک تم میں سے ہوتا فتیل جلادی
جہاں کو جرأت اسپارٹا دکھا دیتے ۔۔۔ حبش کے وتدوں کو تھرماپلی بنا دیتے
تمہاری قوم شہادت کچھ ایسی دکھلاتی ۔۔۔ کٹے پہ اپنے حریفوں کو شرم آجاتی
اطالیہ کو بھی ہوتا اس امر کا اقرار ۔۔۔ کہ ہو کے رہتی ہے کس طرح جیت میں بھی ہار
علاوہ اس کے تمہاری عظیم قربانی ۔۔۔ تمہارے نام کو کرتی مزید لافانی
نہ مٹ کے رہتی جہاں میں کبھی تمہاری بات ۔۔۔ تم آج پاتے غلامانہ زندگی سے نجات
تمہارے شاہ نے بھی بارہا کہا تھا یہی ۔۔۔ کہ ہے ایک ایک نے ٹھکرا رکھی جان کی بازی
خود اُس نے ہو کے مگر اپنے قول سے بیزار ۔۔۔ حبش کو چھوڑ کے لی بے دریغ راہ فرار
دوا ہے جماعت اقوام کو بہ رنج و ملال ۔۔۔ سنا رہا ہے عبث اپنی کلفتوں کا حال
بھلا وہاں سے کوئی ہو سکے گا کیا راضی؟ ۔۔۔ جہاں نہ حق ہے، نہ انصاف اور نہ فیاضی
جہاں مدام دلوں کو عمل سے ہے انکار ۔۔۔ جہاں ہیں صرف زبانیں ہمیشہ کارگزار!
کسی کا جا کے غرض اُس مقام پر رونا ۔۔۔ ہے آپ اپنے ہی اشکوں سے آبرو کھونا
یہ پہلے شاہ سلاسی پہ ہو چکا ہے عیاں ۔۔۔ اُسی کا اب ہے یقیناً زیادہ تر امکاں
جہاں میں آج ہے وہ انفرادیت کی پکار ۔۔۔ کہ دوسرے کو ہے ایک آنکھ دیکھنا دشوار
جب اتنے زور سے تو سو نہیں بڑھ رہا ہے عزار ۔۔۔ کسی سے کیا ہو کسی کو توقع امداد ؟
فقط اُسی نے ہے اب زندگی کو پہچانا ۔۔۔ جو زندگی کے لیے جانتا ہے مر جانا
جو یہ نہیں ہے تو عزت نہیں وقار نہیں ۔۔۔ متابعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں

یہ دیکھنا ہے کہ اسے تیرھو ابھی کیا کیا!
اب آگے آگے دکھائے یہ بزدلی کیا کیا

تنقید کتب

خطبات گارسان دتاسی

انیسویں صدی کے شروع میں گارسان دتاسی نامی ایک فرانسیسی نے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد اردو زبان میں بھی اسقدر کمال حاصل کر لیا کہ وہ اس کا محقق مانا جانے لگا اور پیرس یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم شروع کی گئی۔ اور گارسان دتاسی ہی اردو کا پروفیسر مقرر ہوا۔ چنانچہ ہر سال کے آخر میں وہ ایک لکچر دیا کرتا تھا جس میں وہ اردو ادب کی سالانہ ترقی کا ریویو کر کے وہ اُس سال کی اردو ہندی کتابوں نئے رسالوں، چھاپہ خانوں وغیرہ کا حال بیان کیا کرتا تھا۔ یہ لکچر تاریخی حیثیت سے اس وقت بہت اہم تھے مگر اب تک ان سے اردو داں جماعت کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکتی تھی۔

اب ہمکو انجمن اردو کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ اس نے "خطبات گارسان دتاسی" کے نام سے پروفیسر موصوف کے اُنیس سالانہ لکچروں کا ترجمہ کر کے شائع کر دیا ہے۔ ان لکچروں کی ابتداء ۱۔ دسمبر ۱۸۵۰ء میں ہوئی اور ان کا سلسلہ ۴۔ دسمبر ۱۸۶۹ء تک جاری رہا۔ غدر ۱۸۵۷ء کی وجہ سے اس سال کے متعلق معلومات فراہم نہ ہو سکی تھی اس لئے ۱۸۵۸ء میں کوئی لکچر نہیں دیا گیا۔ ان لکچروں سے آج سے تیراسی برس پہلے کی ادبی ترقی پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۰ء سے لیکر ۱۸۶۹ء تک یعنی اُنیس سال کے عرصہ میں اردو نے کسقدر ترقی کی۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ پروفیسر گارسان دتاسی کو اردو سے سچا عشق تھا جسکی وجہ سے وہ ہندوستان سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر بیٹھا ہوا اردو زبان سے اسقدر دلچسپی لے رہا تھا۔ اصل لکچروں کا دستیاب ہونا آسان نہ تھا۔ اسلئے ہمکو ڈاکٹر سر سید راس مسعود کا احسانمند ہونا چاہیئے جنہوں نے ان خطبات کو انڈیا آفس کے کتبخانہ سے ڈھونڈھ نکالا۔ پہلے خطبوں کا ترجمہ خود اُنکے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ساتویں، آٹھویں اور نویں خطبہ کا ترجمہ مسٹر عبدالباسط بی۔ اے نے کیا ہے۔ ایک حصہ کا ترجمہ مسٹر ڈیوک پٹھان کی اہلیہ محترمہ نے کیا۔ اور بقیہ لکچروں کا ترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب ڈی لٹ ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی محنت کا نتیجہ ہے۔ یہ لکچر انجمن اردو کے ماہی رسالہ اردو میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب انجمن نے ان لکچروں کو شائع کر کے اردو

کی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ واقعی بیخطبات اُردو زبان کی مفصل تاریخ اور اُردو شاعروں کا مفصل تذکرہ ہے۔ بہرحال کتاب پڑھنے اور کتبخانوں میں رکھنے کے قابل ہے۔ ٹائپ کی چھپائی ہے۔ حجم ۱۲۰۸ صفحات قیمت پانچ روپیہ۔ پتہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔

مثنویات[1]

مولانا محمد امیر احمد صاحب علوی بی، اے۔ کاکوری کا ایک فاضلانہ مضمون ہے جو جنوری ۱۹۲۹ء کے رسالہ نگار میں شائع ہوچکا ہے مگر اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ لائق مصنف نے نہایت محنت و کاوش کیساتھ اُردو مثنویوں کے حالات لکھے ہیں۔ آپ نے پچھلے تین سو سال کی مختلف مثنویوں سے بحث کی ہے۔ چنانچہ وجدی دکنی کی مثنوی "تحفۂ عاشقان" مصنفہ ۱۱۵۰ھ سے لیکر میر مہدی حسن احسن لکھنوی کی جذب عشق مصنفہ ۱۳۰۰ھ تک کا اسمیں ذکر ہے۔ مثنوی نگار شاعروں کو آپ نے چار دَور میں تقسیم کرکے ہر شاعر کا مختصر حال اور اسکی مثنوی کا نمونہ درج کیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں ایکسو تین مثنویوں اور بیاسی شاعروں کا مختصر تذکرہ موجود ہے۔ مصنف کا طرز تحریر بھی نہایت شگفتہ ہے۔

اس کتاب میں ہر مثنوی کے طرز بیان، پلاٹ وغیرہ کے مختصر ریویو کے علاوہ ہر مثنوی کے متروک الفاظ کی فہرست بھی دیدی گئی ہے۔ غرض ادبی حیثیت سے یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔

متاعِ سخن[2]

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے۔ پی ایچ ڈی نے سخنوران دکن کے چھوٹے چھوٹے تذکروں اور ان کے انتخاب کلام کا ایک سلسلہ شائع کر رہے ہیں چنانچہ کیفِ سخن" اور بادۂ سخن" نام سے دو تذکرے پہلے طبع ہوچکے ہیں۔ "متاعِ سخن" اس سلسلے کی تیسری کتاب ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اسے خود مرتب فرمایا ہے۔ "دکن کی اُردو شاعری" کے عنوان سے ان تینوں کتابوں کا ایک ہی تمہیدی مقدمہ ہے۔ رسالہ زیر ریویو میں نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی سوانح عمری اور ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ نواب صاحب کا فوٹو بھی درج ہے۔

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ اور چونکہ آپکی کوٹھی داغ کی کوٹھی سے قریب تھی اسلئے اُستاد کی صحبت سے جسقدر افادہ آپکو حاصل ہوا اسقدر

---

[1] حجم ۱۰۲ صفحات قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ۔ مولوی محمد ذکی احمد علوی لائبریرین امیر الدولہ پبلک لائبریری نیر باغ کاکوری ضلع لکھنؤ
[2] لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، حجم ۱۲۵ صفحات۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ:۔ سید عبدالقادر پبلشر حیدرآباد دکن

شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ داغ کے مشہور شاگرد جناب احسن مارہروی نے بھی یادگارِ داغ جلوۂ داغ میں عزیز صاحب کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ بہرحال نواب عزیز نے اپنے استاد کے رنگ میں دہلی کی زبان میں شعر کہے ہیں۔ حیدرآباد میں ایسے بہت کم شاعر ملیں گے جن کو دہلی کی ٹکسالی زبان میں اسقدر کامیابی حاصل ہوئی ہو۔ اس سے پہلے زمانہ میں نواب صاحب کے دیوان [illegible] پر ریویو ہو چکا ہے۔ اس تذکرہ کے تمہیدی مضمون میں فضول طوالت سے کام لیا گیا ہے۔

ذیل میں حضرت عزیز کے چند اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

آرام اپنے بس کا ہے۔ بس میں نہیں ہے کیا — گلشن میں کیا دھرا ہے۔ قفس میں نہیں ہے کیا
گلشن کی یاد بھی ہے۔ رہ رہ کے چٹکیاں — سامانِ اضطراب قفس میں نہیں ہے کیا

گئی گزری ہوئی باتوں سے حاصل — اب ان کا شکوہ کیا ان کا گلا کیا
انھیں سے کر رہا ہوں ان کے شکوے — الٰہی خیر ہو، مجھ کو ہوا کیا
یہ سنکر بڑھ گئی دل کی تڑپ اور — نہ ہو تقصیر جس کی وہ خطا کیا
نگاہوں میں سماتا اس کا جلوہ — اگر میں دیکھتا بھی، دیکھتا کیا

اس خرابات میں خراب نہ ہو — کوئی ایسا نظر نہیں آتا
وہی اندھے ہیں عقل کے جن کو — عیب اپنا نظر نہیں آتا

مٹی ہے گلشنِ عالم میں طرحِ آشیاں کیا کیا — چلی ہیں آندھیاں کیا کیا گری ہیں بجلیاں کیا کیا
الٰہی بیچ والوں کی در اندازی نہیں جاتی — یہ کہتے ہیں یہاں کیا کیا، لگاتے ہیں وہاں کیا کیا

غرض یہ تھی کہ وہ مجلس میں اپنی باتوں کو — جو پیدار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
سمجھ لیا تھا کہ جھوٹا ہے، ان کا قول مگر — میں اعتبار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
مریضِ عشق میں اپنے ہی مضطرب دل کو — تسلی کار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

گلِ عجائب[1]

یہ پرانے اردو شاعروں کا ایک مختصر سا تذکرہ ہے جو اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی نے ۱۱۹۴-۹۵ھ میں فارسی زبان میں حروف تہجی کے حساب سے مرتب کیا تھا۔ اب اسے انجمن ترقی اردو نے صحت وصفائی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ شروع میں مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن کا ایک مختصر مقدمہ ہے۔ اصل تذکرہ میں ایک سو پینسٹھ شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام درج ہے۔

درحقیقت مصنف نے ایک ضخیم کتاب "مقالات الغرائب" کے نام سے لکھی تھی۔ اسکے ہر مقالہ کو مصنف نے "گل" کے نام سے موسوم کیا تھا اور ہر "گل" کے ذیلی باب کو "رنگ" کا نام دیا تھا۔ یہ تذکرہ "گل عجائب" کا "رنگ دوم" ہے۔ چونکہ اصل کتاب نایاب ہے اسلئے صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اسکے کتنے "گل" اور کتنے "رنگ" تھے اور ان میں کن کن مضامین پر بحث کی گئی تھی مصنف نے اپنی کتاب کے اس حصہ کا نام جسمیں شاعروں کا تذکرہ ہے "گل عجائب" رکھا تھا۔

یہ تذکرہ بہت مختصر ہے اور فارسی تحریر کی رنگینی کے سوا اسمیں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی ہے۔ ترتیب بھی کچھ اچھی نہیں ہے۔ بعض شاعروں کے حالات ہیں مگر نمونہ کلام ندارد۔ بعض کا نمونہ کلام ہے مگر حالات ندارد۔ اور بعض شاعر بالکل نظرانداز ہوگئے ہیں۔ بہرحال اردو کے قدیم تذکروں کے سلسلے میں اس تذکرہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ہم یہاں پر اس قدیم تذکرہ سے اردو کے ایک پرانے ہندو شاعر رائے انند رام مخلص وکیل کا کلام نمونتاً درج کرتے ہیں۔ زبان کے تیور اور مضامین کی رنگینی ملاحظہ ہو ؎

دھوم آتے کی کس کے گلزار میں پڑی ہے — ہاتھ ارگجے کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے

یوں پکارے ہے نقیبِ گلشن میں سروِ ناز بلکی — پہنچو قمری کہ کیا آزاد جاتی ہے بہار
پھول پر گلشن کے گویا دانۂ شبنم نہیں — عاشقوں کے حال پر آنکھیں بھر آتی ہے بہار

کسان[2]

آجکل جبکہ کانگریس اور گورنمنٹ دونوں کی توجہ دیہات کو ترقی دینے اور اہلِ دیہات کی حالت

[1] حجم ۱۹۶ صفحات ہے۔ قیمت ایک روپیہ دس آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔
[2] حجم ۱۵۵ صفحات ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ جامعہ ملیہ دہلی۔

شدھارنے کی طرف مبذول ہو رہی ہے ملک میں بہت سا لٹریچر ترقی دیہات۔ کے متعلق شائع ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے انیسویں صدی کے وسط میں نیشنل کانگریس کے نامور بانی مسٹر دادا بھائی نوروجی نے ہندوستانی کسانوں کے افلاس اور ان کے فلاح و بہبود کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی تھی۔ اسکے بعد اس مسئلہ پر واقعی حیثیت سے کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی اب کسانوں کے متعلق چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم ایل اے۔ ممبر سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی نے یہ قابل قدر تصنیف کی ہے۔ چودھری صاحب خود بھی کسان ہیں کسانوں میں پیدا ہوئے اور کسانوں ہی کا ودیشا پائی۔ اسلئے چھوٹے زمینداروں اور کاشتکاروں کے رنج و مصیبت کا اندازہ جسقدر ان کو ہو سکتا ہے اتنا کسی دوسرے کو مشکل ہوگا۔ چنانچہ آپنے اس کتاب میں اپنے دل کے سچے جذبات کا پوری طرح اظہار کیا ہے۔

چودھری صاحب نے کاشتکاری کی اصلاح و بہبود کے مسئلہ پر غیر ممالک کا سفر کر کے بہت کچھ غور و خوض اور مطالعہ کیا ہے۔ آپ نے ضمناً شرح تبادلہ، شرح بنک اور سرکاری قرضہ جات کے مسئلوں پر بھی محققانہ نظر ڈالی ہے۔ اور حکومت کے طرز عمل پر بھی آزادی سے نکتہ چینی کی ہے۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں بعض مغالطوں کو رفع کیا گیا ہے۔ دوسرے میں افلاس کے اسباب کی تحقیقات کی گئی ہے۔ تیسرے میں زراعت کی خصوصیات پر بحث ہے اور چوتھے میں کسانوں کی بیماری کا علاج تجویز کیا گیا ہے۔ ہر حصہ میں کئی باب ہیں۔

شروع میں پنڈت مدن موہن مالوی کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس میں موضوع کتاب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اصل کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی اب جامعہ ملیہ دہلی کا ہمکو شکر گزار ہونا چاہیئے جس نے اس کا اردو میں ترجمہ کرا کے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔

کتاب نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ اور ہر شخص کو جسے کسانوں کی حالت سدھارنے کا خیال ہے اسے غور سے پڑھنا چاہیئے۔

دھرم کرم ۔ اس کتاب میں ہندو دھرم کے تیوہار بہت۔ تیرتھ دیوی۔ دیوتا۔ اوتار۔ سو دھارمک گرنتھ۔ سنسکار۔ سندھیا۔ ہون۔ وغیرہ کے صحیح طریقے نہایت واضح طور پر بتلائے گئے ہیں۔ گیتا اور راماین کا لب لباب بھی خوبی کیساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مذہبی دلچسپی رکھنے والے لوگ ہر دو کو اس کتاب کی قدر کرنا چاہیئے۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲؍) ملنے کا پتہ:۔ بابو اشرفی لال گپتا، یونیوانسر امپروومنٹ ٹرسٹ۔ کانپور

لطف سخن

از حضرت آرزو لکھنوی مدظلہ

آپ ہیں ایک، نام دو کا ہے
یہ تو گنتی نہیں ہے، دھوکا ہے

سچ ہے میں مانگتے ہی جھکا تھا
دینے والے نے ہاتھ روکا ہے

بہتے آنسو تو روک لے جس نے
ندیوں کا بہاؤ روکا ہے

آنے والے نہ بھول جانے کو
تیری ہر سانس اک ٹھوکا ہے

آرزو ہاتھ وہ نہ چھٹنے پائے
جس نے گرتے میں تجھکو روکا ہے

(از جناب فضل الدین اثر بی۔ اے۔ آگرہ)

ہوکے ہم مایوس عشرت آہ و نالہ کیا کریں
غم سے تم خوش ہو تو پھر غم ہی نہ کیوں مانگا کریں

تشنگی ذوق کا منشا حقیقی موت ہے
سامنے آنے سے بہتر ہے کہ وہ پردا کریں

زندگی ہے نام ان کا، زندگی ہے اضطراب
دل میں وہ آئیں تو کیونکر دل کو آسودا کریں

دل کی ہر ہنگامہ آرائی تھی پروانہ فروز
بجھ گیا جب دل تو محفل میں نہ جایا کریں

دل کی قیمت پوچھنی ہو تو خدا سے پوچھئے
دل امانت ہے، امانت کا بھی کیا سودا کریں

رنگ و گل میں چھپے رہنے کا مقصد ہے ضرور
یعنی جس پردے کو اٹھیں ہم تجھے دیکھا کریں

دیر و کعبہ برہمن اور شیخ کی جاگیر ہیں
اے تعین دوست! آخر ہم کہاں سجدا کریں

ہیں بیچارگی کے طعن دنیا چھوڑئے
یا وہ اک آنسو بتا دے ہم جسے دریا کریں

ایسا ہیں بہت آبادیوں میں نے اثر
چلکے ویرانوں میں ان کے حسن کا چرچا کریں

(از مولوی عبد الجبار اختر)

ہم جفا کو تری وفا سمجھے
درد کو مدتوں دوا سمجھے

عشق کو درد لا دوا سمجھے
ہائے سمجھے بھی ہم تو کیا سمجھے

دل اترا ہم نہ مدعا سمجھے
ہائے ظالم تجھے خدا سمجھے

مدتوں ہم رہ محبت میں
راہزن کو بھی رہنما سمجھے

ہم نے جانا جو وہ غلط جانا — آپ جو سمجھے وہ بجا سمجھے
کچھ کہیں ہم تجھے غرض کیا ہے — حال دل کو تری بلا سمجھے
ایسی تقدیر ہے محبت کی — جس کو ہم سمجھیں یا خدا سمجھے
ہائے دنیا تھی کیا فریب آگیں — ایک نقطہ کو دائرا سمجھے

اس کا کچھ بس چلے تو اے آخر
آپ کو آدمی خدا سمجھے

(از پنڈت امرجیت خرما مہرہ ضلع میرٹھ)

رہزن ہوش خرد کو مہرباں سمجھا ہوں میں — دل کی بربادی کو تعمیر جہاں سمجھا ہوں میں
موت کی تخئیل کو وہم و گماں سمجھا ہوں میں — زندگانی کو بہار بے خزاں سمجھا ہوں میں
ایسی بھی وابستگی کیا ہے مجھے ضدین سے — دشمن نامہرباں کو مہرباں سمجھا ہوں میں
اہل دنیا کی نظر میں حشر کا سامان ہے — خامشی کو قلب کی لیکن زباں سمجھا ہوں میں
عشق کا عالم تخئیل میں کہاں محدود ہے — مذہبوں کی گتھیوں کو رائیگاں سمجھا ہوں میں

(از جناب بسمل الہ آبادی)

دست جنوں نے بے سر و ساماں بنادیا — دامن کو چاک کرکے گریباں بنادیا
صد آفریں کرامت باد بہار پر — غنچہ کو گل تو گل کو گلستاں بنادیا
اب میں ہوں اور رات دن احساس نیک و بد — مجھ کو یہ کس قصور پہ انساں بنادیا
جوش جنوں نے عالم وحشت میں جان لی — تار نفس کو تار گریباں بنادیا
اک لفظ سے بیاں ہوئی شرح کتاب زیست — قدرت نے اس میں موت کا عنواں بنادیا
اللہ رے جمال رخ یار کی جھلک — اس نے تو آئینہ کو بھی حیراں بنادیا
اک ایک چاک میں تھا ہزاروں طرح کے چاک — اس ڈھنگ کا جنوں نے گریباں بنادیا
بسمل ساحت پرست ہو ہند میں حق پرست — ہندو کو آج کس نے مسلماں بنادیا

معذرت۔ ہمکو دلی افسوس ہے کہ زمانہ جون میں مضمون سلاطین اسلام کا نظام عدالت ہمارے کرم احباب کی دلشکنی کا باعث ہوا ہے۔ زمانہ کی پالیسی ہمیشہ فرقہ وارانہ خیال سے بالاتر رہی ہے۔ اس کے صفحات ہر مضمون پر مختلف پہلوؤں کے مباحثہ کیلئے وقف ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایڈیٹر مضمون نگاروں کی رائے سے متفق ہو۔ واقعی اس مضمون کا لہجہ کہیں کہیں قابل شکایت ہو گیا ہے۔ جسکا ہمکو دلی افسوس ہے۔ اس کے متعلق اگر کوئی صاحب تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنا چاہیں تو ہم شکریہ کے ساتھ اس کو ہدیہ ناظرین کریں گے۔
ایڈیٹر

علمی خبریں اور نوٹ

جون ۱۹۳۶ء کا مہینہ ادبی دنیا کے لئے بہت نامبارک ثابت ہوا۔ روس کے ہردلعزیز مصنف میکسم گورکی اور انگلستان کے مایۂ ناز ادیب مسٹر چسٹرٹن کی موت سے روس اور انگلستان کی ادبی محفلیں سونی ہو گئی ہیں۔ اردو ادب کو بھی لکھنؤ کے مشہور ادیب و محقق مولانا ممتاز حسین صاحب عثمانی ایڈیٹر "اودھ پنچ" لکھنؤ کی وفات سے جو [illegible] ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ اودھ پنچ کے نامور بانی منشی سجاد حسین مرحوم کے بعد مولانا ممتاز حسین نے جس قابلیت سے اودھ پنچ کی ادبی شان اور اس کی تمام بہترین روایات کو قائم رکھا اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ علمی تبحر اور ہمہ دانی کے ساتھ ساتھ آپ کو ظرافت اور بذلہ سنجی میں غیر معمولی دخل تھا۔ زبان اردو پر آپ کو ہمہ گیر قدرت حاصل تھی۔ لکھنؤ کے محاورات پر آپ کو خاص عبور تھا۔ اور بیگماتی زبان لکھنے میں تو شاید آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ "اودھ پنچ" میں منشی آزاد بیگم کے سیاسی تبصرے ہمارے قول کے شاہد عادل ہیں۔ مرحوم زبان و ادب میں تحقیق و تدقیق کا بھی بہت بڑا ملکہ رکھتے تھے جس کا ادنیٰ ثبوت "نور اللغات" اور "جامع اللغات" لاہور پر آپ کی فاضلانہ اور محققانہ تنقید ہے جو اودھ پنچ میں عرصہ سے مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ اردو شارٹ ہینڈ کی ایجاد میں بھی آپ کا بہت بڑا حصہ تھا۔ آپ بائیس ۲۲ سال تک اودھ پنچ کو غیر معمولی قابلیت سے چلاتے رہے۔ اس اثنا میں آپ نے صدہا مضامین لکھ ڈالے مگر کبھی کسی مضمون پر اپنا نام نہ ڈالا اور نہ کوئی شعر اپنے نام سے شائع کیا۔ بیسیوں کتابیں لکھ کر دوسروں کے حوالہ کر دیں۔ درحقیقت مولانا مرحوم علم و فضل اور محققانہ کمالات کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ آپ کو تمام دیگر مشاغل سے سبکدوش کر کے اردو لغت کی ترتیب و تالیف کا کام آپ سے لیا جاتا۔ آزاد خیالی، بے تعصبی و حب الوطنی کے جس اعلیٰ معیار کو پیش نظر رکھ کر منشی سجاد حسین نے مشہور "اودھ پنچ" کو جاری کیا تھا اُسے مولانا ممتاز حسین صاحب نے بھی آخر دم تک قائم رکھا۔ کچھ عرصے سے آپ کی صحت خراب رہتی تھی اور "اودھ پنچ" کی مالی حالت بھی کچھ بہت قابل اطمینان نہیں تھی۔ ہم کو افسوس ہے کہ اردو کے بلند آہنگ خیرخواہ اس زبان کے اصلی خادموں کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ چنانچہ مولانا ممتاز حسین صاحب کو بھی اپنے ادبی خدمات کے سلسلے میں کافی پریشانیوں کا سامنا رہا۔ "افسوس آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"۔ خداوند تعالیٰ آپ کو غریق رحمت کرے اور آپ کے

صاحبزادہ محمد ظہیر حیدر صاحب کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

معزز اودھ پنچ جو اس وقت بھی اپنے طرز کا اکیلا پرچہ ہے، اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جاری رہنا چاہیئے۔ ہم کو یہ دیکھکر دلی اطمینان ہوا ہے کہ اب اس کی ایڈیٹری کی اہم ذمہ داری اُردو زبان کے نامور ظریف شاعر حضرت ظریف نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔ ہمارے خیال میں اس وقت اودھ پنچ کو آپ سے بہتر ایڈیٹر نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم کو امید ہے کہ قدر دانانِ اُردو ظریف صاحب کو اس نامور پرچے کو ترقی کے ساتھ جاری رکھنے میں پوری مدد دیں گے۔

ناظرینِ "زمانہ" کو یہ سُنکر بہت افسوس ہوگا کہ مسٹر جیواد میرٹھی کا جن کی گراں قدر نظمیں اس رسالہ میں اکثر شائع ہوا کرتی تھیں ۲۔ جون کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ آپ پانچ چھ سال سے مرضِ دق میں مبتلا تھے تینتیس "۳۳" چونتیس "۳۴" برس سے زیادہ عمر نہ تھی۔ مگر اس کم عمری ہی میں آپ نے اچھی مہارت حاصل کرلی تھی اور آپ کا کلام ہر حیثیت سے قابلِ قدر ہوتا تھا۔ آپ کی ناوقت موت جوانمرگی کی موت ہے آپ کے والد بزرگوار اور دیگر اعزا کے ساتھ ہم کو دلی ہمدردی ہے۔ خداوند کریم پسماندگان کو اس سانحہ کے برداشت کی طاقت عطا فرمائے۔

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۳۵ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں اس کو پریس کی چھپائی اور مطبوعات کی فروخت سے تیس ہزار دو سو ستانوے روپیہ کی آمدنی ہوئی اور اِسی قدر خرچ بھی ہوگیا۔ انجمن کے زیرِ اہتمام اس وقت دو سہ ماہی رسالے شائع ہوتے ہیں جو اپنی خوبیوں کے لحاظ سے خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔ انجمن کا ادبی رسالہ "اُردو" مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر اُردو عثمانیہ یونیورسٹی و سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی ایڈیٹری میں نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ خود مولوی صاحب کے مضامین اور اُن کی قابلِ قدر تمہیدیں اس کی خصوصیات ہیں۔ دوسرے پرچہ کا نام "سائینس" ہے جو واقعی اُردو میں آپ ہی اپنا نظیر ہے۔ دونوں رسالے علم دوست اصحاب کی قدردانی کے مستحق ہیں۔

انجمن نے گذشتہ چند سال کے اندر اُردو کی ابتدائی تاریخ کے متعلق قدیم اہم تصانیف کا ایک سلسلہ شائع کرکے محققینِ زبان پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ انجمن کا مطبع عثمانیہ یونیورسٹی اور سررشتۂ تعلیم حیدرآباد کی درسی کتابوں کے علاوہ صدہا بیش بہا کتابیں شائع کرچکا ہے۔ اس وقت بھی کئی کتابیں زیرِ طبع ہیں۔ جن میں سب

قابلِ ذکر انگریزی اُردو ڈکشنری ہے جو متعدد اہلِ قلم کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کا حجم تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات کا ہوگا۔ اسی کے ساتھ طالب علموں کے لئے بھی ایک ڈکشنری تیار ہو رہی ہے۔ دونوں ڈکشنریوں میں الفاظ کے انتخاب اور ان کے معنی کی صحت میں خاص تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر "انقلاب" لاہور نے مرزا غالب کی سوانحعمری کا ایک ایسا جامع مرقع خود مرزا کی تحریرات سے تیار کیا ہے جسے درحقیقت غالب کی خود نوشت سوانح عمری کہنا چاہیئے، اور جس میں غالب کے ابتدائی و خاندانی حالات، اُن کا دلی آنا، کلکتہ و رامپور کے سفر، غدر کی کیفیت، قید کی مصیبت، اُن کی تصانیف اور عادات و خصائل وغیرہ۔ غرض اُن کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر جس قدر معلومات فراہم کی جاسکتی تھیں یکجا کردی گئی ہیں۔ امید ہے کہ یہ سوانح عمری آخر اگست ۱۹۳۶ء تک شائع ہو جائے گی اور تین روپیہ قیمت پر دفتر انقلاب لاہور سے مل سکے گی۔

آجکل ڈاکٹر سر اقبال کے تازہ اردو کلام کا مجموعہ "ضرب کلیم" کے نام سے چھپ رہا ہے اور عنقریب کتاب خانہ طلوع اسلام ۳ میکلوڈ روڈ لاہور کے اہتمام سے شائع ہوگا۔

ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے پچھلے سال کی ہندی مطبوعات میں سے حسبِ ذیل کتابوں کو اپنے طرز کی بہترین کتابیں قرار دے کر اُن کے مصنفین کو قابلِ قدر انعامات دیے ہیں:-

(۱) جاشا رہسیہ کے مصنف پنڈت رام نراین دویدی کو ایک طلائی تمغہ دیا گیا ہے۔

(۲) پرتاب چرتر کے مصنف کیسری سنگھ برہٹ صاحب کو رتناکر انعام اور رادھاکشن داس تمغہ۔

(۳) نورجہاں کے مصنف ٹھاکر گوربھگت سنگھ کو بھی رتناکر پرائز اور رادھاکشن داس تمغہ

(۴) کشیہ روگ کے مصنف ڈاکٹر شنکرلال گپتا اور (۵) سچیت شالیہ وگیان کے مصنف ڈاکٹر مکند سروپ ورما کو بھی تمغے دیے گئے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری کو جو حال میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہے، ملک و بیرونِ ملک میں غیر معمولی ہردلعزیزی حاصل ہوئی ہے۔ اس کی قیمت ہندوستان کے لئے سات روپیہ اور ممالکِ غیر کے لئے پندرہ شلنگ مقرر ہے۔ تاہم اب تک

اس کی بیس ہزار سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کے اخبارات میں بھی اس کے طولانی اقتباسات شائع ہو چکے ہیں، اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمہ کا انتظام ہو رہا ہے۔ چنانچہ جامعہ ملیہ نے بھی اس کے اردو ترجمہ کی اشاعت کا اعلان کیا ہے۔ جو اس وقت پنڈت جواہر لال کی آپ بیتی کے نام سے زیر طبع ہے، اور عنقریب شائع ہوگا۔

انگلستان کے نامور شاعر و مصنف رڈیارڈ کپلنگ کی یادگار میں امپیریل سروس کالج ونڈسر میں ایک عالی شان لائبریری قائم کی جا رہی ہے۔

ملک معظم ایڈورڈ ہشتم

۱۶ جولائی ۱۹۳۶ء کی صبح کو ملک معظم شاہ ایڈورڈ ہشتم برگیڈ گارڈ کو نیا نشان و جھنڈا دینے کی رسم ادا کرنے کے بعد ہائیڈ پارک لندن کی طرف شاہانہ جلوس کے ساتھ اپنے محل بکنگھم پیلس واپس جا رہے تھے۔ جب سواری مبارک کانسٹی ٹیوشن ہل کے اوپر سے گزر رہی تھی تو ایک بظاہر مخبوط الحواس شخص ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور اعلیٰحضرت ملک معظم کی طرف ایک بھرا ہوا ریوالور سر کرنا چاہا۔ ایک عورت اور ایک پولیس مین نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر ریوالور گرا دیا جو شاہی گھوڑے کی بغل سے لگتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ ہز مجسٹی نے ادھر اُدھر دیکھا مگر بغیر کسی توقف یا پس و پیش کے اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق جلوس کے ساتھ محل شاہی تشریف لے گئے اور تمام دن دستور کے مطابق اپنے شاہانہ فرائض انجام دیتے رہے۔ حملہ آور ایک ۳۴ سالہ آئرلینڈ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پانچ فیر کا ریوالور تھا جس میں چار کارتوس تھے۔ پولیس نے اس کو فوراً ہی گرفتار کر لیا۔ اور جب اس کو پولیس لاری میں سوار کرایا جا رہا تھا تو ایک اور شخص نے اس کو چھڑانے کی کوشش کی چنانچہ پولیس نے اس کو بھی گرفتار کر لیا۔ اصلی مجرم کا نام میکموہن بتایا جاتا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ میری نیت ملک معظم پر قاتلانہ حملے کی نہ تھی، لیکن چونکہ ہوم سکریٹری نے میری شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اس لئے میں مظاہرہ کے خیال سے ریوالور دکھانا چاہتا تھا۔ بہر حال جو کچھ ہو ہزار ہزار شکر ہے کہ اس ناعاقبت اندیش شخص کو وار کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کہتے ہیں کہ ۱۸۷۲ء میں ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کو بھی اسی مقام پر ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا اور وہ بھی اسی طرح بال بال بچ گئی تھیں۔ حافظ حقیقی کے فضل و کرم سے ملک معظم ایڈورڈ ہشتم بھی اس حملہ سے بالکل محفوظ رہے جس پر دنیا کے ہر گوشے میں اطمینان و مسرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ ہم بھی دست بدعا ہیں کہ خداوند کریم ہمارے ملک معظم کو عرصۂ دراز تک زندہ و سلامت رکھے۔

بعدالت جناب بابو جیون چند ملک صاحب سب جج بہادر فرخ آباد

سمن واسطے قرار داد امور تنقیح طلب

(آرڈر ۵ - قاعدہ ۱ و ۵)

نمبر مقدمہ ، سنہ ۱۹۳۶ء

عدالت سب جج فرخ آباد ضلع فرخ آباد

(۱) گیا پرشاد ولد مولچند
(۲) جگناتھ ولد بلدیو پرشاد
} اقوام برہمن ساکنان قصبہ چھبرامئو محلہ سرافان ضلع فرخ آباد۔ مدعی

بنام

بنارسی لعل ولد راجہ رام قوم برہمن ساکن فرخ آباد محلہ پرانہ بازار ضلع فرخ آباد۔ مدعا علیہ

ہرگاہ مدعیان نے آپکے نام ایک نالش حسب پیرا گراف ۱ عرضی دعویٰ بابت واپسی دائر کی ہے۔ لہذا آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بتاریخ ۲۷ ستائیس ماہ اگست سنہ ۱۹۳۶ء بوقت دس بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور کل امورات اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو کر جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہوں اور جوابدہی دعویٰ کی کریں اور آپ کو لازم ہے کہ اسی روز جملہ دستاویزات پیش کریں۔ جن پر آپ بتائید اپنی جوابدہی کے استدلال کرنا چاہتے ہوں۔

آپ کو اطلاع دیجاتی ہے کہ اگر بروز مذکور آپ حاضر نہ ہوں گے تو مقدمہ بغیر حاضری آپ کے مسموع اور منفصل ہوگا۔

بثبت میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۳۱ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء جاری کیا گیا۔

(مہر عدالت)

دستخط۔ حاکم

THE ZAMANA

زمانہ

مرتبہ منشی دیا نرائن نگم بی اے

جلد ۶۷ | اگست ۱۹۳۶ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

تصویر — حضرت نازش بدایونی مرحوم

[illegible] کانپور سے شائع ہوا



محمد مبین نازش بدایونی

سنہ ۱۸۷۵ء — سنہ ۱۹۳۶ء

زمانہ

جلد ۶۷ — اگست ۱۹۳۶ء — نمبر ۲

"علمِ ادب"

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب، بریلوی، بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

ادب کا مفہوم | سنسکرت میں ادب یا ساہتیہ سے کاویہ یا شاعری مراد لی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے ہمارے علما نے ہر موضوع پر اپنے خیالات کو منظوم کر دیا ہے۔ چنانچہ فلسفہ، اخلاق، حکمت، نجوم، تاریخ، سوانح، اقتصادیات اور سیاسیات غرضکہ ہر شعبۂ علم پر بڑی سے بڑی اور قیمتی سے قیمتی تصنیف آپ کو نظم میں ملے گی۔ ہندی میں بھی ابتداءً ادب کا یہی مفہوم رہا ہے مگر اب یہ خیال متروک ہو گیا ہے۔ انگریزی زبان میں لٹریچر کا جو مطلب ہے "ادب" بھی اردو زبان میں انہیں معنوں میں مستعمل ہے۔ پس یہاں ادب یا ساہتیہ سے کسی زبان کا موجودہ ذخیرۂ کتب ہی مراد لیا جائے گا۔

یہی ادب کی صحیح تعریف مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کے تحت میں ہر قسم کی کتابیں آ جاتی ہیں۔ بعض علمائے مغرب نے تاریخ ادبیات سے تاریخ خیالات مراد لی ہے۔ اُن کے نزدیک عہد بعہد کے مطالعۂ ادبیات کا صرف یہی مفہوم نہیں ہے کہ ہم ہر زمانے کے محاورات، شاعرانہ موشگافی اور علم الالسنہ کا مطالعہ کریں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہر عہد کے انقلابات خیالات کا بھی جو مختلف ممالک اور اوقات کی پیداوار ہیں موازنہ کرتے جائیں۔

مطالعۂ ادبیات سے ہم اقوام و ممالک کے تاریخی حالات سے تو کما حقہ واقفیت حاصل کر سکتے ہیں لیکن جب تک ہمیں ادبیات کی تاریخ کا پورا پورا علم نہ ہو جائے ہماری کوشش کامیاب

نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کا مطالعہ خاصہ وسیع ہے وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ ہر کامیاب مصنف اپنے عہد وعصر کی کیفیات ہی کا پابند نہیں رہتا بلکہ ماضی اور مستقبل کو بھی اپنے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔ اس کی تصنیف میں جہاں پیش رو مصنفین کے خیالات کی جھلک نمایاں رہتی ہے وہاں آنے والے اہل قلم کی رہنمائی کے لئے ضروری سامان بھی موجود رہتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر جہاں وہ

ادب اور ملی اثرات

متقدمین کا تتبع کرتا ہے وہاں ایسے نقوش بھی چھوڑ جاتا ہے جن کی پیروی کر کے آئندہ نسل شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم معاصرین کی تصانیف کا مطالعہ کر کے متقدمین سے بھی کم و بیش شناسا ہو جاتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارا ہر مصنف و شاعر ہمیں اپنے قومی رجحانات و مذاق سے روشناس کرا کر مختلف اقوام کے تہذیب و تمدن اور اطوار و خصائل وغیرہ سمجھنے میں خضر راہ کا کام دیتا ہے۔ اس قابل قدر علم و ادراک کی روشنی سے ہم اپنی قومی اصلاح و تعمیر میں بڑا کام لے سکتے ہیں۔

قومیں ترقی کے مختلف مدارج سے کس طرح گذرتی ہیں؟ ان کا مفہوم و مقصود زندگی کیا ہوتا ہے، اور ان کے خیالات میں وقت کے ساتھ ساتھ کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں؟ ان تمام رازہائے سربستہ کا آئینہ ادب ہوتا ہے۔ یہ بات تو اب عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ اقوام عالم اپنے مادی و روحانی عناصر کی بنا پر خاص حالات کے ماتحت منتخب و مخصوص انداز سے آگے بڑھتی ہوئی اپنے مقصد حیات کی جانب بسرعت گامزن ہیں۔ ان اختلافات کے مادی اور روحانی اثرات کا حسب قدر لطیف و خوبصورت عکس علم و ادب کے آئینوں میں نظر آ سکتا ہے، اس کی مثال کہیں دوسری جگہ ملنا بھی محال ہے۔ ہم یونانی و فرانسیسی، ہندی اور انگریزی لٹریچر کا عام طور پر تذکرہ کرتے ہیں، بادی النظر میں ان الفاظ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہمارا مطلب ایک خاص ملک ایک خاص قوم اور ایک خاص زبان کے مصنف یا تصنیف سے ہے۔ ایک حد تک یہ مطالب بھی غلط نہیں کہے جا سکتے لیکن ان سے ہمارے مفہوم کی تکمیل نہیں ہوتی۔

بعض مصنفین آپ کو ایسے ملیں گے جن کی تحریریں ان کی قومی خصوصیات کی حامل نہیں ہوتیں۔ تاہم دنیائے ادب میں وہ اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔

اگر ادبیات عالم کا نقادانہ موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام اختلافات کے باوجود بھی چند ایسے نکات ہیں جس پر تمام اہل الرائے متفق ہیں۔ اس خوشگوار منظر کو "اتحاد عالم" کا پیش خیمہ قرار دیا جا سکتا ہے، اور اس سے یہ حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ دنیا مختلف راستوں سے ایک ہی

منزل کی جانب بڑھ رہی ہے۔ اس لئے اگر اختلافات کو چھوڑ کر ایک ایسا راستہ تجویز کر لیا جائے جس پر دنیا ایک دوسرے کے دوش بدوش آگے بڑھ سکے تو شاید اس دور دراز سفر زندگی کی ساری دشواریاں دلچسپیوں سے بدل جائیں۔ آپ شکسپیر کے ڈراموں کو سامنے رکھکر سطور بالا پر غور کیجئے۔ ان میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جس پر دنیا کے تمام مختلف العقائد لوگ ادب و احترام سے ان کے مصنف کا دم بھرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے زبان کی طرح ادب بھی خیالات کا مظہر ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو کچھ قلم یا زبان سے نکل جائے وہ لازمی طور پر ادب کہلانے کا مستحق ہے۔ جب ہم اپنے خیالات کو بعض حدود کے اندر اس طرح ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ ہمارا طرز بیان ایک خاص معیار پر پورا اترتا ہے اس وقت ہماری تحریروں کو ادبی درجہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ معیار خیال کی نوعیت الفاظ اور ان کے برمحل استعمال سے مستنبط ہوتا ہے۔ بعض اہل الرائے کے نزدیک خیالات کی ندرت اور بیان کی دلکشی ہی ادب کا معیار ہے۔ جب کوئی واضح خیال موزوں الفاظ میں حسن و لطافت کے ساتھ ادا ہو جاتا ہے تو اس میں ایک عجیب دلفریبی آ جاتی ہے اور تم اسے ادبیات کے ذیل میں لے آتے ہیں۔

قومی ادب کسی قوم کی دماغی اپج اور اس کے فطری اقتدار کا آئینہ بردار ہوتا ہے۔ اگر کسی عہد کے چوٹی کے چند مصنفین کے بعض خیالات میں جو اس قوم کی معاشری زندگی کا ماحصل ہوں ایک فطری یکسانیت ہو تو انہیں اس فرقہ کی قومی خصوصیات کے نام سے تعبیر کیا جائیگا۔ لیکن یہ قطعاً ناممکن ہے کہ انہیں خیالات کا شائبہ بعینہٖ اس فرقہ کے تمام اہل قلم حضرات کی ادبی کاوشوں میں لازمی طور پر نظر آ جائے۔ ادب کا دامن بھی انفرادی افتراقات کے نہ مٹنے والے دھبوں سے قطعی طور پر پاک و صاف نہیں رہ سکتا۔ درحقیقت ادب کے زندہ ہونے کا ثبوت یہی تفرقات ہیں جن کا یکسر محو و مدغم ہو جانا اس کی فنا کے مترادف ہے۔ جن مشترک تخیلات کی ادبیات میں افراط ہوگی وہ قوم کی فطرت اور اس کے ضمیر کا عکس ہونگے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ صرف اخلاقی بلندیوں ہی کے حامل ہوں اور انہیں پست اخلاقی سے بالکل مس نہ ہو۔ انہیں تخیلات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کس قوم نے ارتقاء عالم کے لئے کیا مستحسن کوشش کی۔

ایک زمانہ میں اہل یورپ کا عام عقیدہ تھا کہ کوئی شخص اس وقت تک تحصیل علوم کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک کہ اس نے یورپ کے عام مشہور مقامات کا دورہ نہ کر لیا ہو خصوصاً روم

انگریزی ادبیات میں ایک ممتاز شاعر مانا گیا ہے، اس کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے کالجوں کے احاطے سے باہر سیر و سیاحت کی بدولت گنجینۂ علم حاصل کیا، اور اپنی ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر دنیائے ادب کے لئے روح افزا لافانی پیغام چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوا۔ مطالعہ سے ماضی و حال دونوں کی حقیقت ہم پر روشن ہو جاتی ہے لیکن سیر و سیاحت سے اس مقصد کے حصول میں کامیابی نہیں ہوتی۔

ادب اور تاریخ دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ رموز حیات کو مختلف پہلوؤں سے بے نقاب کرنا ہی دونوں کا مطمح نظر ہے۔ عام طور پر تاریخ کسی ملک یا قوم کی مادی تہذیب کے ارتقا و انحطاط کی مظہر ہوتی ہے۔ لیکن ادب ہمیشہ افراد یا اقوام کے باطن کا مرقع ہوتا ہے اور یہ دونوں برابر ایک دوسرے پر اس طرح اثر انداز ہوتے رہتے ہیں جس طرح چاند کے گھٹنے بڑھنے سے چاندنی بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

جب ہم غالب کا مطالعہ کرنے لگتے ہیں تو ہمیں خواہ مخواہ میر اور دیگر اساتذۂ قدیم کی یاد آتی ہے، اور ہمارا یہ احساس اس درجہ قوت ممیزہ کا محرک ہوتا ہے کہ ہمیں ان کا موازنہ و مقابلہ کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی شخص کے عیال و اطفال کے نقش و نگار اور اُن کے اخلاق و اطوار میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہی بات کسی عہد کے مصنفین کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے حالانکہ ایسی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں تاہم یہ اصول فطرت کے مطابق ہے۔ کیونکہ ایک ہی ملک و ملت کے مصنفین میں خیالات کی ہم آہنگی تو معمولی بات ہے لیکن جب ان میں کوئی مافوق الفطرت ہستی آ جاتی ہے تو وہ ان تمام قدیم کو بالائے طاق رکھکر اپنے لئے دوسرا مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ اور اس طرح دنیائے ادب میں نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

زمانہ کے لحاظ سے دنیا کی کسی زبان کے ادبیات کی ٹھیک ٹھیک تقسیم نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد جدید میں بھی ایسے اہل قلم موجود ہیں جو قدیم طرز تحریر کے دلدادہ ہیں۔ اگر اس کی مثال دریا کی روانی سے دی جائے تو بیجا نا مناسب نہ ہوگا۔ جس طرح دریا کے پھیلاؤ کے ساتھ اس کی بہت سی شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں اور ان میں سے بعض نہایت صاف اور بعض نہایت غلیظ و کثیف ہو جاتی ہیں بعینہ یہی حال ادب کا بھی ہے۔ جو سطح زمین سے مصلح و مخرب الاخلاق بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو زبان کو لے لیجئے۔ ہندوستان

کے اختلاط و ارتباط کے ساتھ ساتھ کاروباری اغراض کی تکمیل کے لئے یہ نئی زبان وضع کی گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ ایک علمی و ادبی زبان شمار ہونے لگی۔ اور تقریباً ان تمام خصوصیات سے لبریز ہوگئی جو من حیث القوم مسلمانوں کا فطری جوہر ہیں۔

بدقسمتی سے اُردو زبان کے علم و ادب کا سنگ بنیاد اس وقت رکھا گیا جب ذوق عامہ مسلمانوں کی اخلاقی زوال اور عیش پسندی کا شکار ہو رہا تھا۔ ایسی صورت میں اُردو کی جو درگت بنتی تھوڑا تھا۔ اس کے ابتدائی ادب کے ادبار کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ارباب حل و عقد نے ملکی زبانوں سے استفادہ کرنے کے بجائے فارسی ادب کو اپنا ماخذ بنایا۔ ہر چند کہ بعض روشن خیال مسلمان مصنفین نے بھاشا کے چمن پر بہار کی آبیاری کرنے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ ان کے باوجود اہل ہند کا روحانی ماحول مسموم و پراگندہ ہوگیا اور عوام شرنگار رس کے   ریلے میں بے طرح بہہ گئے۔ اور ہمارا ادب خس و خاشاک کا معجون مرکب بن کر رہ گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ابتدا از تصنیف و تالیف کا کام شاہانِ وقت کی خوشنودی سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے جن مشاغل سے انھیں دلچسپی   تھی انھیں کا عکس اُس وقت کی تصانیف میں نمایاں ہے۔

بدی نیکی سے زیادہ زود اثر ہوتی ہے۔ اور بہت جلد عوام و خواص کا دل لبھا لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پس اُردو ادیبوں کے حسن و عشق کی داستانوں نے ملک کی فضا ہی بدل دی، اور پنجاب میں ہیر رانجھا اور سوہنی مہیوال وغیرہ کے عشقیہ افسانوں کی دھوم مچ گئی۔ دکن میں سبرس اور اسی نوع کے دیگر بیشمار قصص کا غوغا بلند ہوا۔ شمالی ہند میں پدماوت، اور مہش جواہر وغیرہ کے راگ گائے جانے لگے۔ اور شیریں فرہاد و لیلیٰ مجنوں وغیرہ کی تو اکناف ہند میں ایسی ہوا بندھی کہ بنگلہ جیسی متین زبان پر بھی ان کا رنگ چڑھے بغیر نہ رہا۔

اب ملکی ادب کا رخ بدل چکا تھا اور شاعری مایۂ تفنن قرار دی جا چکی تھی۔ شاعر کا کام روحانی غذا فراہم کرنا نہ تھا بلکہ عشق اور جنون عشق کی پستیوں کو حسن بیان سے مُرتب کر کے پیش کرنا اور رکیک جذبات کو اُبھارنا تھا۔ چنانچہ عشق و محبت کا مفہوم تقدیس کے بجائے شوریدہ سری اور آوارہ مزاجی قرار پایا لیکن اسی پر قناعت نہیں ہوئی بلکہ جوشش وحشت میں فطرت کے قوانین بھی کچل ڈالے گئے اور سبز خط محبوبوں کی مدح سرائی کی گئی لیکن شکر ہے کہ قدرت کا یہ عالمگیر

ملاحظہ ہو رسالہ ہمایوں لاہور فائل نمبر ۸ جلد ۵، اگست ۱۹۳۳ء صفحات ۵۵ و ۷۶۔

قانون کہ جب زوال و ادبار کی انتہا ہو لیتی ہے تو احیاء و ارتقاء کی داغ بیل پڑتی ہے اُردو کے آڑے آیا اور کچھ ایسی روشن خیال ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے اقتدائے مصحفی و میر کی ممانعت کرکے انگریزی علوم و معارف کی ترویج سے کھلے بندوں استفادہ کرنے کی تلقین کی لیکن اس نیک و مفید مشورہ کے باوجود بعض گمراہ و گمراہ کن شخصیتیں صحیح نصب العین سے منحرف رہیں۔ اور اپنی دُھن میں الفاظ کے طمطراق، غیر مانوس ترکیبوں کے استعمال اور لفظی رعایتوں کے سنہری جال میں مبتلا ہو کر معانی و مطالب کی سحر آفرینیوں سے بے نیاز ہو گئیں۔ ان کے عشق کا تخیل عامیانہ و بازاری ہے۔ اسکا میلان طبیعت بوالہوسی ہے۔ جس سے روح پر ضرب کاری لگتی اور مذاق سلیم کا جانبر ہونا محال ہو جاتا ہے۔

علم و ادب کا سرچشمہ آغاز سے آخر تک برابر بہتا ہی رہتا ہے گو کسی کسی منزل پر پہنچکر اس کا دامن سیمین لوث ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اور کبھی کبھی تو وہ اپنا راستہ تبدیل بھی کر لیتا ہے۔ لیکن اسکی روانی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں آتی

ہر ادیب و شاعر اپنے عہد کے ماحول سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوتا ہے اور ان اثرات کے آثار اپنی تخلیق و تصنیف میں مستقل طور پر چھوڑ جاتا ہے۔ جو بعدہٗ ملکی تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اسطرح یہ سلسلہ یعنی ماضی و حال کا توازن برابر جاری و ساری رہتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اسمیں بقدر ذوق ترمیم و تنسیخ بھی ہوتی رہتی ہے جس کے آخری نتائج بظاہر بالکل نئی صورت میں رونما ہو کر طرح انداز ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ہر طرز نو، طرز قدیم کی ارتقائی کیفیت ہوتی ہے۔ جسے اسکے مبہم ماضی سے منقطع نہیں کیا جاسکتا۔

ہر ادبی تصنیف کو کسی قوم یا ملک کا مستند تاریخی خاکہ سمجھ لینا بھی درست نہیں کیونکہ اسمیں قومی تہذیب و مذاق کے رنگین نقوش کے پہلو بہ پہلو ماضی کی جھلک اور انفرادی رجحان کا شائبہ بھی بغایت موجود رہتا ہے۔ بعض طبیعتیں تو اسدرجہ قدامت پسند ہوتی ہیں کہ وہ شاہراہ ترقی پر آگے بڑھنے کے بجائے دنیائے ادب کو بہت پیچھے ڈھکیل دیتی ہیں۔ مثلاً داغ و امیر نے اُردو شاعری کو میر اور غالب سے بھی پیچھے ہٹا کر کھڑا کر دیا۔ حالانکہ سطحی طور پر ہمیں ایسا نظر نہیں آتا اور یہی وجہ ہے کہ بعض مبصرین اسلوب بیاں کے نئے نئے پہلوؤں سے اُردو کو روشناس کرانے اور اسکی تہی دامنی کی پردہ پوشی کیلئے داغ و امیر کو شعراء کی صفِ اولین میں جگہ دیتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ نہیں۔ ممکن ہے کہ ان کی کوشش سے اُردو زبان کو کچھ وسعت نصیب ہوئی ہو اور اسمیں اظہار خیال کے جدید پیرائے

پیدا ہو گئے ہوں۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان سے ادب اُردو میں کوئی قابل قدر اضافہ ہوا۔ کیونکہ زبان صرف خیال کا لباس ہے۔ اور ترقی ادب سے وسعت خیال مقصود ہے نہ کہ وسعت زبان۔ پھر لباس یا زیور کی خوبصورتی سے کسی شاہد بازاری کے حسن ظاہری میں تو اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اس کا باطن اسیطرح تاریک رہتا ہے۔ بلکہ اس تصنع کا اسپر اور بھی برا اثر ہوتا ہے۔ ادب کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ جب زبان اپنی وسعت پر نازاں ہوتی ہے۔ تو تخیل کی پستی اپنی تنگ دامانی کی فریادی نظر آنے لگتی ہے اور ادب کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اُردو شاعری کا لکھنؤ اسکول اس حقیقت کی ایک زندہ مثال ہے۔

مرزا غالب کے بعد جن حضرات نے صحیح معنوں میں اُردو شاعری کو آگے بڑھایا وہ حالیؔ، سرورؔ، چکبستؔ، نادرؔ، شعلہؔ، اکبرؔ، محرومؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور برقؔ وغیرہ چند مقتدر ہستیاں ہیں۔ انکے علاوہ دیگر اصحاب کی مساعی بھی فضول و رائگاں نہیں گئیں بلکہ ادب اُردو کی ترقی میں وہ بھی ممد و معاون ہوئیں مگر وہ بلند مدارج حاصل کرنے سے قاصر رہیں جو مذکورہ بالا حضرات کی ادبی کاوشوں کو نصیب ہیں۔

اہل الرائے اصحاب نے محاسن و معائب کی پڑتال کے مختلف معیاروں کی بنا پر ادبیات کو زمانہ کے لحاظ سے تقسیم کرنے کے حسب ذیل اصول قائم کئے ہیں۔

۱- انداز بیان کی مشابہت۔ ۲- خیالات کی عام رو۔ ۳- موضوعات اور جذبات کی لطافت وغیرہ قدما کا خیال ہے کہ یہی باتیں شعرا کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ لیکن جہانتک ہمعصر کے نقادوں کا تعلق ہے۔ یہ تمام باتیں غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ انکے نزدیک شاعر یا ادیب کی صرف اسپرٹ ہی ہماری توجہ کی مستحق ہے اور اسی کی بنا پر ہم مختلف اہل قلم حضرات میں صحیح طور پر امتیاز کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہر شاعر کا رنگ عموماً جداگانہ ہوتا ہے۔ ان بعض عطائی لوگ کسی اُستاد کے رنگ کا تتبع کرنے کی کوشش میں اپنے فطری جوہر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ باقی تین شرائط بھی قریب قریب فضول ہیں۔ بہرحال یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ندرت خیال کیساتھ زبان میں وسعت آتی ہے اور تخیل کی نفاست کے موافق طرز بیان میں بھی سوز و نیستد پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح لطافت بیان لطافت خیال پر منحصر ہے۔

ادب متعصب | پہلے کہا جا چکا ہے کہ ادب قومی خصوصیات، ملکی حالات، اور ایک خاص عہد کے احوال کا حامل ہوتا ہے۔ متعصب اقوام عموماً اخلاقی پستی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اسلئے ان کے علم و ادب کے آئینہ میں بھی تعصب کا رنگ نظر آنے لگتا ہے۔ بدقسمتی سے ادب اُردو کے چہرہ پر تعصب کے

بیشمار داغ نظر آتے ہیں۔ شاعری کے علاوہ ہمارا افسانوی ادب بھی ان عیوب سے مبرا نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں رجب علی بیگ سرور، عبدالحلیم شرر اور اقبال جیسے باکمال ادیبوں کی تصانیف میں بھی اس قسم کی بہت سی کمزوریاں موجود ہیں جنہیں بخوف طوالت یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مگر یہی باتیں ان گرانقدر تصانیف کو ملکی ادب کے زمرے سے گرا کر فرقہ وارانہ ادب کے ذیل میں لے آتی ہیں اس قسم کی کوششوں سے ملک کے علاوہ خود فرقہ کو بھی گرانقدر نقصان پہونچا ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی طبقے کا ہر فرد متعصب ہے۔ درحقیقت ہر فرقہ اور طبقہ میں بعض ادیب عہد حاضرہ کے خیالات کو جلا دیکر بہت آگے بڑھا لیجاتے ہیں اور حال کو مستقبل کا رنگ دیکر زمانہ کو بدل دیتے ہیں۔ غالب۔ ٹیگور۔ قاضی نذرالاسلام (بنگلہ زبان کے مشہور شاعر) کا انھیں اصحاب میں شمار ہوگا۔ مرزا غالب اور ڈاکٹر ٹیگور دونوں کی لازوال شہرت کا راز انکی فنی خصوصیات نہیں بلکہ مذہبی رواداری کی اسپرٹ اور بلند اخلاق ہے جسکا ایک ایک فقرا ایک ایک شعر میں دفن ہے۔ اکثر سیاسیات وقت کی الجھنیں ادیب شاعر کو اپنے مرتبہ سے نیچے گرا دیتی ہیں۔ اقبال "بانگ درا" میں مسلمانوں کی تنگ نظری پر پھوٹ پھوٹ کر روئے ہیں۔ مگر "بال جبریل" میں تعصب اور فرقہ وارانہ ذہنیت بغایت عود کر آئی ہے۔

اردو بلاشبہ ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ اور اسکا ادبی سرمایہ دونوں کی ملکیت ہونا چاہیئے۔ آج دنیا کے امن کیلئے ہندو مسلم اتحاد کی جتنی شدید ضرورت ہے شاید اتنی پہلے کبھی نہ تھی مگر ان دونوں کے اختلافات کی خلیج آج جسقدر وسیع ہوگئی ہے اس سے پیشتر اسکا وہم و گمان میں آنا بھی مشکل تھا۔ پھر کیا یہ ناممکن ہے کہ کم از کم ادبی حلقہ کو مذہبی مناقشات کا آماجگاہ نہ بنایا جائے۔ اور ہندو و مسلمان دونوں ہمزبان و ہمخیال ہوکر قومی ادب کی تعمیر میں حصہ لیں۔

مجموعی حیثیت سے ادب کی دو قسمیں قرار دیجاتی ہیں ایک دوامی جس سے وہ تصانیف مراد ہیں جو اسقدر وسیع اور جامع ہوتی ہیں کہ ہر ملک اور ہر عہد کے باشندوں کو یکساں طور پر اپیل کرتی ہیں۔ مثلاً رباعیات خیام کالیداس کی شکنتلا اور گوئٹے کا فاؤسٹ وغیرہ۔ دوسرے عارضی۔ اس صنف میں ایسی کتابیں آتی ہیں جنکی تصنیف کسی خاص موقع اور مقصد کیلئے مفید ہوتی ہے اور چند روز تک انکا غلغلہ رہنے کے بعد لوگ انہیں ہمیشہ کیلئے طاق نسیاں پر رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً البرٹ بل اور سراسیمہ ساحر و بھارت جننی وغیرہ ناٹک۔ انمیں سے صرف پہلی قسم سے ادب کی مستقل خدمت کی توقع کیجا سکتی ہے۔ اور دوسری صنف کو تو حلقہ ادب

میں شامل کرنا ہی فضول ہے۔

<u>ادب اور غیر ملکی اثرات</u> جب دو مختلف العقائد اقوام میں باہم ربط و ضبط ہو جاتا ہے۔ تو دونوں کم و بیش ایک دوسرے کی تہذیب، تمدن، اخلاق و اطوار اور خیالات و رسوم سے متاثر ہوتے ہیں۔ اردو شعراء کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ہندو شاعروں کے کلام میں جگہ جگہ گل و بلبل کا رونا اور دفن و مزار کا تذکرہ موجود ہے اور بہت سے مسلمانوں کے ہاں بھی کرشن کنہیا کی بانسری اور گوپیوں کا جھگڑا نظر آجاتا ہے۔ اسکے علاوہ نو وارد مسلمانوں کی عیش پسندی انکی روح نشاط کس طرح ہندی ادب کے قالب میں حلول کر گئی ہے تقریباً تمام ملکی زبانیں اسکی شاہد ہیں۔ قدرت نے ہر متنفس کو اخذ و قبول کا مادہ عطا کیا ہے۔ لیکن پست اقوام دوسروں کی اچھائیوں کو اپنا لینے سے گریز کرتی ہیں اور ہر ایسے مستحسن اقدام کو اپنی مذہبی و اخلاقی موت تصور کر کے ارتقائے عالم کے راستہ میں مخل ہوتی ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی اہل یونان و روم نے بھی ہندی علوم و معارف کی خوشہ چینی کی تھی اور ان سے انگریزوں اور دیگر مغربی قوموں نے فلسفہ، مذہب، اخلاق، قانون، سائنس اور دوسرے علمی و ادبی شعبوں میں فائدہ اٹھایا۔ پھر ایک مدت کے بعد جب ہندوستان زوال و ادبار کی زد میں آیا تو یہی سب قومیں ہندی ادب کے غیر پر اثر انداز ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ ہندی ادب جتنا انگریزی لٹریچر سے مستفید ہوا اتنا شاید کسی دوسری زبان سے نہیں۔ سب سے پہلے بنگلی زبان کو انگریزی ادب کے گلہائے رنگارنگ سے اپنا دامن بھرنے کا فخر حاصل ہوا اور نثر نگاری کیساتھ ساتھ ناول نویسی کی بھی ابتداء ہوئی۔ لیکن بنگالی زبان اس دور میں دیگر ملکی زبانوں سے سبقت لے گئی۔ اہل بنگال نے جہاں فرنگی ادب کا تتبع کر کے اپنی زبان کو نوادر ادب سے مالا مال کیا وہاں انگریزی کو بھی ایسے نادر تحفے نذر کئے جو ہمیشہ یادگار رہیں گے چنانچہ مدھوسودن، تارا، سروجنی، رومیش دت اور ٹیگور وغیرہ نے انگریزی میں ایسی داد سخن دی کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ سب سے آخر میں اردو اور ہندی زبانوں کا نمبر آیا۔ ان دونوں زبانوں کی ابتدا بھی دیگر زبانوں کی طرح نظم سے ہوئی لیکن بعدہٗ انگریزی کی برکت سے نثر نویسی کا ڈول پڑا۔

خیالات و حالات کی تبدیلی کیساتھ ساتھ طرز بیان میں بھی اہم تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہر شخص کا طرز تحریر جداگانہ ہوتا ہے۔ اور اس کا انحصار اس کے خیالات کی باریکی لطافت اور وسعت پر ہے۔ سرشار سے اردو ناول نویسی کی ابتداء مانی جاتی ہے۔ ضرورت وقت و اقتضائے طبیعت کے تقاضے انھوں نے جس رنگ میں ناول فن دی بدی دلچسپ نہایت رنگین دلفریب ہونیکے باوجود بھی فن ناول نویسی کو انتہائے کمال تک پہنچانے کیلئے کافی نہ تھا چنانچہ پریم چند نے جن جدید خیالات سے متاثر ہو کر ناول لکھنا شروع کیا انکی خوبصورتی بحال و برقرار رکھنے کیلئے اسی طرز تحریر کی ضرورت تھی جو انکا حصہ ہے۔ اور شاید اسی لیے انھیں غیر معمولی کامیابی بھی نصیب ہوئی۔

اِلتجائے بیداری

از حضرت وصل بلگرامی

یہ مسز سروجنی نائیڈو صاحبہ نے لکھنؤ کانگرس کے کل ہند مشاعرہ کے لئے ایک معرکۃ الآرا انگریزی نظم لکھی تھی جس کا منظوم ترجمہ ہمارے کرم دوست حضرت وصل بلگرامی نے مشاعرہ کی پہلی نشست منعقدہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۰ء میں پڑھ کر سنایا تھا۔ اس ترجمہ کو صدر مشاعرہ یعنی مسز سروجنی نائیڈو و نیز عام شعراء کرام و سامعین نے نہایت پسند فرمایا تھا۔ آج ہم وصل صاحب کی عنایت سے اس قابل قدر نظم کو ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔

خواب سے اے مادرِ ہندوستاں! بیدار ہو — تیرے بچے، التجا کرتے ہیں ہاں! بیدار ہو
تیرے بچے ہیں دو زانو، تیری خدمت کیلئے — تیری پُر عظمت پرستش اور عبادت کیلئے
رات، خوابِ صبح کے جلووں سے ہے آئینہ تاب — تو ہو کیوں زندانِ رنج و غم میں اب تک محو خواب
اٹھ اور ان کڑیوں کو، جو جکڑے ہوئے ہیں توڑ ڈال — ہیں مصیبت کی جو کڑیاں، باعثِ رنج و ملال
پاک کر اُس کامیابی کے لئے بچوں کے ہاتھ — جو بلاتی ہے، تبسم اور رعنائی کے ساتھ
مادرِ محبوب! وارث کیا نہ ہم ہوں گے ترے؟ — کیا نہیں حقدار، ہم تیرے غرور و ناز کے؟
ہم، تجھے ہرگز نہ بھولیں گے، نہ چھوڑیں گے کبھی — جن کے دل میں تو ہے، کیوں جھکیں وہ خدمت سے تری
جھکے دل تیری سپر ہیں، تیری قربان گاہ میں — ہچکچائیں گے وہ کیوں، جو تیرے عظمت خواہ ہیں

بزمِ انجم کو ترے قصوں سے گرمائیں گے ہم
مرکزِ عظمت کی جانب پھر تجھے لائیں گے ہم

ہندو

مادرِ ہندوستاں اے مایۂ صد افتخار — ہم نے گلہائے پرستش کے چڑھائے تجھ پہ ہار

پارسی

مادرِ ہندوستان آتش نہیں تیری بید کے گھیرے بیٹھے ہیں تجھے شعلوں میں ہم امید کے

مسلمان

مادرِ ہندوستان! یوں قدر و منزلت کی تری ہم نے شمشیرِ محبت سے حفاظت کی تری

عیسائی

مادرِ ہندوستان! دامانِ مریم کی قسم رات دن، نغمے عقیدت کے تری گاتے ہیں ہم

سب کی متفقہ آواز

دیکھ اے ملکہ! حُسن اد دیوی!! تجھی سے ہے خطاّ اپنے جذباتِ عقیدت کیلئے ہوں گے مستجاب

دُکھ بھری آواز سُننے کے لئے تیار ہو

مادرِ ہندوستان! بیدار ہو بیدار ہو

رُباعی

تریاق کے پہلو میں ہے موجِ سُم بھی
مانا کہ ہے اک خوشی۔ تو لاکھوں غم بھی
قدرت نے ہمیں کھیل بنا رکھا ہے
قدرت کی ہنسی اُڑائیں آؤ ہم بھی

(کلیم) جوش

حاتم

از سید محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی مصنف سیر المصنفین

آپ کا نام شیخ ظہور الدین اور تخلص حاتم ہے۔ شاہجہاں آباد میں ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے لفظ ظہور سے تاریخ پیدائش نکلتی ہے، اور یہی ان کا تاریخی نام ہے۔ چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں بقولش "تاریخ تولدش حرف ظہور باشد"۔ آپ کے والد کا نام شیخ فتح الدین تھا، سپاہی پیشہ تھے۔ حاتم کی تربیت بھی اسی فن کے مناسب ہوئی تھی۔ لیکن آپ نے سولہ سترہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے بعدازاں حاتم کے نام سے مشہور ہوئے بقول مصحفی کی "در ایام جوانی سپاہی پیشہ بود...... ازبسکہ ایں غرا بہ از قدما ان معمور بود۔ امیر زادہ ہائے والااعتبار و نوئینان ذوی الاقتدار اوما بیش از بیش بہ تواضع و تعظیم پیش آمدہ بر مسند برابر خود جائے دادند و مناسب حال خود ہا ہر یکے ازو افرمی گزرانیدند۔" ہمیشہ عمدہ معاش بود، واوقات را بخوبی گزرانیدہ مرد سپاہی پیشہ از ہندوستان زبانان قدیم بودہ" ظاہر ہے کہ ابتدائے عمر میں آپ سپاہی پیشہ رہے اور بعدازاں نواب عمدۃ الملک امیر خاں کے یہاں ملازم ہوگئے ندیم خاص بھی تھے اور داروغہ باورچی خانہ بھی۔ نواب صاحب ہی کی فرمایش پر آپ نے مثنوی در تعریف قہوہ لکھی۔ آپ کی زندگی اگرچہ امیروں اور نوابوں کی صحبت میں گزرتی تھی مگر درویشوں کے یہاں بھی آمد و رفت تھی اور قدم شریف کے پاس میر بادل علی شاہ کا تکیہ ان کی خاص نشست گاہ تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

خودی کو چھوڑ آ حاتم خدا دیکھ | کہ تیرا رہنما ہے شاہ بادل
حاتم کیا ہے حق نے دو عالم میں سر بلند | بادل علی کے جب سے لگے ہیں قدم سے ہم
جناب حضرت حق سے نہ ہو کیوں فیض حاتم کو | ہوا ہے تربیت وہ بادل باذل کی صحبت میں

شاہ موصوف ہی کی صحبت کا اثر تھا کہ آخر کار حاتم ملازمت ترک کرکے درویش بن گئے۔ عمر تقریباً چھیانوے ۹۶ سال کی ہوئی، اور سنہ ۱۲۰۷ھ میں رحلت فرمائی آپ کا اصلی دیوان نہایت ضخیم ہے۔

اور دیوان زادہ میں بھی تقریباً پانچ ہزار اشعار ہیں۔ ہمارے پاس مولانا حسرت موہانی کا مرتب کردہ نسخہ ہے جو اُنھوں نے غالباً دونوں دیوانوں سے منتخب کیا ہے اور جس میں تقریباً بارہ سو اشعار ہیں۔

کلام پر تبصرہ | ولی کے بعد دوسرے دور کے شعرا میں شاہ حاتم ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اُن کے شاگرد بھی مشہور و معروف ہوئے ہیں۔ مثلاً مرزا رفیع السودا اور عبدالحیٰ تاباں۔ عمر بھی زیادہ ہوئی، اس لئے اُن کو دورِ اول اور دورِ سوم کے شعرا سے بھی میل ملاقات کا موقع ملا۔ دورِ اول اور دورِ دوم کے شعرا زیادہ تر ایہام گوئی کو شاعری سمجھتے تھے۔ آپ نے دورِ اول کے شعرا سے اگر ایہام گوئی کا سبق لیا تو دورِ سوم کے نئے خیالات سے متاثر ہو کر اُس کو ترک بھی کر دیا۔ دیوان زادہ ترتیب دیا جس میں ہر غزل بقید تاریخ درج کی ہے جس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ کس سنہ میں کہی گئی تھی۔

آپ نے اُردو زبان کی صفائی میں بہت حصہ لیا اور ستر سال تک مشقِ سخن کرتے رہے۔ مضامین تو آپ کے یہاں بہت معمولی ہیں اور اندازِ بیان بھی کوئی خصوصیت نہیں رکھتا لیکن کلام کی سادگی اور صفائی اُس زمانہ کے لحاظ سے خوب ہے۔ اپنے زمانہ کے حالات بھی مسلسل غزلوں، قطعوں اور مثنویوں میں بیان کئے ہیں جس سے اُس عہد کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اور بعض واقعات پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ مثلاً ۱۱۲۱ھ کے لکھے ہوئے دیوان زادہ میں ایک غزل ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:-

اے ولی مجھ سے آزردہ نہ ہو اگر مجھے ۔۔۔ یہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاتم نے یہ غزل ولی کی اُس مشہور غزل پر لکھی تھی جس کا مقطع حسب ذیل ہے:-

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق ۔۔۔ کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

چونکہ حاتم ولی کا نہایت احترام کرتے تھے اس لئے آخر الذکر سے معذرت کی ہے کیونکہ ایسے استاد کی غزل پر غزل کہنا خصوصاً اُن کی موجودگی میں اُن کے نزدیک سوء ادب ہے۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ ولی اُس وقت زندہ اور غالباً شاہجہاں آباد میں تھے۔ لہٰذا اُن کی وفات ہرگز ۱۱۱۹ھ میں نہیں ہوئی جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے۔

ف رسالہ اُردو کے ایک پرچہ میں ۱۱۱۹ھ کو وفاتِ ولی کا سنہ قرار دیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ زمانہ کانپور ۱۹۳۲ء میں ہم اُن کے

یا محمد شاہ کے عہد کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے :-

کیا بیاں کیجے نیرنگیِ اوضاعِ جہاں — کہ بیک چشم زدن ہو گیا عالم ویراں
جھولے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں — پھرتے ہیں محتاجی کو محتاج پڑے سرگرداں
نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت — روزہ پھرتے ہیں یہاں قوتِ لایموت کو اپنی حیراں
جن کی پوشاک سے معمور تھے توشک خانے — سو وہ پیوند کو پھرتے ہیں ترستے عریاں
پرچہ نان کو رکھ ہاتھ میں کھاتے ہیں امیر — جس کو دیکھو ہوں سو ہر ٹکڑے پہ غلطاں پیچاں
خوانِ الوان کہاں اور وہ کہاں دستر خواں — یعنی چہ سیر وچہ مرزا وچہ نواب چہ خاں
پوچھتا کوئی نہیں حال کسی کا اس وقت — ہے عدم دہر کی آنکھوں سے مروت کا نشاں
اقتدار ہیگا جنہیں سو ہیں علیہ اللعنۃ — ہیں سگے ہر ایک یزید و شمر و ذریہ و مروان
گرم ہے ظلم کا بازار، خدا خیر کرے — کہیں مظلوموں کے رونے سے نہ آوے طوفاں
کان دھر بات کسو کی نہیں سنتا کوئی — آنکھ سے آنکھ ملانا تو بیاں کیا امکاں
وے جو بیکار ہیں ان کا تو خدا حافظ ہے — سو جو ہیں نام کو نوکر انہیں تنخواہ کہاں
کیا زمانہ کی ہوا ہو گئی سبحان اللہ — زندگی ہو گئی ہر ایک کی اب دشمنِ جاں
زن و بچوں سمیت فاقہ کھاتے ہیں ٹکڑے ستے ہیں — غضب آئے، جو کوئی جائے کسی کے مہماں
وے جو شعلے کو ترستے تھے سو اس دور میں آج — ہوئے ہیں صاحبِ مال و محل و فیل و نشاں
رتبۂ شیروں کا ہوئیگا شغالوں کو نصیب — جائے بلبل ہیں چمن بیچ غزل خواں زاغاں
اے خدا خوب کہا ہے یہ کسو نے مصرع — یعنی نعمت بسگاں بخشی و دولت بخراں
مرض ہے بھوک کا عالم کو کرے کون علاج — گر اس درد کو ہو فضلِ خدا کا درماں
چشمِ عبرت سے نظر کیجو لو اولاالابصار — دیکھ لو راست میں کہتا ہوں عیاں را چہ بیاں
حاتم اس بحرِ مروت کی ملی دیوے داد — جس کا اس وقت ہو لب پہ توحید الاحساں

یا بعض اشعار ایسے ہیں جن سے اُس دَور کی ناگفتہ بہ حالت ظاہر ہوتی ہے اور امیروں کی خود غرضی اور اُن کے عادات پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً :-

خیر و برکت ہند سے سب اُٹھ گئی — سب کی دھارِ تیغِ ہمت مڑ گئی
عادتِ فیض و کرم اہلِ دول سے چھوٹ گئی — دستِ ہمت شل ہوا چشمِ مروت پھوٹ گئی
آشنا حاتم غریبوں کا ہو امراؤں کو چھوڑ — نام کو قدرت نہیں ہے ان بچاروں میں دماغ

عجب احوال دیکھا اس زمانے کے امیروں کا نہ ان کو ڈر خدا کا اور نہ ان کو خوف پیروں کا

رباعی

یک ذرہ کبھو نہ کام آئی مجھ کو دولت مندوں کی آشنائی مجھ کو
گر فائدہ ان سے ہو نہ جو حاتم ہوں یکساں ہے شاہی ہو گدائی مجھ کو

جس وقت ہم مریں تو یہی دوستاں لکھو جانے جواب نامہ ہمارے کفن کے بیچ
یعنی کہ یہ فریب زمانہ کے ہاتھ سے جا کر بسا تھا چھوڑ کے شہروں کو بن کے بیچ
اس جا بھی آسماں نے نہ دی فرصت اس کے تئیں مارا جلا کے آگ لگا تن بدن کے بیچ
چاہے تھا کچھ کہے کہ اسی دم میں ناگہاں یوں آ گئی اجل کہ رہی من کی من کے بیچ

ایک قطعہ آپ نے حسنین کے ماتم میں خوب لکھا ہے جو ذیل میں درج ہے:۔

ایک دن سیر گلستاں کو گیا تھا حاتم دیکھتا کیا ہے کہ یک دشت ہے ماتم کی بنی
رعد نالاں ہے ادھر ابر ادھر گریہ کناں سانس ٹھنڈی سی ادھر لے ہے نسیم چمنی
جیب گل چاک ادھر غنچہ گرفتہ خاطر بلبل غمزدہ کرتی ہے ادھر نعرہ زنی
نیل میں ہے آج ادھر سرو کے پیراہن سبز پہن بیٹھی ہے ادھر فاختہ جگہاں کفنی
باغبانوں سے جو پوچھا کہ یہ کیا باعث ہے کہا رو کر کہ یہ ماتم ہے حسین و حسنی

ایک اور قطعہ ۱۱۶۹ھ کی تصنیف ہے وہ بھی خوب ہے۔

ایک دن حاتم میں جاتا تھا بیاباں کی طرف ناگہاں یک گور اوپر جا پڑا میرا قدم
خاک سے اس شخص کی آواز آئی کان تک یعنی وہ یہ بیت پڑھتا تھا بصد سوز و الم
از فریب باغباں غافل مشو اے عندلیب پیش ازیں من ہم دریں باغ آشیانے داشتم

آپ بالطبع منکسر اور خاکسار تھے، اپنی شاعری پر نازاں نہ تھے۔ فرماتے ہیں:۔

کئی دیوان کہہ چکا حاتم اب تلک پر زباں نہیں ہے درست
جہاں کے کوچے میں ہر صبح ہے سبیل فنا حاتم پڑے ہیں تجھ سے بہتر اہل جوہر خوار دنیا میں

اپنے ہم عصروں کے کلام کی داد بھی خوب دیتے تھے۔ یہاں تک کہ شاگردوں کی بھی خوب تعریف کرتے تھے۔

خوب گو سب ہیں لیکن اے حاتم — خوب سے خوب ہے فغاں کی زباں

سودا کی شاگردی اور اپنی استادی کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ یہ مصرع ہمارے حسبِ حال ہے:

رتبۂ شاگردی من نسبت استاد مرا

عبدالحئی تاباں سے بے حد محبت تھی، فرماتے ہیں:-

ریختے کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت — پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباں کی طرف

یا

فیضِ صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں — طفلِ مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا

سعادت یار خاں رنگین بھی آپ ہی کا شاگرد تھا۔ حاتم نے اپنا ایک شعر پڑھا:-

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے — رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

رنگین نے فوراً اعتراض کیا اور کہا کہ مصرعِ آخر اگر اس طرح ہوتا تو خوب ہوتا:-

"ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے"

شاہ حاتم بجائے اس کے کہ ناراض ہوتے رنگین کو علیحدہ بلا کر سمجھایا کہ سب کے سامنے اعتراض کرنا گستاخی میں داخل ہے، اگر تنہائی میں مجھ سے کہتے تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ آئندہ احتیاط رکھو اور میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اپنے دیوان میں دوسرے مصرع کو اسی طرح بدل کر لکھونگا۔

لیکن "میر بد دماغ" "نکات الشعراء" میں تحریر فرماتے ہیں: "مردیست جاہل و متمکن و متقطع وضع و بآشنا غناندارد دریافتہ نمیشود کہ ایں رگ من بسبب شاعری است کہ بجو من کسے نیست یا وضع او ہمین است:"

آپ کے کلام میں مقامی رنگ بھی پایا جاتا ہے، فرماتے ہیں:-

چھاتی بھر آتی ہے پپیہے کی صوت سے — برسات مجکو آ کے ستاتی ہے بر برس

ہولی کے اب بہانے چھڑکا ہے رنگ کس نے — نام خدا تجھ اوپر اس آن عجب سماں ہے

رنگِ گلال منہ پر ایسا بہار دے ہے — جوں آفتاب تاباں زیرِ شفق نہاں ہے

آپ کا کلام زیادہ تر آپ کے اصلی خیالات کو ظاہر کرتا ہے۔ بعض تخیل ہی سے کام نہیں لیا بلکہ جو حالت آپ پر گزرتی تھی اس کا صحیح نقشہ اپنے اشعار میں کھینچا ہے۔ حکیم قدرت اللہ نے مجموعۂ نغز میں لکھا ہے:-

"........ بسیار آزادانہ زندگی می نمود و خیلے خوش مزاج و خلیق بود...... برخلاف

وقبح آزادان عیسوی پوشیدہ و بسیار بالطافت و طہارت می زیست و گرد منکرات نمی گشت و بصوم و صلوٰۃ و سائر فرعیات سنت مقید بود اما دستار چہ آزادانہ بر کلاہ می بست و چوبک باریک و رودال کہ شعار آزادان است با خویش میداشت باجملہ مرد خیلے بود نیک دین صاحب یقین و شاعرے بود با تمکین از طبقہ دو مین دیوانے ضخیم گفتار قدیم مشتمل الفاظ متروکہ دارد و دیوانکے خورد کہ دیوان زادہ اش نام کردہ و آں ہم پنج ہزار بیت تخمیناً خواہد بود بطرز طبقۂ سوئمین از دیادگار ماست و شعر فارسی ہم میگفت تلامذہ بسیار داشت۔"

حکیم صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ حاتم پہلے شراب پیتے تھے لیکن میر بادل علی شاہ کے فیض صحبت سے ترکِ منہیات کو اپنا شعار بنا لیا۔ غالباً یہ شعر اُس وقت کا ہے جب آپ بادہ خوار تھے۔

ہمیں مضمون و معنی سے نہیں کچھ ربط اے حاتم
نشہ کی لہر میں جو دل میں آیا ہم بھی بک بیٹھے

گلشن بیخار میں نواب شیفتہ لکھتے ہیں:-

"دراوّل حال فکرتش مقصور بر تتبع قدما مانند ولی و غیراں بود چوں طرز متاخرین طراز جیب و داماں شہرت گشت وے نیز دست بدامان ایشاں زدہ بنائے دیوانِ ثانی بریں طریقہ نہاد و ہمدریں سمورہ بہرے کہ ہمدوشِ عمر طبیعی شدہ بود دامن ہستی از کف سر داد۔"

آپ کے یہاں بعض فارسی تراکیب بھی خوب ہیں، مثلاً:-

تیز پر :- جیسا کہ اُڑے ہے طائرِ دل ایسا کوئی تیز پر نہ دیکھا

بے جگر :- ع ایسا کوئی بے جگر نہ دیکھا

چشمِ بد دور - دست و گریباں :- ع رات اور وں کو ہم دست و گریباں دیکھا

بہرِ شست و شو :- ع کہ بہرِ شست و شو ہے منتظر باران رحمت کا

عاشق شب خیز - تنگ ظرفی - جامِ لبالب :- شعر

نہایت لودہ ہوں ساقی تنگ ظرفی نہ کر ظالم
میں تیرے ہاتھ سے مشتاق ہوں جامِ لبالب کا

تیغ زن - کارواں - سر براہ :- شعر

میں اپنے دل کو بڑا کارواں سمجھتا تھا پر ایک کام مرا سر براہ بھی نہ کیا

باریاب، دست بدست۔ تغافل پناہ وغیرہ وغیرہ

آپ کے یہاں متروکات کی فہرست طویل ہے کیونکہ ابتدائی زمانہ تھا اور زبان رفتہ رفتہ منجھ کر صاف ہوئی۔ اس لئے اس امر کی کوئی شکایت نہیں، اگر آپ کے یہاں متروک الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔

ہیگی بجائے ہے ع دوستی اس کی ہیگی زندگانی کا مزا

بغل بیچ بجائے بغل میں ع دل بغل بیچ مرا دشمن جاں ہے گویا۔

نیئں کو نیں" باندھا ہے شعر

چھپائیں جا بجا حاضر ہے پیارا　　کہاں وہ چشم جو ماریں نظارا

آجکل نظارا ماریں کے بجائے نظارا کریں کہیں گے۔

نت بمعنی ہے نقارہ بغیر تشدید ق۔ بجے ہے کوچ کا ہر دم نقارا۔ کونچ بجائے کوچ جوں بمعنی مانند۔ سوں بجائے سے۔ تیئں بجائے کو۔ بعض مقام پر "نے" حذف کر دیا ہے مثلاً

ایسا کوئی تم ہنر نہ دیکھا

کبھو بجائے کبھی۔ انتظاری بمعنی انتظار۔ تروار بجائے تلوار۔ ٹک بجائے ذرا۔ گلشن اوپر بجائے گلشن پر۔ کہیں بجائے ہرجگہ۔ ہوئیگا بجائے ہوگا۔ جریانہ بجائے جرمانہ۔ ناؤں بجائے نام۔ احمقائی بجائے حمق۔ مصرع کہ سب اہل چمن ہنستے ہیں تیری احمقائی پر"۔ سینت۔ رکھ بجائے حفاظت سے رکھ ع تو اپنا سینت رکھ اے باغباں باغ۔ خوشبوئی بجائے خوشبو۔ امراؤں بجائے امیروں وغیرہ وغیرہ

بعض الفاظ کو آپ نے مذکر باندھا ہے جو آجکل مونث ہیں، مثلاً:۔

ع جہاں سے فوت ہوا رسم آشنائی کا۔ آجکل رسم مونث ہے۔

ع ہمارا جان گیا ہم نے آہ بھی نہ کیا۔　　جان اور آہ دونوں مونث ہیں۔

ایک مصرع میں "ستم" کا میم یا "ہوتا" کی "ہ" گر جاتی ہے:

ع ستم ہوتا اس زمانہ میں تو کہتا آفریں

واؤ عطف بھی اب اس طرح استعمال نہیں کرتے ع ایک سے دونوں ہیں کیا بیگانہ و کیا آشنا

بعض اشعار آپ کے یہاں بھی رکیک ہیں مثلاً :۔

جی ترستا ہے یار کی خاطر　　اس سے بوس و کنار کی خاطر

اکسیر اس نگر کی حاتم کو کیمیا ہے　　جو مرد ہر نہیں ہے اسکو طلائی خواہش

ذیل میں آپ کے چیدہ اشعار لکھے جاتے ہیں جن کو تبرک سمجھنا چاہیے آپ کا سلسلہ شاعری آج تک جاری ہے۔ دورِ حاضر کے بڑے شاعر مولانا حسرت موہانی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں

سیرِ چمن کی دل کو مرے آرزو نہیں
حسرت ہے مجھ کو وہ گلِ بے خار دیکھنا

دیکھا تھا دور سے میں اُسے چھپ کے ایک روز
نظروں میں بھا گیا وہ ستمگار دیکھنا

فقیروں سے سُنا ہے ہم نے حاتم
مزا جینے کا مر جانے میں دیکھا

کعبہ و دیر میں حاتم بجز از غیرِ خدا
کوئی کافر نہ کوئی ہم نے مسلماں دیکھا

کیا ہر ایک سے مل مل کے دل کا بھید ہم سب
کیا معلوم عالم میں جو ہے سو اپنے مطلب کا

نہیں معلوم میرے کام کا انجام کیا ہوگا
یہی ہے فکر ہر دن صبح کیا اور شام کیا ہوگا

میں اپنے دوست پر شب خواب میں دیکھا اگر تھا
سحر کو کُھل گئی جب آنکھ میرا ہاتھ دل پر تھا

مدت سے خبر نہیں کچھ اس کی
اک دن بھی ہمارا آشنا تھا

مل مل کے سرکشوں سے وہ مے خوار ہو گیا
کیا خوب آدمی تھا پر اب خوار ہو گیا

جاتے ہو سنا ادھر بھی وہ جانانہ ہو گیا
آئینہ خانہ دل کا پری خانہ ہو گیا

جس کو دیکھا سو یہاں دشمنِ جاں ہے اپنا
دن وہ جانے تھے ہم اپنا سو کہاں ہے اپنا

شوق اُس کا آن کر یکبارگی سب لے گیا
جان سے آرام سر سے ہوش و آنکھوں سے خواب

پوچھا طبیب سے میں کروں اپنا کیا علاج
کہنے لگا کہ یہ ہے درد لا علاج

چاہوں کہ دردِ دل میں کہوں اُس سے رو بہ رو
ہو جاوے ہے زبان مری بے اختیار بند

اس زمانے میں ہمارا دل نہ ہو کیونکر اداس
دیکھ کر احوالِ عالم کے جاتے ہیں حواس

قیامت پر قیامت ہوئیگی روزِ جزا ظالم
اُٹھیں گے وہ تجھ سے مانگتے جب صف بصف عاشق

جانے نہ دونگا ہاتھ سے اُس کو کسی طرح
مقدور میرا ہوئے گا حاتم جہاں تلک

یکایک ہو گیا ایسا جدا دل
نہ تھا گویا کبھو کا آشنا دل

پیری و ضعفِ جگر ضعفِ دل و ضعفِ دماغ
سب ہوئے جمع تو حاتم یہ ہیں آثارِ اجل

فارغ ہوئے جہان کی شادی و غم سے ہم
ہر دم رکھیں ہیں کام یہاں اپنے دم سے ہم

آئے تھے مثالِ شعلہ سرگرم
جاتے ہوئے جوں شرر گئے ہم

کس جگہ لے جائیں تیرے ظلم کی فریاد ہم
تجھ سے ہی تیرے ستم کی چاہتے ہیں داد ہم

آخر ہم آسماں نے فرصت نہ دی کبھو ملے
جو بیٹھ کر نکالیں دل کا غبار ہم تم

دل چاہتا ہے مل لیں دم کا نہیں بھروسا — دو دن کی زندگی میں پھر ایک بار ہم تم
اگر اس رات گل کے ساتھ تو ہم خواب ہے شبنم — سحر کو تو کہاں اور وہ کہاں سب خواب ہے شبنم
نہیں ہے گل سا اگر غیر سے تجھکو نظر بازی — تو کیوں خورشید کے دیکھے سے تو بیتاب ہے شبنم
عجب بے رونق اے حاتم ہوا ہے اس زمانے کی — چمن بے آب و گل بے رنگ اور نایاب ہے شبنم
کیا باد خزاں نے گل چراغ دودمان گل — چمن کی ان دنوں بھی کچھ تو رکھتی ہے خبر شبنم
تمھاری چشم کے طالب کو جام سے کیا کام — نگہ کے مست کو شرب مدام سے کیا کام
جسے مساوی ہے ماضی و حال و استقبال — اُسے رہا نہیں آیندہ و بود و ہست سے کام
میں کفر و دیں سے گزر کر ہوا ہوں لا مذہب — خدا پرست سے مطلب نہ بت پرست سے کام
تغافل اس قدر حاتم سے شخص کے حق میں — کوئی بھی تجھ میں مروت کا ڈھنگ ہے ظالم
میسر فقر کا ہے جس کو دیہیم — وہی ہے بادشاہ ہفت اقلیم
خلق نے مفت میں کیا بدنام — مجھ سے اُن سے نہ ہے دعا نہ سلام
جو ذائقہ سے درد کے دل آشنا نہیں — دنیا میں زندگی کا اُسے کچھ مزا نہیں
دل جل کے بجھ گیا ہے کسی نے نہ لی خبر — ہم سوختہ دلوں کا کوئی قدرداں نہیں
حاتم خموش لطف سخن کچھ نہیں رہا — بکتا تو کیوں پھرے ہے کوئی نکتہ داں نہیں
جہاں میں کوئی کسی کا رفیق و یار نہیں — کہے بھی کوئی کہ میں ہوں تو اعتبار نہیں
لباس فقر کا سامان پردہ پوشی ہے — تو خرقہ پوش نہیں ہے جو عیب پوش نہیں
افسوس شیخ دل سے تجھے راہ ہی نہیں — بہتر تو اس سے کوئی گنہگار ہی نہیں
دنیا خیال و خواب ہے میری نگاہ میں — آباد سب خراب ہے میری نگاہ میں
ہستی پھرے ہے عمر تلاطم میں دہر کے — انسان جوں حباب ہے میری نگاہ میں
چھوٹا ہوں جب سے شیخ تعین کی قید سے — ہر ذرہ آفتاب ہے میری نگاہ میں
نہ دل میں چین ہے میرے نہ خواب آنکھوں میں — پھرے ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں
نہ کچھ ستم سے ترے آہ آہ کرتا ہوں — میں اپنے دل کی مدد گاہ گاہ کرتا ہوں
کروں دل کھول کر سیر بیاباں — جو فرصت دے کوئی دم مجھکو زنداں
کیا مجھکو گر عشق نے یارو کیا خانہ خراب — مجھکو لازم ہے کہ پاس خاطر مہماں کروں
دامن تلک بھی اُس کے نہ پہنچا مرا غبار — مشہور ہے زمیں کہاں آسماں کہاں

حاتم

رفیق اس دور میں ہم اک دلِ ناشاد رکھتے ہیں
سو اُس کے ہاتھ سے بھی رات دن فریاد رکھتے ہیں

پڑھایا آسماں پر ہم کو آخر خاکساری نے
بگولے کی طرح گو خانماں برباد رکھتے ہیں

کوئی اس وقت نہ بولو ان سے
آپ غصہ میں بھرے بیٹھے ہیں

ننگ و ناموس سے گئے ہیں گزر
گو ہمیں لوگ نام رکھتے ہیں

میں پیدایش کیا مجنوں صفت یکسر بیاباں کو
نہ پہنچا دامنِ صحرا مرے چاکِ گریباں کو

تم کہ بیٹھے ہوئے اک آفت ہو
اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

مفلسی اور دماغ اے حاتم
کیا قیامت کرے جو دولت ہو

باغ میں تم جو کار فرما ہو
تو خزاں میں بہار پیدا ہو

لذت سے زندگی کے بڑا بے نصیب ہے
جس دل میں دیکھنے کی تری آرزو نہ ہو

ہم تو ہیں آشنا ترے ظالم
تو اگر آشنا نہیں تو نہ ہو

ہم تو تیری جفا کے بندے ہیں
تجھ میں رسمِ وفا نہیں تو نہ ہو

دردِ دل میری آہ سے پوچھو
سبب اُس کی نگاہ سے پوچھو

سختیِ بے مروتیِ بتاں
اُس تغافل پناہ سے پوچھو

صحنِ چمن میں بیٹھ کے مے نوش مت کرو
گل کو نگہ کے جام سے بیہوش مت کرو

فدوی ہے جاں فشاں ہے غلامِ قدیم ہے
حاتم کی بندگی کو فراموش مت کرو

ہم کو پہنچے نہ کبھو سنگِ زمانہ سے شکست
کوئی ایسا بھی یہاں شیشہ گراں ہے شیشہ

دلِ صد پارۂ بے قدر کی قدر
وہی جانے جو ہو آفت رسیدہ

بیگانہ دیکھتا ہوں میں ہر گل کا رنگ و بو
ہمداغ اس چمن میں اگر ہے تو لالہ ہے

جس کو تیرا خیال ہوتا ہے
اُس کو جینا محال ہوتا ہے

جس طرح خورشید کی ہووے نظر سے سنگ لعل
اس طرح دل فیض پاتا ہے دلِ آگاہ سے

مسندِ سالوس سے زاہد نہیں ہے شانِ فقر
بوریے پر بیٹھئے اور بے ریائی کیجئے

ہے دل کے مدعا سے مرے اُس کو سب خبر
درکار نامہ بر نہیں پیغام کے لئے

جس کے منہ سے اُتر گئی لوئی
غم نہیں اُس کو کچھ کہو کوئی

تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے
جہاں کے کام تھے جتنے تمام بھول گئے

مکاتیب شمیم

(از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے)

اہلِ کمال ہر ملک اور ہر زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن اظہارِ کمال اور شہرت طلبی کی وبا جیسی اس زمانہ میں پھیلی ہوئی ہے ایسی کبھی نہ پھیلی ہو گی۔ علم و فن کا کوئی شعبہ اس سے پاک نہیں رہا۔ علم ادب کب بچ سکتا تھا۔ مجھے کم و بیش پچیس سال سے اُردو دنیا سے واقفیت ہے۔ میں نے ہر طرف یہی دیکھا ہے کہ چند سطور صحیح لکھنے سے پیشتر یا چند مصرعے موزوں کرنے سے پہلے ہمارے اولوالعزم نوجوان اس بات کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو جلد سے جلد مصنف یا شاعر کے نام سے مشہور ہو جائیں اور اس نام سے مشہور ہو جانے کے بعد پھر یہ کوشش ہوتی ہے کہ اب وحید عصر و یگانۂ روزگار بھی تسلیم کر لئے جائیں۔ اس معاملہ میں جتنے جس کے وسائل وسیع ہیں اُس کو اتنی ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف بھی دیکھا گیا ہے اگرچہ شاذ۔ اگلے زمانہ میں تو بالعموم ہندوستان کے اہلِ کمال شہرت و ناموری کے ذرائع اختیار کرنا اخلاقاً برا سمجھتے تھے حتیٰ کہ بعض تصنیفوں پر مصنفوں کے نام تک نہیں ملتے۔ اب بھی ملک ایسی ہستیوں سے خالی نہیں ہے بہت سے باعظمت صاحب کمال حضرات گمنامی سے اُنسیت رکھتے ہیں اور شہرت کو تشہیر کے مرادف سمجھتے ہیں۔ یہی خیال اُس بلند پایہ ہستی کے اظہارِ نام میں مانع ہے جس کے کمالات کا راز فاش کرنے کا مجرم ہو رہا ہوں اور اس جرم خطا پر شاد ہوں۔ میں اس ذاتِ گرامی کو "آپ" کے پردے میں مستور کئے دیتا ہوں تاکہ اس تشہیر کا گناہگار ہو کر آپ کے لئے ملال کا باعث نہ ہو سکوں۔

ایسے انسان کم پیدا ہوتے ہیں جو جامۂ انسانیت کے لئے زیور ہوں اور اُن ہستیوں کو جن میں جوہرِ انسانیت کے ساتھ ادبی کمالات بھی مجتمع ہوں خالق عالم کی بہترین مخلوق سمجھنا چاہئے مجھے یہاں آپ کی سیرت پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں لیکن کسی کے کمالات کی صحیح حقیقت جاننے کے لئے اُس کے عادات و خصائل سے بھی کم و بیش واقفیت لازمی ہے اس لئے مختصراً صرف دو ایک جملے آپ کے ذاتی اوصاف کے متعلق عرض کئے جاتے ہیں۔ ایک مکمل انسان میں جسقدر بھی خوبیاں ہو سکتی ہیں وہ سب آپ کی ذات والا صفات میں مجتمع ہیں۔ بلکہ حقیقت یوں ہے کہ آپ اُن اوصاف کے مالک تھا جو یوگیوں کا ورثہ ہے۔ میں آپ کے جس ادبی کمال کا ذکر کرنے والا ہوں اُس کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے

آپ کا ایک وصف ذرا صراحت طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص مہینوں آپ کی صحبت میں بیٹھے لیکن وہ کبھی کوئی لفظ آپ کی زبان سے ایسا نہ سنے گا جو یہ غمازی کر جائے کہ گفتگو کرنے والے کو اپنی قابلیت کا علم تو کجا احساس بھی ہے اگرچہ گفتگو کا لفظ لفظ ادبی سانچے میں ڈھلا ہوا اور معنویت میں ڈوبا ہوا ہو گا لیکن عجز و انکسار سے بھرا ہوا۔ ناممکن تھا کہ مکاتیبِ شمیمؔ اس خصوصیت سے خالی ہوتا۔ چنانچہ جگہ جگہ آپ نے اپنی قابلیت کو "بے بضاعتی" اور "بے بصیرتی" سے تعبیر کیا ہے اور جہاں کہیں کسی ادبی موضوع پر بحث کی ہے اس شک و شبہ کے انداز سے گویا آپ کچھ جانتے ہی نہیں۔ واقعی اہلِ کمال کا یہی شیوہ ہے۔

بزمِ دنیا کی رونق بادشاہوں کی شان و شوکت سے ہے لیکن انسانی رفعت و عظمت ایسی ہی ملکوتی صفات ہستیوں سے قائم ہے۔ اور قوموں کا وقار ایسے ہی ستودہ صفات انسانوں سے برقرار ہے جاہ و منصب پر ناز کرنے والو سیم و زر کی چمک دمک پر مٹنے والو پروردگارِ عالم تم کو توفیق دے کہ تم انسانی فضائل کی قدر و منزلت کرنا جانو تو تم کو معلوم ہو گا کہ جینا کس کو کہتے ہیں اور زندگی کی عظمت کا راز کن باتوں میں پنہاں ہے۔ ایک پاک باطن اور نیک نفس انسان کی صحبت میں جو قلبی تسکین اور باطنی مسرت حاصل ہوتی ہے وہ دنیا کی کسی نعمت میں نہیں ہے۔ پرستش کے قابل ہیں وہ ہستیاں جو اس ظاہر پرستیوں کے زمانہ میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ باطنی جوہروں کے چمکانے میں صرف کرتی ہیں۔

قدرت کے عطیات میں بہترین عطیہ دولتِ علم ہے۔ یہ دولت آپ کو بڑی فیاضی کے ساتھ عطا ہوئی اور طرفہ یہ ہے کہ اس دولت کو دوسروں کیلئے سرمایہ سرور قلب و تسکین روح بنا دینے کی قدرت بھی آپ کو حاصل ہے۔ طالب علمی کے زمانہ ہی میں آپ کی ذہانت و ذکاوت کا یہ عالم تھا کہ آپ دیگر طلبا کیطرح کوئی نصاب کی کتاب روزانہ مطالعہ کے لئے لیکر کبھی نہیں بیٹھتے تھے۔ جب جی چاہا کوئی ایک کتاب اٹھالی۔ گھنٹے دو گھنٹے اسے دیکھ لیا سارا مضمون تمام باریکیوں اور تفصیلات کے ساتھ دماغ میں محفوظ ہو کر رہ گیا۔ کتاب کیسی ہی مشکل کیوں نہ ہو اور مضمون کیسا ہی نازک مگر ذرا سی توجہ سے اسکا سارا جوہر کھینچ لیتے تھے۔ ہر جماعت میں اول یا دوسرے نمبر پر کامیابی حاصل کی۔ بی۔ اے کے امتحان میں آپنے کالج میں اوّل اور الہ آباد یونیورسٹی میں ساتواں نمبر حاصل کیا۔ کالج سے طلائی تمغہ عطا ہوا اور یونیورسٹی سے وظیفہ مقرر ہوا انگریزی۔ فارسی اور فلسفہ میں بی۔ اے پاس کیا۔ بی۔ اے میں کالج کا پرنسپل ایک انگریز ہم لوگوں کو انگریزی پڑھاتا تھا وہ اس زبان کا جید عالم تھا، وہ نہایت سخت گیر نقاد۔ اُس کا دستور تھا کہ ہفتے میں ایک دن کوئی موضوع بتا کر اس پر مضمون لکھنے کی فرمائش کرتا تھا۔ پینتالیس پچاس منٹ کے وقت میں ہر طالب علم اپنی قابلیت کے مطابق زورِ قلم دکھاتا تھا۔ گھنٹہ بجتے ہی پرنسپل سب کاپیاں لے لیتا تھا

اور دو تین روز بعد اُن کو دیکھکر واپس کرتا تھا۔ بیس پچیس طلبا میں ایسے خوش قسمت دو چار ہی نکلتے تھے جن کے مضامین کی داد دی جاتی تھی باقی سب نشانۂ ملامت بنتے۔ آپ کے قلم سے کوئی مضمون ایسا نہیں نکلا جس پر باریک بین نقاد نے Very very fine! Excellent کی مُہرِ آفریں ثبت نہ کی ہو۔ فارسی میں بھی آپکی استعداد کا یہی حال تھا۔ ادبیات سے آپ کو ہمیشہ ذوق رہا۔ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد حافظؔ و غالبؔ سے آپ کو عقیدت ہو گئی۔ وکالت کی مصروفیتوں سے دل و دماغ میں جو خشکی اور افسردگی پیدا ہو جاتی ہے اُس کی چارہ فرمائی انہیں دو مسیحائے سخن کے نسخوں سے کیجاتی ہے دیکھئے کس پر لطف اور حسرت انگیز لہجے میں پیشۂ وکالت کی جفاکاریوں اور اپنے ادبی ذوق کی باہمی کشاکش کا شکوہ کرتے ہیں اور کس عاشقانہ انداز سے دل کو تسکین دیتے ہیں۔

" اس میں شک نہیں کہ بڑے دن کی تعطیل میں حاضری کا قصد کیا تھا لیکن ایسے چند در چند موانع پیش آ گئے کہ یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ اس پیشۂ وکالت میں لطف صحبت تو کجا ادب لطیف کے مطالعہ کا بھی وقت نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قانون کی دفعات اور نظائر کی موشگافیوں میں ہی تمام دنیا محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ قضا و قدر کی اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے کہ حافظؔ و غالبؔ کے پرستار کو ضابطۂ دیوانی اور قانون میعاد سماعت سے پالا پڑا ہے۔ خیر ؎

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش کہ آنچہ ساقیِ ما ریخت عین الطافیست

یہ علم و فضل اور یہ حسن تحریر کہ روح وجد کرتی ہے مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آپکے علمی جواہر سے دنیائے ادب محروم ہے اور وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کسی ادبی کام کی طرف توجہ کرنا خود نمائی و خود فروشی خیال فرماتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کی قومی بدبختی ہے۔ ان جواہرات کے چند نمونے یعنی آپؒ کے کچھ خطوط جو میرے نام ہیں میں نے محفوظ کر رکھے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اُردو کے خزانہ کی ان سے زیب و زینت بڑھائی جائے لیکن چند در چند امور مانع ہیں۔ بہر حال اس مجموعہ کی بعض نمایاں خصوصیات کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اور کچھ نمونے اپنے بیان کی تصدیق میں پیش کرتا ہوں

یہ امر مسلّمہ ہے کہ اردو ادب کی تدوین و تکمیل فارسی ادب کے نمونہ پر ہوئی۔ کسی زمانہ میں ظہوری سخنوروں کی پیروی اُردو شعرا کی مطمح نظر تھی جس کے باعث بہت سے غیر فطری اجزا اردو شاعری میں داخل ہو گئے۔ تخیل اور زبان دونوں میں تصنع غالب آ گیا جس سے ابھی تک اُردو کا دامن اچھی طرح پاک نہیں ہو سکا ہے۔ اسی طرح نثر میں فارسی ادب کی رنگینی اور صناعی کی نقل کی گئی۔ [illegible]

ظہوری وغیرہم کی مثالیں سامنے تھیں۔ بعید استعارے مقفّیٰ ترکیبیں مسجع بندشیں انشاپردازی کی خوبیوں میں داخل ہوئیں۔ "فسانۂ عجائب" اس اندازِ تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔ نظم و نثر کی ہر صنف میں کم و بیش یہ تصنعات نمایاں تھے۔ خطوط نویسی ایک مستقل فن سمجھی جاتی تھی جس کی تحصیل و تکمیل کے لئے مستند اور مشہور انشاپردازوں کے رقعات پڑھائے جاتے تھے۔ القاب آداب کے اسلوب سکھائے جاتے تھے اور زمانہ کے مذاق کے مطابق عبارت آرائی کی تعلیم ہوتی تھی۔ مگر کوئی مصنوعی بات دیرپا نہیں ہوتی۔ آخر زمانہ بدلا۔ قدرت نے اصلیت کی طرف رہنمائی کی جس طرح نظم میں ہوسکا کورانہ لفاظی اور تصنع کا طلسم ٹوٹا اور شعر مشاہدۂ فطرت اور حقیقت نگاری پر مائل ہوئے اسی طرح انشاپرداز بھی صداقت کے دلدادہ اور سادگی کے عاشق ہوگئے۔ آزاد، حالی اور سرور جہان آبادی جدید رنگ کے پیشوا تھے۔ مرزا غالب نے غزل کے مردہ قالب میں نئی روح پھونکی۔ یہ روح ان کے متصوفانہ خیالات اور ان مصائب و آلام کا شور تھی جن سے ان کو کبھی نجات نہیں ملی اور جن کے باعث ان کو کُڑھنا پڑا۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ناممکنات سے تھا کہ مرزا جیسا حقیقت بین اور ستم زدہ اپنے خیالات و کیفیات کے اظہار کے لئے نجی خطوط میں لفظی تصنعات کا سہارا لیتا۔ یہی حقیقت حال تھی جس نے اردو نثر کے خزانے میں ایک نئی دولت کا اضافہ کیا اور "عود ہندی" اور "اردوئے معلی" جیسے قیمتی مجموعے ظہور پذیر ہوئے۔ ان مجموعوں سے دنیائے ادب کو معلوم ہوا کہ نجی خطوط کا انداز تحریر سادگی اور سچائی سے قریب ہونا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ مرزا کی طباعی نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ اور لطیف ظرافت کی چاشنی نے اس میں عجب دلکشی پیدا کردی۔

خطوط نویسی اب کوئی مستقل فن نہیں سمجھی جاتی اور نہ واحد طور پر یہ ادبیات کی کوئی شاخ ہے لیکن مشاہیر کے خطوط بڑے کام کی چیز ہوتے ہیں۔ ادبی محاسن سے قطع نظر سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کاتب کی سیرت کی شرح کردیتے ہیں۔ خصوصاً وہ خطوط جو مخلص احباب یا اعزہ کو لکھے جاتے ہیں۔ لکھنے والا ان میں نہایت بے تکلفی کے ساتھ زندگی کی مختلف حالتوں پر بلاخوف تنقید لکھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے تمام اوضاع و اطوار، خیالات و جذبات صاف صاف ظاہر ہوجاتے ہیں جن سے اس کی تصانیف کی حقیقت جاننے میں آسانی ہوتی ہے اور اس کا مرتبہ قائم کرنے میں امداد ملتی ہے اور یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ بڑے بڑے کارناموں کا اصلی جزو چھوٹی

بھی خصوصیات ہوتی ہیں۔

علم ادب کا پہلا مقصد یہ ہے کہ انسانی سیرت کی جلا ہو۔ اس کے بعد یہ کہ دل و دماغ کو نشاط کا سامان بہم پہونچے۔ اصلاح سیرت انہیں صحیفوں سے ہوتی ہے جو عالم باعمل کے قلم سے نکلتی ہیں۔ عالم باعمل سے مراد متشرع مولوی یا پوجا دھاری پنڈت نہیں بلکہ وہ بشر مراد ہے جو برائیوں سے بچتے رہنے کی کوشش اور تہذیب نفس میں ہمہ تن مصروف رہے۔ سامان نشاط مہیا کرنے کیلئے ادیب باعمل کی شرط لازمی نہیں۔ نہ ادیب کے لئے یہ ضرور ہے کہ وہ حکمت و موعظت کو اپنا دائرہ فکر بنائے یا ہر وقت تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کے درس دیکر یاد آخرت کی ہدایت کرتا رہے لیکن جب ادیب کے پیکر میں کوئی عارف جنم لیتا ہے تو اس کے قلم سے جو کچھ نکلتا ہے نشاط انگیزی کا سرچشمہ اور بصیرت افروزی کا دفتر ہوتا ہے۔ اس کے حرف حرف کے ساتھ وہ تاثیر لپٹی ہوئی نکلتی ہے جو پڑھنے والے کے دل و دماغ میں اتر کر جزو روح بنجاتی ہے اور حیات باطنی کے نشو و نما و آسودگی کے لئے مستقل سامان کا کام دیتی ہے۔ تاثیر زبان درد دل کا فیض ہے

درد دل میں اگر نہیں ہوتا بات میں کچھ اثر نہیں ہوتا

درد دل فیض ہے آلام و مصائب یا غم عشق کا۔ میر و غالب کے نشتروں کا یہی راز ہے۔ نقادان ادب نے درد کو ہمیشہ شعر و انشا کا اعلیٰ جوہر تسلیم کیا ہے۔ بلکہ بعض اہل نظر کی رائے میں یہی ایک خوبی ہے جو شاعری کیلئے لازمی ہے۔ نجی خطوط میں اس وصف کی توقع نہیں کیجا سکتی لیکن اگر کسی کے خطوط میں ادبی محاسن کے ساتھ ساتھ درد بھی ہے تو یہ مجموعہ ادب کے بہترین مجموعوں میں شامل ہوگا۔

کمال ایک تو خداداد ہوتا ہے ایک اکتسابی۔ خداداد جوہر آناً فاناً فروغ پاکر اپنی تابانیاں دکھانے لگتا ہے اور دنیا کو حیرت میں ڈال دیتا ہے جس کی مثال رتن ناتھ کا فسانۂ آزاد ہے ایسے ہی شاہکاروں کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے "ایں سعادت بزور بازو نیست" "مکاتیب شمیم" کا ہر لفظ اور ہر فقرہ کہتا ہے کہ مجھے بنور دیکھو اور خدا کی دین پر حیرت و استعجاب کرو۔ نجی خطوط کسی ادبی مقصد کو پیش نظر رکھکر نہیں لکھے جاتے اور اسی لئے زیادہ غور و فکر سے بھی ان میں کام نہیں لیا جاتا۔ "مکاتیب شمیم" بھی اسی بے پروائی کے ساتھ قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں اسکی شہادت خود کاتب نے ایک موقع پر فراہم کر دی ہے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "میں سمجھتا ہوں کہ آپ میرے خط کا نہایت بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے مگر بایں ہمہ اس عرصہ میں کچھ ایسا

عدیم الفرصت رہا کہ آج سے پہلے خط لکھنے سے بالکل مجبوری و معذوری رہی اور آج بھی یوں لکھ رہا ہوں کہ امین صاحب اس وقت دعا شہود جا رہے ہیں۔ پہلے تو یہ سوچا تھا کہ امین صاحب کے ذریعہ سے آپ کی خدمت میں زبانی معذرت ہی عرض کر دوں مگر پھر آپ کی برہمی کے خوف سے ادھر ادھر سے وقت نکال کر خط لکھنے بیٹھ ہی گیا۔ گاڑی کا وقت بالکل قریب ہے اور امین صاحب دس پانچ منٹ میں جانے والے ہیں" اب اس دس پانچ منٹ کی فرصت میں اگر اسکو فرصت کہا جائے میری ایک طول طویل نظم "سہاگن ابھاگن" کے متعلق جو اس وقت کاتب کے سامنے بھی نہیں ہے جس فاضلانہ انداز سے تنقید کی ہے اور جس ادا کے ساتھ آپکے حسن و قبح پر بحث کی ہے اس کو قدرت تحریر کا کمال کہنا چاہئے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اس قلم کا کرشمہ ہے جس کو اب تک تو کسی ادبی مشغلہ میں جنبش نہیں ہوئی تو ہماری حیرت کی حد نہیں رہتی اور اس مجموعہ کو انشا پردازی کا اعجاز کہہ دینا پڑتا ہے۔

سطور بالا میں کہیں کہا گیا ہے کہ مرزا غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ یہ روش بہت پسند ہوئی یہاں تک کہ جادۂ تقلید بن گئی۔ لیکن مکالمہ کی بے تکلفی بعض اوقات اسقدر عامیانہ ہو جاتی ہے کہ اس میں ادبی شان باقی نہیں رہتی "مکاتیب نسیم" میں یہ بات نہیں۔ جہاں کہیں مکالمہ کا انداز پیدا ہوا ہے ادبی وقار ضرور قائم رہا ہے اور انداز تخاطب اتنا دلکش پاکیزہ اور بدیع ہے کہ بے اختیار منہ سے آفریں نکلتی ہے۔ حسن ظرافت کا یہ عالم ہے کہ بس دل میں گدگدی سی پیدا ہوئی اور لبوں پر ہلکا تبسم آ گیا لیکن ہنسی کبھی نہیں آتی۔ یہ رنگ ان مقامات پر بہت نمایاں ہے جہاں کاتب نے خود ہی مکتوب الیہ بنکر اور غائب کو حاضر مان کر سوال و جواب کئے ہیں۔ ذیل میں جو اقتباس پیش کیا جاتا ہے میں نے بار بار پڑھا ہے اور کیسا ہی فکرمند کیوں نہ رہا ہوں ہر بار لبوں پر مسکراہٹ آ ہی گئی ہے۔

" آداب عرض کرتا ہوں اللہ رے شان بے نیازی ہم سلام پر سلام عرض کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ مانا کہ گنہگار ہیں، قصوروار ہیں مگر یہ تو کہئے کہ عادتیں کس کی بگاڑی ہوئی ہیں۔ آپ کی جانب سے نہ کسی شکوہ و شکایت کی ضرورت ہے نہ سرزنش کی حاجت میں خود کہتا ہوں کہ واقعی بڑی سخت غلطی ہوئی۔ اور اس غلطی پر اس درجہ نادم ہوں کہ عرض نہیں کر سکتا۔ آپ اگر روٹھے ہیں تو آپ کو منانا کیا بڑی بات ہے چشم تصور سے آپ کے تبسم زیر لب کو دیکھ رہا ہوں اور سمجھتا ہوں اب

[illegible]

کیا ہے' بازی مارلی۔ کیوں صاحب اب وہ لازم بالجزم کہاں گیا کہ اس بیہودہ سو آپ بات نہ کریں گے اور ہرگز خط نہ لکھیں گے۔ اب تو بولئے گا اور خط لکھئے گا! کہئے ہاں۔

ہم باسمہ اور تو جیتا؟!

جہاں اس لطیف ظرافت کی لہر زندگی کی ستم ظریفیوں پر ماتم کرنے میں کارفرما ہوئی ہے وہاں تو قیامت ہی کردی ہے۔ ہر فقرے کے ساتھ ساتھ دل کی کیفیتیں متغیر ہوتی جاتی ہیں ایک برقی اثر ہے کہ دوڑا چلا جاتا ہے۔ ہلکا ہلکا تبسم لبوں پر پیدا ہوتا ہے مسکراتے مسکراتے دفعتہً برچھی سی دل میں جا لگتی ہے۔ خاتمہ پر پہونچتے پہونچتے رگ پے میں زہرِ غم اتر جاتا ہے چشم بصیرت وا ہو جاتی ہے اور روح وجدانی کیفیتوں میں ڈوب جاتی ہے۔ پڑھنے والا دم بخود سکتہ میں رہ جاتا ہے اور ناطقہ پکار اٹھتا ہے۔

اگر یک سرِ موے برتر پرم ۔۔۔ فروغِ تجلی بسوزد پرم

"آپ غالباً شاید جنوری کے وسط میں گئے ہیں۔ جنوری اور فروری میں ترک موالات نے بریلی میں خوب زور پکڑا۔ آج کالج میں اسٹرائک ہے کل فلاں اسکول بند ہو گیا۔ پرسوں فلاں اسکول میں اسٹرائک کی خبر ہے۔ غرض ایک عجیب عالم تھا۔ اس پر باہر کے مقررین سوامی ستیہ دیو' منشی بابو رام صاحب ساکن ایٹہ وغیرہ وغیرہ کی تقریریں سمند ناز پر تازیانہ کا کام کرتی تھیں۔ نیشنل اسکول تو شاید آپ کے سامنے ہی کھل گیا تھا۔ اسکے طلبا غول در غول دیگر اسکولوں پر "بندے ماترم" اور "مہاتما گاندھی جی کی جے" کے نعروں سے رجز خوانی کرتے ہوئے حملوں میں مصروف رہتے تھے۔ اور کچہری آتے جاتے پنڈت ہیت رام کے بنگلہ سے کتب خانہ تک تمام فضا انہیں آوازوں سے معمور معلوم ہوتی تھی۔ نیشنل اسکول جنوری کے پہلے ہفتہ میں قائم ہوا تھا۔ اور تنخواہ دار مدرسوں کے بہم پہونچنے تک چند دیگر وکلا کی معیت میں میں نے بھی اس کے متعلق کچھ خدمت اپنے ذمہ لی تھی۔ وکالت سے پہلے ہی سے بیزار تھا۔ ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ دوستوں کا ایک پرشاد سے ایک روز ترک وکالت پر آمادگی ظاہر کردی۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ہی جا کر ایک جلسہ میں اعلان کر دیا۔ اس تعجیل کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ کہیں صید گرفتہ نکل نہ جائے۔ ایک دوسرے جلسہ میں ایک اور صاحب نے یہ مشتہر کر دیا کہ میں نے وسط۔ ماہ حال پر نیشنل اسکول کے لئے زندگی وقف کردی ہے

حالانکہ یہ سراسر غلط تھا۔ میں نے کبھی کسی سے ایسا وعدہ نہیں کیا تھا۔ ترک وکالت سے سب گھر والوں کو بیحد متوحش اور پریشان کر دیا۔۔۔۔۔ امین صاحب کے زجر و توبیخ سے نجات ہوئی تو کوئی اور صاحب آموجود ہوئے کہ یہ کیا حماقت کرتے ہو۔ وہ رخصت ہوئے تو کوئی اور تیسرے صاحب آدھمکے۔ غرض عجب ضیق میں جان تھی۔ گھر میں قدم رکھتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا موت ہوگئی ہے۔ باہر نکلتا ہوں تو ان مواعظ اور نصائح سے پیچھا چھڑانا مشکل۔ گو سب از راہ محبت، ہمدردی و خیر طلبی کہتے تھے مگر حضرت ناصح اور جناب واعظ کی بات کسی کو بھی اچھی معلوم ہوئی ہے، جو مجھے گوارا ہوتی۔ خانصاحب بہادر نے بھی الٹی میٹم Ultimatum. دیدیا کہ تم ترک وکالت کرو اور میں تم سے ترک موالات کرتا ہوں۔ آٹھ دس روز ایسی مصیبت میں مبتلا رہا ہوں کہ یا میں جانتا ہوں یا میرا پروردگار۔ ایک مدت العمر کی تکلیف دماغی اور پریشانی بھی اس ہفتہ بھر کی کشمکش اور مصیبت کے سامنے ہیچ ہے۔ انجام کار کچھ احباب اور اعزہ کے اصرار کا اثر، کچھ اپنی مالی حالت کیجانب سے بے اطمینانی، کچھ اخلاقی کمزوری، ان سب کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ ارادہ پھر بدلگیا جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ یہ حرکت نہایت مذموم تھی اور اب مجھے منہ دکھانے کو جگہ نہ رہی۔ مگر ارادوں میں عزم و استقلال اور خیالوں میں پختگی و ثبات کہاں سے لاؤں اور کیونکر اپنی اور متعلقین کی ضروریات زندگی سے بالکل بے نیاز ہو جاؤں۔ غرضکہ بجز تائیں تائیں فش کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ میں نے بھی دل کو بلبل شیراز کی نصیحت سے یوں سمجھایا کہ ؎

در کوئے نیک نامی ما را گذر ندادند   گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

آخر مشیت ایزدی بھی تو کوئی چیز ہے۔"

اہل نظر اس نثر کو وہ شاعری کہینگے جس کے لفظ لفظ میں سوز و گداز بھرا ہے۔ نظم ہو یا نثر بعض اہل کمال کے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ مطالب کی خوبی، طرز ادا کی شگفتگی سے ملکر وہ شگرف کارنمایاں دکھاتی ہے جو دلکشی کی جان ہیں۔ عبارت کی روانی کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کے خیال میں منوم عجیب عجیب جلووں کی جھلک دکھاتا چلا جاتا ہے۔ دل و دماغ ہیں کہ ایک جادو کے اثر سے کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور اشاروں پر رقص کر رہے ہیں اور رقص کی کیفیتوں میں محو

...ا ہو رہے ہیں یعنی اک درد ہے کہ رگ و پے میں سرایت کرتا چلا جا رہا ہے۔

مدد کل آپ کا کارڈ آیا۔ کاش میری خاموشی کی یہی وجہ ہوتی جو آپ نے سمجھی ہے یعنی اگر میری ہی علالت کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی ہوتی تو غنیمت تھا۔ مگر آفت تو یہ ہے کہ لڑکی کی بیماری کا سلسلہ نا متناہی معلوم ہوتا ہے اور گمان غالب یہ ہے کہ "مرض میت ہی ہمارا اس صحت ہو تو ہو" اسی طرح پڑے پڑے تقریباً دس مہینے ہو گئے یہ بھی خوب معلوم ہے کہ دوا دارو سب بیکار ہے اور اس موذی مرض سے جانبری مشکل نہیں بلکہ محال ہے، مگر کچھ تو مزید امید اور کچھ دنیا کا دستور دیرینہ اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ علاج معالجے سے دستکش ہو کر راضی برضا بیٹھ رہیں کوہکن تیشہ بغیر نہ مر سکا تھا' اور دنیا والے مرنے والے کو بغیر دوا کی زحمت کے چین سے مرنے بھی نہیں دیتے! لڑکی اپنے اعمال کا پھل بھوگ رہی ہے اور ہم لوگوں کی تعزیر کے لئے بھی ایک تازیانہ ہے منجانب اللہ۔ کارکنان قضا و قدر کی ستم ظریفی دیکھئے کہ تیمارداری کا کام جو بہ الفاظ دیگر آغوش مرگ میں بھیجنے کی تیاری کا نام ہے، ہم سے ہی لیا جا رہا ہے!

ایک سب سے ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ جس امر کے متعلق بھی ذکر شروع کیا گیا ہے اسکا اختتام اس خوبی اور کمال کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس سے بہتر طریق پر ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اور اکثر جگہ ہر نوعیت سے ایک مکمل جزو ادب بن جاتا ہے۔ یہ خوبی صرف پسندیدہ مطالب ہی سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ بعض اوقات تو نہایت روکھی پھیکی معمولی باتوں کو بھی اس پر لطف طریقہ سے کہہ دیا جاتا ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"آم کی قلموں کے متعلق دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ رام لیلا کے باغ اور سید پور باکنس کی طرف دو چار مالی قلمیں فروخت کیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ غیر معروف سے آدمی ہیں کوئی بڑا کارخانہ نہیں ہے۔ مفصل تحریر فرمائیے کہ کس قسم کی قلمیں اور کتنی تعداد میں مطلوب ہیں تاکہ قیمت وغیرہ کے متعلق جملہ امور دریافت کر کے اطلاع دی جائے۔ مگر آپ یا آپ کے کرمفرما پنڈت صاحب بدگمان نہ ہوں۔ آئندہ فصل تک جواب ضرور ملجائیگا"

تیرہ برس ہو گئے نہ آپ بریلی تشریف لاتے ہیں نہ میری ہی رسائی وہاں تک ہوتی ہے آئندہ دسمبر میں بڑے دن کے موقع پر بریلی میں آل انڈیا کایستھ کانفرنس کا اجلاس ہونے والا ہے، آئیے اور مسدس حالی کی سی کوئی نظم ہمراہ لائیے جو

قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے۔ اس تحریر میں جو مفہوم اس ایک مصرع نے "جو قلب کو ا..." ادا کیا ہے طول طویل تحریروں سے ادا نہیں ہو سکتا۔

"کھانسی کو ۱۰/۱۱ مہینے ہو گئے مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ مختلف قسم کے علاج کئے گئے لیکن سب بے سود۔ معلوم ہوا ہے کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ یعنی وقت سے پہلے: کھانسی کا جانا ممکن ہے نہ مرض حیات کا ازالہ۔ دیکھئے کس صورت سے نجات ہوتی ہے۔ صبر اور شکر سے انتظار کیا جا رہا ہے اور یہی کیا کم ہے کہ اس انتظار کا ختم ہو جانا بالکل یقینی ہے۔"

اس عبارت میں کس قدر شعریت اور سوز و گداز ہے۔ آخری فقرے تو بے پناہ ہیں۔

بعض موقعوں پر کسی ضرب المثل یا کسی مشہور شعر کا ایک ٹکڑا اس خوبی اور بے تکلفی سے صرف کیا گیا ہے کہ عالم تخیل میں عجب لطف اور رنگینی پیدا ہو جاتی ہے اور جس پر تفصیل و صراحت کی ہزار خوبیاں نثار۔ ضرب المثل تو ضرب المثل ہی ہے بعض اشعار بھی ضرب المثل ہو گئے ہیں جیسے حافظ و نسیم کے شعر جو تحریر و تقریر میں کثرت سے آتے رہتے ہیں۔ لیکن مبصرین ادب جانتے ہیں کہ جس کثرت استعمال نے ان کو ضرب المثل بنا دیا ہے اسی نے ان کو ایک عامیانہ رنگ بھی دیدیا ہے۔ اس راز کو جاننے والے ان کو اس مہارت سے استعمال کرتے ہیں کہ بلاغت منہ چوم لیتی ہے اور اختصار و ایجاز کی روح پھڑک اٹھتی ہے۔

"اردو کے اشعار اور ہندی دوہوں کی آپ مجھ سے فرمائش کرتے ہیں! کجا دنیائے شاعری کی رنگینی و لطافت اور کجا دکانت کا تُس رکشانت۔ "بین تفاوت رہ"[1] پر غور کیجئے اول تو اچھے اشعار کا انتخاب سلامت ذوق پر منحصر ہے جس سے مجھ بے بصیرت کو کیا واسطہ دوسرے جتنا جو کچھ یاد تھا "طاقِ نسیاں کی نذر ہو گیا"[2]

یہ تو ہے کنایہ کی گفتگو کی سحر کاری۔ اب تفصیل و صراحت کی معجز نمائی دیکھئے۔ جہاں قلم تشریح و تفصیل پر رجوع ہو گیا ہے لفظ لفظ اور فقرے فقرے میں مطالب کی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں نہایت دلفریب، پختہ اور مربوط عبارت رفتہ رفتہ کچھ ایسے نتیجہ کی طرف غائبانہ طور پر ذہن کو دوڑائے لئے جاتی ہے جس پر پہونچکر معرفت یا حقیقت کا کوئی پہلو اس حسن کے ساتھ دل پر نقش ہو جاتا ہے گویا جزو دل ہو گیا۔ ایسے حصوں کو در اصل مختصر افسانہ نویسی کا نمونہ سمجھنا چاہئے۔ افسوس یہ ہے کہ

---

[1] حافظ کا شعر ہے "صلاح کار کجا و من خراب کجا — بین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"

[2] غالب کا شعر ہے "یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں"

ایسے خطوط ودایک ہی ہیں اور سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ اُن میں کچھ ایسی رازدارانہ باتیں ہیں جو شائع نہیں کی جاسکتیں۔

میں نے اس بیش بہا مجموعے کے بعض نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اجمال و اختصار کے ساتھ۔ ان خوبیوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے جو ادب کا مسلمہ جزو ہیں۔ مگر کہیں اُن کا ذکر آگیا ہے ضمناً یا کنایۃً۔ اسی کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ ان جواہر ریزوں کے محاسن "مشتے نمونہ از خروارے" بھی پیش نہیں کرسکا ہوں۔ میں نے ایک روح پرور اور بصیرت افروز گنجینۂ ادب کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے اس تقریب سے کہ ایک ایسی مایۂ ناز ہستی کا جو کبھی صفت دُشنا کو بھی رسوائی اور شہرت کو تشہیر سمجھتی ہے۔ ادبی دنیا سے تعارف ہوجائے۔ خدا کرے کسی طرح یہ ذات گرامی مجھے یہ گنجینۂ بیش بہا شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائے اُس وقت حقیقت میں اہل نظر کو معلوم ہوگا کہ آسمان ادب پر کیسا درخشاں و تاباں آفتاب طلوع ہوا ہے۔ میں تو جب اسکی رنگینیوں اور تابانیوں پر غور کرتا ہوں تو یہ اپنے خلاق کی تصویر معنوی کے ساتھ ساتھ دل و دماغ میں چھا جاتی ہے، روح عجیب سرور و انبساط کی کیفیتوں میں ڈوب جاتی ہے اور چمن آرائے دو عالم کی کرشمہ سازیوں پر حیران رہ جاتا ہوں ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار | گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

غزل

از جناب کانی جہاں سکینہ اثر دہلوی

اور بھی میری پریشانی کا ساماں ہوگئیں
مشکلیں مجھ پر پڑیں ہی کیوں کہ آساں ہوگئیں

ایک مرکز پر میں لے آیا جہانِ عشق کو
حسرتیں دنیا کی میرے دل کا ارماں ہوگئیں

تنگیاں زنداں کی مجھ صحرا نوردِ عشق کو
وسعتِ دل سے بیاباں در بیاباں ہوگئیں

جوششِ غم میں نہیں یہ دیدۂ دل خونفشاں
دل کی تاریکی میں دو شمعیں فروزاں ہوگئیں

اعترافِ بیوفائی ہے خلافِ شانِ حسن
ہم سمجھتے ہیں وہ نظریں کیوں پشیماں ہوگئیں

جو نگاہیں باعثِ چاکِ گریباں تھیں کبھی
اب وہی خود بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

آرزو ان کو تھی کس گل کی ریاضِ دہر میں
کس کے غم میں آج کلیاں چاک داماں ہوگئیں

جن نگاہوں میں تڑپتی تھی کبھی برقِ تنا
دل میں آنکھوں سے اُترتے ہی رگِ جاں ہوگئیں

بڑھ گیا اس درجہ شوقِ چاک دامانی اثرؔ
دھجیاں بھی اب بجائے خود گریباں ہوگئیں

طلوعِ زندگی

از جناب روش صدیقی

طلوعِ زندگی ہے اپنی ہستی کو مٹا دینا
بقا کیا ہے؟ چراغِ خود پرستی کا بجھا دینا

جہاں انسانیت کی روح افسردہ نظر آئے
جہاں رنگِ بہارِ زیست پژمردہ نظر آئے
تم اس دنیا میں اپنی ہر مسرت کو لُٹا دینا

جو دشمن بھی تمہارے گہری کی نیند سوتے ہوں
اور اپنی کشتیٔ دل بحرِ غفلت میں ڈبوتے ہوں
انھیں سوز و فا کے پاک نغموں سے جگا دینا

مصائب میں ہر اک تدبیر جب ناکام ہو جائے
اُمیدوں کی سحر جب پائمالِ شام ہو جائے
یقیں کی روشنی میں اک قدم آگے بڑھا دینا

تم اپنی مشکلوں میں پیکرِ صبر و رضا رہنا!
مگر حق کی حمایت کے لئے گرم وغا رہنا!
غرض حُسنِ عمل سے خلق کو درسِ وفا دینا

غریبوں کے لہو سے لالہ افشاں جام ہو جبکا
رگِ مزدور سے خوں چوس لینا کام ہو جبکا
مٹا دینا تم ایسے ہر ستمگر کو مٹا دینا

جہاں خود غرضیوں کی شمع کو ظلمت فشاں دیکھو
جہاں مظلوم کی آہوں کو بادِ رائگاں دیکھو
گرا دینا، اُس ایوانِ تمدّن کو گرا دینا

نہ غم کرنا جو ہو جائیں زمین و آسماں دشمن
نہ گھبرانا، نظر آئیں، جو سب اہلِ جہاں دشمن
خدائے دو جہاں کا نام لیکر مسکرا دینا

جری آزاد ہی رہتے ہیں زنجیروں کے سایہ میں
ادا کرنا تم اپنا فرض۔ شمشیروں کے سایہ میں
دمِ آخر بھی پیمانِ محبت کو نبھا دینا

دلِ سرشار ہی بیدارِ عقل و ہوش ہوتا ہے
وہی طوفاں اٹھا سکتا ہے جو خاموش ہوتا ہے
حدودِ امتیازِ ہوش و مستی کو ملا دینا

مگر طغیانِ تمکیں میں ابھر جانا نہیں اچھا
کبھی انسان کا حد سے گذر جانا نہیں اچھا
تم اپنے نفس کو ہر ایک لغزش کی سزا دینا

ندامت دامنِ ہستی کے داغوں کو مٹاتی ہے
یہ ہے وہ آگ، جو مٹی کو بھی کندن بناتی ہے
گناہوں پر کبھی خلوت میں دو آنسو بہا دینا

طریقِ خدمتِ خلقِ خدا روحِ سعادت ہے
قبولِ حضرتِ معبود ہے یہ وہ عبادت ہے
غریبوں کی مدد کرنا مریضوں کو دوا دینا

مبارک عظمتِ ایثار سے عظمت نہیں کوئی
فزوں، اس دولتِ بیدار سے دولت نہیں کوئی
جو ہاتھ آئے جہادِ زندگانی میں لٹا دینا

برائی کے مٹانے میں تو کچھ غفلت نہیں کرتے
بُروں سے بھی مگر اہلِ صفا نفرت نہیں کرتے
بلا شک تم ہر اک کے دل سے نفرت کو بھلا دینا

حقیقت اور افسانہ

مترجمہ سید اختر رضوی الہ آباد یونیورسٹی

انگریزی کا مشہور ناول نگار ٹونی ایک ایسا ناول لکھ رہا تھا جس پر اُسے خود بھی ناز تھا۔ شروع سے آخر تک اُس کا ہر حصہ۔ ہر جملہ اور ہر لفظ اُس کے نزدیک ایسا تھا جو اُس کے نام کو بچے بچے کی زبان تک پہونچا دے گا۔ اس کا بیشتر حصہ لکھ چکنے کے بعد اُس کا قلم اُس جگہ رُک گیا جہاں جارج۔ ناول کا ہیرو۔ ایک ایسی مصیبت میں پڑ گیا تھا جہاں اُس کے سامنے دو مختلف چیزوں کی محبت کے نقش یک یک کر کے آتے جاتے تھے۔ کبھی وہ جولیا کی محبت کا خیال کرتا اور کبھی اُسے خود اپنی زندگی پیاری لگنے لگتی۔ جولیا کو اس سے حد سے زیادہ محبت تھی اُس نے جارج کو حاصل کرنے کے لئے دنیا کی بہت سی چیزوں کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جارج نے اُس کے ساتھ جو برتاؤ کیا اُس کا نتیجہ حسین جولیا کے لئے برا ثابت ہونے والا تھا۔ اُسے اس مضر اثر سے بچانے کی قیمت صرف جان تھی۔ اپنی پیاری جان۔ جارج نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے گا جولیا پھر اُسی آرام کی دنیا میں پہونچ جائے گی جہاں سے وہ اُسے زبردستی لے آیا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ٹونی نے اپنے آپ کو ناول کی فضاؤں میں گم کر دیا اور روانی کیساتھ اس کے چند بیش بہا ورق لکھ ڈالے۔ ہیرو مر گیا۔ حسین اور وجیہ جارج کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ موت کی مہر اُس کے چہرے پر تھی اور کنپٹی سے بہتا ہوا خون اُس کی گذری ہوئی زندگی کی یاد دلا رہا تھا۔ پاس ہی وہیں پستول بھی موت کی وجہ بتانے کے لئے پڑا تھا۔ ناول کا ایک اور باب ختم ہو گیا

دروازے کے باہر قدموں کی آواز آتی ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور ہیروئن داخل ہوتی ہے وہ اس خوفناک نظارہ کو دیکھتی ہے اور . . . .

ٹونی کے قلم کی روانی یہاں آ کر کم ہو گئی۔ وہ اس کے آگے کچھ نہ لکھ سکا۔ اس کے جوش میں ایک رکاوٹ سی پیدا ہو گئی لیکن جوش کی روانی نے ہر دوسرے خیال کو سامنے سے ہٹا دیا۔ اور اسی رو میں اس نے کئی صفحے اور لکھ ڈالے۔ لیکن ذرا سی دیر میں وہ سب ردی کی ٹوکری میں پہونچ گئے۔

اس وقت اُس کے لئے سب سے مشکل سوال یہ تھا کہ آخر ہیروئن اس موقع پر کیا کرے گی؟

کیا وہ چلا کر آگے بڑھے گی؟ کیا اُس کے منہ سے نکلے گا۔ "ہائے پیارے جارج یہ تم نے کیا کیا" ناممکن ہے وہ یہ کہے۔ "پیارے جارج! میرے جارج! مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ میرے پاس آؤ۔

رازِ آفرینش

(از جناب برقؔ دہلوی مرحوم)

ہوا کرتا ہے پیدا سب کے دل میں یہ سوال اکثر
نمودِ بے وجودِ عالمِ امکاں ہوئی کیونکر

یہ ہست و بود کا دورِ تسلسل کب سے جاری ہے؟
یہ گلزارِ جہاں کس کا رہینِ آبیاری ہے

یہ خود پیدا ہوا ہے یا کوئی خلاقِ فطرت ہے
کوئی چیتن سکتی ہے؟ کوئی زندہ حقیقت ہے؟

یہ عقدہ فلسفہ نے۔ مذہب و ملت نے کھولا ہے
اسے سائنس نے تحقیق کی میزان میں تولا ہے

کوئی کہتا ہے یہ ہے مادے کی کارفرمائی
یہی ہے عالمِ اسباب کی اک علتِ غائی

کشش۔ قوت۔ حرارت یہ سہ گونہ ہیں صفات اسمیں
یہ صورت گر ہے پوشیدہ ہے رازِ کائنات اسمیں

اسی کی ارتقا صد باعثِ تخلیقِ عالم ہے
یہی بنیادِ ہستی ہے مؤخر ہے۔ مقدم ہے

کسی کا قول ہے مجموعۂ ذرات ہے دنیا
تماشائے فروغِ حسنِ موجودات ہے دنیا

کوئی کہتا ہے ساری کارسازی ہے یہ نیچر کی
یہ فطرت کا کرشمہ۔ جاں نوازی ہے یہ نیچر کی

یہ ذی حس۔ غیر ذی حس جسقدر مخلوقِ ہستی ہے
یہ عالم آفریں نیچر کے زیرِ سرپرستی ہے

کوئی کہتا ہے ہستی نیستی سے رنگ لائی ہے
کرشمہ ایک لفظ 'کن' کا یہ ساری خدائی ہے

مقولہ ہے کسی کا اک پریشاں خواب ہے عالم
طلسماتِ نظر ہے۔ قلزمِ بے آب ہے عالم

کوئی کہتا ہے پرکرتی نیہب کھیل ہوتا ہے
سرِشتی کی ہے رچنا پرش سے جب میل ہوتا ہے

کوئی یوں گلفشاں ہے مجمعِ اضداد ہے دنیا
ہوا ہے خاک و باد و آب و آتش سے ظہور اسکا

غرض ادراکِ انسانی کی جس حد تک رسائی ہے
وہیں تک سرِ ہست و بود کی عقدہ کشائی ہے

یہ سازِ سرمدی بھگوان نے کھولا ہے گیتا میں
حقیقت فاش کی یکساں ہے جو دنیا و عقبیٰ میں

یہ دنیا کیا ہے جلوہ گاہ حسنِ لایزالی ہے
یہ نورِ ذات کا پرتو ہے تصویرِ جمالی ہے

وہی ذاتِ احد و بے ہمہ داں ہے ہر دو عالم کی
ضیا ہے ذرے ذرے میں اسی نورِ مجسم کی

جو کثرت رونما ہے در حقیقت عینِ وحدت ہے
جو فطرت آفریں ہے ایک لافانی حقیقت ہے

اسی کا روح سایہ ہے اسی کا عکس مایا ہے — اسی کی ذات بے ہمتا میں کل عالم سمایا ہے
وہ آتم تو نِراکار ہے نرگن ہے عالم ہو — وہ آدی سول ہے آس ہو نظامِ ذات قائم ہو
تجلی جسم ظاہر ہیں ہے نام و روپ کا جلوہ — جو دا ہوں دیدۂ دل سر بسر ہے حسن بے پردا
وہی ناظر وہی منظور ہے وہ خود نظارا ہے — وہی جلوہ وہی جلوہ نگر ہے جلوہ آرا ہے

حقیقت کا جسے رحمت سے اسکی گیان ہوتا ہے
وہ جیون مکت ہے حاصل اسے نروان ہوتا ہے

کلام آرزو

(از جناب آرزو لکھنوی)

رفعِ حجابِ رخ کے بعد جلوہ پھر اک حجاب ہے — آنکھ پہ جھکی ہوئی نظر غیرتِ صد نقاب ہے
حسن بھی اک شراب ہے عشق بھی اک شراب ہے — جسمیں یہ دونوں ایک ہوں وہ دعوہ کامیاب ہے
سرخیِ چشمِ اشکبار آتشِ زیرِ آب ہے — جوششِ غم میں جان نثار ماہیِ دل کباب ہے
ذوق اگر ہے پائدار جذب ہے روکشِ بہار — منظرِ کائنات کو یہ نہ سمجھ کہ خواب ہے
ایک تسلسلِ خیال جو کہیں ختم ہی نہیں — میری کتابِ شوق میں فصل ہے نہ باب ہے
دل کا حقیر آئینہ وہ بھی شکستہ و خراب — عشق کی کائنات ہے حسن کا انتخاب ہے
نزہتِ رنگ و بوئے گل ہے وہ طلسم در طلسم — جس کی کتابِ حسن کا ہر ورق اک کتاب ہے
طالبِ راحت و سکوں موت اپنے منہ سے مانگ — برق و شرر سے پوچھ دیکھ زندگی اضطراب ہے
دیکھ کے تیرا پیچ و تاب ہاں یہی دل کا اضطراب — ایک طرف سوال ہے ایک طرف جواب ہے
کشمکشِ حیات و موت اجزۂ بیم و امید دم! — رخ پہ ہوا کے رکھ نگاہ ہر نفس انقلاب ہے
لطفِ خلش تو اب کجا ذوقِ خلش بھی مٹ چکا — درد جگر سے کیا گیا حالتِ دل خراب ہے
سنگِ عتاب لبن ردِ عمل تو ہو چکا — خوفِ عذاب جیتے جی جان کو اک عذاب ہے
تلونِ مزاج ہونے نہ دیگا کامیاب — درس گہِ نیاز میں روز نئی کتاب ہے
نہ ہلاکِ جستجو، پیاس کو مار آرزو — آ نہ فریبِ نفس میں آب نہیں سراب ہے

نسبتِ فکرِ آرزو اس پہ یہ قدرتِ بیاں
صبح میں ہے سوادِ شام شیب نہیں شباب ہے

قدرت کے کھیل

ایک قصہ

ازبابو بھگوت سروپ صاحب بی۔ اے

بے زندی رنگ لائی۔ دوپہر سے شام ہو گئی ایک سرے سے دوسرے سرے تک سارا شہر چھان ڈالا بیسوں دروازے جھانکے لیکن کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہ ملی۔

"بیٹا اچھے گنگا نہانے آئے۔ دن ڈوب رہا ہے مگر سیدھی کرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ گٹھری رکھنے ہی کو جگہ مل جاتی تو رات سے پہلے دو غوطے لگا لیتے"

"اماں! ابھی گھڑی گھر سے چلے تھے۔ اس تیرتھ نگری میں جہاں بیسوں دھرم شالے آشرم و آس۔ بھون بنے ہوئے ہیں ہم بدنصیب غریبوں کو رات کاٹنے کو جگہ نہیں ملتی۔"

"بیٹا۔ سچ تو یہ ہے کہ دھرم کا نام بدنام کیا جاتا ہے۔ ورنہ یہ اونچے اونچے مکان اپنے آرام دنامودی کے لئے بنائے جاتے ہیں نوکر چاکر ٹھہرنے والوں سے کرایہ وصول کرتے ہیں اُن پر رعب جماتے ہیں۔ پَن کا پھل تو جیسا شاسترون میں لکھا ہے ویسا معلوم ہاں باپ کی گٹھڑی ضرور بھاری ہو جاتی ہے۔"

"اماں رات ہو رہی ہے چلو پہلے گنگا جی نہالیں۔ راجہ بہادر دھرم نریش منشی رام جی کی سب سے بڑی دھرم شالا ہے وہاں رات کاٹنے کو تو جگہ مل ہی جائے گی"

✢ ✢ ✢

"بھائی۔ ہم ماں بیٹے فیروزپور کے رہنے والے ہیں کیا دو دن ٹھہرنے کو جگہ مل سکتی ہے"

"ارے یہ دھرم شالا ہے بھلے آدمیوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ محتاج خانہ نہیں ہے"

"بھائی صاحب ہم بھی بھلے آدمی ہیں۔ جاترا کرنے آئے ہیں۔ غریب ضرور ہیں لیکن چور نہیں ہیں"

"چل بے۔ جاتری کے بچے تن پر لتا نہیں تیرتھ کرنے آئے ہیں لنگوٹا کسا اور چل دئیے۔ تم جیسوں کے ٹھہرنے کے لئے یہاں جگہ نہیں ہے"

"اماں کیا کریں کہاں جائیں۔ رات کو تو سردی سے اکڑ جائیں گے"

"بیٹا! ایسا جانتے تو آتے ہی کیوں۔ رات ہو گئی ہے رام، کیا کریں"

"اماں چلو ریل کے مسافرخانہ میں پڑ رہیں گے"

"ارے تمہارے پاس دوآنے بھی نہیں۔ دوآنے پر میں تمہیں کوٹھری دے دوں گا؟"

دوسرے نے کہا "یہ [illegible] بات نہیں تو ٹھیا مردی میں ٹھٹھر کے رہ جائیگی۔ چوکیدار کہتا تو ٹھیک ہے دوآنے کی بات ہی کیا ہے۔"

"اچھا بھئی یہ دوآنی لے لو۔ ہم تو کل ہی نہا کر چلے جائیں گے۔"

"کیوں بے۔ ایک تو تم نے کو جگہ دے دی اوپر سے تہمت لگاتا ہے۔ نیکی برباد گنہ لازم۔"

"نہیں بھائی۔ ہم تو اپنے تقدیر کا دوش بتاتے ہیں۔ اسمیں دھرا ہی کیا تھا۔ یہی دس پانچ روپے دو چار کپڑے۔"

"اسمیں چاہے کچھ ہی ہو۔ کیا ہم نے لے لی ہے؟"

"نہیں بھائی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ذرا کی ذرا ماں کو پانی پینے چلا گیا تھا اور یہاں چوکیدار کے سوائے کوئی دوسرا نہ تھا۔ واپس آیا تو گٹھری غائب تھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے کسی کو لیتے دیکھا ہو تو ...."

"ابے مارے جوتوں کے سر گنجا کر دونگا۔ ہم کیا تیرے باپ کے نوکر تھے جو تیرے مال کی چوکیداری کرتے۔ نکل یہاں سے۔ بدمعاش کہیں کا۔"

"اماں۔ چلو۔ یہاں سے چلو۔ ٹکٹ کو بھی دام نہیں رہے۔ گھر کیسے پہنچیں گے۔"

"ارے گنگا جی میں کود پڑو۔ بہتے بہتے کلکتہ پہونچ جاوگے۔"

(۲)

ٹہلورام ایک معمولی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا باپ گنگارام حلوائی کی دوکان کرتا تھا۔ روپیہ دو روپیہ روز کما لیتا تھا جس سے اچھی طرح گذر ہو جاتی تھی اور کچھ بچ بھی جاتا تھا۔ ابھی ٹہلورام آٹھ ہی برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ دو تین برس گھر گرہستی بیچ کر گذر ہوئی دوکان کا سامان بھی بک گیا۔ مکان ٹکڑے ٹکڑے کر کے رشتہ داروں نے کوڑیوں میں لے لیا۔ ماں بیٹے کے پاس صرف ایک کوٹھری رہ گئی جب کچھ سہارا نہیں رہا تو ماں نے بیٹے کو اُبلے چنوں کا خوانچہ لگوا دیا۔ ماں چنے اُبال کر نمک مرچ پیس کر تھال میں لگا دیتی۔ اور بیٹا مدرسوں کے سامنے۔ سڑک کے چوراہوں پر۔ گلی گلی "چنے ہیں مصالحہ دار" کی آواز لگاتا پھرتا اور شام تک دو چار آنے کے پیسے لے آتا جس سے [illegible] کی بسر ہوتی تھی۔ کشوری کی کفایت شعاری سے

پر سینے کچھ نہ کچھ پس انداز ہو ہی جاتا تھا۔ سالہا سال کے بعد وہی ہیں سورج گرہن دیکھ کر کاتکی اشنان پر ماں بیٹے نے گنگا اشنان کا ارادہ کیا۔ ہردوار جیسے تیرتھ میں جاتریوں کے ٹھیرنے کو پنڈوں کے مکانوں اور دھرم شالاؤں کی کیا کمی مگر نردھن کی بات کون پوچھتا ہے وہ تو دولتمندوں کی جاگیریں ہیں۔ دھرم شالے میں کرم شالے ہیں۔

دس بجے ریل سے اترے اسوقت سے شام تک گھومتے رہے شب گذاری کا بندوبست نہ ہو سکا۔ ماں بیٹوں نے اشنان کیا۔ آخری کوشش کی دھرم نریش کی دھرم شالا میں بھی جگہ نہیں ملی۔ گٹھری بسترا دیکھ کر چوکیدار نے دو آنہ کے عوض اپنے کوٹھری میں پڑ رہنے کی اجازت دیدی صبح کو ٹھلورام ماں کو پانی دینے گیا۔ موقع پاتے ہی چوکیدار نے گٹھری پر ہاتھ صاف کر دیا۔ پردیس میں تن کے کپڑوں اور بستر کے سوا کچھ پاس نہ رہا گنگا اشنان تو ہو گیا لیکن پھل کڑوا ملا۔ دُکھ تکلیف جھیل کر ایک ہفتہ بعد دونوں گھر واپس آئے۔

دوسرے ہی دن سڑکوں اور گلیوں میں آواز سنائی دینے لگی۔

"چنے ہیں مصالحہ دار گرم گرم"

(۳)

"اماں! چنے بیچتے بیچتے تو اب جی اکتا گیا۔ اب تو کوئی دوسرا کام کرنے کو جی چاہتا ہے"

"بیٹا۔ تمہارے باپ دوکان کرتے تھے۔ سب طرح کی مٹھائی بناتے تھے۔ روپیہ دو روپیہ کما لیتے تھے۔ اچھی طرح زندگی بسر ہوتی تھی۔ چار پیسے بچا لیتے تھے۔ اول تو تم بنانا ہی کیا جانتے ہو دوسرے دکان کرنے کو روپیہ چاہئے۔ گھر میں رکھا ہی کیا ہے اور تنگی ترشی جھیل کر جو کچھ بچایا بھی تھا وہ گنگا مائی کی نذر ہو گیا۔ بیٹا۔ مجھکو خود تیرا بہت خیال ہے مگر کروں کیا"

"اماں کیا تم کو بھی کچھ بنانا آتا ہے!"

کستوری نے کہا "صرف موتی چور کے لڈو۔ یوں تو سب سامان دوکان پر بھی بنتا تھا مگر وہ ایک مرتبہ لڈو خود میں نے بنائے تھے جو خوب بکے۔ پھر تو لڈو میں ہی بناتی تھی"

"اچھا تو اماں کل پھر ویسے ہی لڈو بنا دو"

"لڈو تو بن جائیں گے۔ کڑھائی چھلنی سب موجود ہے مگر یہ سوچو تو جو دو روپیہ لگا دیئے تو پھر گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ بچے گی"

"ماں میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ چنے بیچتے شرم آتی ہے۔ یہ کام تو دس پندرہ

برس کے لڑکوں کا ہے کل تم مجھے لڈو بنا دو۔ یا تو وہ بک ہی جائیں گے نہیں تو دیکھا جائے گا۔
دیکھا کیا جائے گا۔ کچھ نہیں بس لڈو بنا دو۔"
"کرموں کی گت ہے۔ لڈو تو میں بنا ہی دوں گی مگر یہ سمجھ لو کہ وقت سے پہلے اور تقدیر سے زیادہ کسی کو نہیں ملتا!"
ایسا نہ ہو کہ دو روپیہ بھی ہاتھ سے جاتے رہیں۔"

+ + +

"لڈو ہیں موتی چور کے۔ بڑھیا لڈو!"
"آمخوانچہ والے۔ جلیبیاں بھی ہیں!"
"نہیں مگر لڈو بہت عمدہ ہیں۔ بالکل تازہ!"
"ہمکو تو جلیبیاں چاہیئے تھیں۔"
"لڈو ہیں نکتی کے۔ صاف شدہ گھی کے بنے!"
"ارے بھئی۔ گلاب جامن بھی ہیں!"
"لڈو ہیں لڈو۔ ایک ایک نکتی کھلی جاتی ہے۔ پورانی نامی دوکان کے ہیں۔ کھا کر دام دینا اگر خراب ہوں تو پھینک دینا!"
"ہمکو تو گلاب جامن چاہیئے تھی۔ تم اپنی بکواس رہنے دو!"
"نہ تو صاحب۔ خفا کیوں ہوتے ہو!"
"خفگی کی تو بات ہے ہی۔ تم سے پوچھا گلاب جامن کو اور تم سنانے لگے لڈوؤں کی کتھا!"
"اچھا بھائی صاحب معاف کیجئے!"
بھرائی ہوئی آواز میں پھر صدا لگی "مزیدار لڈو ہیں دلی والے"
ایک لڑکے نے کہا "کیا آج چنے آپ ہی آپ کھا لئے۔ بالکل کے چنے پیکر لڈو بنا لائے!"
"دیکھو تو چیز کیا ہے!"
"کتنے بیچ لئے!"
تہلورام نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "یار ابھی بہنی بھی نہیں ہوئی!"
"شہر میں قدم قدم پر حلوائیوں کی دوکانیں ہیں۔ لڈو کون لے گا! ایسے سودے یا تو دوکانوں پر بکتے ہیں یا میل سے بکتے ہیں اکیلے لڈو کوئی نہیں لیگا۔ جوا اور سودا ہوتا تو شاید

لڈو بھی بک جائے"

"بھئی اب کیا کریں دس بج گئے پیسہ کا سودا نہیں بکا"

"میری مانو تو انکو جہنم میں ڈالو۔ یا اپنے پیٹ میں۔ شام کو ذرا چنے اچھے بنا کر لے آنا۔ چٹ پٹا مسالہ ہو بس کسر نکل جائیگی"

ٹھلو رام نے دل میں سوچا " گھر کی سب پونجی اس تھال میں ہے ابتو شام کے لئے چول کے بھی دام نہیں رہے۔ اور اسوقت کھانے کو کوڑی بھی پاس نہیں ہے۔ ماں بھوکی ہو گی۔ میں بھی تھک گیا ہوں۔ ایسی زندگی سے مرجانا بھلا ہے۔ نوجوان آدمی اور دو آدمیوں کا پیٹ بھی بھر نہ سکے۔ لعنت ہے ایسی تقدیر پر۔ بھوکی ماں انتظار دیکھ رہی ہوگی۔ خالی ہاتھ کیسے جاؤں۔ اس دوست کی رائے درست ہے۔ مشورہ خوب دیا ہے۔ بہتر ہے کہ میں ان لڈوؤں کے ساتھ ندی میں جاکر ڈوب مروں۔ ماں کا نہیں تو مچھلیوں کا پیٹ تو بھر جائے گا"

۴

نہر جہلم کی تجویز مکمل ہو گئی۔ نقشے بنکر مکمل ہو گئے آراضیات سرکار نے حاصل کرلیں۔ داغ بیل لگ گئی۔ اب نہر کی کھدائی اور دفتروں اور کوٹھیوں کی تعمیر باقی رہ گئی تھی جو سب بڑا کام تھا۔ ٹھیکوں کے لئے نوٹس جاری کئے گئے۔ کل کام کو پچاس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہر حصہ کے لئے دس لاکھ روپیہ کا تخمینہ تھا۔ ٹنڈر طلب کئے گئے تھے۔ بڑے بڑے انگریز اور ہندوستانی ٹھیکے لینے آئے ہوئے تھے۔ قصبہ شہر بنا ہوا تھا۔ میدان میں ڈیرے خیمے۔ چھولداریاں لگی ہی تھیں۔ بڑے بڑے فرموں۔ کمپنیوں اور ٹھیکداروں کے علاوہ سیکڑوں چھوٹے چھوٹے ٹھیکیدار۔ نکمی کام کرنے والے۔ اور ہزار ہا دیہاتی مزدور بھی زیادہ مزدوری کے لالچ میں آئے ہوئے تھے۔ سرکار کی طرف سے ایک ماہر فن انجنیر بھی ولایت سے آیا تھا۔ ابتدائی مراحل طے ہونے کے بعد مسٹر ... چیف انجنیر تعینات کئے گئے اور ٹھیکہ داری۔ اجارہ داری۔ تخمینوں کی منظوری کے تمام اختیارات انہیں دیدیے گئے تھے۔ گو جانچ پڑتال کے لئے درجنوں ماتحت افسران بھی موجود تھے۔ تاہم صاحب تازہ ولایت ہونے کی وجہ سے ہر کام کی خود معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے اور نئے ملک سے واقفیت پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ہندوستانی زبان سے ابھی تک انہیں صرف کتابی واقفیت تھی۔ اردو سمجھ لیتے تھے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتے۔ علی الصبح ہی میم صاحب

کیا تو جھٹ سے پہاڑی اور میدانی علاقہ کے رہنے والوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے زمین کی پیداوار۔ آبپاشی کے ذرائع اُنکے اخراجات وغیرہ کی خود دوڑ سے جانچ پڑتال کرتے انکے متعلق یادداشت لکھتے۔ بجٹ بنا کر حساب لگاتے۔ کبھی کبھی لوگوں کو جمع کر لیتے نہر کے فائدے بیان کرتے اُن میں انگریزی گورنمنٹ اور حاکمانہ فرعونیت نام کو بھی چھو نہیں گئی تھی۔ وہ ہر شخص سے آزادی سے بولتے اور جہاں جاتے ہر ایک سے خوش اخلاقی سے پیش آتے جسکی وجہ سے لوگ چاروں طرف سے گھیر لیتے۔ اُنکی ہندوستانی بول چال بھی لوگوں کے لئے کافی دلچسپی کا سامان مہیا کر دیتی تھی۔ اکثر لوگ انہیں چھیڑتے بھی وہ کسی سے ناراضگی کا اظہار نہ کرتے تھے۔

⁂

آخر ٹینڈر لئے جانے کا دن آ پہونچا۔ پہلے ہی سے اعلان کر دیا گیا تھا کہ آج ہی فیصلہ کیا جائے گا اور سب ٹنڈر دستی لئے جائیں گے۔ ہر ٹھیکہ دار کو کم از کم دس لاکھ کا کام لینا پڑیگا اور ضمانت نقد داخل کرنا ہوگی۔ البتہ کام اپنے ذمہ داری پر شکمی ٹھیکہ داروں سے کرا سکے گا بارہ بجے کے بعد کوئی ٹنڈر نہیں لیا جائے گا۔

سوا گیارہ بج چکے تھے مگر ہچنسن صاحب چیف انجینئر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ سویرے ہی سے میم صاحب کے ساتھ ٹہلنے نکل گئے تھے اور ابھی تک واپس نہیں ہوئے تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کہاں اور کس طرف گئے ہیں۔ سب ملازمان انتظار کر رہے تھے۔ حاضری ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ خانساماں پریشان تھا اور بیرا حیران انکو کیا خبر تھی کہ صاحب بہادر جہلم کی ریتی میں راستہ بھول گئے ہیں اور اب دریا کے کنارے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ صبح سے بہت وقت ہو گیا۔ انکو کوئی آدمی نہ ملا۔ دھوپ ہو گئی اور گرم ہوا چلنے لگی یہاں تک کہ تمازت آفتاب سے ریتی جل رہی تھی ذرا ہوا تیز ہو گئی تو گرم گرم ذرّوں سے منہ اور ان کے ہاتھ جھلنے لگے بھوک سے بیتاب ہو گئے کیونکہ چائے اور حاضری سے گزر کر لنچ کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ دو چار مرتبہ دریا کا پانی پیا تشنگی کو فوراً تسکین ہوئی۔ لیکن بھوک بڑھ گئی میم صاحبہ تو ایک چھوٹے سے درخت کے برائے نام سایہ میں بھوک سے مجبور تکان سے چور ہو کر گر پڑیں۔ صاحب میں ابھی طاقت برداشت باقی تھی میم کو دلاسا دیا۔ اُمیدوں کے خواب دکھلائے " یہ ناممکن ہے کہ اس طرف کوئی نہ آئے۔ خدا آدمیوں سے خالی نہیں ہے۔ اور کہا عجب ہے کہ ہمارے ہی آدمی تلاش کرتے کرتے اس طرف آ جائیں " مگر ان طفل تسلیوں سے کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ میم صاحبہ کی حالت لمحہ بہ لمحہ نازک ہونے لگی۔ بے ہوشی سی

طاری ہو گئی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں صاحب کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئیں۔ اب انجینئر صاحب کو یقین ہو گیا کہ عزیز شریک زندگی سے دائمی مفارقت کا وقت آ پہونچا۔

آفتاب نصف النہار پر پہونچ چکا تھا۔ صاحب کی بیقراری بڑھ رہی تھی وہ سوچ رہے تھے قبر کون کھودیگا۔ کیا اسی جنگلی درخت کے نیچے ریت میں پیاری بیوی کا مدفن بنے گا۔ وطن سے ہزاروں میل کے فاصلے پر یہی درخت اس بےکس کے مدفن پر پھول چڑھائیگا۔ مجھ میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ لوٹ جاؤں مگر۔ ہائے کہاں جا کر تھا نہ ویرانی ہوئی۔ لاکھوں بندگان خدا کی آبیاری کرنا اور ہزاروں ایکڑ زمین کو سیراب کرنے آیا تھا لیکن خود میری محبوب بیوی دنیا سے تشنہ کام و نامراد مر رہی ہے کیا اس کو یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ نہیں۔ نہیں۔ اگر میری غیر حاضری میں دم رک گیا تو آخری دیدار کی بھی حسرت رہ جائیگی۔

"لڈو ہیں بڑھیا۔ موتی چور کے لڈو۔" کانوں نے سُنا آنکھوں نے رہبری کی سلسلۂ خیالات شکست ہو گیا۔ بے تحاشا زبان سے نکلا

"اے رحم و کرم کے فرشتہ۔ آ کہ خداوند کریم نے تجھے میرے لئے بھیجا ہے۔" اے نوجوان ادھر دیکھ میری جان سے زیادہ پیاری بیوی مر رہی ہے، کیا ہم کو چھاؤنی تک پہنچا سکتا ہے۔ ہماری مدد کر تجھکو میں ایک ہزار پونڈ دونگا۔ نہیں۔ نہیں۔ اسکا دگنا تگنا جو کچھ مانگے گا دونگا۔"

"ارے یہ تو نہر کا بڑا صاحب ہے۔" "حضور میم صاحب کو کیا ہو گیا؟"

"بھوک سے بیتاب اور گرمی سے پریشان ہو کر مر رہی ہیں۔" "اسمیں کیا ہے؟"

"صاحب یہ لڈو ہیں۔ میں انکو لیکر جہلم میں ڈوب مرنے کے لئے آیا ہوں۔"

"کیوں؟"

"مفلسی سے تنگ آ کر۔"

"آہ۔ ایک کو موت کی خواہش ہے دوسرے کو زندگی کی تمنا۔ یہ کیا اجتماع ضدین ہے" صاحب نے تھال چھین لیا۔ ٹھلو رام نے درخت کے اوپر اپنا صافہ ڈالکر سایہ کر دیا۔ تھال خالی کر کے اسمیں پانی بھر لیا۔ میم صاحب کے منہ پر چھڑکا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ صاحب نے ایک لڈو توڑ کر منہ میں ڈالا۔ پانی کے قطرے ٹپکائے۔ وہ بیٹھ گئیں۔ دوسرا لڈو خود کھایا۔ تیسرا صاحب نے کھایا۔ ذرا طاقت آئی۔ دونوں نے لڈو پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ نہ میم دکا نشان خانساماں۔ نہ بٹلر باتوں باتوں میں آدھا تھال خالی ہو گیا۔

"ہم کو چھاؤنی تک پہونچا دو۔ تم کو ہم دام اور انعام دونوں پر دیگا"
"صاحب کیسے دام۔ میں ہندو ہوں اور تمام عمر میں آج ہی دھرم ایک کا موقع ملا ہے۔ اس کے دام دونگا۔ غریب ضرور ہوں مگر انشور دیگا"
"اچھا۔ اچھا۔ دیکھا جائیگا۔ ہم کو چھاؤنی پہنچا دو۔ کتنی دور ہے"
"آپ راستہ بھول گئے ہیں۔ چھاؤنی صرف سوا میل پر ہے۔ چلئے"

۵

بڑے صاحب نے دفتر سے نکل کر غصہ سے کہا "آپ لوگوں کو یہ زعم ہے کہ ہمارے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ غلط اور بالکل غلط۔ آپ لوگوں کا زعم توڑنے کو میں کل سے کام جاری کرا دونگا۔ اور آپ کی مدد کے بغیر نہر بنجائے گی اور کام نہیں رکے گا"
"ہم آپکا مطلب نہیں سمجھے"
"مطلب نہیں۔ کیا آپکو نہیں معلوم تھا کہ ٹنڈر لینے کا وقت بارہ بجے مقرر ہے اور اب ایک بجا چاہتا ہے"
"حضور ہم لوگ تو صبح سے ہی حاضر ہیں۔ حضور ہی . . . . . ."
"اور کیا ہم بھاگ گئے تھے۔ کیا ٹھیک پونے بارہ بجے ہم نہیں آ گئے تھے"
"لیکن ہم لوگوں کا خیال تھا کہ حضور تھکے ہیں آرام کریں گے"
"تھکاوٹ فرض کو نہیں روک سکتی۔ سب ٹنڈر نامنظور۔ آپ لوگ جائیں" چیف انجنیر صاحب یہ حکم دیکر بنگلہ کے اندر چلے گئے۔
اردلی نے اطلاع کی۔ کہ میکچن فاسٹر اینڈ کمپنی۔ برناڈ اینڈ کمپنی۔ لائل اینڈ کمپنی مسرس جیولٹ اینڈ سنس لین براؤن۔ رائے بہادر سر سکھ رام۔ لالہ دلا رام اینڈ کمپنی۔ کے نمائندے حضور سے ملنا چاہتے ہیں۔
"آنے دو . . . . . سنئے صاحبان۔ ہمارا وقت قیمتی ہے۔ ہم نے جو حکم دیا وہی قائم رہے گا۔ ہمارا مزاج ضدی ہے۔ ہم کچھ نہیں سن سکتے"
"آپ ہم کو صرف یہ بتلا دیں کہ کام کیسے ہوگا"
"سر سکھ رام اگر آپ سرکاری خیرخواہ نہ ہوتے تو میں ایک منٹ بھی آپکو اس سوال کیلئے یہاں ٹھہرنے نہ دیتا۔ آپ غرضمند ہیں۔ اور غرضمند باؤلا ہوتا ہے۔ اس لئے میں کوئی سخت حکم نہیں دیتا

حضرات آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ کام کل سے شروع ہو گا۔ ٹھیکیداروں کا حال دیکھ کر
انڈین کمپنی کے انجینئر نے جو صاحب کو وہاں سے جانتا تھا۔ کہا کس کس کو۔
"صرف ایک کمپنی ٹھیکہ دار کو جو کل سے کام جاری کر دیگا۔ جو کل سے پہلے دس لاکھ کی ضمانت

لالہ سالگرام نے ڈرتے ڈرتے کہا: "حضور وہ کون صاحب ہیں؟"
"تم نہیں دیکھتے۔ یہی لالہ ٹھولو رام ہیں جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں"
سب نے دیکھا کہ ایک نوجوان شخص ڈھیلم ڈھالا۔ انگریزی سوٹ پہنے۔ نکٹائی کالر لگائے بیٹھا ہوا ہے۔
سب ٹھیکہ داروں کے چہرے اتر گئے۔ یاس و حسرت سے ہاتھ ملنے لگے۔ امیدوں کا خون ہو گیا۔
عظیم خاں کشمیری ٹھیکہ دار کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

دور جائے تھے ساقی منگے میخانہ کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانہ کو ہم

مسرس ہیولٹ ہیں براؤن کے نمائندے نے کہا
"سر۔ کیا ہماری یہ التجا قبول ہو سکتی ہے کہ لالہ صاحب اپنے کام میں ہم سے بھی مدد لے لیں"
"یہ انکا فعل ہے۔ اس کی انکو پوری اجازت ہے"
"مجھکو کسی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ چیف انجینئر صاحب کی سفارش یا اجازت ہے اس لئے میں آپ لوگوں سے صرف پانچ فیصدی منافع لیکر سرکاری تقسیم کے مطابق کام دے دونگا۔ بشرطیکہ آپ لوگ ضمانت اور میرے منافع کا بیس فیصدی آج ہی داخل کر دیں بقیہ زر منافع ضمانت سے قسط وار وصول ہوتا رہے گا۔ میرے ٹنڈر کی نقل دفتر سے لیکر جو جو صاحب یہ شرائط منظور کریں روپیہ جمع کرکے فوراً اقرار نامہ رجسٹری کرا دیں"
چیف انجینئر نے کہا" لالہ صاحب میں آپ کی فیاضی کی داد دیتا ہوں۔ خیر یہ سب بہتر ہو گا۔ یہ لوگ ٹنڈر دیکھ کر ایک ایک چٹ بنا لائیں۔ سب کاموں کی اسم وار لاٹری ڈالدی جائیگی اور ٹھیک تین بجے تمام کام تقسیم ہو جائے گا۔ تاکہ کل سے شروع ہو جائے"
سرکاری خزانہ میں آج خاص طور پر کام بڑھ گیا۔ روپیہ جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا پانچ کروڑ روپیہ نقد لالہ ٹھولو رام کے نام سے جمع ہوا اور پچاس لاکھ ضمانت کی رقم تھی۔

سائیں جگو بیٹھیں دبوریں چتر بہار
دکھین کے دکھ دور بھل جنکو لیویں آہڑ

٭ ٭ ٭

"نہیں آیا۔ ابتک نہیں آیا۔ میرا لال۔ میری آنکھوں کا تارا نہیں آیا۔ کیوں۔ کس سے لڑا۔ نہیں نہیں وہ تو کسی سے لڑتا ہی نہیں۔ گاڑی یکہ کے نیچے تو نہیں دب گیا۔ رام جانے یہ کیا بات تھی کل اس نے لڈوؤں کی ایسی ضد پکڑ لی اور جب میں نے یہ کہا کہ اگر نہ بکے تو وہ جواب میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ جوان بیٹا غریبی سے تنگ آکر کہیں کچھ کر نہ بیٹھے۔ بھیا کاہن چند۔ بھیا تمہیں ذرا بازار میں دیکھ آؤ"

"چاچی آوارہ لونڈوں میں گھومتا ہوگا۔ آج تو لڈو دل گئے خوب عیش رہی ہوگی۔ لڈو ختم ہو جائینگے ہاتھ جھاڑ کر آ جائے گا۔ نالائق اولاد ایسی ہی ہوتی ہے"

"نا بھیا وہ ایسا نہیں ہے"

"اچھا چاچی وہ بڑا سپوت سہی ہم کو فرصت نہیں ہے"

"بیٹا ابیت تم ہی چلے جاؤ"

"نا دادی میرے پاس اتنا فالتو وقت کہاں ہے"

"رات ہو رہی ہے۔ ہے کرشن بھگوان مجھ بڑھیا کی لاٹھی کی سہائتا کیجئو۔ دن کی ایک ایک گھڑی ایک ایک برس ہو گئی۔ گرمیوں کے دن اس دھوپ لو میں۔ ہے بھگوان اب تو رات ہو رہی ہے۔ کہاں رہا؟ کیا ہوا؟ کیا گزری؟ ابھی تک بھوکا پیاسا ہوگا"

غریب بڑھیا نے دروازہ کھولا اور کھٹیا پر لیٹ گئی۔ رات کے دس بج گئے تھے پڑے پڑے روتے روتے نیند کا جھوکا آ گیا۔ سپنے میں کیا دیکھتی ہے کہ ٹھلو رام بھوکا پیاسا لڈو لئے بیٹھا تھا کوئی گاہک پاس نہیں آتا۔ شرم کے مارے وہ گھر نہیں آتا۔ ماں میں تو جب ہی آؤنگا جب لڈو بک جائیں گے۔

آجا۔ آجا۔ بیٹا آجا۔ لڈوؤں کو بھاڑ میں ڈال۔ روٹی دینے والے کرشن بھگوان ہیں۔ میں سویرے سے تیرے لئے روٹی لئے بیٹھی ہوں۔ تو بھوکا ہے تو میں نے بھی برت رکھا ہے۔ جب ہی روٹی کھاؤں گی جب تو آ جائے گا۔

اتنے میں ایک گھوڑا گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سے کشوری جاگ اٹھی۔

"پربھو! دیکھو اماں بھاگ گئی تھیں۔ تو انکو جلدی سے پلا دو۔ سویرے سے بھوکی ہونگی جب تک میں نہ کھاؤں خود بھی نہیں کھاتیں۔ بہاری! تم اور سامان گاڑی سے اتار لاؤ۔ گلاب تم گاڑی لیجاؤ سویرے جلدی آجانا۔ ہم پہلے اپنے بنگلہ میں چلے جائیں گے اس کے بعد صاحب کے پاس جائیں گے۔

کشوری خواب سے چونکی۔ تو دوسرا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ بار بار آنکھیں مل کر دیکھتی کہ یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے اسکو بیٹے کی آمد بھی خواب ہی معلوم ہو رہی تھی۔

— ۶ —

کاتکی کا میلہ پھر آگیا۔ ہردوار میں جاتریوں کے جھنڈ کے جھنڈ آنے لگے۔ اسپشل ٹرینیں چلنے لگیں ہردوار بہت بڑا شہر بن گیا جس طرف دیکھو آدمی ہی دکھائی دینے لگے۔ سبھی گھر۔ مکان اور دوکانیں یاتریوں سے بھر گئیں۔ راجہ بہادر دھرم نریش تلسی رام کی دھرم شالہ میں تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہر شام کئی رتھ جنمیں حصار کے بیلوں کی جوڑی جتی ہوئی تھی اور سینگوں پر سنہری روپہری خول چڑھے تھے اس دھرم شالہ کے سامنے رُکے۔ دس پانچ سپاہی خدمتگار بھی ساتھ تھے سب صاف ستھرے صافے باندھے ہوئے۔ رتھوں کی نئی پوشش دمک رہی تھی۔ دھرم شالہ کے ملازم دیکھنے لگے۔ سواریاں رُکتے ہوئے۔ دیکھکر منیجر صاحب دوڑے ہوئے آئے اور لالہ ٹھلورام سے کہنے لگے "بھگون کہاں سے آنا ہوا۔ شریمان کے لئے بہترین کمرے خالی کرا دیئے جائیں گے۔ رتھ۔ بیل۔ ملازموں کے لئے بھی پربندھ کئے دیتا ہوں"

ٹھلورام نے ہنسکر کہا "مہاراج کرپا کریں۔ میں نے اپنا کیمپ ریل کے قریب لگایا ہے۔ اسوقت تو میں لالہ دیوی دیال جی انجنیر کی تلاش میں آیا ہوں جنھوں نے یہاں کا پتہ بتایا تھا۔ وہ سامنے والی آراضی میں میری ماں کشوری دیوی کی دھرم شالہ بنوائیں گے"

"دھن ہو مہاراج بڑے پُن کا کام ہے"

"ہے تو ضرور بشرطیکہ تم جیسے مہاتما پُرش اُسکے ادھکاری نہ ہوں۔ اور اس جیسا (ایک آدمی کی طرف اشارہ کرکے کہا) چوکیدار ڈکیتی نہ کرے اور غریب جاتریوں کا گلا نہ کاٹے"

چوکیدار نے ٹھلو رام کے سخت الفاظ سُنے اور غور سے انکا منہ تکنے لگا اُس نے پارسال والے مسافر کو پہچان لیا تھا۔

◆ ◆ ◆

کشوری بھون تیار ہو گیا پورے ساٹھ ہزار کی لاگت آئی۔ ہردوار میں سب سے زیادہ وسیع اور خوبصورت سہ منزلہ عمارت ہے۔ اسمیں سب سے اول غریب یاتریوں کے ٹھہرانے کا انتظام ہے۔ بھوکوں کو کھانا ملتا ہے۔ مریضوں کا علاج ہوتا ہے۔ بے کسوں کی امداد کیجاتی ہے۔ ٹرسٹ کے پاس کافی روپیہ ہے اور کل آمدنی غریبوں کے لئے وقف ہے۔ خود لالہ ٹھلو رام نگرانی کرتے ہیں۔ اور ٹرسٹی بھی ہیں مگر کیا مجال کوئی کارکن یا ملازم کسی سے کچھ طلب کر سکے یا بے اعتنائی سے پیش آئے۔ کشوری بھون کے دروازہ پر موٹے حرفوں میں تحریر ہے۔

"کشوری بھون کو کشوری دیوی کے پتر ٹھلو رام نے غریب یاتریوں کی سیوا کے لئے تعمیر کیا سمبت ۱۹۸۰ بکرمی"

کلامِ احسن

(از حضرت احسن مارہروی علی گڑھ یونیورسٹی)

غم ہیچ تعب ہیچ خوشی ہیچ، طرب ہیچ
جب ہم نہیں دنیا میں تو سب خاک ہے سب ہیچ

نیرنگی عالم کے فریبوں میں نہ آنا
دنیا کی نمائش ہے سب اے جاہ طلب ہیچ

کیا سیر کروں ہجر میں گلزارِ جہاں کی
اے دل مجھے دنیا ہی نظر آتی ہے اب ہیچ

کچھ اور عمل ہو، جو دل اس بت کا ہلا ئے
فریادِ سحرگاہ غلط، نالۂ شب ہیچ

دنیا تو ہے فانی، مجھے حسرت ہے یہ زاہد!
کیوں ہیچ میں تو اُسکے پھنسا ہے وہ ہے جب ہیچ

ہاتھ آتی ہے تقدیر ہی سے منزلِ مقصود
ہر جستجو و فکر ہے اے پاسِ طلب ہیچ

بے کار کسی چیز کو دنیا کی نہ سمجھو
کس منہ سے کہے کوئی کہ ہے قدرتِ رب ہیچ

وہ شوخ ملے گا تو خوشامد سے ملے گا
اے نالۂ شبگیر ترا شور و شغب ہیچ

اسوقت تکلف میں ہے تکلیف سراسر
خلوت کے لئے شرم ہے بے سود ادب ہیچ

تیرے رُخِ انور کے مقابل کوئی کیا ہو
لگتے ترے ہیں آئینہ و ماہِ عجب ہیچ

احسن کو ملے دین کی نعمت جو ہے سب کچھ
دنیا تو حقیقت میں ہے یا شاہِ عرب ہیچ

خالِص اُردو

(جذباتِ حضرت آرزو لکھنوی)

ہو گئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رُت پلٹ چلی
کون یہ مسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی!!

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
رو کے اُتھار رہے ہیں آج پنکھڑیاں ملی دلی

تاروں کو دیکھتے ہیں سب اور یہ دیکھتا ہوں میں
آئی کہاں سے یہ چمک کس کی ہے یہ جھلاجھلی!!

سب سے بڑا ہوا تھا دن آئے تھے دیکھنے سبھی
آنکھیں جو چوندھیا گئیں مچ گئی جیسے کھلبلی!

دن کی بھی آس ہے یہاں رات کی کر چاندنی
کتنی رُتیں پلٹ گئیں ڈال کبھی نہ یہ پھلی!

دن جو پہاڑ سا بھی ہے، رات سے ہے ملا ہوا
اُٹھ کہ سماں اب اور ہے، چونک کہ دھوپ ڈھل چلی

آنکھ میں اور دھیان میں لاگ کیسا تھا بیر ہے
پاس ہیں دونوں بتیاں ایک بجھی کہ اک جلی

اُس کیلئے کہ آرزو ہنستا ہوا تھا ساتھ ساتھ
ڈھونڈھ کے تھکا ہوں بن کے بن چھان پھرا گلی گلی

(۲)

چاہت کا پھل ایسا ہی جیسے جل جائے کھیتی بونی ہوئی
مت پھرتے پھرتے پھرتی ہے دن چڑھتے چڑھتے چڑھتا ہے

کیا ہوتا ہے آنسو پونچھنے سے چھپتی نہیں آنکھیں روئی ہوئی
پھر بھی کلیاں ہیں ابتک آنکھوں کے پیچھے سوئی ہوئی

مولوی محمد مبین نازش بدایونی مرحوم

مولوی محمد مبین نازش بدایونی جن کا ۲۰ رجون ۱۹۳۶ء کو دہرہ دون میں انتقال ہوگیا۔ فطری شاعر تھے۔ انکا تعلق شاعری کے پرانے اسکول سے تھا مگر طبیعت میں پرلطف شوخی ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ زبان پر قدرت تھی۔ اور طبع رسا کو شعر سے کچھ اسقدر مناسبت تھی کہ سن شعور کو پہونچنے سے پہلے ہی میدان سخن میں جولانیاں دکھانے لگے تھے۔ آپکی شاعری کی ابتداء ظریفانہ کلام سے شروع ہوئی چنانچہ آپنے داغ کے وزن پر اپنا تخلص زاغ رکھا۔ اور ایسے برجستہ شعر اور دلفریب نظمیں لکھیں کہ اخباری دنیا میں بہت جلد "زاغ الہند" کے نام سے مشہور ہوگئے۔

اس زمانہ میں نواب مرزا داغ کا طوطی بول رہا تھا۔ اور چونکہ آپ لکھنؤ اسکول شاعری سے تعلق رکھتے تھے جس کے علمبردار اس زمانہ میں حضرت امیر مینائی لکھنوی تھے، اسلئے بدایوں والوں کو داغ دھلوی سے قدرتاً چشمک تھی۔ چنانچہ جب حضرت داغ کی وہ غزل زبان زد خاص و عام ہوگئی جسکا ایک مصرعہ یہ تھا۔ ع ؎

"ہاتھ لا اُستاد کیوں کیسی کہی"

تو اس غزل پر حضرت نازش نے مزاحیہ پیرایہ میں تضمین کی اور ستم ظریفی دیکھئے کہ آپ نے اس تضمین کو حضرت داغ کے پاس اصلاح کے لئے بھیجا اور یہ درخواست کی کہ جس طرح اُستاد ذوق کا ایک شاگرد ہُدہُد تھا اسی طرح داغ دھلوی بھی زاغ بدایونی کو شرف تلمذ عطا فرمائیں لیکن افسوس یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔

اس زمانہ کے لڑکوں کی تعلیم عموماً مکتبوں سے شروع ہوا کرتی تھی اور بعض لڑکے اپنے ہی بزرگوں سے تعلیم حاصل کیا کرتے تھے چنانچہ حضرت نازش کی تعلیم بھی اسی ڈھنگ سے ہوئی۔ اُردو فارسی گھر پر پڑھ کر بدایوں کے مشن اسکول میں داخل ہوگئے جہاں انگریزی الف بے بھی کچھ یونہی سی شدبد حاصل کرلی۔ لیکن اس سے آپکو کوئی فطری لگاؤ نہ تھا اسلئے اس کا سلسلہ زیادہ قائم نہ رہا۔ شعر گوئی کا مادّہ قدرتاً ودیعت ہوا تھا اسلئے پانچ ہی برس کی عمر سے تک بندی کرنے لگے تھے۔ طبیعت میں قدرتی ظرافت تھی لیکن وہ مزاح کی حد تک محدود تھی۔ کسی کی ہجو بھی کہتے تو دلآزاری سے محترز رہ کر البتہ

شعرائے رامپور رہیں سے مولانا کو کچھ قدرتی لگاؤ ہو گئی تھی اس لئے ان سے مستثنیٰ تھے۔

بدایوں میں میاں مذاق نامی ایک نامور صوفی اور شاعر تھے جن سے ریاست پاٹودی کے نواب قاسم علی خاں بہادر کو خاص عقیدت تھی۔ ۱۸۹۲ء میں نواب صاحب موصوف میاں مذاق مرحوم کے عرس میں بدایوں آئے۔ اسوقت مزاح نگاری میں حضرت نازش کا سکہ چل رہا تھا اور بدایوں کا کوئی شاعر اس فن میں انکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ شدہ شدہ مولانا کے کلام کی شہرت نواب صاحب کے بھی گوش گذار ہوئی چنانچہ انہوں نے آپ کو خاص طور پر طلب کر کے کلام سنا اور اسقدر محظوظ ہوئے کہ آپ کو اپنے ساتھ دہلی لے گئے جہاں آپکا افضل الاخبار دہلی سے تعلق ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ پنڈت لیکھرام کے قتل سے آریوں اور قادیانیوں میں خوب چل رہی تھی۔ آریہ سماجی اخبار مرزا غلام احمد قادیانی کو اس قتل کی سازش میں لپیٹ رہے تھے۔ مرزا صاحب نے اسوقت مولانا نازش کی خدمات حاصل کیں اور انہوں نے افضل الاخبار میں مضامین کا ایک سلسلہ جاری کیا اور قطعی دلائل اور قراین سے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی کہ پنڈت جی کا قاتل کوئی مسلمان نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں نازش نے بہت زوردار مضامین لکھے۔

یہ زمانہ نازش صاحب کی جوانی کا تھا۔ اور جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اس پر دہلی کی بود و باش سمند ہوا پر تازیانہ ہو گئی۔ چنانچہ مولانا ایک حسینہ کے دام گیسو میں گرفتار ہو گئے۔ اور جب محبت کے پینگ بہت زیادہ بڑھ گئے تو انہوں نے اس محبوبہ دلنواز سے نکاح کر لیا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔ وہ بیوی فوت ہو گئی اور مولانا "رفتئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد" کہہ کر ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اس کے بعد تادم مرگ پھر دوسرا نکاح نہیں کیا۔

قیام دہلی کے زمانہ میں مولانا نازش کا مولانا راسخ دہلوی سے بھی اسقدر ارتباط ہو گیا جس کا آپکی شاعری پر بہت بڑا اثر پڑا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ حضرت راسخ کی بدولت آپکی شاعری کی کایا پلٹ ہو گئی یعنی انہوں نے مذاق ظریفانہ چھوڑ کر طرز رندانہ اختیار کیا۔ جس سے ان کے کلام میں سنجیدگی اور پختگی آگئی۔ آپ مرزا غالب کے شاگرد سید ذکریا خاں ذکی دہلوی کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے اور مجروح مرحوم کو بھی اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اس زمانہ تک آپ دہلی کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے مگر مولانا راسخ دہلوی یا حکیم مضطر کو دکھائے بغیر کبھی غزل نہ پڑھتے تھے۔ ظریفانہ پیرایہ ترک کرنے کے بعد آپ نے زاغ کے بجائے نازش تخلص کر لیا تھا۔ لیکن

یاران طریقت پیر خانی کی غرض سے علی گڑھ میں ناز[ل] ہوئے۔ ہمیشہ داغ ہی پڑھتے تھے جس سے آپ بہت بگڑ جاتے تھے۔ بالآخر دوستوں سے تنگ آکر اور داغ سے بچنے کے لئے مولانا نے ناز میں "ش" شین بڑھا کر نازش تخلص اختیار کر لیا۔ اس طرح آپ ناز داغ سے ناز دہلوی سے نازش بدایونی ہوگئے۔ آپ کے ظریفانہ و سنجیدہ مضامین و کلام اخباروں و رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں آپ کچھ دنوں کے لئے بدایوں آئے اور چند ماہ بعد پھر دہلی چلے گئے۔ لیکن سنہ ۱۹۰۱ء میں دہلی سے بالکل قطع تعلق ہوگیا۔ گو اکابرین دہلی کی یاد ہمیشہ دل میں تازہ رہی۔

دہلی سے واپس آکر آپ نے بدایوں سے "انڈین ٹریبیون" کے نام سے ایک ظریف اخبار جاری کیا۔ مگر یہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ چند روز بعد آپ نے شمالی ہند کی سیر و سیاحت شروع کر دی۔ بدایوں سے جب کبھی دل گھبراتا تھا تو اکثر بریلی چلے جایا کرتے تھے اور قاضی محمد خلیل صاحب جیران رئیس بریلی کے مہمان ہوتے تھے۔ کچھ دنوں آپ نے روہیلکھنڈ گزٹ بریلی میں بھی کام کیا۔ روزانہ اخبار بریلی کے مالک منشی کرم الٰہی سے بھی آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان دونوں اخباروں میں آپ کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ جب بدایوں میں رہتے تو مولانا نظامی صاحب کے اخبار "ذوالقرنین" میں آپ کے اکثر مضامین چھپا کرتے تھے۔ ان اخباروں کے علاوہ آپ نے جبل پور کے اخبار "روزنامہ ہمت" اور بعض دیگر اخباروں میں بھی بہت دنوں کام کیا۔ کانپور میں بھی آپ ہر سال سید عبداللہ قلم کی جنتری کی ترتیب کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہاں چند روز "صدائے مسلم" اور اخبار "بیدار" سے بھی آپ کا تعلق رہا۔

دہلی اور بدایوں کے بعد آپ نے اپنا مستقل قیام لکھنؤ میں اختیار کر لیا تھا۔ لیکن جب کبھی کانپور تشریف لاتے تھے تو ایڈیٹر "زمانہ" اور ایڈیٹر "بیدار" سے ضرور ملا کرتے تھے۔ گھنٹوں لطف صحبت رہتا تھا۔ لکھنؤ کے طولانی قیام کی بدولت آپ خود بھی لکھنوی ہوگئے تھے۔ اور سلام و مرثیے کہنے لگے تھے۔ لیکن طبعی شوخی، معاملہ بندی اور تغزل اسمیں بھی نہ چھوڑا۔ چنانچہ آپ کے سلام و مرثیہ کی ابتدا ہمیشہ ساقی نامہ سے ہوتی تھی۔ لکھنؤ میں آپ کے خاص احباب سید جالب، حضرت وصل بلگرامی اور حکیم آشفتہ وغیرہ تھے۔ مگر سید جالب کی وفات کے بعد مولانا نازش کے قیام لکھنؤ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ کبھی کبھی جاتے ضرور تھے لیکن اب لکھنؤ کو وہ مرکزی حیثیت حاصل نہیں رہی تھی۔

نازش صاحب کی وجہ معاش اخباری مضامین اور افسانہ نگاری تھی۔ آپ نے لالہ سری رام صاحب کی نگرانی میں خمخانۂ جاوید کی دوسری اور تیسری جلد کی ترتیب میں بھی بہت دنوں تک کام کیا۔

اسی اثنا میں آپ نے خود بھی ایک تذکرۃ الشعراء لکھنا شروع کیا تھا جس میں ہر شاعر کے کلام کی تنقید تھی۔ مگر اس کا مسودہ دیوان کے ساتھ ریل میں چوری گیا۔

اس چوری کا واقعہ اس طرح ہو کہ ایک مرتبہ جب آپ بدایوں سے لکھنؤ جارہے تھے تو اپنی تمام عمر کی ادبی کمائی ایک ٹرنک میں بھری ہوئی ساتھ تھی۔ دودھیا اسٹیشن کے قریب گاڑی پہونچی تو ایک شخص مولانا کا ٹرنک اٹھا کر ٹرین سے کود پڑا اور مولانا چیختے چلاتے رہ گئے۔ جب گاڑی رکی تو چور کی تلاش کی گئی لیکن اسکا کوئی پتہ چلا اس طرح آپ کی اکثر تصانیف ضائع ہوگئیں جس کا انھیں ہمیشہ صدمہ رہا۔ مگر چونکہ آپ کا کلام اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوچکا تھا اس لئے مولانا حسرت موہانی نے اس کا تھوڑا سا حصہ یکجا کرکے شائع کردیا ہے۔

نازش صاحب طبیعت کے بڑے غیور آدمی تھے۔ کبھی کسی دوست یا عزیز قریب کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ تمام عمر قلم کے ذور سے معاش حاصل کی۔ اور ہنستے بولتے بےفکری کیساتھ زندگی گزاردی۔ اسی سے انھوں نے اکثر اپنے ضرورت مند عزیزوں کی دامے درمے مدد بھی کی چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ لکھنؤ میں سید جالب دہلوی مرحوم بیمار ہوئے۔ اور علالت نے غیر معمولی طوالت کھینچی جس کی وجہ سے ہاتھ تنگ رہنے لگا۔ تو مولانا نازش نے ایک مختصر رقم جو نہ معلوم کتنے دنوں کا اندوختہ تھی، لاکر چپ چاپ جالب صاحب کے سامنے دست بستہ رکھدی۔ گو سید صاحب نے اسے قبول نہیں کیا۔ لیکن اس ذراسے واقعہ سے نازش صاحب کے اخلاص ومحبت کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔

نازش صاحب کی سب سے پہلی تصنیف انکا مزاحیہ ناول "لال بی بی" ہے جو اس زمانہ کی یادگار ہے۔ جب دہلی میں آپ خود ایک "لال بی بی" کی زلف دراز میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس کے بعد "مسٹر نتھو" نے جنم لیا اور تیسرے نمبر پر "مرزا چوں بوں بیگ" پیدا ہوئے۔ مولانا کی تصانیف کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو ان سے دوسرے لوگوں نے اُجرت دیکر لکھوایا اور شائع کیا۔ اُردو اہل قلم کے افلاس کا اکثر لوگ بیجا فائدہ اٹھاتے ہیں چنانچہ نازش صاحب کو بھی اپنی ضروریات زندگی کے خاطر اکثر اوقات دوسروں کی فرمائشات پوری کرنا پڑتی تھیں۔ بہرحال ان چیزوں سے قطع نظر ان کے بہت سے اور معرکہ کے ناول بازار میں ملتے ہیں مثلاً "جہانور نامہ" "گلدستہ قومی" "نازنین مراکش" "معرکۂ فرانس" "معرکۂ الجزائر" "معرکۂ ٹیونس" اور "معرکۂ سمرنا" وغیرہ۔

نازش صاحب آخری بار اسوقت کانپور آئے جب شہنشاہ جارج پنجم کے جشن سلور جوبلی کے سلسلہ

[illegible] اساتذہ میں شمار ہونے والا تھا آپ نے ایک طویل عرصہ [illegible] کر کر
کانپور ارسال فرمایا تھا چنانچہ دفتر زمانہ و آزاد میں آپ گھنٹوں بیٹھ کر اپنے کلام اور چستہ فقروں سے محظوظ فرمایا کرتے تھے۔ کانپور میں جب کبھی آتے تھے کارکنان زمانہ سے ہمیشہ خاص محبت سے ملتے تھے اور قریب قریب روزانہ تشریف لایا کرتے تھے۔

مولانا کی شاعری گو پرانی وضع کی تھی مگر طبیعت کی شوخی کی وجہ سے حضرت یاس مرحوم کی طرح وہ بھی حضرت شیخ اور جناب واعظ کی بہت کافی خاطر مدارات کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے اکثر شعر بے تکلف صحبتوں ہی میں پڑھے جانے کے لائق ہوتے تھے مثلاً

وصل ہوتے ہیں گرے شیخ کی دستار سے بت　　　　کھل گیا قبلۂ دین کعبۂ ایمان ہونا

۱۹۱۹ء میں ایڈیٹر زمانہ نے ایک مختصر بزم سخن منعقد کی تھی جس میں صرف چند شعرا کو اپنا کلام سنانے کی زحمت دی گئی تھی۔ نازش صاحب بھی اس مختصر صحبت میں شامل تھے۔ اکثر احباب نے آپ کے کلام کو سنا اور بہت محظوظ ہوئے۔ بات یہ ہے کہ مشاعرہ میں جب غزل سناتے تھے تو خود شعر بن جاتے تھے۔ زبان کی سلاست اور محاورے کی صفائی کی بدولت انہیں معاملہ بندی میں کمال حاصل تھا ان کے اشعار حسن و عشق کے معرکوں کی تصویریں کھینچ دیتے تھے۔ ذیل کے دو شعر ملاحظہ کیجئے

"سمجھا کوئی بھی تم کہ گئے رو ہیں" - "وہیں تھے ہم"　　　　"وہیں۔ کیسی؟" "وہیں کیا بہانا کیجئے" "بزم دشمن میں"
"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں" "وہاں میری بلا جائے"　　　　"بلا کیوں جائے! تم جاتے ہو چھپ کر۔ بزم دشمن میں"

ان مضامین کو وہ خود خاص طریقہ سے ادا کرتے تھے۔ تو خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

مولانا راغب بدایونی نے آپ کے عادات و عقائد کے بارہ میں ہمسر ذوالقرنین میں لکھا ہے کہ۔

"مرحوم وحدت الوجود کے قائل تھے اور ہر صوفی کے دشمن ہوتے اور قوالی کے رسیا نہ ہوتے کیا وجود تصوف سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ وجود و شہود کی بحثوں میں بہت گہرے جاتے تھے۔ موت اور زندگی کے فلسفہ میں شاعری کرتے تھے۔ وہ زندگی کے مصائب کی نگاہ لگانے کے لئے استغراق و محویت کے سمندر میں ہر وقت ڈوبے رہتے تھے۔ پہروں سکوت کا عالم طاری رہتا۔ گھنٹوں دھوپ اور بارش میں ٹہلتے یا کمرے میں تنہا کرتے رہتے تھے۔ ایسی محویت کے وقت جب وہ گونگے کا گڑ کھا لیتے تھے، خواہ کوئی کچھ کہے، نہ سنتے تھے نہ جواب دیتے تھے۔ لیکن جہاں اس عالم سے نیچے اتر کر عالم ناسوت میں آ جاتے تھے تو مزہ مزہ کی باتیں کرتے تھے۔ اگر کسی سے تیز و تند بحث ہو جاتی تو مخالف کی جان کو آ جاتے تھے..... اور دلائل سے نہیں تو اپنے غصے سے قائل کر لیتے اور اپنے خیالات منوائے بغیر نہ رہتے تھے۔"

محرم کے اول دس دن ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ ایسا ہی امسال بھی کیا۔ پھر کمزور طبیعت اور کمزور آدمی تھے۔ گرمی کے روزوں کی تاب نہ لا سکے۔ بخار آنے لگا۔ کسی طبیب کے معتقد تھے اور نہ کسی کی دوا پیتے تھے اگر خود کوئی دوا دل میں آئی تو کھالی اور بس۔ ندی پر جا کر روزانہ غسل کرتے تھے۔ ابھی طبیعت پورے طور پر بحال نہ ہوئی تھی کہ ۲۶ راپریل ۱۹۳۶ء کو آپ بریلی تشریف لے گئے۔ جہاں طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی۔ قاضی محمد خلیل صاحب جیرال رئیس بریلی نے جو علم وفن کے قدرشناس اور آپ کے بہت بڑے دوست تھے، بہت کچھ علاج کیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ اسی دوران میں قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ حکیم محمد احمد صاحب ٹوی ڈیرہ دون آگئے ہیں تو آپ مولانا کو بھی ڈیرہ دون لے گئے۔ دس بارہ روز تک علاج ہوا۔ مگر زندگی نہ تھی۔ ۲۰ رجولائی کو انتقال ہو گیا اور ۲۱ رجولائی کو تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ آپ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس حساب سے آپ نے ستاون اٹھاون سال کی عمر پائی۔ آپ کی وفات حسرت آیات سے ادب اردو کا ایک محسن اٹھ گیا اور بزم احباب میں ایک مرنجان مرنج صاف باطن دوست کی جگہ ہمیشہ کے لئے خالی ہو گئی۔ خداوند تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

جذباتِ جگر

حضرت جگر بریلوی

ہم کو تا شبِ غم سے مرنا ہے — اب اسی رنگ میں نکھرنا ہے
دلِ مضطر کا خون کرنا ہے — نالۂ غم میں درد بھرنا ہے
زندگی کیا ہے صبر کرنا ہے — خون کا گھونٹ پی کے مرنا ہے
جاں نثاری قبول ہو کہ نہ ہو — ہم کو اپنی سی کر گزرنا ہے
اب کوئی زہر دے کہ بادۂ ناب — ایک پیمانہ ہم کو بھرنا ہے
دیکھ لی ہم نے عشق کی معراج — اس سے آگے بھی اب گزرنا ہے
حسن ہو عشق ہو جنوں ہو کہ ہوش — سب سے بیگانہ دل کو کرنا ہے
موج دریا ہیں ہم ہمارا کیا — کبھی مٹنا کبھی ابھرنا ہے
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں نگاہِ خلوص — دلِ مردہ کو زندہ کرنا ہے
تیغِ قاتل جگر نہیں ملتا — دل کا قصہ تمام کرنا ہے

تنقید کتب

جاپان[1]

جاپان کے متعلق اُردو میں بھی بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن جس اسلوب اور حسین دلکش اور سبق آموز پیرایہ میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کی تعریف نہیں ہوسکتی ہے۔ اس کے مصنف مسٹر چمن لال پیا جن کے دل میں وطن کی محبت اور قوم کا درد ہے چنانچہ انہوں نے اس کتاب کو ناظرین کی تفریح طبع کے لئے نہیں لکھی بلکہ اس خیال اور اس نیت سے لکھی ہے کہ اہل ملک اسے پڑھ کر نہ صرف لطف اندوز ہوں بلکہ جاپان کے حالات سے سبق حاصل کریں اور اپنی فلاح و بہبود کی تدبیریں نکالیں۔

کتاب دراصل مسٹر موصوف نے انگریزی زبان میں لکھی تھی مکتبۂ جامعہ کے مولوی محمود علی خاں صاحب نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ درحقیقت اس کتاب کا ہر فقرہ خلوص اور حب وطن کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔ جس درد قومی سے بیچین ہو کر فاضل مصنف نے یہ کتاب لکھی ہے اسکا اندازہ ان کے الفاظ ذیل سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"میں اپنے ہم وطنوں سے درخواست کروں گا کہ وہ ایک لمحہ کے لیے اس پر غور کریں کہ ۳۰ کروڑ انسانوں کی قوم کیوں دنیا میں ذلیل و خوار ہے۔ آج ہندوستان کا ہندستان کی حیثیت سے کوئی وجود نہیں ہے بلکہ اسے "برطانوی ہند" کہتے ہیں۔ اور دنیا کے اخبارات اسے "برطانوی نوآبادی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی یہ محسوس کیا ہے کہ "برطانوی ہند" کتنا مضحکہ انگیز اور ذلت آمیز لفظ ہے، ہم نے اپنی دولت، اپنی فوجی قوت، اپنی صنعت و حرفت، سب کچھ کھو دی ہے۔ لیکن اس تباہی کی انتہا یہ ہے کہ اب مادر وطن کا نام "ہندوستان" بھی ختم ہو گیا۔ میں آزادی پر کوئی وعظ کہنا نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ اپنی غلامی اور تنزل کے اسباب پر غور کریں۔ میرے نزدیک ہمارے تنزل کے اسباب چار ہیں۔ یعنی (۱) حسد (۲) ڈسپلن کا فقدان (۳) ذاتی اغراض پر قومی مفاد کی قربانی۔ اور (۴) موت سے ڈر۔ اگرچہ مجھے یہ لکھتے ہوئے بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن اسکا اظہار کرنا بھی اپنا فرض

[1] قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔

سمجھتا ہوں کہ ہمارے بعض شخص ہ بنا بھی حسد اور خود غرضی کے جراثیم سے پاک نہیں ہیں۔ وہ
بڑی بڑی قربانیاں کر سکتے ہیں، لیکن افسوس کہ حسد کو ترک نہیں کر سکتے۔

تین چوتھائی صدی پہلے جاپان ایک گمنام اور کمزور ملک تھا، اور اتنا کمزور تھا کہ یورپین قوموں کے جہازوں کی توپوں نے اس کے بندرگاہوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، اور اسے اپنی دو درجن کے قریب بندرگاہیں یوروپین تجارت کے لئے کھول دینے پر مجبور کیا تھا۔ مگر آج وہی جاپان ہے جس نے دیکھتے دیکھتے اسقدر طاقت بڑھالی ہے کہ اب دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی تن تنہا اس سے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ اور صنعت و حرفت و تجارت میں اس نے اسقدر ترقی کی ہے کہ آج تجارتی دنیا میں اسی کا طوطی بول رہا ہے، اور جنگِ عظیم سے پہلے صنعت و حرفت و تجارت میں جو امتیازی خصوصیت جرمنی کو حاصل تھی وہی آج دولت جاپان کو حاصل ہے۔ جاپان ملک پر ملک فتح کرتا چلا جاتا ہے اور کسی سے نہیں دبتا۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب خود فاضل مصنف نے یہ دیا ہے کہ "جاپانیوں کا عمل سریمد بھگوت گیتا کے اس قول پر ہے۔ کہ "آتما امر ہے" لیکن وہی ملک جس نے کرشن جی کو جنم دیا ان کے اس پیغام پر عمل کرنے کو تیار نہیں ہے جو صدیوں سے جاپان اپنے دل پر نقش کئے ہوئے ہے۔ اور جس پر عمل کرکے وہ میدان ترقی میں گامزن اور بام عروج پر جلوہ فگن ہے۔

یہ تو تھیں اس کتاب لاجواب کی معنوی خوبیاں، لیکن یہ کتاب قابل قدر ظاہری خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔ اسمیں ڈھائی درجن سے زیادہ مختلف مقامات، اشخاص، مناظر اور اشیا کی تصویریں ہیں جن سے اس کتاب کی خوبیوں میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ کل کتاب ۱۳ مختلف ابواب میں تقسیم ہے، اور ہر باب اس خوش اسلوبی اور شگفتگی سے لکھا گیا ہے کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ کتاب میں پہلا باب انتہائی جذبۂ وطن پرستی (باب ۲) ہمدرد حکومت (باب ۵) صنعتی ترقی کا راز (باب ۷) بہترین اخبارات اور (باب ۸) سبق آموز کہانیاں، خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔

کتاب کے شروع میں مسٹر ہکالشی چیف ایڈیٹر ٹوکیو نچی نچی واد سا کاینچی کی لکھی ہوئی تقریب اور ڈاکٹر جیمس اے۔ بی۔ شیرر کا دیباچہ ہے۔ ہماری رائے میں پوری کتاب اس قابل ہے کہ ہر محب وطن کو اسے پڑھنا چاہئے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ، حجم ساڑھے دو سو صفحات مجلد۔

---

[1] جاپان کا سب سے بڑا روزنامہ اخبار جس کی اشاعت ۲۵ لاکھ ہے۔

جواہر سخن [illegible] دوم[1]

ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی ایماء سے مولانا کیفی چریاکوٹی نے چھ سال کی محنت سے اردو کے سر برآوردہ شاعروں کا مستقل تذکرہ مع انتخاب کلام چھ جلدوں میں مرتب کیا ہے اور ہندستان کے چھ مشہور ادیبوں نے اس تذکرے کی مختلف جلدوں پر نظر ثانی بھی کی ہے۔ اسکی پہلی جلد جس کی مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے نظر ثانی کی تھی سنہ ۱۹۳۲ء میں طبع ہو چکی ہے چنانچہ رسالہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں اسکی تنقید بھی ہو چکی ہے۔ اسوقت اس تذکرہ کی دوسری جلد ہمارے سامنے ہے جو نامور ادیب سید مسعود الحسن صاحب رضوی ایم۔ اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اس جلد میں ۱۱۴۸ھ لغایت ۱۲۵۰ھ زبان اردو کے اڑتالیس مشہور شاعروں کا تذکرہ مع انتخاب کلام درج ہے۔ شعراء کے ناموں کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ [illegible] مدار ہے۔ بہرحال اس جلد میں اردو شاعری کے دور دوم کے تمام شعراء مثلاً میر تقی میر، سودا، [illegible] سوز، جرأت، انشا، مصحفی، نصیر، راسخ، قائم چاندپوری، شہیدی وغیرہ کا ذکر آگیا ہے۔ گو اس کتاب کی تالیف و ترتیب تمام و کمال مولانا کیفی کی دماغی محنت کا نتیجہ ہے۔ لیکن اسکی تہذیب و ترمیم میں جناب ادیب کا بھی بہت بڑا حصہ ہے چنانچہ ادیب صاحب اپنے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"نظر ثانی کرتے وقت میں نے زیادہ تر حذف و ترمیم سے کام لیا۔ شعراء کے حالات سنین وغیرہ میں مؤلف کتاب کی تحقیق پر اعتماد کر کے صرف غیر ضروری باتیں حذف کر دیں، عبارت میں لفظی ترمیم کر دی، بیان کی ترتیب میں ضروری تغیر کر دیا، اور بعض شعراء کے خصوصیات کلام از سر نو لکھے، کلام کے انتخاب میں بھی زیادہ تر حذف سے کام لیا...... اس کاٹ چھانٹ کے بعد کتاب کی ضخامت نصف کے قریب رہ گئی، پھر بھی یہ جلد تقریباً ایک ہزار صفحوں پر مشتمل ہے۔"

اس تذکرہ کی پہلی جلد میں میر، سودا، سوز جیسے نامور شعراء کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا تھا جس پر نگار کے ریویو میں توجہ دلائی گئی تھی۔ شکر ہے کہ اس دوسری جلد میں اس فروگذاشت کی تلافی کر دی گئی ہے جس کے لئے ہم صاحب تذکرہ کے ممنون ہیں۔ ادیب صاحب بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کیونکہ آپ نے انتخاب کلام میر میں سو سو اشعار کا اضافہ فرمایا ہے۔ اس سلسلے میں ادیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"سودا کے قصیدے اور ہجویں، میر کی مثنویاں اور واسوخت، میر حسن کی مثنوی سحر البیان" ا ن

[1] قیمت آٹھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ کتابستان الہ آباد

چیزوں کے جو انتخابات اس کتاب میں شامل ہیں ان کا ذمہ دار زیادہ تر میں ہوں۔ میر تقی میر کے حالات اور مقدمہ کتاب ...... یہ دونوں چیزیں بھی میں نے از سر نو لکھی ہیں"۔

شعرا کے سوانح حیات قلمبند کرنے میں زائد از ضرورت ایجاز سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے ...ر وہ تشنہ اور تحصیل طلب رہ گیا ہے۔ مثلاً جرأت جیسے مشہور شاعر کے حالات کے لئے پون صفحہ، قائم ...پوری کے ہمعصر بیتاب کے لئے ڈیڑھ سطر، مجذوب کیلئے پونے تین سطر اور ماہر کے لئے جو سودا ...شاگرد تھے صرف سوا دو سطریں کافی سمجھی گئی ہیں۔ البتہ منتخب کلام کی مقدار کافی ہے۔ مگر اس کے ...ت بھی حضرت ادیب فرماتے ہیں۔ کہ

"میں نے اس کتاب پر نظر ثانی کرنے میں بہت سا وقت صرف کیا۔ اور بہت کچھ حذف و اضافہ کیا پھر بھی یہ انتخاب ایسا نہ ہوا جیسا میرا جی چاہتا تھا"

ہمکو بھی افسوس کیساتھ اس جلد کے متعلق بھی اُس ریمارک کا اعادہ کرنا پڑتا ہے جو زمانہ دسمبر ۱۹۳۲ء ...سکی پہلی جلد کے ریویو میں شائع ہو چکا ہے یعنی

"کتاب زیر تنقید میں اکیڈیمی کے قائم کردہ اصولوں کی تکمیل نہیں ہو سکی"

اس کتاب میں صحت طباعت کا بھی چنداں خیال نہیں رکھا گیا ہے مگر شکر ہے کہ اس کے آخر ...ساڑھے تین صفحہ کا غلطنامہ دیدیا گیا ہے۔ بہرحال ابھی اس تذکرہ کی چار جلدیں اور باقی ہیں۔ ...ہے کہ یہ جلدیں کافی غور و خوض اور احتیاط کیساتھ شائع کیجائیں گی تاکہ یہ نقائص باقی نہ رہیں۔ ...ب ٹائپ کے حروف میں چھپی ہے۔ کاغذ دبیز حجم ۴۰۸ صفحات۔

جہان آرزو[1]

کئی برس ہوئے سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی جانشین جلال مغفور کا پہلا دیوان فغان آرزو ...لع ہوا تھا۔ اس کے بعد آپکی ایک مختصر مگر جامع اور معنی خیز تصنیف نظام اردو کے نام سے شائع ہوئی جیسا کہ حضرت ...نف خود فرماتے ہیں، یہ کتاب علم بلاغت کے ایک نئے شعبہ علم تنسیق کلمات کی پہلی کتاب ہے جسمیں اردو ...ن کے اجزائے ترکیبی کی تحقیق و تشریح کی گئی ہے اور مترادفات کیلئے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اب غالباً آپ کا ...سرا دیوان جہان آرزو کے نام سے شائع ہوا ہے اور ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اس کے شروع میں مصنف نے شاعری کا ...

---

[1] مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ آہنی چھاپ۔ قیمت ایک روپیہ عہ

عناصر کے متعلق سات صفحات کا ایک مفید اور دلچسپ مضمون اسپر رقم فرمایا ہو نظام شمسی کی طرح یہ مضمون بھی شائقین سخن اور ماہرین فن کی توجہ کے قابل ہو ہم یہ تو نہیں کہتے کہ آرزو صاحب کی ہر رائے کو ہر شخص مان لے گا مگر اتنا ضرور کہیں گے کہ انکی تحریر ہر اعتبار سے اس قابل ہو کہ اسپر غور کیا جائے اور جن مسائل پر اسمیں بحث کی گئی ہو انکو اصول فن اور مذاق سلیم کی کسوٹی پر کسا جائے اور ان کے حسن و قبح کو جانچ کر ان پر صحیح رائے قائم کیجائے۔ حضرت آرزو کا شمار لکھنو کے اساتذہ میں ہو وہ جو کچھ کہتے ہیں اپنے رنگ میں خوب کہتے ہیں۔ اسی دیوان کی پہلی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آگئی منزل مراد بانگ درا کو بھول جا ذات خدا میں یوں ہو محو نام خدا کو بھول جا
جس پہ مرض کا تھا گمان اصل شفا تو ہے وہی لذت درد کو نہ بھول فکر دوا کو بھول جا
چشم طریق وا تو کر خود یہ پکار اٹھے گا دل قبلہ ترا کدھر نہیں قبلہ نما کو بھول جا

غزل کو اکثر لوگ ایک فرسودہ اور فضول صنف سخن سمجھتے ہیں آرزو صاحب غزل کے متعلق فرماتے ہیں اور صحیح فرماتے ہیں:-

ظاہرا اک صنف ہو محدود سی جس سے ہو منسوب عشق و عاشقی
باطناً دنیائے لامحدود ہے کل کا کل اس جزو میں موجود ہو

ناظرین کی دلچسپی کے لئے ہم چند اور اشعار دیوان سے نقل کرتے ہیں:-

درد جاں پرور پہ اپنے اس کی حسرت دیکھئے ہو نہ باقی موت کی بھی آس جس بیمار کو
پہلے جگر پہ چوٹ کھائے پھر کہیں حال دل سنائے شرط کرم کے بس نثار۔ حسد کے ستم نواز ہو
تقرب کا ہو مژدہ ہر کڑی منزل کا طے ہونا بڑھے غم جس قدر اتنا ہی دل مسرور ہوتا ہو
ہیرا بھی ہو دل تو پتھر ہے یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے ہاں پانی ہو کر بہ نکلے پھر جو قطرہ ہے موتی ہے
غمزاد رہی جب کاوش رکھیں راحت کی امید کروں کس سے اب نیند بھی راتوں کو آکر کانٹے آنکھوں میں چبھوتی ہے

جناب آرزو کئی برس سے خالص اردو میں غزلیں کہتے ہیں جسمیں کوئی لفظ فارسی عربی کا نہیں ہوتا اور ساتھ ہی اس کے درجہ تغزل سے اشعار گرنے نہیں پاتے بقول انشاء "ہندوی پن بھی نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھسے جانے جیسے بھلے مانس اچھوں سے اچھے لوگ آپس میں بولتے چالتے ہیں جوں کا توں وہی سب ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے":

اس قادر الکلام اور مشاق شاعر نے پرانے ڈگر سے ہٹ کر جو راہ اپنے لئے نکالی ہو وہ ضرور قابل داد ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کے خالص اردو کلام کا مجموعہ جلد شائع ہو۔ (م-ل)

علمی خبریں اور نوٹ

ناظرین یہ خبر سنکر رنجیدہ ہونگے کہ آجکل اردو کے قدیم محسن اور ملک کے نامور افسانہ نگار منشی پریم چند صاحب سخت علیل ہیں۔ آپکو عرصے سے ضعف معدہ کی شکایت تھی۔ اب جلندھر کا مرض ہوگیا ہے جس سے ہاضمہ کی قوت بہت ہی کم ہوگئی ہے اور آپ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ پچھلے ماہ آپ میڈیکل کالج کے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے لکھنؤ آئے تھے۔ مگر وہاں کچھ زیادہ افاقہ نہیں ہوا۔ آپ پھر اپنے وطن بنارس واپس گئے۔ اور آجکل وہیں ہیں۔ ڈاکٹری علاج ہو رہا ہے جس سے طبیعت کچھ سدھری ہوئی ہے۔ خدائے تعالیٰ آپکو جلد صحت کامل عطا فرمائے۔ اردو و ہندی دونوں پر آپ کے احسانات عظیم ہیں۔ الحمدللہ آپکے ادبی خدمات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ چنانچہ حال ہی میں منشی پریم چند صاحب کا ایک دلکش و سبق آموز ناول "میدان عمل" کے نام سے مکتبہ جامعہ دہلی سے اور مختصر افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ "زاد راہ" کے نام سے حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا ہے۔ میدان عمل کی قیمت تین روپیہ اور زاد راہ کی ایک روپیہ ہے۔

مولانا سیماب اکبرآبادی اردو کے پرانے محسن ہیں۔ آپ کے زیر نگرانی ایک خالص ادبی رسالہ "شاعر" بھی آگرہ سے شائع ہوتا ہے۔ اسکا جون جولائی کا مجموعی نمبر "آگرہ نمبر" کے نام سے خاص اہتمام کیساتھ شائع ہوا ہے جس میں آگرہ کے تمام مشہور ادیبوں اور شاعروں کے مفصل حالات درج ہیں۔ زمانہ حال کے آگرہ کے اہل قلم اصحاب کی تصاویر نے اس نمبر کی دلچسپی اور بھی دوبالا کردی ہے۔ میر تقی میر کی تصویر بھی شائع ہوئی ہے جو اگر صحیح ہے تو شائقین ادب کے لئے ایک غیر معمولی دلچسپی کی چیز ہے۔

ہمکو یہ معلوم ہوکر خوشی ہوئی کہ آجکل مولانا سیماب اکبرآبادی اپنی ادبی نظموں کا دوسرا مجموعہ "پیام فردا" کے نام سے ترتیب دے رہے ہیں۔ آپکی غزلیات کا دوسرا مجموعہ بھی قریب قریب تیار ہوگیا ہے جو عنقریب "توراتِ مشرق" کے نام سے شائع ہوگا۔

دار المصنفین اعظم گڈھ نے "مقالات شبلی" کے نام سے شمس العلما مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے تمام مضامین نثر پانچ جلدوں میں یکجا کرکے شائع کر دینے ہیں۔ حال میں اسکی پانچویں جلد طبع ہوئی ہے جسکی ضخامت ۲۰۰ صفحات اور قیمت ایک روپیہ ہے۔

آجکل مولوی نصیر الدین ہاشمی کی مقبول عام تالیف "دکن میں اردو" کا چوتھا ایڈیشن زیر طبع ہے۔ نئے ایڈیشن میں فاضل مولف نے اصل کتاب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے جس کی وجہ سے اب یہ اپنے موضوع پر ایک حد تک مکمل ہوگئی ہے۔

پچھلے دو تین سال سے انجمن اردو اورنگ آباد نے اپنے اولوالعزم سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب بی اے کے زیر نگرانی اردو شاعروں کے قدیم اور نایاب تذکروں کا ایک قابل قدر سلسلہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اردو زبان کی ابتدائی تاریخ پر ان تذکروں سے غیر معمولی روشنی پڑتی ہے۔ حال میں انجمن نے [illegible] اورنگ آبادی کا تذکرہ شعراء شائع کیا۔

[redacted]

[redacted]

[redacted]

کمالِ داغ

حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوان کا انتخاب
مع مقدمہ تنقیدی مرتبہ مولانا حامد حسن قادری
مقدمہ میں (۱) اردو غزل گوئی پر بنیادی ...
نگاہ سے تنقید کرکے غزل کے قدیم ...
حالی صاحب پر ... ڈالی گئی ہے ...
(۲) حضرت داغ کی غزل ...

[illegible]

اس کھانسی کو بند کیجئے

[illegible]



زمانہ

جلد ۶۷ — ستمبر ۱۹۳۶ء — نمبر ۳

انیس پر ایک سرسری نظر

(از سید وصی رضا۔ ایم۔ اے۔ ریسرچ سکالر لکھنؤ یونیورسٹی)

کسی قوم کے فنون لطیفہ کی عظمت کے لئے قوت تنقید کی ترقی ضروری ہے۔ ایشیائی قوم میں بھی فطرت انسانی کے مطابق حسن و قبح کا حکم تو لگایا جاتا تھا لیکن تصویر کے تمام خد و خال کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ تھی۔ مجموعی طور سے کسی ادب یا ادبی شاہکار کی نسبت بلندی یا پستی کا اطلاق ختم کر دیا جاتا تھا لیکن اسکی صناعی کی دقت و موشگافیاں نظر انداز ہو جاتی تھیں۔ یورپ میں تنقید کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہے اور ہر سال اس پر متعدد کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مغربی ادب کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا ہے لیکن ارباب ادب اُردو بد قسمتی سے قوت تنقید کو عموماً اپنے باکمالوں کی تنقیص پر صرف کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی صنعت کی تعریف کا صحیح سلیقہ اس کی مذمت یا نکتہ چینی سے کہیں بہتر ہے۔ کسی چیز کی اصلی خوبی کو سمجھ لینا اتنا آسان نہیں ہے جتنا اسکی برائی کو محسوس کر لینا۔ اسی خود بیزاری کے سبب سے ہمکو اپنے باکمالوں کے کلام میں اغلاط اور غیر فطری واقعات کے سوائے کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے۔ جب کوئی شخص محض اعتراض کی نگاہ سے کسی چیز کو دیکھے گا تو ظاہر ہے کہ اسکی خوبیوں پر نظر ہی نہ پڑے گی اور اگر محاسن کا احساس بھی ہوا تو انکی پوری قدر دانی ممکن نہیں ہے۔

فرانسیسی نقاد سینٹ بو کا قول ہے کہ پڑھنا۔ سمجھنا۔ محبت کرنا اور دوسروں کو محبت پر آمادہ کرنا حسن مذاق پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی پہلے پھولے باغ سے عمدہ عمدہ پھول چن کر انکا گلدستہ بنا کر پیش کرنا

نگہیں کا فرض ہے کہ تیز اور چبھتے ہوئے کانٹوں کو سمیٹ کر یہ ثابت کرنا کہ جو گلستاں لہلہاتا ہوا نظر آتا ہو وہ درحقیقت خارزار ہو۔

انیس بھی انہیں مظلوموں میں ہیں جن کا جگر بے اعتنائی کے کانٹوں سے مجروح اور جن کا دل اعتراضوں کے تیروں سے چھلنی ہوا ہو۔ اگر خوش قسمتی سے یورپ کے کسی خطہ کو انکا وطن ہونیکا شرف حاصل ہوتا تو آج لوگ ان کے ایک ایک بند پر بڑی بڑی سلطنتیں قربان کرنے پر تیار ہوتے۔ ان کے کلام پر سر دھنتے اور دوسروں سے ان کے ادبی معجزات کا اعتراف سنکر جامہ میں پھولے نہ سماتے۔ مگر بدقسمتی سے وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اردو ادب میں وہ سخن ور ہی جس کے حامی محسن کشی میں الشر ہیں۔ اسلئے ان کو نہ وہ بین الاقوامی شہرت حاصل ہو جسکا فخر ہومر اور شکسپیر کو نصیب ہوا اور نہ ان کے مراثی کی وہ عالمگیر قدر و منزلت ہو جو گیٹے کی فاؤسٹ یا ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ کے حصہ میں آئی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے لگائے ہوئے باغ پر اعتراضات کی اوس انکی ریاضت کو خاک میں ملا رہی ہو۔

سب سے پہلے نساخ نے ایک رسالہ اغلاط انیس و دبیر پر لکھا (تطہیر الاوساخ۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ اور المیزان وغیرہ میں اسکی تفصیل موجود ہی) جسمیں بہ حیثیت مجموعی کاتبوں کی بے پروائی سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اور دو باکمال اور جلیل القدر ہستیوں کو ہدف اعتراض بناکر اپنی علمی قدر اندازی کا سکہ دلوں پر جمانے کی کوشش کی گئی۔ آجکل بھی چند شہرت پسند نقادوں نے یہی رویہ اختیار کیا ہو۔ البتہ علامۂ شبلی مرحوم نے موازنہ انیس و دبیر لکھ کر ادب اردو پر احسان عظیم کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس باکمال نے خوب خوب داد تنقید دی لیکن جن اعتراضات کا اعتراف علامۂ موصوف نے ازراہ منصف مزاجی۔ تصویر کے دونوں رُخ دکھانے کے لئے کیا ہو ان کے متعلق ہم کو انکی رائے سے اتفاق نہیں۔ اس سے میری یہ مُراد نہیں ہو کہ انیس کا کلام غلطیوں سے پاک ہو۔ اسمیں بمقتضائے بشریت لغزشیں بھی ہیں اور غلطیاں بھی۔ لیکن میر انیس نے لاکھوں شعر کہے ہیں اور اگر ان میں بعض میں کچھ خامیاں رہ گئیں تو اس سے ان کے کمال پر حرف نہیں آسکتا" (نقد الادب صفحہ ۴۹)

اسٹینلے وڈ نے شکسپیر کے صرف ایک ڈرامہ (Twelfth Night) میں پانچ خامیاں دکھائی ہیں لیکن اس سے شکسپیر کے دامن کمال پر داغ نہیں آسکتا۔ ایک عام اعتراض مرثیوں پر بالعموم اور مراثی انیس پر بالخصوص یہ کیا جاتا ہو کہ اسمیں مقامی رنگ نہیں ہو۔ یعنی انیس عرب کے ریگستان پر ایران کے ہرے بھرے باغ لگاتے اور نینوا کے چٹیل میدان پر سبزہ کا فرش بچھاتے ہیں۔ وہ عرب کے بے تکلف کرداروں میں اودھ کی شرم و حیا کے انداز دکھاتے اور تمدن عرب کی تصویریں

مذہب ہند کا رنگ بھر سکتے ہیں۔

مگر معترض کو پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ شاعر کا مقصد کیا ہے؟ اسکو دراصل دو باتوں کا لحاظ کرنا ناگزیر ہے

مرثیت اور شعریت

بمقتضائے مرثیہ نگاری انکا فرض تھا کہ وہ ہر طبقہ کے آدمیوں کو متاثر کرنیکی کوشش کرتے۔ اگر عرب کی صداقت کیساتھ عربی طرز معاشرت اور عربی رسم و رواج کی ترجمانی کرتے تو ان کو ہرگز اسقدر کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ ان کے کلام سے مستفید و مستفیض ہونے والے ہندوستان کے رہنے والے تھے۔ ان کے قلوب کو متاثر کرنے کے لئے ضروری تھا کہ انیس اپنے رجال داستان کو خود سننے والوں کے ماحول۔ انکی معاشرت۔ اور انکی ذہنی فضا کی جیتی جاگتی تصویریں بنا کر پیش کرتے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو جو سربلندی اور عظمت انھیں آج بحیثیت صناع اور شاعر کے حاصل ہے وہ نصیب ہو سکتی

(نقد الادب صفحہ ۱۹۰)

ملٹن نے اپنی مشہور آفاق تصنیف پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) میں شیطان کی متعدد ارواح (Spirits) کی جو کیفیات ادا کی ہیں وہ تمام تر فطرت انسانی سے مطابق ہیں۔ پروفیسر بروک (Stopford Brooke) نے تو یہاں تک کہدیا کہ بعل زبب (Beelzebub) کے کردار میں چارلس کے مشیر سٹریفورڈ (Strafford) کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ پیراڈائز لاسٹ (حصہ دوم) کی شیطانی مجلس کا مباحثہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے گویا مجلس آئین ساز میں بیٹھا ہوا مقررین کی دھواں دھار تقریریں سن رہا ہے۔ اگر مولک بیلیل۔ میمن اور بعل زبوب کے منہ میں انسانی زبانیں نہ رکھدی جاتیں تو مورخین ادب کے سوائے آجکل کون اس کتاب کو اسقدر ذوق و شوق سے پڑھتا؟۔ اگر انیس بھی عربوں کے طرز کلام میں تمام کیفیات کو ادا کرتے تو ظاہر ہے کہ عوام الناس کے لئے ان کے مرثیئے ایک عجوبہ چیز ہو جاتے۔ نہ دلوں پر چوٹ لگتی نہ شدید جذبہ طاری ہوتا اور نہ ان کے قلوب اتنے متاثر ہوتے کہ درد لہو بنکر آنکھوں سے ٹپکتا جو مرثیہ کا حاصل ہے۔ مثال کے ذریعہ سے یہ امر زیادہ واضح ہو جائیگا۔

جب اہل بیت اطہار مدینہ سے رخصت ہونے لگے تو حضرت صغریٰ کا حال غیر ہو گیا۔ ماں سے التجا کی کہ چلتے چلتے ننھے بھائی علی اصغر کی شکل ایکبار پھر دکھا دو۔

مضطر ہوئی سنکر یہ سخن بانوئے بے پر پردہ سے جگر بند کا منہ کر دیا باہر

بی بی سے کہا دست پسر ہاتھ پہ رکھ کر لو آخری تسلیم بجا لاتے ہیں اکبر
منہ زرد ہے رخساروں پہ آنسو بھی بہے ہیں
یہ نرگسی آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہے ہیں

عرب میں یہ رسم رائج نہیں ہے بلکہ اودھ کا مخصوص طریقہ ہے۔ لیکن اس طرز بیان سے اس حسرتناک رخصت کا کیا صحیح نقشہ حاضرین مجلس کے پیش نظر ہو جاتا ہے۔

اگر انیس عرب کے ریگستانوں کی خاک اڑاتے اور بے گیاہی پر اشک حسرت ٹپکاتے تو باغ وراغ کے دلکش مرقعوں اور صبح و شام کے رنگین مناظر کی اعلیٰ تصویروں سے ہمارا نگارخانۂ ادب خالی رہتا۔ اگر انیس نے صرف بیابانوں کی خاک بیزی کی ہوتی تو ادب اردو کا دامن ایسے ایسے آبدار موتیوں سے محروم رہتا۔

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

بہت سے مقامات پر مقامی رنگ سے گریز ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً:۔

دشت میں چلتی ہے لو۔ دھوپ کی شدت ہے کمال جیٹھ بیساکھ کے ایام ہیں اور وقت زوال
سرخ ہے خوں سے قبا دھوپ سے رخسار ہیں لال نکلی آتی ہے زباں منہ سے یہ ہے پیاس سے حال
تن جلا جاتا ہے جب گرم ہوا آتی ہے
ریت اڑ اڑ کے ہر اک زخم میں بھر جاتی ہے

یہاں کسی عربی مہینے کے نام سے سامعین پر جنکی زیادہ تعداد عوام پر مشتمل ہے خاک اثر نہ پڑ سکتا۔ کیونکہ انکا دماغ کسی نادیدہ ملک میں ناشنیدہ موسم کے تخیل سے خالی ہے۔

معترضین کو انیس سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ ضعیف روایتوں کو نہ صرف بے تکلف نظم کر دیتے ہیں۔ بلکہ انہیں خاص طور سے رنگ آمیزی کر کے صفحۂ سادہ کو رنگین و پرکار بنا دیتے ہیں لیکن نقادان ادب کو مورخ اور شاعر کا فرق پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ انیس کے مرثیے مذہبی یا تاریخی تصانیف کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ فن شعر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ فنی اعتبار سے اگر اسمیں خامیاں پائی جائیں تو ان کے اظہار میں مضائقہ نہیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اُن کے مرثیوں کو جانچنا اصولی غلطی ہے جس طرح ڈاروِن کی (Origin of Species) کو ادبی معیار سے پرکھنا صحیح نہ ہوگا بالکل یہی کسی تماشے سے صحیح لطف ہم کو اسیوقت حاصل ہوتا ہے جب وہ فرضی ہو۔ ڈرامہ نگار کا فرض محاکات

ہے ویسا ہو بہو نقشہ کھینچا نہیں ہے وہ اہلِ فن ہونہ کرو ذرا غور سب جانتے ہیں کہ سکندر نامہ نظامی کی تاریخی اہمیت کیا ہے اور یوسف زلیخائے جامی کہاں تک واقعہ کے مطابق ہے۔ پھر بھی فارسی ادب میں ان کا پایہ کس قدر بلند ہے۔ شاعر کا فرض واقعہ نگاری نہیں بلکہ اثر انگیزی ہے۔ وہ ایک ایسا مصور ہے جو صرف ان اجزاء کو لیتا ہے جو کسی جذبہ کے محرک ہوں۔ ان میں اضافہ یا تخفیف کر کے اپنے بیان کو اصل چیز سے زیادہ موثر بنا دینا اس کا کام ہے۔ اگر ترتیب واقعات میں کوئی کمی رہ جائے یا جذبات غیر فطری طور پر نظم کرئے جائیں تو البتہ وہ قابلِ اعتراض ہے۔ لیکن یہی خصوصیات انیس میں ممتاز و نمایاں ہیں۔ وہ واقعات کی ترتیب بلکہ جزویات کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ اور جذباتِ انسانی کا اس طرح اظہار کرتے ہیں جیسے ہم خود محسوس کر رہے ہوں۔ صاحب "یادگار انیس" نے درست لکھا ہے کہ یہ غلط سہی کہ حضرت صغریٰ وطن میں رہ گئیں پھر بھی اگر یہ واقعہ جزو مرثیہ نہ ہوتا تو اردو زبان کو یہ لاثانی بیت میسر نہ ہوتی۔

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

سارا کنبہ عازمِ سفر ہے۔ مگر ایک بیمار بچی کو وطن میں چھوڑ جانے کا ارادہ ہے۔ وہ چلنے پر بضد ہے۔ ہر ایک کی طرف بہ نگاہِ حسرت دیکھتی ہے۔ مگر سب کا رُخ پھرا ہوا پاتی ہے۔ امام عالی مقام کا حکم ہے۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ کس ساحرانہ انداز میں اس نفسی کیفیت کی تصویر کھینچی ہے۔

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

حضرت قاسم کی شادی ملا حسین واعظ کاشفی صاحب روضۃ الشہدا کا من گھڑت افسانہ سہی لیکن انیس نے اپنے قلم سے دولہا کی رخصت کے وقت جذباتِ فطرت کے کیسے پُر اثر اور صحیح نقشے کھینچے ہیں۔

گھونگھٹ ہٹا کے ہم کو دکھاؤ تو رُخ کا نور پاس اب نہ آسکیں گے کہ ہوتے ہیں تم سے دور
آنکھوں پہ ہیں ہتھیلیاں رقت کا ہے وفور نرگس کے پھول ہاتھ سے ملنا یہ کیا ضرور

بیٹھے کی اس چمن میں خوشی دل سے فوت ہے
بلبل جو گل کی شکل نہ دیکھے تو موت ہے

صاحب! بھلا عدم کے مسافر سے کیا حجاب ہم یوں ہیں جس طرح کہ سرِ آب ہو حباب
ایسی رواروی میں ٹھہرنے کی کب ہو تاب کہتی ہے موت گور کی جانب چلو شتاب

رستہ ہے پُر خطر کہیں وقفہ ذرا نہ ہو
منزل بہت کڑی ہے پہ جلدی روانہ ہو

مصیبت کی ماری - نئی نویلی دلہن پر اس کا کیا اثر ہوا ؟ اس نے صرف ایک جملہ کہا لیکن اس اجمال پر ہزار تفصیلیں نثار - ایک تو وفور گریہ - دوسرے فرمایا - اس پر کرتا ہی وقت - لیکن اس نباض فطرت نے "اک آہ کی" کا اضافہ کر دیا جس میں ہزاروں ناگفتہ حسرتوں اور سیکڑوں بیتاب آرزوؤں کے خون کی بو شامل ہے -

جب یہ سخن کلام تو بی بی سنا گیا ۔۔۔ دل پر چھری چلی کہ جگر تھرتھرا گیا
منہ پر دلہن کے صاف رنڈاپا سا چھا گیا ۔۔۔ جوشش بکا میں کچھ نہ زباں سے کہا گیا
دولہا کو اتنی بات سنا کر اک آہ کی
صورت بتاتے جاؤ ہمارے نباہ کی

اس موقع پر کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو شکوہ و شکایت کا دفتر کھول دیتا لیکن انیس اس رمز کو خوب سمجھتے تھے کہ "جب دل بھرا ہوتا ہے تو الفاظ کم نکلتے ہیں"۔

بعض ستم ظریفوں نے انیس کے کلام پر ناہمواری کا الزام دھرا ہے - پہلی بات تو یہ کہ ناہمواری سے کسی شاعر کی قدر و منزلت کم نہیں ہوتی - میر کی استادی باوجود اس نمایاں خصوصیت کے غزل گوئی میں مسلم ہے - دوسرے یہ کہ اگر انیس کا کلام ناہموار ہے تو اردو کے کس شاعر کا کلام ہموار کہا جاسکتا ہے؟ انیس کے کلام کا خاص جوہر ہمواری ہے - غالباً تدریجی مراحل کے اتار یا چڑھاؤ کو ناہمواری پر محمول کیا جاتا ہے - حالانکہ یہ ایک اعلیٰ خصوصیت ہے جسکو Climax کہتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ انیس کے کلام میں کہیں جزالت و ضخامت - کہیں سلاست و روانی دیکھکر یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ اس کے کلام میں یکسانیت نہیں ہے - تنوع کی بنا پر مرثیہ میں زبان کا اختلاف ضروری ہے - میدان جنگ کا نقشہ کھینچنا ہو تو دلاوروں کی رجز خوانی گھوڑوں کی جست و خیز تلواروں کی مار کاٹ اور زخمیوں کی چیخ پکار کے لئے پُر زور الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں - مثلاً -

گھوڑوں کی وہ تڑپ وہ چمک تیغ تیز کی ۔۔۔ سو سو صفیں کھل گئیں جب جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی ۔۔۔ تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی
آدھی جو ہو گئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تینوں نے منہ پھرا لئے تھے کارزار سے

جب ضرب لگی زمیں کے طبق ہل کے رہ گئے ۔۔۔ سر اڑ گئے تنوں سے گلے مل کے رہ گئے
زخموں کے پھول چار طرف کھل کے رہ گئے ۔۔۔ بسمل تڑپ کے سامنے بسمل کے رہ گئے

ہمدم خدا کا لٹ گیا دل پر عذاب تھا
لاشے اٹھ گئے یہ نیا انقلاب تھا

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در　　جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جھکتے تھے کانپ کانپ کے گرتے تھے ادھر　　دنیا میں خاک اڑتی تھی جاتی جدھر نظر
اندھیر ہے اُٹھی برکت اب جہان سے
دہل گیا زمیں کا طبق آسمان سے

قیدخانہ میں ماں یتیم بچی کو بہلا پھسلا کر سُلانا چاہتی ہو تو اس کے لئے نہایت سہل و سادہ الفاظ اور آسان طرز بیان کی ضرورت ہے۔ مثلاً

بانوئے حزیں کہتی تھی با گریہ و زاری　　گھر ایسا ہی لٹتا ہے گنہگاروں کو واری
لو سو رہو آنسو نہ گراؤ آنکھوں سے جاری　　سُن لیوے کہیں شمر نہ آواز تمہاری
ماں صدقے گئی سہہ لو جو کچھ رنج و تعب ہے
پھر باندھ دے رسّی سے جو گردن تو غضب ہے

سانسیں نہ بھرو ہچکیاں لے لے کے نہ روؤ　　کڑھ کڑھ کے میں صدقے گئی جاں اپنی نہ کھوؤ
مل جائیں گے بابا بھی منہ اشکوں سے نہ دھوؤ　　قربان گئی آؤ مری گود میں سوؤ
اب سبط پیمبر سے ملا دیویں گے تم کو
آویں گے جو بابا تو جگا دیویں گے تم کو

شب کو تو ذرا لیٹ رہو سوئی ہو دم بھر　　میں پاس تمہارے ہوں جو بابا نہیں سر پر
دیکھو تو کہ جنگل میں پڑے ہیں علی اصغر　　نے لاش پہ سایہ ہے نہ مرقد ہے میسر
پالا تھا جسے چھاتی پہ سُلا کر
وہ ہم سے جدا ہو گئے پردیس میں آ کر

یہ ضرور ہے کہ انیس کے ابتدائی دور کے کلام میں وہ پختگی نہیں جو مشق سخن بڑھنے کے بعد پیدا ہوئی لیکن یہ فرق اتنا نازک اور غیر محسوس ہے کہ ہم مرثیوں میں ترتیب زمانی قایم نہیں کر سکتے۔

نئی روشنی کا تعلیمیافتہ طبقہ انیس کے کلام پر یہ اعتراض وارد کرتا ہے کہ انیس کا کمال شاعری مسلم لیکن صنائع لفظی و بدائع معنوی سے (جو اُردو شعرا کے کلام کا نمایاں عیب ہے) انیس کا کلام بھی خالی نہیں ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ صنعتوں کا استعمال درحقیقت عیب نہیں بلکہ ہنر ہے کیونکہ

بھی عروس سخن کے زیورات ہیں۔ بشرطیکہ سلیقہ کے ساتھ کم کم اور اعتدال کیساتھ کبھی کبھی استعمال کئے جائیں اور معنی کو الفاظ کی صنعت گری پر قربان نہ کیا جائے۔ اگر لطافت معانی و بیان کیساتھ لطافت بدیع اس طرح شامل ہو جیسے مرصع زیورات پر نگینے تو کلام کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے۔ صنائع و بدائع کی افراط سے البتہ کلام سست و بے مزہ ہو جاتا ہے چنانچہ امانت کی شاعری بھانڈ کی نقل ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ سوسائٹی کے دباؤ اور کم عیار حریفوں کے مقابلہ نے انیس کو ہر جگہ جادۂ استقامت پر قائم رہنے نہیں دیا بلکہ اس دھر پتے کی طرح جسے مجلس کے بے مغزوں کو رجھانے کے لئے کبھی کبھی بارہ ماسا چوبولے بھی الاپنے پڑتے ہیں اکثر مبالغہ و اغراق کی آندھیوں کے طوفان اُٹھانے پڑے ؎ (مقدمۂ شعر و شاعری) لیکن اس میں بھی جہانتک ہو سکا انہوں نے بے اعتدالی اور بے راہ روی سے گریز کیا ہے۔ اور اپنے خداداد حُسن مذاق سے صنعت نگاری کے نہایت اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں مثال کے طور پر میں صرف تشبیہ کی چند مثالیں انیس کے کلام سے پیش کرونگا۔

انیس کی اکثر تشبیہات نہایت لطیف اور معنی خیز ہوتی ہیں۔ وہ اس ذریعہ سے نہ صرف کلام کی رونق دوبالا کر دیتے ہیں بلکہ مضمون میں بھی ترقی پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض موقعوں پر تشبیہ کا استعمال ضروری ہوتا ہے اگر شاعر ایسے مواقع پر سیدھے سادے انداز سے کام لے تو سامع کو کوئی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ احساس غیر محسوس چیزوں کے بیان میں بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً گھوڑے کے آہستہ آہستہ چلنے کا صحیح نقشہ کھینچنے کے لئے محض تصریح اتنی مفید نہیں ہو سکتی جتنی تشبیہ۔

آمد فرس کی تھی دلہن آتی ہے جس طرح   تھم تھم کے نکہت چمن آتی ہے جس طرح
تصویر آہوئے ختن آتی ہے جس طرح   یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح

باہم جلو رکتے تھے کبک دری ہے یہ
گھوڑے پر لوگ پانتے کہ بیشک پری ہے یہ

گلعذاران محمدؐ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں   جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں بکس گئیں

مؤذن یوسف جمال کی حُسن صوت کا انداز دکھاتے ہیں۔

شیبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں   بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

تلوار کی تیزی کی مثال دیتے ہیں۔

یوں دوڑتی تھی تن میں لہو جیسے رگوں میں

قید خانہ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

کیا کہیے تنگی خرابے کا کیا بیاں
صحبت وہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں
وہ شب کا گھر وہ اندھیرا کہ الاماں
ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے وہ تنگ تھے کہ ہوا کا گزر نہ تھا

مثل دل یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ
تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ
چھایا تھا دل جلی ہوئی رانڈوں کا دود آہ
حجرے سے چشم تر کے نکلتی نہ تھی نگاہ
دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشم غزال تھا

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر
ظاہر تھے جا بجا حشرات زمیں کے گھر
تھے وقف آشیان ابابیل سقف و در
نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

وہ تیرگی کہ ہو شب ظلمات اس سے دنگ
ہر ذرہ سان حجرۂ چشم بخیل تنگ
تھی واں کی صبح و شام سواد دیار زنگ
دیوار و سقف و بام و زمیں سب سیاہ رنگ
قید اس میں تھے حرم شہ گردوں مقام کے
کیا صبح مل گئی تھی خرابے کو شام کے

قیدیوں کی تصویر ملاحظہ ہو۔

پہلے پہل کی قید وہ اور وارثوں کے داغ
یہ رنگ تھا کہ ہوئے خزاں دیدہ جیسے باغ
رونے سے اہل بیت کو اک دم نہ تھا فراغ
نے چاندنی نہ شمع نہ مشعل نہ واں چراغ
غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں
ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں

یوں وہ شکستہ حال تڑپتے تھے ہر نفس
دشوار جیسے صید پہ ہو تنگئ قفس
جانوں کو تھی بدن سے نکل جانے کی ہوس
بازو بندھے ہوئے تھے نہ تھا کچھ کسی کا بس
دل چھاتیوں میں صورت بسمل تڑپتے تھے

زنداں کے در سے جا کے سروں کو پٹکتے تھے

بستی وہ فاطمہؑ کی کہاں اور وہ گھر اُجاڑ ۔ جاڑوں پہ تھی بنی ہوئی قسمت کا تھا بگاڑ
کیا دل کھلیں کہ شام سے جب بند ہوں کواڑ ۔ دیواریں تھیں بلند کہ چھاتی پہ تھے پہاڑ
گھبرا کے چھت کو بیبیاں ہر بار تکتی تھیں
ٹوٹے مکاں کی رات کو کڑیاں کڑکتی تھیں

ہر دم زمیں سے واں کی نکلتا تھا یوں بخار ۔ جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار
گرمی سے یوں زمیں پہ تڑپتے تھے سوگوار ۔ جس طرح سے سپند ہو آتش پہ بیقرار
جھک جھک کے آسمان کو حسرت سے تکتے تھے
کیسے ہوائے سرد کو بچے ترستے تھے

اسیران ستم کے سر بازار تشہیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ تشبیہوں کی مناسبت اور لطافت پر غور کیجئے:۔

آگے آگے تو ہیں سجادؑ جھکائے گردن ۔ پاؤں بیڑی میں ہیں گلا طوق میں گردن میں رسن
مثل خورشید فلک شرم سے لرزاں ہے بدن ۔ چاک ہے غم میں گریباں عقب تا دامن
بیٹھ جاتے ہیں تو جھنجھلا کے اٹھاتے ہیں لعیں
بوڑیاں نیزوں کی شانوں میں چبھاتے ہیں لعیں

پیچھے بیمار کے ہے قافلۂ اہل حرم ۔ چپ ہیں تصویر سے گویا کہ کسی میں نہیں دم
دختر فاطمہ زہراؑ کا عجب ہے عالم ۔ تھرتھری جسم میں ہے اٹھ نہیں سکتے ہیں قدم
رو کے فرماتی ہیں کس گوشہ میں جائے زینب
ہاتھ کھل جائیں تو منہ اپنا چھپائے زینب

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن ۔ جس طرح ہوتے ہیں گلدستہ میں گلہائے چمن
رشتہ داران علیؑ سب ہیں گرفتار محن ۔ شرم کے مارے چھپی جاتی ہے اک شب کی دلہن
دمبدم ساس بھی سر پیٹتی ہے ساتھ اس کے
ابھی کنگنا نہ کھلا تھا کہ بندھے ہاتھ اس کے

آخر میں برادران وطن سے التجا ہے کہ وہ اپنے باکمالوں کے کلام کو بغور پڑھیں، سمجھنے کی کوشش کریں پھر ٹھنڈے دل سے فیصلہ کریں کہ یہ ہستیاں واقعی اعتنا کی مستحق ہیں!

نہیں۔ یہ سچ ہے کہ شکسپیر کے ڈراموں کے استفادہ کی شائع ہو چکے ہیں اساتی شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ انکو پڑھنے کے لئے قارئین کا خزانہ درکار ہے اور اس کی تصانیف کے ایک ایک پہلو پر ہر سال اتنی کتابیں لکھی جاتی ہیں کہ سب کو پڑھنے کے لئے عمر نوح کی ضرورت ہے چنانچہ Seigfried Kosteriel اپنے مختصر مضمون گیٹے اور موجودہ انسانیت میں لکھتا ہے "صرف اس سال تقریباً پانسو کتابیں گیٹے پر شائع ہوئیں" (Bookman, London April 1932) اس کے برعکس ہمارے باکمالوں کے مجموعہ کلام کا ایک ایڈیشن بھی صحیح نہیں نکلتا۔ مگر بجائے اس کی تصحیح کرنے کے انہیں غلطیوں پر اعتراضات کا طومار باندھنا کتنی بڑی غلطی ہے۔ بہرحال ارباب ادب اردو ہی کا فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔ جب تک ان کے ترجمے اور شرحیں نہ لکھی جائیں گی بے چارے مستشرقین کو کیا معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے باکمال اس سرزمین سے اٹھے اور پیوند خاک ہو گئے۔

چپہ چپہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

غزل

(از جگدیش سہائے صاحب سکسینہ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

اور بھی وحشت ہوئی گلہائے خنداں دیکھکر
بڑھ گیا جوش جنوں چاک گریباں دیکھکر

اللہ اللہ۔ یہ ترے درس محبت کا اثر
چشم تر روتی ہے دشمن کو بھی گریاں دیکھکر

باعث تکمیل الفت ہے دلا رنج و غم
شاد ہوتا ہوں بلائے شام ہجراں دیکھکر

اُف رہی شبنم کی کل اندیشیاں گلزار میں
صبح تک روتی رہی پھولوں کو خنداں دیکھکر

شوق وصلت ہے اگر۔ ترک تمنا کیجئے
دل میں وہ آتے ہیں لیکن دل کو ویراں دیکھکر

اک بہار بے خزاں ہے میرے پہلو میں نہاں
بھول جاتا ہوں چمن کو داغ سوزاں دیکھکر

محبس دنیا میں ہم زحمت کش بند حیات
جی کو بہلاتے رہے گور غریباں دیکھکر

تہذیب

(پنڈت اندرجیت شرما)

حُسن کی دیوی ہے یا برقِ حیا پردر ہے تو
کھینچ لے جو دل حسینوں کے بھی وہ منظر ہے تو

تیرے پرتو سے ہے قائم آب و تاب زندگی
روشنی پاتا ہے تجھ سے آفتابِ زندگی

بادۂ گلگوں چمکتا ہے گلاسوں میں ترے
کیسے دلکش تار ہیں رنگیں لباسوں میں ترے

عالمِ ایجاد میں بجتا ہے جب تیرا رباب
جوش پر آتا ہے انساں کے تخیل کا شباب

ہو کے رہ جاتا ہے دل قرباں ترے انداز پر
لوٹ ہوتی ہیں نگاہیں خلق کی ہر ناز پر

پھونک دیتی ہے فضائے دہر پر تو کیا سکوں
دل میں موجیں مارنے لگتا ہے سیلابِ جنوں

جذب ہونے لگتے ہیں پُر نور منظر آنکھ میں
سیکڑوں رنگینیاں کر لیتی ہیں گھر آنکھ میں

آنچلوں کی سرسراہٹ ڈھانے لگتی ہے غضب
شادمانی بخشتے ہیں روح کو عیش و طرب

قمقموں کی جلوہ ریزی تیرے کاشانوں میں ہے
زندگی خلدِ بریں کی تیرے ایوانوں میں ہے

تیرے فواروں میں پلتا ہے نزاکت کا شباب
تجھ پہ پڑتی ہے زمانے کی نگاہِ انتخاب

مال سے اُلفت ہے تجھ کو زر سے تجھ کو پیار ہے
جو ترا شیدا ہے دُنیا میں وہی زردار ہے

تیری خوش پوشی نرالی ہے تعجب خیز ہے
ہر نمایش کیف آور ہے سرور انگیز ہے

اہلِ عالم پڑھ رہے ہیں خطبے تیرے نام کے
جھومتے ہیں بے پیئے متوالے تیرے جام کے

موجزن بحرِ لطافت ہے ترے جذبات میں
دن کا نظارہ ہے عریاں ہر اندھیری رات میں

مایۂ عیش و طرب ہے مرکزِ اُمید ہے
تو نوید کامرانی ہے پیامِ عید ہے

ہو گئیں گلزار پرتو سے ترے آبادیاں
تیرے دم سے سج گئیں ماتم کدوں میں شادیاں

زندگی مستور ہے رنگیں اداؤں میں تری
صبحِ ارماں منہ دکھاتی ہے فضاؤں میں تری

کس ادا سے کھیلتی ہے تو زمیں کے فرش پر
لیکے انساں کو پہنچ جاتی ہے لیکن عرش پر

تیری زرّیں پتیوں پر دیکھ کر نقش و نگار
منہ کو آنچل میں حیا سے ڈھانپ لیتی ہے بہار

دخل دل پر کیسی آسانی سے پا لیتی ہے تو
نقشِ آب و گل پہ فوراً ہی جما لیتی ہے تو

اور ہے تیرا ہی جو دنیا کی ہر محفل میں ہے
تیری ہی رونق ہے جو ہر گھر میں ہر منزل میں ہے
راگ اٹھتے ہیں ترے سازوں سے لہراتے ہوئے
دوسروں پر چھا کے رہ جاتے ہیں ٹکراتے ہوئے

دوسرا پہلو مگر اک پردۂ تاریک ہے
لائق نفرت ہے وہ اور قابل تضحیک ہے
تجھ سے ہی ہو جاتے ہیں اعضا بدن کے مضمحل
تجھ سے ہی بے آب ہو جاتا ہے رنگ آب و گل
لوٹ لیتی ہے جوانوں کی جوانی کی بہار
قعر ذلت میں پھنسا کر تجھ کو آتا ہے قرار
ہوش کی ڈاکو ہے تو اوسان کی رہزن ہے تو
قتل کرنے ہاتھ سے شوہر کو بھی دشمن ہے تو
آگہی کی دھجیاں تیرا اڑاتا ہے جنوں
کور کر دیتا ہے دنیا کو دنیاؤں کا فسوں
زندگانی کا الٹ دیتی ہے پل بھر میں نظام
باتوں ہی باتوں میں کر دیتی ہے تو قصہ تمام
پستیوں پر دہر کی رکھتی ہے تو اپنی نظر
توڑ کر رکھ دیتی ہے عالم کی ہمت کی کمر
داستاں ہے غم کی پوشیدہ نوید عیش میں
یاس و حسرت کا تماشا ہے امید عیش میں
بن کے آتی ہے زمیں پر تو وہ سیلاب فنا
کانپ اٹھتے دیکھ کر جس کو فرشتے موت کا
تیرے ساز زندگی سے جو نکل جاتے ہیں راگ
خوف کی دنیا میں لہراتے ہیں وہ بن بن کے ناگ
کیسا ہیبتناک نقشہ تیرے ہیجانوں کا ہے
یعنی خونریزی نتیجہ تیرے طوفانوں کا ہے
کسقدر سفاک ہے تو کس قدر خونخوار ہے
دم نہ لے جو کاٹ کر سر بھی تو وہ تلوار ہے
صبر کی مضبوط بنیادیں ہلا دیتی ہے تو
خاک میں سب حسرتیں دل کی ملا دیتی ہے تو
اہل ظاہر جانتے ہیں تجھ کو الفت کی حدیث
اہل باطن کی نظر میں ہے تو نفرت کی حدیث
غم بڑھا دیتی ہے تو راحت گھٹا دیتی ہے تو
بھائی کی گردن کو بھائی سے کٹا دیتی ہے تو
تھپکیاں دیکر سلا دیتی ہے جب انسان کو
چھوڑتی ہے اس کا پیچھا بھی تو لے کر جان کو
جان دیتے ہیں جو پہلے نغمہ خوانی پر تری
پھر وہی پڑھتے ہیں لعنت خوں فشانی پر تری
زحمت بیچارگی سے دل ہر اک غمناک ہے
بے کسی بے مائگی سے سب کا سینہ چاک ہے
ابن آدم کو مٹانے کے لئے تیار ہے
سادگی کی روح سے تو برسر پیکار ہے
رہتے ہیں تیری جبینوں پر تکلف کے نشاں
اصلیت کو بھی چھپا لیتی ہیں رنگ آمیزیاں
جذبۂ احرار کو خاموش کر دیتی ہے تو
فطرتی انوار کو روپوش کر دیتی ہے تو
سینوں پہ رکھ دیتی ہے قانون کا سنگ گراں
سانس تک لینے نہیں دیتیں تری پابندیاں
تیرے دلدادوں کو ہوتا ہی نہیں حاصل سکوں
بیٹھنے دیتا نہیں اک حال پر تیرا جنوں

شانِ عالی ہی نرالی ہے ترے دربار کی
روح تک جس میں نہیں اخلاص کی ایثار کی

ہو کے رہ جاتی ہے گل شرم و حیا کی روشنی
کیسی دکھلاتی ہے کیا انسانیت کی زندگی

جور سے ہو واسطہ تجھکو جفا سے کام ہے
کیا تماشا ہے کہ پھر تہذیب تیرا نام ہے

وہ تری تعلیم ہے جس میں دلیری ہی نہیں
غیرت و احساس ڈھونڈھے سے نہیں ملتے کہیں

تقویت پا جاتے ہیں دم سے ترے بغض و ریا
نام تک باقی نہیں رہتا وفا و حلم کا

داستاں ہے تیرے کرتوتوں کی محشر آفریں
اے سکوں دشمن! جہالت تجھ سے بہتر ہو کہیں

انکشافِ حقیقت

(از حضرت بیتاب بریلوی۔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی)

رہینِ غمِ عشق ہر مرد و زن ہے
ہوس پیشہ دنیا ترا حسنِ ظن ہے

فرشتوں نے جس جا بکھیرے ہیں سجدے
وہ میرا وطن ہے وہ میرا وطن ہے

حقیقت میں دنیا اک عشرتکدہ ہے
مگر اپنی قسمت سے دار المحن ہے

شبابِ شبِ تار ڈھلنے لگا ہے
ستاروں کی سمٹی ہوئی انجمن ہے

مہِ نو نے کھینچی ہے رنگین جدول
کنارِ اُفق چاندنی ہالہ زن ہے

چمکتا ہے زرتار آنچل کسی کا
کہ اُڑتی ہوئی سی سنہری کرن ہے

اک عالم میں کل جسکے سکے رواں تھے
وہی آج محتاجِ گور و کفن ہے

ہجومِ تمنا کی بیچارگی پر
جوانی کی بے بس حیا خندہ زن ہے

اشاروں اشاروں میں ہنستی ہیں کلیاں
قبائے گلِ تر شکن در شکن ہے

خزاں کی ستم رانیاں سن چکا ہوں
مری آشیں آج رشکِ چمن ہے

نرالا ہے اندازِ شیون ہمارا
نئے ساغروں میں شرابِ کہن ہے

اولمپک کھیل

یونان کے جنوب میں موریاؔ نامی ایک چھوٹا سا جزیرہ نما واقع ہے جس کے مغربی ساحل پر ملک ایلیسؔ نامی ایک علاقہ ہے۔ جس میں ایک چھوٹا سا شہر اولمپیاؔ نامی ہے۔ قدیم زمانہ میں یعنی حضرت عیسےؑ سے ہزار ہا سال پہلے اس شہر کے متصل ایک وسیع میدان میں آلطسؔ دیوی کے نام پر ایک بہت بڑا باغ تھا۔ جس کے اندر یونانیوں کے مہادیو۔ ذیوشسؔ کا ایک عالیشان مندر تھا جس میں مشہور و معروف یونانی بت تراش فیدیاسؔ کا بنایا ہوا ہاتھی دانت کا ایک بہت بڑا بت رکھا تھا یونانی دیو مالا کی قدیم روایت ہے کہ جب یونانیوں کی اہل ایلیس سے جنگ ہوئی تو مشہور و معروف یونانی ہیرو ہرقلیشؔ نے ایلیس کے بادشاہ آجیاسؔ کو قتل کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نمایاں فتح کا جشن اولمپیا کے میدان میں منایا۔ جس میں اس نے گرد و نواح کے پہلوانوں اور ورزشی نوجوانوں کو مدعو کیا جنہوں نے مختلف کھیلوں میں اپنے اپنے کمالات دکھائے۔ یہی اولمپک کھیلوں کی ابتداء ہے۔ رفتہ رفتہ یہ یونانیوں کا ایک قومی جشن ہو گیا اور ہر چوتھے سال منایا جانے لگا اور یہ بھی قاعدہ جاری ہو گیا کہ ان کھیلوں میں جو لوگ کامیاب ہوتے تھے اُن کے نام کندہ کر کے ہیراؔ دیبی کے مندر میں لگائے جاتے تھے۔ اور ملک بھر میں ان کی بہت عزت ہوتی تھی۔ جب اولمپیا کے دنگل کا زمانہ قریب ہوتا تو نقیب لوگ تمام ملک میں گشت لگا کر گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس کی مقررہ تاریخوں کی اطلاع دیتے تھے۔ جس مہینہ میں یہ کھیل ہوتے اسمیں ہر قسم کی جنگ و جدل بند کر دی جاتی تھی اور اس رسم کی مذہبی قاعدہ کی طرح پابندی کی جاتی تھی۔ میلہ کے ایّام میں لاکھوں آدمی مندر کے میدان میں جمع ہوتے تھے اور چند روز کے لئے خیموں کا ایک عظیم الشان شہر آباد ہو جاتا تھا۔ اور اس چہار سالہ میلہ کا نام اولمپیاڈؔ ہے۔

۷۷۶ء قبل مسیح کے اولمپیاڈ میں ملک ایلیس کا ایک جوان مسمی قاریبوسؔ پیادہ دوڑ میں اوّل آیا۔ چنانچہ اس کے ہموطنوں کو اس کامیابی سے اتنی خوشی ہوئی کہ انھوں نے اس کا نام

Pheidias Zeus Altis Olympia Elis Morea
Coroebus Olympiad Hera Hercules

کندہ کرا کے مندر میں لٹکا دیا۔ اسی دن سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۵۷۲ء قبل مسیح تک صرف [illegible] اہل ایلیس یا ان کے ہمسایوں کے نام کندہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد اہل کارنتھ، اہل میگاریہ اور ان کے بعد ایتھنز اور شمالی کوہستانیوں کے لوگوں کے نام بھی نظر آنے لگے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولمپیاڈ نے ایک دیہاتی میلہ سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے قومی حیثیت و شہرت حاصل کر لی تھی جس میں خاص یونان کے علاوہ نوآبادیوں کے شہزور بھی آ کر اپنے اپنے کمالات دکھاتے تھے یہ سلسلہ بارہ سو برس تک جاری رہا۔

کھیلوں میں ہار جیت کا فیصلہ کرنے والے دس آدمی ہوتے تھے۔ ملک ایلیس میں دس قبائل آباد تھے۔ اور ہر قبیلہ میں سے ایک ایک جج منتخب کیا جاتا تھا۔ ان ججوں کو جنہیں یونانی زبان میں ہیلانو ڈیسائی کہتے تھے۔ دس مہینہ تک مختلف کھیلوں کے قواعد و ضوابط کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مختلف ممالک کے امیدوار بہت دنوں پیشتر سے موقعہ پا کر الطس دیبی کے اکھاڑے یا "جمنازیم" میں محنت کرنے آ جاتے تھے جن لوگوں کے سپرد اس میلہ کا اہتمام کیا جاتا تھا وہ ایک خاص پوشاک پہنکر آراستہ و پیراستہ رتھوں میں سوار ہو کر قطار در قطار دیوتا کا "پرشاد" لئے ہوئے آگے آگے چلتے تھے۔ میلہ میں مقابلہ صرف شہزوری یا کھیلوں تک محدود نہ رہتا تھا بلکہ فنون میں بھی کمالات دکھائے جاتے تھے۔ دیمیٹری دیبی کی پوجارنیوں کے سوائے دوسری تمام عورتوں کو بھی میلہ دیکھنے اور مقابلہ میں شریک ہونیکی اجازت تھی۔

جس روز کھیل شروع ہوتے تھے اس کی صبح کو طلوع آفتاب کے وقت تمام امیدواروں کو صدر صاحبان کے سامنے پیش ہو کر نسل کے لحاظ سے خالص یونانی ہونے اور اپنے نیک چلن ہونے کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔ اور یہ بھی اطمینان دلانا پڑتا تھا کہ وہ دیبی کے اکھاڑے میں مسلسل دس ماہ تک مشق کرتے رہے ہیں، اور اب مقابلے میں کسی قسم کے مکر و فریب سے کام نہ لیں گے۔

تمام رسمیات کے بعد تمام امیدوار کھیل کے میدان میں پہونچکر دنگل میں داخل ہوتے تھے اور اپنے جسم پر تیل کی مالش کر کے چار چار آدمیوں کی ٹولیوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ دوڑ کے ابتدائی خط پر قرعہ اندازی سے کھڑے ہونے کی جگہ ملتی تھی۔ کھیل شروع ہونے پر چار آدمی خط روانگی پر جا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور ایک نقیب بہ آواز بلند اعلان کرتا تھا۔ کہ جس شخص کو کسی امیدوار کی نسل یا چال چلن پر اعتراض ہو تو وہ سامنے آ کر بیان کرے اور جب کوئی اعتراض

Dpwetre of Gymnasium & Hellanodicae

دیوتا اور شکھا پیوتا جاتا تھا جس کی آواز سنتے ہی مقابلہ شروع ہوجاتا تھا۔ تیئسویں اولمپیاڈ تک یہ میلا ایک ہی دن میں ختم ہوجایا کرتا تھا۔ لیکن امیدواروں کی تعداد میں اضافہ کی وجہ سے بعد میں یہ کھیل پانچ دن تک جاری رہنے لگے۔

شروع شروع میں کامیاب امیدواروں کو معقول انعامات دئے جاتے تھے۔ لیکن چوتھے اولمپیاڈ سے یہ قاعدہ بدل دیا گیا۔ اور جو شخص کھیل میں نمبر اول آتا تھا اس کے سر پر جنگلی زیتون کی شاخوں کا بنا ہوا تاج رکھ دیا جاتا تھا۔ یہ شاخیں زیتون کے اس مقدس درخت سے جو ہرقلیس نے طبقۂ ظلمات میں دریائے ایسٹر کے کنارہ سے لاکر المقس دیبی کے باغ میں نصب کیا تھا طلائی چھنیہ سے کاٹکر لائی جاتی تھیں۔ اس طرح اس مقابلہ میں قومی اعزاز و احترام کے سوائے کوئی مادی فائدہ نہ ہوتا تھا۔

انعامات دینے کا طریقہ یہ تھا کہ نقیب کامیاب امیدوار کا نام مع ولدیت اور سکونت بلند آواز سے پکارتا تھا۔ اور جج صاحبان ہاتھی دانت کی ایک مطلا چوکی سے زیتونی تاج اٹھاکر امیدوار کے سر پر رکھ دیتے تھے اور ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ دیدیتے تھے۔ جس کے بعد کامیاب اُمیدوار اپنے احباب کے حلقہ میں باجے گاجے کیساتھ نکلتا تھا۔ اور راستے بھر اس پر پھول برسائے جاتے تھے۔ اور اس شخص کے نام پر یونانی سال کا ایک دن مقرر ہوجاتا تھا۔ اور جب وہ اپنے وطن میں واپس آتا تھا تو اسے بہت کچھ ملتا تھا۔ یعنی اگر وہ ایتھنز کا رہنے والا ہوتا تھا تو اس کو حکیم سولن کے قانون کے بموجب پانچ سو درم اور تمام عمر مفت کھانا ملتا تھا۔ اگر وہ اسپارٹا کا باشندہ ہوتا تھا تو میدان جنگ میں اسے عزت کی جگہ دی جاتی تھی۔ اور یونان کے بڑے بڑے مشہور شاعر اس کی شان میں قصیدے کہتے تھے۔ اور حکومت نامور سنگ تراشوں سے ان کے بت بنانے کی فرمائش کرتی تھی۔

اولمپک کھیلوں کی طرح یونان کے تین قومی میلے اور بھی ہوتے تھے:۔

(۱) پائتھیاڈ۔ یہ کھیل اور میلہ ہر چوتھے سال اپالو دیوتا کے اعزاز میں ڈلفائی کے مندر میں ہوا کرتا اور کامیاب امیدوار کو انعام میں پھولوں کا تاج دیا جایا کرتا تھا۔ یہ میلہ اور اس کا دنگل ۵۸۶ قبل مسیح سے زیادہ مشہور ہوگیا تھا۔

(۲) نیمیان کھیل ہر دوسرے سال زیوس دیوتا کے اعزاز میں ۵۱۶ قبل مسیح سے شروع ہوگئے تھے۔

Delphi ے Appollo ے Pythiad ے Sparta ے Athens ے
Nemean ے

اس میں جیتنے والے امیدوار کو جنگلی کلسی کا تاج پہنایا جاتا تھا۔

(۳) کارنتھین کھیل۔ یہ ۲۲۸ قبل مسیح سے خاکنائے کارنتھ میں ہونا شروع ہوا تھا اور اولمپیاڈ و صل سے ایک سال قبل اور ایک سال مابعد ہوا کرتا تھا۔ ان کھیلوں میں شہر ایتھنز کا جو باشندہ اوّل آتا تھا اسے قانون سولن کے بموجب پچاس درم نقد سرکاری خزانہ سے ملتے تھے۔

یونان میں اولمپک کھیل بارہ سو برس تک جاری رہے۔ اور ۲۹۰ مرتبہ ہوئے۔ بالآخر ۳۹۴ء میں عیسائی بادشاہ تھیوڈوسیس نے انھیں بند کرا دیا لیکن اس کی ممانعت کے باوجود اسکی شہرت اور نام ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا۔ چنانچہ اس کے پورے ڈیڑھ ہزار سال بعد فرانس کے بیرن پیری ڈی کوبرٹین کے دل میں اُمنگ اُٹھی اور اس نے اولمپک کھیلوں کو از سر نو زندہ کرنیکا تہیہ کر لیا۔ لیکن اہل فرانس نے اس معاملہ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ تاہم اس تحریک کو اسقدر کامیابی ہوئی کہ سنہ ۱۸۹۶ء میں یونان کے پایہ تخت ایتھنز کے قریب ایک پرانے میدان میں جہاں تیسری صدی عیسوی میں گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی اولمپک کھیل منعقد کئے گئے۔ یہ میدان نہایت وسیع اور اس کا کوہستانی منظر نہایت دلفریب ہے۔ اسی جگہ یونان کی مشہور پچیس میل لمبی "میریتھان" دوڑ ہوئی تھی۔ جس کے تذکرے یونان کے قومی لٹریچر میں ابتک فخر اور شوق کیساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ دوڑ میں ایک یونانی۔ ہتوڑا پھینکنے میں ایک انگریز اور دوسرے مختلف کاموں میں امریکن لوگ اوّل رہے۔ اور اس کے بعد اولمپیاڈ کھیلوں کا سلسلہ ہر چوتھے سال مختلف ممالک میں جاری ہوگیا۔ مثلاً سنہ ۱۹۰۰ء میں پیرس۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں بلجیم اور سنہ ۱۹۰۸ء میں لنڈن میں اولمپک کھیل منعقد کئے گئے۔

لنڈن کے اولمپک کھیل میں دنیا کی بیس مختلف قوموں کے کھلاڑی شریک ہوئے تھے۔ اور بیس ہی مختلف کھیلوں میں مقابلہ ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں یہ کھیل اسٹاکہام میں ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں برلن کا انتخاب ہوا۔ لیکن جنگ عظیم کی وجہ سے وہاں کھیل نہ ہوسکے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں اینٹورپ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں یہ کھیل پیرس میں غیر معمولی دھوم دھام کیساتھ منعقد ہوئے اسوقت دنیا کی پینتالیس قوموں کے نمایندے شامل تھے۔ اور مقابلہ کرنیوالے کھلاڑیوں کی تعداد لنڈن سے چند تھی۔ غرض اب ہر چوتھے سال کہیں نہ کہیں اولمپک کھیل منعقد ہوتے ہیں۔ امسال یعنی سنہ ۱۹۳۶ء

Pierre de Coubertine ؎ Theodosius ؎ Corinthian ؎
Marathon ؎ Stadium ؎

تھا۔ یہ کھیل برلن پایۂ تخت جرمنی میں ہوئے جہاں ہٹلر کے زیرِ ہدایت نہایت دھوم دھام سے تیاریاں کی گئیں۔ برلن کی کوئی دکان یا مکان ایسا نہ تھا جو رنگ برنگ جھنڈیوں سے آراستہ نہ کیا گیا ہو۔ تمام سڑکیں دنیا کی مختلف قوموں کے جھنڈوں سے سجائی گئیں۔ برلن کے قریب ہی ایک گاؤں اولمپک کے نام سے آباد کیا گیا ہے۔ جرمن زبان میں اسے دار الامان کہتے ہیں اور یہاں ہر قوم کے نمایندوں کے لئے الگ الگ عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں جن پر اسی قوم کا جھنڈا لہراتا ہے۔ ہٹلر نے مہمانوں کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اس کھیل کا آغاز یکم اگست ۱۹۳۶ء کو برلن اسٹیڈیم میں لاکھوں آدمی کے موجودگی میں ہوا۔ اس بین الاقوامی تقریب کی افتتاحی رسم خود ہٹلر نے ادا کی۔ ہٹلر ایک بلند مرکزی مقام پر کھڑے ہو گئے اور انکے سامنے سے ٹیمیں گذرنے لگیں۔ ہر ٹیم کیساتھ اس کا قومی جھنڈا ہوتا تھا۔ سب سے پہلے یونانی ٹیم اپنا قومی جھنڈا لہراتی ہوئی آئی اور ہٹلر کو سلام کرتی ہوئی گذر گئی۔ اس کے بعد مصری آئے جن کے سروں پر ہلال و کوکب کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ لوگ ترکی ٹوپیاں پہنے تھے۔ مصریوں کے بعد افغانی ٹیم اپنے قومی لباس اور جھنڈے کیساتھ گذری، اسیطرح نمبروار چین، جاپان اور دنیا کی ترپن قوموں کی ٹیمیں نکلیں ہندستانی ٹیم بھی حلقے باندھے ہوئے گذری غرض دنیا کے پانچ ہزار کھلاڑی اس میدان میں موجود تھے۔

جب تمام ٹیمیں گذر چکیں تو اولمپک کھیلوں کے پریسیڈنٹ نے ایک حوصلہ افزا تقریر کی اور آٹھ دس ہزار جرمن بچوں نے کھیل کود کے مختلف کام دکھا کر رقص سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

دوسرے دن سے اولمپک کھیل شروع ہو گئے اور سولہ اگست تک جاری رہے۔ کوئی ہارا کوئی جیتا۔ ہندوستانی کھلاڑی ہاکی میں اوّل نمبر پر رہے۔ اس طرح ہندوستان کی بھی عزت رہ گئی۔

ہندستانی ہاکی ٹیم کا پہلا میچ ہنگری سے ہوا۔ اس روز بارش ہو رہی تھی مگر ہندستانی ٹیم نے ہنگری کو چار گول سے ہرا دیا۔ گو فریقِ مخالف نے بھی دانت کھٹے کر دئے تھے۔ دوسرا میچ امریکہ سے ہوا۔ امریکن ٹیم ہنگری والوں سے زبردست تھی لیکن ہندستانی ٹیم نے ان کو بھی آٹھ گول سے ہرا دیا۔ ۱۰ اگست کو جاپان سے مقابلہ ہوا وہ بھی نو گول سے ہار گئے اور فرانس کو دس گول سے ہرایا۔ آخری ٹکر جرمنی سے ہوئی جو ہندوستانی ٹیم کو شکست دینے کے لئے چار سال سے مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ اسوقت جرمن ٹیم دنیا میں سب سے طاقتور خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ اولمپک کھیل شروع ہونے سے پہلے ایک دوستانہ میچ میں جرمن ٹیم نے ہندوستانیوں کو چار گول سے ہرا بھی دیا تھا۔ فائنل ۱۵ اگست کو جرمنی اور ہندستان کے درمیان تھا۔ پچیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے ہندوستانی اور جرمنی ٹیم میدان میں آ گئیں

حاضرین نے ان کا جوش وخروش سے خیر مقدم کیا۔ ہندوستانی ٹیم میں ایلن، جیکسن، جعفر، گیلی، ہارڈی، شہاب الدین، دارا، دھیان چند، روپ سنگھ، جعفر شریک تھے۔

پہلے نصف وقت میں جرمن ٹیم بڑی تندہی اور جانفشانی کیساتھ کھیلی۔ اور ہندوستانیوں کے متواتر زور کے باوجود انھوں نے کوئی گول نہ ہونے دیا جس سے لوگوں کو خیال پیدا ہونے لگا کہ شاید یہ میچ برابر رہےگا۔ لیکن روپ سنگھ نے یکایک وہ کمال دکھایا کہ بجلی کی سی تڑپ کیساتھ گیند لیجاکر ایک گول کر ہی دیا۔ اور لوگوں نے "شاباش! شاباش!! ہندوستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔

دوسرے نصف وقت میں جرمنوں پر ہندوستانیوں کا سکہ بیٹھ گیا۔ اور انھوں نے گول پر گول کرنا شروع کردیا۔ ساتویں منٹ میں ٹیپسیل نے دوسرا گول کیا۔ اس کے بعد دسویں منٹ میں تیسرا اور گیارھویں منٹ میں چوتھا گول دھیان چند نے کیا۔ اس پر بھی جرمنوں نے کوئی پروا نہ کی۔ بلکہ جس طرح زخمی شیر بھپر کر حملہ کرتا ہے اسی طرح انھوں نے بھی کیا۔ بہت کیساتھ قسمت نے بھی یاوری کی اور سترھویں منٹ میں والتس نامی جرمن کھلاڑی نے ایک گول ہندستانی ٹیم کو کر ہی دیا۔ اس وقت جرمن قوم کے جوش وخروش کا حال قابل دید تھا۔ وہ خوشی کے مارے آپے سے باہر ہوگئے۔ عورت، مرد، بچے سب فرط مسرت سے چلا رہے تھے۔ لیکن یہ خوشی مختصر ثابت ہوئی، کیونکہ فوراً ہی جعفر نے پانچواں گول اور دارا نے چھٹا اور ساتواں گول کردیا۔ آٹھواں گول پھر دھیان چند نے کیا۔ اس طرح جرمن ٹیم کو جو دنیا میں بہترین سمجھی جاتی ہے۔ فرزندانِ ہند نے سات گول سے شکست دی۔ اس طرح خدا نے غریب ہندوستان کی عزت رکھ لی۔

۱۶ راگست کو اولیپک کھیلوں کا خاتمہ ہوا۔ اس روز بھی زیادہ عظیم الشان تیاریاں تھیں کیونکہ اب سالہا سال تک برلن کو پھر ایسا موقعہ نہیں ملیگا۔ لاکھوں آدمی پیشتر ہی سے آکر اسٹیڈیم میں جمع ہوگئے تھے۔ ہر ہٹلر، ڈاکٹر گوئبلز، جنرل گورنگ وغیرہ تمام وزرا سلطنت اور اعلیٰ حکام اور غیر ممالک کے سفیر صاحبان موجود تھے۔ اس روز شہسواری کے کرتب دکھائے گئے۔ ایک ترک شہسوار نے بھی اپنا کمال فن دکھایا۔ آخر میں کامیاب کھلاڑیوں کو تمغے تقسیم کئے گئے۔ مختلف ممالک کے حصہ میں جو تمغے آئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

---

Dr. Goebels ؎ Gallbardy ؎ Tapsell ؎ Allen ؎
General Goering ؎

شمار	نام ملک	طلائی تمغوں کی تعداد	نقرئی تمغوں کی تعداد	مسی تمغوں کی تعداد	نمبر[1]
۱	جرمنی	۳۳	۲۶	۳۰	۱۸۰
۲	امریکہ	۲۴	۲۰	۱۲	۱۲۴
۳	ہنگری	۱۰	۱	۵	۳۷
۴	اٹلی	۸	۹	۵	۴۷
۵	فنلینڈ	۷	۶	۶	۳۹
۶	فرانس	۷	۶	۶	۳۹
۷	سویڈن	۶	۵	۹	۳۷
۸	جاپان	۶	۴	۸	۳۴
۹	ہالینڈ	۶	۴	۷	۳۳
۱۰	انگلینڈ	۴	۷	۳	۲۹
۱۱	آسٹریا	۴	۶	۳	۲۷
۱۲	زیکوسلاکیہ	۳	۵	×	۱۹
۱۳	ایستھونیہ	۲	۲	۳	۱۳
۱۴	ارجنٹائن	۲	۲	۳	۱۲
۱۵	مصر	۲	۲	۲	۱۰
۱۶	سوئٹزرلینڈ	۱	۹	۵	۲۶
۱۷	کناڈا	۱	۳	۵	۱۴
۱۸	ناروے	۱	۳	۲	۱۳
۱۹	ترکی	۱	×	۱	۴
۲۰	ہندوستان	۱	×	×	۳

اس فہرست کے مطابق سب سے زیادہ کامیابی جرمنی اور امریکہ کو نصیب ہوئی۔ مصر بھی جو پہلی مرتبہ ان کھیلوں میں شریک ہوا تھا پانچ تمغے لے گیا۔ ہندوستان کو البتہ صرف ایک ہی طلائی تمغہ ملا...

---

[1] واضح ہو کہ تین نمبروں کے معنی ایک طلائی تمغہ، دو نمبروں کے معنی ایک نقرئی تمغہ اور ایک نمبر کے معنی ایک برنجی تمغہ ہیں

اس دفعہ کے اولمپک کھیل کے تماشائیوں میں مہاراجہ صاحب بڑودہ، مہاراجہ صاحب
اندور اور راجہ صاحب پیرپور (لکھنؤ) بھی موجود تھے۔ جرمنوں نے اس مرتبہ عدیم المثال
مہمان نوازی سے کام لیا اس کے متعلق جو انتظامات کئے گئے ہیں انکا اندازہ اسی سے کر لینا
چاہیئے کہ اس دفعہ کے اولمپک کھیلوں کو دیکھنے کے لئے پندرہ لاکھ غیر ملکی جرمنی آئے۔ اور
مقررہ گاڑیوں کے علاوہ ایکسٹرا ٹرینیں روزانہ برلن کو چلائی گئیں، کل پینتالیس لاکھ ٹکٹ
فروخت ہوئے۔

جب کھیل ختم ہوکر انعامات تقسیم ہو چکے تو آتش اولمپیا کو سرد کرنیکا وقت آیا۔ اس کی تاریخ بھی
بہت دلچسپ ہے۔ ابتداء میں یہ آگ العلس دیبی کے مندر کے نہون کنندہ سے لیجاتی تھی جس کی نگرانی
و پرداخت کنواری داسیاں کیا کرتی تھیں۔ اور قدیم سے یہ روایت تھی کہ اس آگ کو دیوتاؤں نے
آسمان سے نازل کیا تھا۔ چنانچہ اس روایت کی تقلید میں امسال جرمنوں نے بھی اس کے لئے
ایک خاص وفد یونان بھیجا جس کے پایہ تخت ایتھنز کی چودہ منتخب اور حسین لڑکیوں نے قدیم
یونانی لباس میں آراستہ ہوکر اپنے ہاتھوں میں آتشی شیشے لیکر ایک مرکز پر جہاں آتشگیر مادہ
رکھا ہوا تھا۔ سورج دیوتا کی شعاعوں سے آگ پیدا کی اسی کو خاص اہتمام کیساتھ برلن لایا گیا۔
اور جب کھیل ختم ہو چکے تو یہ آسمانی آگ، قدیم اولمپک رسمیات کیساتھ رفتہ رفتہ سرد کردی گئی۔

اس وقت تمام اسٹیڈیم برقی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اور تیز شمس روشنیوں کی قلمیں
ہر طرف سے اسٹیڈیم پر پڑ رہی تھیں۔ گھنٹوں پہلے سے ایک لاکھ سے زیادہ تماشائی جمع ہو چکے تھے۔
دفعتاً بہت سے بگل ایک ساتھ پھونکے گئے اور پہلے دن کی طرح تمام کھلاڑی اپنے قومی جھنڈوں کے
ساتھ ہر ہٹلر کو سلام کرتے ہوئے سامنے سے گذرنے لگے۔ ہر سلام کا جواب دیا جاتا تھا۔ اس کے
بعد اسٹیڈیم سے اولمپک جھنڈا اتار لیا۔ اور آرکیسٹرا نے "قربانی" کا گیت گایا۔ اور جرمن سپاہیوں
نے اتارے ہوئے جھنڈوں پر پھولوں کے ہار چڑھائے۔ جو قت اولمپک جھنڈا آہستہ آہستہ اتر رہا
تھا۔ توپیں شلک کرکے سلامی اتاری جا رہی تھی۔ جب جھنڈا اتر گیا تو سارا مجمع ادب واحترام کیساتھ
کھڑا ہوگیا اور سبھوں نے بیک وقت داہنے ہاتھ سے اس جھنڈے کو سلامی دی۔ پھر ایک منٹ
تک خاموشی طاری رہی جس کے بعد اولمپک کلاک نے گھنٹہ بجایا اور پھر ایک منٹ سکوت طاری
ہوا۔ اس کے بعد آلات کے ذریعہ سے جاپان کا یہ پیغام براڈکاسٹ کیا گیا۔

"میں دنیا کے نوجوانوں کو ٹوکیو آنے کی دعوت دیتا ہوں"۔ اس کے بعد آچیڑا نے نعرہ لگایا۔
اولمپک کھیلوں کے سلسلہ میں رقص و سرود کی محفلیں بھی ہوئیں چنانچہ پندرہ مختلف ممالک کے نامور رقاص شریک مقابلہ ہوئے تھے۔ ہندوستان کی نمایندگی مسز لیلا سوکھے عرف مینکا نے اپنی پوری جماعت کیساتھ کی تھی۔ چنانچہ مینکا نے فن رقص میں کمالات دکھا کر ہندوستان کے لئے تین مختلف انعامات حاصل کئے۔ پہلا انعام کتھک ناچ کے صلہ میں۔ دوسرا انعام ہندوستان کے قدیم رقصوں کا۔ اور تیسرا انعام مینکا کے ساتھیوں۔ اور سازندوں کو ملا۔
اب سنہ ۱۹۶۴ء میں جاپان کا نمبر ہے اور یہ سب سے پہلا موقعہ ہوگا کہ اولمپک کھیل ایشیا کے نامور شہر ٹوکیو میں منعقد ہوں گے۔

جذباتِ شوق

پنڈت جگموہن ناتھ صاحب رینہ۔ شوق

سوزِ دل تجھکو بغیر آگ لگائے نہ بنے
اور پھر کوئی بجھائے تو بجھائے نہ بنے

رنگِ رُخ اُڑنے پہ آجائے تو روکے نہ رُکے
لاکھ وہ راز چھپائیں تو چھپائے نہ بنے

کوئی کیا اس دلِ بیتاب سے اُمید رکھے
اپنی روداد جسے آپ سُنائے نہ بنے

کیا مزہ ہو نہ رہیں یاد جو اندازِ جفا
میں کہوں بھی کہ سناؤ تو سنائے نہ بنے

اے فلک دیکھ لئے تیرے ستم کے انداز
کوئی افتاد ہو ایسی کہ اُٹھائے نہ بنے

خود وفا ہے مری شاہد کہ وفادار ہوں میں
لاکھ تم دل سے بُھلاؤ تو بُھلائے نہ بنے

دل کے ذرّوں میں ہے وہ جوشِ محبت کی نمو
خاک میں اُن کو ملاؤ تو ملائے نہ بنے

گردِ الفت نے کچھ ایسی مری صورت بدلی
دامنِ وحشت چھپائے تو چھپائے نہ بنے

دل کو اب تابِ تلافی و مداوا بھی نہیں
چارہ گر آئے تو احسان اُٹھائے نہ بنے

کوئی خاکہ مری تصویر کا کھینچے تو سہی
کھنچ بھی جائے کوئی نقش تو مٹائے نہ بنے

ایسے ڈھب سے ہو گلہ اُنکے ستم کا اے شوق
بات کچھ چاہیں بنانی تو بنائے نہ بنے

نکتہ سنج خوش نوا

(از ابو الفاضل راز چاندپوری)

حبذا اے نکتہ سنج خوشنوا گیسو بدوش
روح پرور ہے تری تقریر کا جوش و خروش

ادعائے علم و عرفانِ حقیقت، مرحبا
واقعی تو صاحبِ دل ہے یقیناً تیز ہوش

مظہرِ حسنِ تکلم ہے ترا طرزِ بیاں
ایک عالم تیری خوشگوئی کا ہے حلقہ بگوش

بادۂ اسرارِ الفت تیرے پیمانے میں ہے
یاد ہیں ابتک تجھے افسانہائے بزمِ دوش

منکشف ہے تیرے دل پر رازِ بزمِ کائنات
جانتا ہے تو رموزِ میکش و بادہ فروش

ترجمانِ رمزِ کُن ہے واقعی تیری زباں
تیرا ہر اک لفظ ہے تفسیرِ پیغامِ سروش

صاف گوئی تیری فطرت کا ہے اک جزوِ لطیف
بے تکلف تو بھری محفل میں ہے نکتہ فروش

یہ تو سب کچھ سچ ہے لیکن کیا کہوں اک رند نے
کہہ دیا تھا کل کسی میکش سے پیرِ مے فروش

خود فروشی شیوۂ اہلِ ہنر ہوتا نہیں
بے ادب خاموش باش و بادۂ صافی بنوش

اشعار

تجھ پہ ایمان ہے اور تو ایمان
ہم مسلماں ہوئے کافر ہو کر

کیفِ مے میں ہوا عرفاں حاصل
اعتبارِ مے و ساغر ہو کر

بہشتی لازمۂ ہوش ہوئی
آئے وہ ہوش کا منظر ہو کر

(محمد شالق علیخاں ہنڈا)

حضرت فراقؔ کے سو اشعار

(از سید حامد حسن بلگرامی ایم۔اے)

منشی رگھوپت سہائے صاحب فراقؔ۔ ایم۔اے کی غزلیات کا یہ مختصر انتخاب غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ادبِ اُردو سے محبت کرنے والے اشخاص جانتے ہیں کہ حضرت فراقؔ نے دنیائے شاعری میں پندرہ سال سے زیادہ رہ نوردی کی ہے اور شاعرانہ بلندیوں کی جستجو میں زندگی کے عزیز ترین اوقات صرف کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ ایک خاص رنگِ تغزل حاصل کرنے پر قادر ہوگئے ہیں آپ کے کلام میں ایک پُر کیف محویت، اور دلپذیر انفرادیت بھی نمایاں ہے۔ لیکن اس جگہ اس انتخاب کی نسبت اتنا کہنا ضروری ہے کہ اسمیں عموماً وہ اشعار منتخب کئے گئے ہیں جو حضرت فراقؔ کی طبیعت کے ہر رنگ کا آئینہ ہیں۔ اسکے ساتھ یہ بات بھی مدِ نظر رکھی گئی ہے کہ جہاں تک ہوسکے خیالات کی وہ مناسبت بھی قائم رہے جو عموماً غزلوں کے مختلف اشعار کے انتخاب میں مفقود ہوجاتی ہے۔ اور کل انتخاب میں پروازِ تخیل کی بلندیوں کی بدولت خود ایک تسلسل قائم ہوگیا ہے۔ اسی لئے بعض غزلوں کے دو اور تین اشعار اخذ کرنا پڑے۔ یہ صورت اس خیال سے بھی اختیار کرنا پڑی کہ بعض غزلوں کی وہ ہم آہنگی اور یکرنگی منقطع نہ ہونے پائے جنمیں ایک شعر کا تموج دوسرے شعر سے منسلک نظر آتا ہے۔

یہ مختصر انتخاب کسی خشک منطقی بحث کا متحمل ہوسکتا ہے پھر کیوں نہ اشعار ہی میں رازِ حُسن کی تفسیریں اور رازِ عشق کی حقیقتیں دیکھی جائیں؟

جانا اشاروں پر فراقؔ نرگسِ مست یار کے
ہم بھی مزاج داں ہیں کچھ گردشِ روزگار کے

ٹوٹا ہوا خمار نہ انتظار کا
رازآشناہوں میں کسی غفلت شعار کا

درد والے روتے ہیں شانہ یہاں اسکو نہ دست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا۔

اے گرفتار محبت سر شوریدہ سنبھال
یہ وہ زنداں ہے کہ دیوار نہ در ہوتا ہے
لاکھ افسانوں کا افسانہ ہے افسانۂ عشق
جتنا بے ربط ہو اتنا ہی اثر ہوتا ہے

فریب رنگ و بو سے بچ کے سیر بوستاں کرتے — بہار چند روزہ کو بہار جاوداں کرتے

غرض کہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست — وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

دیکھو جب عالم ہو کو تو نیا عالم ہے — بستیاں بھی نظر آنے لگیں ویرانوں میں
جان و ایمان جنوں سلسلہ جنبانِ جنوں — کچھ کشش ہائے نہاں جذب ہیں ویرانوں میں
بزم مے بیخود و بیتاب نہ کیوں ہو ساقی — موج بادہ ہے کہ درد اٹھتا ہے پیمانوں میں
جلوۂ صبح ازل کیفیت شام ابد — نظر آتے ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

نگاہوں میں ہے شوخی لب پہ ہلکا سا تبسم ہے — کہانی سن رہے ہیں وہ کسی کہتے ہوئے دل کی

لڑتے ہیں شیشے بھی ٹکراتے ہیں پیمانے بھی — نگہ مست سے جنبش میں ہیں میخانے بھی

اُجڑنا تھا جنہیں اُجڑے بھرے گلزار کے ہاتھوں — مبارک برق کو غارت گر صد آشیاں ہونا

فریب رنگ و بو کھا کر چمن سے ہاتھ دھو بیٹھے — ترے وحشی تو کب کے لے اڑے ہوتے گلستاں کو
توبہ ہے عنایت ہو کرم ہے لطف و احساں ہے — مگر کیا کیجئے تیرے تغافل ہائے پنہاں کو

میری جمعیت خاطر فراق اب یہی اک ہوتی ہے   پریشاں اور کرلینا خیالات پریشاں کو

لرز رہی ہے فضا عالم محبت کی   کچھ اس طرح نگہ یار شرمسار ہے آج

نگاہ یار کچھ ایسی پھری ارماں نصیبوں سے   کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے

اک وقت ہوگا ہم سے جو دیکھا نہ جائے گا   ہم جانتے ہیں اے شب ہجراں سحر تری
صبح شب فراق ہوئی اور ابھی فراق   بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہ گزر تری

کھنچا جاتا ہے جہاں عالم بالا کی طرف   ایک نقشہ ہے یہ عالم تیری انگڑائی کا

گل کہاں باد بہاری کے ابھر آئے ہیں داغ   آہ سمجھا ہی نہیں راز گلستاں کوئی

ذکر فراق چھیڑنے کی چیز ہی نہ تھی   اک عالم سکوت تری انجمن میں ہے

منہ پھیرے ادھر سے جانے والے   مجھ پر قہر خدا کو دیکھا
تری وہی سرگرانیاں سہی   ہم نے اپنی وفا کو دیکھا

ہستی کے بند بند الگ ہو کے رہ گئے   دل پر پڑی تری نگہ بے قرار کیا؟
کچھ لڑکھڑا رہی ہے نسیم بہار بھی   ساغر بکف اٹھا کوئی صبح بہار کیا؟

رخ رنگیں سے گلستاں کو ہوا ہوئی جمال   نام لے نکہت برباد نہ رعنائی کا

تعیّنات تو امید و بیم کے ٹوٹے   وہ پا گئے تری ہاتھوں ہمیں جو پانا تھا
کسی کے صبر نے بے صبر کر دیا ہم کو   فراق نزع میں کروٹ کوئی بدلتا تھا

کیا چیز۔ آہ۔ یادِ وطن ہے دلا سے ہیں　　صیاد ہم قفس میں ہیں یا آشیانے میں

رفتہ رفتہ موت کی نیند آ گئی ہنگامِ قتل　　سو گئے افسانۂ بے دردیِ قاتل سے ہم

اشاروں پر جنوں کے چل رہے ہیں تیرے شیدائی　　عجب بیساختہ پن آج ہے شورِ سلاسل میں

یہ انتہائے ہوش ہے، یہ بےخودی نہیں　　خورشید ہی کی آخری منزل تو رات ہے

قید کیا، رہائی کیا، ہے ہمیں میں ہر عالم　　رُک گئے تو زنداں ہے چل پڑے بیاباں ہے
اے فراق انہیں پا کر ہم یہ دل میں کہتے ہیں　　سوچئے تو مشکل ہے دیکھئے تو آساں ہے

جو درد کے مٹنے پر ہاتھ آئے وہ درماں ہوں　　اعجازِ سلیماں کی تاخیر پشیماں ہوں

اُمیدِ مرگ تا کے، زندگی کا دردِ سر کب تک　　یہ مانا صبر کرتے ہیں محبت میں، مگر کب تک
وہاں دوش سے کچھ ہو چلے ہیں ان فضاؤں میں　　میری پرواز میں حائل رہیں گے بال و پر کب تک
گریباں پھاڑ لے، منہ موڑ لے جشنِ گلستاں سے　　کہ زیرِ آسماں یہ منظرِ رقصِ شرر کب تک

اک نگاہِ شرمگیں تھی داستاں در داستاں　　اک پیامِ زیرِ لب افسانہ در افسانہ تھا

نزع میں اک شکن جبیں پر تھی　　داستاں تیری بے وفائی کی
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں　　تو نے تو خیر بے وفائی کی

دوستی جس پر تصدق صلحِ کل جس پر نثار　　وہ چڑھی تیور تھی اک آمادۂ پیکار کی

کر ترک بھی دنیا کو دنیا کی طلب بھی کر　　چلتے ہوئے دنیا میں بچتے ہوئے دنیا سے

بھی جیا ہے یہی جان ہے محبت کی جو نیچی نظروں سے تکتی ہے ہم تمہارے ہیں

ہمارا حال سننے والے تیرے ضبط کے صدقے یہ رہ رہ کر تیرا ہم مسکرا دینا سمجھتے ہیں
کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے ترے دم بھر کے مل جانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

ڈرتا ہوں کامیابیٔ تدبیر دیکھ کر یعنی ستم ظریفیٔ تقدیر دیکھ کر
اہل جنوں کو وسعتیں کچھ اور مل گئیں دل بڑھ گئے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

مدتیں قید میں گذریں مگر اب تک صیاد ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں

اُبھر کر اٹھ چلا اوپر کو عالم کوئی انگڑائیاں لیتا اُٹھا کیا!

اے رازِ جہاں بتانے والے اک اور جہانِ راز بھی ہے
اے مطربِ نغمۂ حقیقت اک تارِ رگِ مجاز بھی ہے

کچھ مداوا بھی ہو مجروح دلوں کا اے دوست مرہمِ زخم ترا جورِ پشیماں ہو جائے
یہ بھی سچ ہے کوئی فرقت میں پریشاں کیوں ہو یہ بھی سچ ہے کوئی کیوں کر نہ پریشاں ہو جائے

دل ویراں کے سوا کچھ دل ویراں نہ ہوا یہ وہی گھر ہے جو شرمندۂ مہماں نہ ہوا

دنیا کا رنگ و بو بھی وہ رنگ و بو نہیں ہے جب سیر کر چکے ہم دنیا کے رنگ و بو کی

اب بارِ زیست کا بھی اُٹھانا ہوا محال ہم جرمِ عشق کر کے کسی کی حیا ہوئے

پاتے جو ہم تجھے تو نہ جانے کہ ہوتے کیا کھو کر تو ہم تجھے دل بے مدعا ہوئے

مستی میں لگاوٹ سے اس آنکھ کا یہ کہنا
میخوار کی نیت ہوں ممکن ہے بدل جانا

فرقت گل میں بھڑک اٹھی ہے تیرے دل کی آگ
یہ کھلا گلزار اے بلبل تری تصویر ہے
تیلیوں پر ہے نشیمن ساز تنکوں کا گماں
اب قفس اپنا سراپا حسرت تعمیر ہے

نمود شاہد دنیا تھی اک جاتی ہوئی دنیا
نگاہ حسن عالم بھی نگاہ واپسیں نکلی

یہ جذب کیا ہے کہ تصویر خانۂ دل میں
ہر ایک نقش کو حسرت ہے مٹ کے جلنے کی

اب ہمیں بھی نہ یوں ستا بے ہم
اب ہمارا بھی اعتبار نہیں

دھڑکوں میں عمر کاٹی اے شمع ہم نے لیکن
مجھ سے نظام عالم ٹھہرا ہوا رہا ہے

نثار پرسش غم کے ترے کرم کے نثار
ہیں عبرتیں بھی بجا ہے دوست عشق رسوا کو
نہ ہے یہ ربط پسند اور نہ احتراز پسند
ابھی سمجھتے نہیں تم مزاج دنیا کو

کچھ اور اب اپنی زندگی ہے
یہ دوستی ہے یہ دشمنی ہے
وحشت پہ فراق کی نہ جانا
یہ بھی انداز بے حسی ہے

جبیں کا خوں کئے کس واسطے سمت مزار آئی
کہاں سر پھوڑتی اے میری شام انتظار آئی

پچھلے پہر کو ساقیا قول ترا یہ دے کے جام
گردش چرخ پھر کھائے دور یہی آخر ہو

ملیں عدم کی حدوں سے حدیں زمانہ کی
کہاں پہونچ کے کڑی ٹوٹی اس فسانہ کی

لاکھوں بیٹے بے سروساماں مگر لے ذوقِ فنا — ہم سمجھاتی ہیں تو کیا بے سروساماں ہو گئے
یہ تو تمہید کرم ہے دل مجروح ابھی — دیکھ کیا کیا نگہِ یار کے احساں ہوں گے

اب وہ سودا بھی نہیں جوشِ تمنا بھی نہیں — لیکن اس ترکِ تمنا کا بھروسا بھی نہیں
مدتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں — اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
تجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنی حجابِ بے باک — ہیں انتہا تا حد آداب تماشا بھی نہیں

وہ درد وہ چوکھٹ کیا چھوٹی اے ہمدم قسمت پھوٹ گئی — چاہا تھا کہ دل کو سنبھالیں پر کچھ سوچ کے ہمت چھوٹ گئی
آگے خدا مُڈ پڑتا ہو صدم کچھ ٹھیک ہمیں معلوم نہیں — یہ درد کی حد ہو فراق ہمیں سے دل کی بستی چھوٹ گئی

یہ الگ بات ہے جیتے رہے جینے والے — یوں تو اپنی سی بہت کی شبِ تنہائی نے

یوں تو دل بھی دُکھا نہیں کرتا — یوں تو تم بھی جفا شعار نہیں
میں گریباں لئے ہوئے روؤں — اے جنوں تیرا اعتبار نہیں

اب فرقِ اضطرابِ سکوں کیوں مٹا نہ دیں — کب تک تری نگاہ کو رسوا کرے کوئی

دیکھنی تھی دیکھ لی اس چھیڑ کی بھی سادگی — بے دلوں کو یہ تبسم ہائے پنہاں کچھ نہیں
کاش اپنے درد سے بیتاب ہوتے اے فراق — دوسرے کے ہاتھوں یہ حال پریشاں کچھ نہیں

اہلِ نظر نہ اہلِ دل دیکھنے والے اب کہاں — جلوہ بے قرار کی تابشِ بار بار کے

فراق ان کو تو دیکھو ہوش میں لائی جنہیں قسمت — اور ایک تم ہو کہ سر ہے اور درِ دیوارِ زنداں ہے

تیرے وعدے ہزار جھوٹ سہی — کیا کریں گر نہ اعتبار کریں

جوشش تجدید شوق سے مبتلا ۔۔۔ دل کو پھر ہم اُمیدوار کریں

بزم انجم دیکھئے صبح گلستاں دیکھئے ۔۔۔ اس طرح کب تک فریب وصل و ہجراں دیکھئے
حسن آزردہ میں ہیں بیتاب کتنی شوخیاں ۔۔۔ چشم پرنم کے تبسم ہائے پنہاں دیکھئے

اے طلسم رنگ و بو! ہاں اے فریب آرزو ۔۔۔ ایک دن ہم بھی سمجھتے تھے بہت کچھ دل میں ہو

ہم فریب حسن کو فرقت میں سمجھے اے فراق ۔۔۔ یاد آتے ہیں کسی کے عہد و پیماں بار بار

سرشوریدہ دیا وحشت بیاباں بھی دئے ۔۔۔ یہ میری خوبیِ قسمت کہ وہ زنداں ہو جائے

جذباتِ جگر

(از حضرت جگر بریلوی۔ بی۔ اے)

دماغ و دل پہ جسے کوئی اختیار نہ ہو ۔۔۔ ضرور اُس کا گنہگاروں میں شمار نہ ہو
مذاق جامہ دری کیا اگر بہار نہ ہو ۔۔۔ جنوں عبث ہے جو ایمائے حسن یار نہ ہو
شریک جور فلک گر جفائے یار نہ ہو ۔۔۔ تباہیٔ دل و دیں ہمکو ناگوار نہ ہو
محیط دہر جمال نگار و دل ویراں ۔۔۔ بہار میں کوئی آزردۂ بہار نہ ہو
وہ جبر ہے جسے سب اختیار کہتے ہیں ۔۔۔ گناہگار نہ ہوں ہم گر اختیار نہ ہو
چراغ غمکدۂ زندگی سہی اُمید ۔۔۔ وہ کیا کرے جسے اُمید سازگار نہ ہو
گدا سمجھ کے جہان اُس نے مجھ کو بخش دیا ۔۔۔ وہیں میں چپ ہوں کہ انکار ناگوار نہ ہو
بہت بلند ہے رتبہ تیرا دل آگاہ ۔۔۔ کشاکش غم و شادی سے بیقرار نہ ہو
خزاں گر آئے نہ ہو شکوہ سنج جور خزاں ۔۔۔ بہار آئے تو منت کش بہار نہ ہو
نظر نہ آئے حقیقت تو کور دگر بن جا ۔۔۔ فریب خوردۂ نیرنگ اعتبار نہ ہو
کسی کی مدح و ثنا ہو نہ باعث پندار ۔۔۔ کوئی بُرا کہے ہرچند ناگوار نہ ہو
ہمیں کو آتش دوزخ میں ڈال دے یارب ۔۔۔ ستمگروں پہ اگر تجھ کو اختیار نہ ہو
زمیں پہ ٹیک تو دوں میں بھی اے جگر جبین نیاز ۔۔۔ نشان سجدہ غم دل کو ناگوار نہ ہو

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی اے)

تخلیق سے فارغ ہوا جب خالق باری — اور جوشِ کرم خلد میں یکسر ہوئی جاری
بلوائے گئے سامنے سب نوری و ناری — بخشیں یہ قدرت نے انھیں نعمتیں ساری
اٹھوائے گئے لعل و گہر بندۂ زر سے
سینہ ترا معمور کیا علم و ہنر سے

مال و متاعِ دہر جو پایا تھا کسی نے — تن پروری میں اپنی اڑایا تھا کسی نے
یا شوق سے دامن میں چھپایا تھا کسی نے — غیروں پہ تو ہرگز نہ لٹایا تھا کسی نے
ہمت سے اپنی تو نے عجب کام کر دیا
منہ موتیوں سے اہلِ ضرورت کا بھر دیا

ہے فیضیاب دم سے ترے ساری خدائی — انساں وہ نہیں جس کو نہو پیسہ پرائی
حصہ میں ازل سے ہے ترے عقدہ کشائی — کھاتے ہیں فرشتے بھی غمِ ناصیہ سائی
کم ظرف کبھی صاحبِ ہمت نہیں ہوتا
انساں کوئی دولت کی بدولت نہیں ہوتا

تو کاشفِ اسرار ہے استادِ جہاں ہے — گر علم کا چشمہ ہے تو حکمت کا نشاں ہے
ہر لب پہ سخن بنکے رواں تیری زباں ہے — قربان تکلم پہ ترے حسنِ بیاں ہے
ہر بات میں اک بات ہے کیا بات ہے تیری
سچ بات ہے منبعِ جہاں ذات ہے تیری

صد غیرتِ گلزار ہے ہستی ترے دم سے — احساں جو کئے تو نے وہ پوچھے کوئی ہم سے
جنبش جو ہوئی پھول جھڑے نوکِ قلم سے — حوریں لئے حاضر ہوئیں گل باغِ ارم سے
دستِ کرم نے تیرے گہر رول لئے ہیں
قربانیوں نے دونوں جہاں مول لئے ہیں

دنیا میں نورِ علم کا دریا بہا دیا — تاریکیِ جہل کا نشاں تک مٹا دیا
آنکھوں سے کذب و مکر کا پردہ اٹھا دیا — پتلے تھے خاک کے جنھیں انساں بنا دیا

معراجِ تخیل

(از شیخ سعید الدین احمد محکمہ کوآپریشن پنجاب)

ملک یونان کے دار الخلافہ ایتھنز میں ہر طرف آہ و بکا اور گریہ و زاری کی دلسوز اور جگر خراش آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ حسین و جمیل دوشیزائیں مصروفِ نالہ ہیں۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں اور مرد سسکیاں لے رہے ہیں۔ اور بوڑھے وفورِ گریہ سے نیم جان ہو رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بلک رہے ہیں اور ان معصوموں کو کوئی چپ کرانے والا نہیں۔ غرض چھوٹا بڑا ہر کس و ناکس مصروفِ فغاں نظر آتا ہے۔ کلیسا کی گھنٹیوں سے ماتمی صدائیں سنائی دے رہی ہیں اور تمام شہر پر کچھ اس قسم کی مردنی اور افسردگی چھائی ہوئی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید صورِ محشر پھونک دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ہر ایک ذی روح [illegible] اور بے کل نظر آتا ہے۔ جسے دیکھو وہی رو رہا ہے۔ معبدوں میں راہب روتے دکھائی دیتے ہیں۔ فوجی بارکوں میں سپاہی مصروفِ نالہ و شیون ہیں۔ شاہی محلات سے آہ و فغاں نالہ و [illegible] اور چیخنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرے رہنما فرشتے نے مجھے کہا "تمہیں معلوم نہیں کہ یہ لوگ کیوں رو رہے ہیں" فرشتے کی اس آواز سے میں چونک [illegible] اور اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسی اثنا میں رہبر فرشتہ نے مجھے قصرِ شاہی کے غرفہ پر لا کھڑا کیا اور کہا "تم ان کے رونے کا سبب سننا چاہتے ہو؟" میں نے کہا کہ میں جس وقت سے اس شہر میں آیا ہوں اسی بات پر غور کر رہا ہوں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا معلوم نہیں کیا معاملہ ہے براہِ کرم آپ ہی مجھے آگاہ کیجئے۔ فرشتے نے کہا "کہانی بہت لمبی ہے مگر میں اختصار کے ساتھ تمہیں سناتا ہوں"۔

یہ شہر یونان کا دار السلطنت ہے اور ایتھنز اس کا نام ہے۔ یہاں سے جنوب مغرب کو ایک جزیرہ ہے جسے کریٹ کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہاں کا بادشاہ ایک نہایت ظالم اور سفاک انسان ہے۔ اس کی مملکت میں بہت سے آدم خور درندے ہیں جن کی خوراک انسان [illegible]

ہے کہ کریٹ کا بادشاہ انہیں خوش رکھنے کے لئے ہمیشہ انسانی گوشت ان کی نذر کرتا ہے
اسی کیلئے وہ اپنے ملک اور ملک سے نوجوان مرد اور عورتیں منگواتا ہے۔ تین سال ہوئے
اس نے ایتھنز پر حملہ کیا تھا جس کی وجہ سے باشندگان شہر کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔
طویل محاصرہ کے بعد اس شرط پر صلح ہوئی تھی کہ ایتھنز سے ہر سال آٹھ جوان منوطار نامی بلا کے
سامنے جایا کریں۔ تاکہ وہ انہیں کھا کر اہل کریٹ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ ایک نہایت کڑی اور
سخت شرط تھی مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ آخرکار ایتھنز والوں کو اس کو قبول ہی کرنا پڑا۔ اب وہ ہمیشہ آٹھ
جوان منوطار کی شکم سیری کے لئے ہر سال کریٹ روانہ کرتے ہیں۔ آج کریٹ کو جوان روانہ کئے
جائیں گے اور طلوع آفتاب سے پہلے پہلے قرعہ اندازی ہوگی جن نوجوانوں کا نام نکلے گا انہیں
کریٹ جانا ہوگا۔ اس لئے تمام شہر ماتم کدہ بنا ہوا ہے اور لوگ مصروف گریہ ہیں۔

فرشتہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا مگر اس کے بیان سے میری روح کی عمیق ترین گہرائیوں میں
میں ارتعاش پیدا ہوا۔ میں نے اس سے کہا کہ کریٹ کا بادشاہ ان موذی بلاؤں کا خاتمہ کیوں
نہیں کر دیتا تاکہ ہر سال اتنی جانوں کا نقصان نہ ہو۔ اور مخلوق خدا اس ہلاکت سے نجات پائے
فرشتہ مسکرایا اور بولا " میاں تم انسان ہو تمہیں کیا خبر کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ آؤ میں تمہیں
دکھاؤں کہ انسان کس طرح انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

ہم آسمان پر پرواز کر رہے تھے صبح کا ستارہ نمودار ہو چکا تھا۔ سمندر کا پانی مصروف رقص تھا
جنوں کی آنکھ ان موجوں کے لئے ترس رہی تھی جو پیدا ہو کر ساحل سمندر سے نہ ٹکرا سکیں۔ صحراؤں
بیابانوں۔ پہاڑوں۔ وادیوں مرغزاروں کوہساروں پر پرواز کرتے ہوئے سمندروں دریاؤں
چشموں آبشاروں ندیوں اور نالوں سے اڑتے ہوئے سبزہ زاروں اور کھیتوں سے اوپر اوپر
لہلہاتے ہوئے سرسبز اور شاداب فصلوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک نہایت خوبصورت شہر میں
داخل ہوئے۔ ابھی میرا رہبر فرشتہ مجھے زمین کی طرف لا ہی رہا تھا کہ شیروں کے گرجنے اور چیتوں
کے دھاڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے فرشتہ سے پوچھا ہم کہاں آ گئے ہیں۔ ایسا
دکھائی دیتا ہے کہ ہم کسی شہر میں اترنے والے ہیں مگر شیروں کی آواز سے شہر گونج رہا ہے یہ شہر
ہے یا شیروں کی کچھار۔

فرشتہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ کہنے لگا " یہی تو رومۃ الکبریٰ ہے۔ یہ وہ سرزمین
ہے جہاں انسان شیروں سے لڑائے جاتے ہیں۔ یہ وہ شہر ہے جہاں انسانی لہو سے ہولی کھیلی

جاتی ہے۔ یہی عصر حاضر کی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ یہی دنیا کا مہذب ترین شہر ہے۔ اسی کے باشندوں کی تمام دنیا پر حکومت ہے۔ مصر و شام پر انہی کا پرچم لہراتا ہے۔ امریکہ اور یورپ پر بھی حکمرانی کرتے ہیں۔

فرشتہ مجھ سے باتیں کرتا جاتا تھا اور ہم شہر کی طرف آ رہے تھے۔ اتنے میں ایک بہت بڑا اور کشادہ میدان دکھائی دیا۔ چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں تھیں۔ فضائے آسمانی میں طیور نغمہ سنجیاں کر رہے تھے۔ درختوں پر طائران خوش الحان مصروف نغمہ تھے۔ پرندے چہچہاتے تھے۔ اور وفور مسرت سے خوشی کے گیت گا رہے تھے۔ ملکۂ صبح نے اپنے حسن کی ضو پاشی سے دنیا کو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ ناگہاں اس میدان میں میری نظر شیروں کے پنجروں پر پڑی میں نے فرشتے سے پوچھا اور کیا یہ چڑیا گھر ہے" فرشتہ حسب معمول مسکرایا۔ اور کہنے لگا۔

"نہیں یہ کلوزیم ہے" اڑتے اڑتے ہم کلوزیم کے برآمدہ پر جا بیٹھے۔ کلوزیم انسانوں سے پر تھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ کوئی جلسہ گاہ ہے۔ لیکن وہاں مجھے ایک اکھاڑہ نظر آیا میں سمجھا کہ شاید یہاں کشتی ہوگی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جوان کو چند آدمی کشاں کشاں لا رہے ہیں۔ وہ جونہی اکھاڑہ میں داخل ہوا ایک آواز پیدا ہوئی وہ آدمیوں کا نعرہ تھا۔ اکھاڑہ کے پاس ہی شیر کا پنجرہ کھڑا تھا۔ شیر اس آدمی کو دیکھ کر غرایا اور ایسا گرجا کہ دل دہل گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیر کے پنجرہ کا دروازہ کھول کر اس نوجوان کو اندر داخل کر دیا۔ شیر نے اس پر جست لگائی اور اسے دبوچنے ہی لگا تھا کہ نوجوان نے نیچے سے ایک کٹار شیر کے سینہ میں گھونپ دی۔ بس پھر کیا تھا شیر نے تمام کلوزیم سر پر اٹھا لیا اور پے در پے حملے شروع کر دیے۔ مگر اس نے ایک ایسا وار کیا کہ شیر پھر نہ اٹھ سکا۔ تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے۔ اور نوجوان پر پھول برسائے گئے۔

اس کے بعد ایک اور آدمی اکھاڑہ میں لایا گیا۔ اور دوسری طرف سے ایک بھینسا چھوڑ دیا گیا۔ بھینسے نے آدمی کو سینگوں پر اٹھا کر ایک ایسی پٹخنی دی کہ وہ چاروں شانے زمین پر آ گرا پھر بھینسے نے اسے اپنے پاؤں سے مسل دیا۔ جوان کو اٹھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ ایک دفعہ اس نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی کہ جھٹ بھینسے نے اپنے سینگ اس کے پیٹ میں گھونپ دیے اور وہ آہ کہہ کر ڈھیر ہو گیا۔

مجھ سے یہ نقشہ نہ دیکھا گیا اور میں نے فرشتہ سے درخواست کی کہ وہ مجھے یہاں

فرشتے نے آسمان کی طرف پرواز کی اور کہنے لگا۔ "دیکھا دنیا میں انسان نوعِ انسان کا کس طرح شکار کرتا ہے۔ تم نے صرف دو ملکوں کا نظارہ دیکھا ہے۔ اور یہ کہ دنیا میں تہذیب و تمدن کے علمبردار ہیں۔ پہلا ملک یونان ہے۔ اسی میں سقراط۔ بقراط۔ افلاطون۔ جالینوس اور سکندر پیدا ہوئے تھے۔ دوسرا ملک روما الکبریٰ ہے۔ اور یہ وہی روم ہے جس نے تمام یورپ کو گلی کا ناچ نچایا ہے۔ یہ وہی روم ہے جس نے یونان کی تہذیب کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ اسی نے ایشیا میں اپنی سطوت کا جھنڈا نصب کیا ہے۔ لیکن اب میں تمہیں ایسا روح فرسا نظارہ دکھاؤں کا جس سے خود میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پہلے آسمان کا دروازہ نظر آیا۔ فرشتے نے دروازہ کھٹکھٹایا آواز آئی کون ہے۔ فرشتہ نے کہا "میں میکل" "اور تمہارے ساتھ کون ہے" فرشتے نے کہا یہ ایک آدم زاد ہے جس کے دل میں ملک کی اصلاح کا جذبہ ہے اسے میں سیر کرا رہا ہوں" آواز آئی "حکم دکھاؤ" فرشتہ نے جھٹ دربان کو تمغہ دکھلایا پہلے فرشتے نے وہ کھڑکی بند کر دی جس سے وہ جھانک کر ہمارے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور دروازہ کھول دیا۔

میں آسمان پر تھا۔ بادِ بہاری مصروفِ خرام تھی۔ فرشتے تسبیح و تقدیس میں محو تھے غرض اس ملکوتی عالم کا حال بیان ہی نہیں ہو سکتا۔ آسمان کی فضا میں یہ نغمہ گونج رہا تھا۔ اور فرشتے اس سے متاثر ہو کر خدا کی حمد بیان کر رہے تھے۔

فرمانِ خدا

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو   کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے   کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی   اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس نغمہ کو سن کر میرے دل میں ایک خاص ولولہ اور شوق پیدا ہوا۔ میں اپنے ذوق و شوق کے عالم میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر اپنے غریب ملک کی حالت پر غور کرنے لگا۔ میں اپنے خیالات میں منہمک تھا۔ اپنے ملک کی تمدنی معاشرتی علمی زرعی اور اقتصادی تکالیف کا رہ رہ کر مجھے خیال آ رہا تھا اور خدا کا فرمان فضائے بسیط میں صاف سنائی دے رہا تھا کہ جس کھیت سے دہقان کو روزی میسر نہ آئے اس کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا جائے جہاں سے کسان کو پیٹ پالنے کے لئے دانہ نہ ملے اس کھیت کو نیست و نابود کر دیا جائے اگر یہی ہونا ہے

تو پھر ہمارے ملک کا کیا حشر ہوگا۔ وہ ملک جہاں لوگ مدت کو بوسے سوجاتے ہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے قابل ہے۔ وہ قوم جس میں نفس پرستی حد سے بڑھ گئی ہو صفحۂ دہر سے حرف غلط کی طرح محو کردینے کے قابل ہے۔ وہ ملک جہاں افلاس وغربت کی وجہ سے زندگی عذاب ہو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے قابل ہے۔

وہ لوگ جو مدت مدید سے خواب غفلت میں مبتلا ہوں ہلاک ہونے کے لائق ہیں۔ ہائے اگر فرمان خدا کی تعمیل ہونے والی ہے تو میرے پیارے ہندوستان کی کیا حالت ہوگی۔ وہ یقیناً سب سے پہلے تباہ کیا جائے گا۔ قعر ذلت کے گہرے گڑھے سے اسے نکالنے کے بجائے نکبت وافلاس کی تیرہ وتاریک غار میں اسے پورے زور سے دھکیل دیا جائے گا۔ یہ خیالات میرے لئے سوہان روح ہو رہے تھے۔ میرے ذہنی تاثرات میں زلزلہ سا آرہا تھا۔ جس کی وجہ سے میں انتہائی اضطراب محسوس کررہا تھا۔

..... ناگہاں رونے اور چلانے کی آواز سنائی دی "ہائے ابا! میری اماں" میں چونک اٹھا آسمان اور اس پر رونا۔ رہبر فرشتہ بولا "جانتے ہو یہ کون ہیں۔ یہ ہندوستانی بچے ہیں۔ ہر روز یہاں ایک بچہ لایا جاتا ہے۔ یہ ہمیشہ روتے ہی رہتے ہیں۔ یہ ہیں ہندوستانی بچے میں حیران ہوا کہ یہ تو میرے ہی ملک کے سپوت ہیں۔ میں نے فرشتے سے پوچھا "یہ کیوں رو رہے ہیں" فرشتہ بولا "بڑوں کی جان کو روتے ہیں۔ روئیں نہ تو اور کیا کریں۔ انکی ماؤں نے ہمیں عجب مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ان کا رونا سنکر ہمیں خود ہی رونا آتا ہے یہ وہ بچے ہیں جنہیں ہر سال ہندوستان میں قتل کیا جاتا ہے"

میں نے کہا "ہمارے ہاں تو کوئی قتل نہیں ہوتا۔ قتل تو ہم نے کریٹ اور روم میں دیکھے ہیں۔ ہمارے ملک میں تو تم نے آج تک کوئی ایسا نظارہ نہ دیکھا ہوگا" فرشتہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

"یہ قتل کریٹ اور روم کے واقعات سے زیادہ اہم ہیں" میں حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ اتنے میں ایک چھوٹا سا لڑکا میرے پاس سے گذرا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہو۔ میں نے ذرا تامل کیا تو یاد آیا کہ یہ ہمارے ہی شہر کا لڑکا ہے اس کے والدین نے اسے ایک مرتبہ کوئی زیور پہنایا تھا۔ بس پھر لڑکے کا پتہ نہیں کہ کہاں گیا سنا تھا کہ لڑکے کو کوئی بدمعاش زیور کے لالچ میں اٹھا کر لے گیا تھا۔

فرشتے کہنے لگا - میاں کیا سوچ رہے ہو۔ تمہارا ہی کہنا درست ہے اور کروڑی مل کا لڑکا سادھو رام ہے۔ اب بتاؤ لالہ کروڑی مل زیادہ موذی ہے کہ ٹھوٹھار"۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر روز ایک معصوم بچہ محض اسلئے قتل کیا جاتا ہے کہ اس کے والدین اسے زیور پہناتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ ایتھنز والے صرف آٹھ نوجوانوں کیلئے کس طرح روتے تھے مگر جس ملک کے تین سو پچاس یا ساٹھ بچے ضائع ہو رہے ہیں اسے اس بات کا علم ہی نہیں۔ اس کے باشندوں میں اسقدر احساس ہی نہیں۔ انہیں خبر ہی نہیں کہ بچوں کو زیور پہنانا ان کی ہلاکت کا باعث ہے۔ بچوں کے قتل کے ذمہ دار خود ان کے والدین ہیں۔ اب بتاؤ مدم کا کلوڈیم زیادہ خطرناک ہے کہ ہندوستان کے جاہل والدین"

میں عجب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ دل ہی دل میں پشیمان ہو رہا تھا۔ اپنے ملک کی تذلیل دیکھکر میرا دل بھر آیا۔ میں نے بہت ضبط کیا۔ مگر اشکوں کا سیلاب نہ تھم سکا۔ بس رویا اور خوب رویا آنسو آنکھوں سے نکلکر میرے رخساروں کو تر کر رہے تھے۔ وفور گریہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرا تکیہ آنسوؤں سے تر ہو رہا ہے۔ یہ وہ آنسو تھے جو میں نے اپنے ملک کی اس قبیح رسم پر بہائے۔ لیکن اس واقعہ کے احساسات ہمیشہ میرے لئے روحانی عذاب کا سبب رہیں گے۔

میں ہر وقت اسی سوچ بچار میں رہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح میری دلی کیفیات سے وہ ہیجان دور ہو جو اس واقعہ سے پیدا ہو گیا ہے لیکن ملک کی موجودہ پستی دیکھ دیکھکر دل میں ہوک اٹھتی ہے اور درد میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہت غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر ہمارے ملکی بھائی تمام مذہبی اور قومی اختلافات کو بالائے طاق رکھکر اس امر کی کوشش کریں کہ جس طرح ہو سکے ہمارے ملک میں علم کو فروغ حاصل ہو تو بگڑی بن سکتی ہے۔ ہمیں تمام اختلافی مسائل کو اسوقت چھوڑ کر اس بات کی تن من اور دھن سے کوشش کرنا چاہئے کہ جس طرح ہو سکے اپنے ملک کی عزت اور وقار کی کشتی کو سمندر کی متلاطم موجوں سے نکال کر ساحل مراد پر پہونچایا جائے۔ موجودہ صورت حال میں ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے پیارے ملک کی گذشتہ شہرت کو برقرار رکھنے کیلئے اس بات کی مکمل طور پر کوشش کریں کہ یہاں کا ہر ایک باشندہ سونے چاندی کے زیورات کی بجائے زیور تعلیم سے آراستہ ہو۔ علم کے زیور سے مزین ہو کر ہم دنیا کی مہذب ترین محفلوں میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ہماری یہی

حالت رہی تو وہ وقت دور نہیں جب ہم اپنی موجودہ ہستی کو بیٹھیں گے۔

رہنمایانِ ملک اور لیڈران قوم کی خدمت میں میری یہ مؤدبانہ گذارش ہے کہ اسوقت وہ صرف اس بات پر زور دیں کہ ہمارے ملک میں تعلیم کا چرچا اور رواج عام ہو۔ جب تک ملک تعلیم یافتہ ہوگا۔ تو باشندگان میں خود بخود وسیع القلبی پیدا ہو جائے گی اور تمام اختلافات کافور ہو جائیں گے۔

گائے

(از پنڈت امرناتھ زتشی صاحب)

خدا کے نام سے کرتا ہوں ابتدائے سخن
اسی سے دارِ فنا میں ہوئی بنائے سخن
یہ نا خدائے سخن ہے یہی خدائے سخن
یہ ابتدائے سخن ہے یہ انتہائے سخن
بیان ہو گائے کی تعریف مدعا یہ ہے
سخنوروں کو شکایت نہ ہو مزا یہ ہے
خدا نے خوب عطا کی ہے لوح پیشانی
بہار دید ہے اُس کی جبیں نورانی
بیاں میں آئے کہاں دلفریب عنوانی
بجا ہے کہئے اگر اس کو زُہرہ ثانی
ہلال عید سے خوشتر ہیں کنگرے سر پر
رواں ہے دودھ کی دھاروں میں چشمۂ کوثر
اسی کے فیض سے رہتے تھے یہاں کتنے
نصیب دودھ ہو جن کو رہے یہاں کتنے
اسی کی ہند میں پہلے دہائی پھرتی تھی
جدھر یہ پھرتی تھی ساری خدائی پھرتی تھی
جفائیں سہتی ہے اہل وفا سے مستغنی
جو درد اس کو ہے وہ ہو دوا سے مستغنی
بشر کو رکھتی ہے گویا غذا سے مستغنی
خدا کے واسطے ہے ماسوا سے مستغنی

کہاں تک اسکی ہو توصیف مختصر یہ ہے
کہ ہندیوں کے لئے سوۃ البقرہ ہے

آرزو

(از گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

رنگینیٔ فلک سے عیاں ہے پیامِ شوق — گویا شفق ہے جلوۂ عنوانِ آرزو

پھر دامنِ فلک سبدِ گل فروش ہے — پھر بڑھ رہی ہے وسعتِ دامانِ آرزو

پھر آرہے ہیں جھونکے ہوائے بہار کے — پھر جوشِ عشق دل میں ہے مہمانِ آرزو

پھر کالی بدلیاں نظر آتی ہیں چرخ پر — پھر اُڑ رہی ہے زلفِ پریشانِ آرزو

پھر رو رہا ہے ابرِ بہاری گہر فشاں — پھر بھر رہا ہے شوق سے دامانِ آرزو

پھر برقِ شعلہ ریز کو جنبش ہے چرخ پر — رقاص پھر ہے شعلۂ عریانِ آرزو

پھر ماہتاب بامِ فلک پر ہے جلوہ ریز — پھر ضوفشاں ہے شمعِ شبستانِ آرزو

پھر بامرہ نواز ستارے چمک اُٹھے — پھر شعلہ زا ہے سوزشِ پنہانِ آرزو

پھر یاد آگیا کوئی محفل فروزِ حسن — پھر بڑھ رہی ہے رونقِ ایوانِ آرزو

پھر بڑھ گئیں کسی کے تصور کی شوخیاں — پھر تازہ کشمکش میں پھنسی جانِ آرزو

رخصت ہوئی مناظرِ لطف آفریں کی سیر — اب میں ہوں اور کاوشِ پنہانِ آرزو

جمعیتِ نشاط کا ساماں کہاں نصیب
اک دل ہے اب سو وہ بھی پریشانِ آرزو

عام فہم زبان

(از مسٹر سلیم جعفر)

آٹھ بجے سیر سے لوٹ کر میں اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دوست تشریف فرما ہیں اور ان کے ساتھ ایک کرسی پر ایک اجنبی بھی۔ علیک سلیک کے بعد میرے پوچھنے پر میرے دوست نے جواب دیا۔

"آپ کا نام ششدھر شرما ہے۔ آپ مدھوکر کے ایڈیٹر ہیں۔"

میں — آپ سے نیاز حاصل کرکے بے اندازہ خوشی ہوئی۔ یہاں کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔

دوست۔ پرچہ کی اشاعت کے سلسلہ میں۔

میں — تو کیا آپ کو امید ہے کہ میں خریدار بن جاؤنگا۔

دوست — کیوں نہیں۔ امید نہ ہوتی تو میں انہیں یہاں لاتا ہی کیوں۔

میں۔ آپ کو دھوکا ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ گھر بھر میں ایک میں ساڑھے تین آدمی ہیں اور میں چار پرچوں کا خریدار ہوں۔

دوست۔ تو پانچویں سواروں میں یہ بھی سہی۔

میں۔ بجا۔ لیکن سوال "نقدہ حرمتہ" کا ہے۔ میرے جیب میں آتے ہی ان کے پر لگ جاتے ہیں اور پھر ان کو بلانے میں جو مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ انہیں کچھ میں ہی خوب جانتا ہوں۔

ششدھر۔ مہاشے۔ اس پتر کا بارشک مولیہ کیول چھ روپے ہے۔ پرتی دوس ایک پیسے سے نام ماتر ہی ادھک ہوا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اس سے ادھک کی تو آپ بیڑیاں ہی پی جاتے ہوں گے۔

میں۔ میں بیڑیاں نہیں پیتا۔ لیکن اس قصہ کو جانے دیجئے۔ اتفاقیہ آپ سے نیاز حاصل ہو گیا اسلئے اگر ہرج نہ ہو تو مجھے یہ بتا دیجئے کہ ایڈیٹر صرف کرتا کیا ہے؟

ششدھر۔ اس کا کام ہے کہ ادمی نے جو لیکھ بھیجے ہیں ان میں سے پتر کیلئے چنے۔ یہ کام بھی

پچھ لیکھ اور ٹپنیاں لکھے۔

میں۔ اوہو۔ تو ایڈیٹر بننا تو کھیل ہی نکلا۔ چھپنے کے لئے مصالح اور ہی بھیج دیتے ہیں جس کا مضمون چاہا چھاپ دیا اور جس کا چاہا ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ رہیں ٹپنیاں۔ یہ کیا بلا ہیں۔ اور کیونکر لکھی جاتی ہیں۔ اگر کچھ ہرج نہ ہو تو بتا دیجئے۔

گفتگو یہیں تک ہوئی تھی کہ ایک پڑوسی آگئے اور ہنس کر کہنے لگے " ایڈیٹر صاحب آپ بھی کہاں آپھنسے یہ تو خود مضمون کے صفحے کالے کیا کرتے ہیں۔ اور ایک رسالہ کی جان کو بلائے بے درماں ہیں

ششدھر۔ (ہنستے ہوئے) تو ماشے آپ مجھے بنا رہے ہیں۔

میں۔ آپ کا خیال غلط ہے۔ چونکہ میں نے کبھی کسی رسالہ کی ایڈیٹری نہیں کی۔ آپ سے یہ فن سیکھنا چاہتا ہوں۔

ششدھر۔ اب ان باتوں کو چھوڑیئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی پڑھے ہیں اور اس میں سندیہ نہیں کہ یدی آپ چیشٹا کریں تو ہندی میں بھی لیکھ لکھ لینگے۔ کرپیا ایک آدھ لیکھ ہمیں بھی دیجئے۔

میں۔ مجھے اتنی ہندی نہیں آتی کہ مضمون لکھ سکوں۔ اردو میں کچھ لکھ بھی دیا تو وہ آپکے کس کام کا۔

ششدھر۔ یدی آپ ایسی بھاشا لکھیں گے جسے سرو سادھارن سمجھ لیں تو ہم آپکا لیکھ اوشیہ چھاپیں گے۔ پرنتو بھاشا کلشٹ بھی ہوئی تو بھی کوئی چنتا نہیں۔ ہم نے انو وادک رکھ چھوڑے ہیں وہ اس کی سرل ہندی بنا دینگے

میں نے مضمون دینے کا اقرار کر لیا اور ادھر ادھر کی چند باتیں کر کے ایڈیٹر صاحب کو رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد کرسی پر سے اٹھ کر مونڈھے پر جا بیٹھا۔ کیونکہ انگلش چیر سے یہ انڈین چیر زیادہ آرام دہ ہے۔ اور سوچنے لگا کہ " سرو سادھارن " کسے کہتے ہیں " سرل بھاشا " کس بلا کا نام ہے۔ کیا ایڈیٹر صاحب کے منہ سے جو پھول جھڑ رہے تھے انہیں کا نام " سرل بھاشا " ہے یہ تو ہر شخص آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ فضائے اردو میں بھی آجکل " عام فہم زبان " کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ آخر یہ بیماری کیا ہے۔

اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ ڈاکٹر بلیر کی تصنیف " بلاغت و ادب " کا خیال آیا فوراً اٹھا کر دیکھی لکھتے ہیں۔

" جس مصنف کی زبان میں سلاست و سادگی ہوتی ہے وہ اپنا مطلب اس طرح بیان کرتا ہے

کہ پڑھنے والا اس کی تحریر دیکھکر یہ سمجھتا ہے کہ میں لکھتا تو یونہی لکھتا" ہو دلیکن سادگی کی تعریف یوں کرتا ہے۔

"مشہور کہانیاں ہے کر ایسے قصے لکھوں گا کہ جو دیکھے یہی سمجھے کہ وہ بھی ایسے ہی لکھ سکتا ہے لیکن لکھنے بیٹھے تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے"

"ایسے مصنف کے بیان میں صناعت کے آثار نہیں ہوتے معلوم ہوتا ہے فطرت خود بول رہی ہے۔ اس کی طرز سے مصنف اور اس کی دماغ سوزی نہیں جھلکتی بلکہ اس سے اسکی تعریف اور فطرت کا پتہ چلتا ہے"

مگر یہ ایک ذرا دقیانوسی مصنف کی رائے تھی اس لئے میں نے ہیزلٹ کی طرف رخ کیا جو اس کے بعد کا مصنف ہے۔ اگرچہ دونوں کے زمانے میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ وہ "عام طرز تحریر" سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اس طرز میں بے معنی شکوہ بے مرد ود نہیں۔ بلکہ اس سے ہر طرح کا ابتذال پستی بے ڈھبی بے محل تلمیحات بھی خارج ہیں۔ اس طرز کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ سب سے پہلے سوجھ گیا لے لیا اس کا مطلب ہے کہ اچھے سے اچھا لفظ جو استعمال عام میں ہو وہ لیا جائے۔ اس طرز کا مقصد یہ نہیں کہ جیسے جی چاہا ویسے ایک جگہ جمع کر دیے بلکہ اس کا مطلب ہے زبان کے صحیح روزمرہ کا استعمال کرنا اصلی عام طرز اس طرح لکھنے کو کہتے ہیں کہ جس سے معلوم ہو کہ کوئی ایسا شخص باتیں کر رہا ہے جسے لفظوں اور ان کے انتخاب پر پوری قدرت حاصل ہے۔ جو بے تکلفی، قوت اور صفائی سے باتیں کرتا ہے اور جو عالمانہ اور خطیبانہ انداز سے دامن بچاتا ہے"

یہ دونوں مصنف کسی قدر دقیانوسی ہی لیکن اکثر دقیانوسیت عیب نہیں ہوا کرتی جبکہ وہ کسی مستقل حقیقت کی مظہر ہو۔ مثلاً ان دونوں مصنفوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ محض لفظوں کی الٹ پلٹ ہے۔ خیال میں کوئی واقعی فرق نہیں۔ بیئر کہتا ہے کہ "ایسے مصنف کے بیان میں صناعت کے آثار نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے فطرت خود بول رہی ہے" اور ہیزلٹ اسی خیال کو یوں ادا کرتا ہے "اصلی عام طرز اس طرح لکھنے کو کہتے ہیں جس سے معلوم ہو کوئی ایسا شخص باتیں کر رہا ہے۔۔۔ جو عالمانہ اور خطیبانہ انداز سے دامن بچاتا ہے۔ اس لئے بعد کے استادان فن کے اس بارہ میں جو خیالات رہے ہیں ان کا پتہ لگا کر انہیں زمانۂ حال تک لانا فضول ہے۔ وہ بھی صرف لفظوں کو بدلتے رہے ہوں گے۔ قصہ مختصر خیالات کو اس طرح کے لفظوں میں ظاہر کرنا جو عام طور سے بولے

جن مضمون میں پیچ نہ ہوں معیار سادگی یا عام فہمی ہے
لیکن یہ معیار کوئی معیار نہیں۔ ایک شخص بالکل بلیغ اور فطری طریق سے گفتگو کر سکتا ہے اس کے فقرے منطق اور صرف و نحو کی رو سے بالکل صحیح ہو سکتے اور فصاحت و بلاغت کے معیار پر پورے اتر سکتے ہیں اور پھر بھی وہ فہم عام سے بلند تر ہو سکتے ہیں۔ کبھی یہ بات نفس مضمون پیدا کرتا ہے اور کبھی اس کی وجہ گفتگو کرنے والے کی علمیت ہوتی ہے۔

"فہم عام" بھی کچھ مبہم سی اصطلاح ہے۔ لفظ "عام" ایک وسیع المعنی لفظ ہے "فہم" کی پست ترین سطح جاہلوں سے شروع ہوتی ہے۔ چونکہ ان کے خیالات اور ان کی واقفیت محدود ہوتی ہے اس لئے اپنا مطلب بیان کرنے کیلئے انہیں بہت سے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور ان کا کلام اکثر ان آرائشوں سے پاک ہوتا ہے جو علم معانی و بیان سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی گفتگو میں تشبیہ و استعارہ دونوں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی تشبیہیں مشاہدات روزمرہ کیلئے جو لفظ ہیں ان سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اور استعارے صرف وہی ہیں جو وہ چار انہوں نے خود بنا لئے ہیں یا جو عالموں کے حلقے سے نکل کر جاہلوں تک جا پہنچے ہیں۔ ایک قصہ ہے کہ کسی ملک کا راجہ لاولد مر گیا۔ ارکان دولت نے طے کیا کہ جو شخص سب سے پہلے صبح سویرے فلاں دروازے سے دار السلطنت میں داخل ہو وہی گدی پر بٹھایا جائے۔ اتفاق سے ایک گنوار کا لڑکا آیا جو سب سے پہلے اس دروازے سے دار السلطنت میں داخل ہوا۔ صاحب قرعہ تو اسی ہاتھی پر بٹھا کر لائے اور گدی پر بٹھا کر خوب خلعت پہنائے پان کھلائے گئے پلنگ پر سونے لیٹا تو لونڈیاں باندیاں پاؤں دابنے لگیں اس آرام کے بعد گنوار کی لال چھوٹ پکڑ لی اور اس کی خبر ہوتے ہی فوراً مر گیا۔ جو کچھ اس پر گزری تھی اس کے ماں باپ نے ان لفظوں میں بیان کر کے

چار پاؤں کو ٹھونک ٹھونک، جا کے پونچھ لگیا	جا پہ چڑھ کے اشبر دیکھو تو بھی نہ مر جی میا
	باجا باجے رے مرے بھیا !
چل کے سب پتے منگائے، جا پہ لا کے دھیا	سارے راتاں دبو ٹھوکو، تو بھی نہ مر جی میا !
	باجا باجے رے مرے بھیا !
چار پہری اس سے اتریں ہمن پہ لال رجیا	سارے راتاں ڈکش مارو تو بھی نہ مر جی میا !
	باجا باجے رے مرے بھیا !

بیچارے نے نہ کبھی ہاتھی دیکھا تھا۔ نہ پان کھائے تھے۔ نہ خوش لباس لونڈیاں باندیاں دیکھی تھیں سان کی تصویریں کھینچ کھینچ کر دکھا رہا ہے۔ اس کا سامان جتنا ہے اس کے گاؤں

کی حد سے باہر کا نہیں ہے۔ ہاتھی کے پاؤں کو کھمبوں سے۔ پان کو پیپل کے پتوں سے۔ پھوٹ
کوڑی سے۔ پیک تھوکنے کو لہو تھوکنے سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ اس ایرانی شاعر کے سے استعارے
کہاں سے لاتا جو کہتا ہے۔ ؎

لولو از نرگس فرو بارید گل را آب داد   وز تگرگ روح پرور مالش عناب داد

یہ تو ایک معصیت زدہ کی کہانی تھی اب ایک غیرت مند بی بی اپنے شرابی میاں کی شکایت کر رہی ہے۔ وہ چار شاید ممالک متحدہ کا رہنے والا تھا۔ یہ عورت دلی کی کمیٹی ریاست اود رہنے والی ہے

پیہر لو کیسے جاؤں رانڈ کو موہ لیا تو ڈھیلے   کونڈا نیچے دھر لو ملیدہ چنا کشکتو ڈو۔
پیہر لو کیسے جاؤں
بارہ برس میں پیہر چالی ٹھس ٹھس رو تو دو ڈھیلے   کھونٹی پے تو دھرے دھوتی تنیا باندھیو ڈنڈا
پیہر لو کیسے جاؤں

دیکھئے اس بیان میں کس بلا کی صفائی و سادگی ہے۔ جذبات کا کیسا سچا اور اچھا فوٹو۔ لیکن یہ بھی گاؤں کی حدود سے باہر نہ نکل سکا۔ ان دونوں کا فہم ایک ہی مرتبہ پر ہے۔ اگر فہم رکھا جائے تو عام فہم وہ عبارت ہوگی جو اس قسم کے تمام لوگوں کے دائرہ فہم سے باہر نہ ہو۔

اس سطح سے بلند تر وہ لوگ ہیں جن کے دماغ ضیائے علم سے منور ہیں۔ ان کی گفتگو اور فہم پر خارجی اثر پڑے ہیں۔ ان کا لفظیات وسیع ہے ان کو اپنی گفتگو میں رنگینی پیدا کرنے طریقے سکھائے گئے ہیں۔ لیکن اس طبقے کے بھی مدارج ہیں۔ جو "مقدار علم" پر مبنی ہیں۔ جتنا زیادہ پڑھا ہے وہ اتنا ہی زیادہ سمجھ سکتا ہے۔ مدارج میں مدارج پیدا کرنے والے مختلف علوم ہیں۔ چونکہ ہر علم کی طرز بیان الگ الگ ہے۔ اس کی اصطلاحیں الگ ہیں۔ اس لئے بے طبقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً منطق کو لیجئے۔ کیا اس علم میں قیاسات اور قضایا کے وہی معنی جو اس علم سے ناواقف کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جنہوں نے منطق پڑھی ہے وہ ان سے معنی جانتے ہیں۔ اگر ان پڑھے کے سامنے کسی منطقی مسئلہ پر بحث ہو رہی ہو اور قضیہ سالبہ دہریہ کا آجائے تو وہ سب بے تکلف سمجھ جائیں گے حالانکہ جو اس علم سے ناواقف ہیں وہ کہیں گے کہ یہ عالم گفتگو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یعنی جو گفتگو ایک طبقہ کے لئے عام فہم ہے وہ دوسرے کیلئے نہ مدارج علم بے انتہا طبقے پیدا کرتے ہیں اور ہر طبقے کے ساتھ ساتھ اصطلاح عام فہم بھی

جاتی ہے۔

لیکن اس اصطلاح کے ایک ایسے معنی بھی لئے جا سکتے ہیں جو ان سب مدارج پر منطبق ہو سکتے ہیں جو تفاوت "مقدار علم" سے پیدا ہوتے ہیں وہ اس صورت سے کہ بلند سے بلند مرتبہ والا اس زبان میں بات چیت کرے جو پست سے پست درجہ والے فہم سے بالاتر نہ ہو۔ اس قسم کی گفتگو ممکن ہے مگر اسمیں دو دقتیں ہیں ایک تو یہ کہ علمی اصطلاحوں کی وجہ سے جو عام فہمی میں دقت ہوتی ہے وہ ہرگز رفع نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ حسن کلام اور خوبی بیان میں بڑا فرق آجائیگا۔ کیونکہ تزئین کلام کے لئے جو تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں ان سے پست ترین درجہ کی گفتگو کا بیشتر حصہ معرا ہوتا ہے۔ اور خوبی بیان سے معنی یابی میں جو دقت پیدا ہو جاتی ہے پست ترین طبقہ یا تو اس کا عادی نہیں ہوتا یا اس کی سمجھ اسقدر اعلی نہیں ہوتی کہ وہ ان کو آسانی سے سمجھ سکے۔ اگر عبارت کو عام فہم بنانے کیلئے ان سب باتوں کو خیرباد کہہ دیا جائیگا جو حسن کلام کی تعریف میں آتی ہیں تو وہ محض روکھی پھیکی اور اکثر بے اثر نہ ہو جائے گی بلکہ بعض اوقات جو باتیں کہنے والا کہنا چاہتا ہے اگر کہے گا تو اتنے بھونڈے اور کریہہ پیرایہ میں کہے گا کہ اس سے سننے والے کو خواہ مخواہ نفرت ہوگی۔

تشبیہہ۔ استعارہ۔ جدت ادا وغیرہ ہی کائنات تزئین کلام ہیں اور بیشتر ایسے مطالب ان کے ذریعہ سے نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیے جاتے ہیں جن کا سیدھے سادے لفظوں میں بیان کرنا شستہ مذاق پر گراں گزرتا ہے۔ مصنف گلزار نسیم نے حق محاکات ادا کرنے کیلئے تین موقعوں پر سماں کا سماں کھینچا ہے اور انہیں تدبیروں سے کام لے کر ابتذال کو تہذیب کا جامہ پہنایا ہے۔

(۱) یہ کہہ کے ملے بہم وہ ایسے | صفحے خط تواماں کے جیسے
(۲) طومار حجاب کو کیا طے | ساغر پہ جھکا وہ شیشۂ مے
(۳) کاوش پہ ہوا گہر سے الماس | غنچے نے بجھائی اوس سے پیاس

واں غنچہ یاسمیں تھا گلنار | یاں دامن سرو ارغواں زار

واں صبح صفا تھی گل بداماں | پھولی رخ مہر پر شفق یاں

اس مصنف کو جب یہ دکھانا پڑا کہ ایک عورت کا یا پلٹ ہوکر مرد ہوگئی اور ایک مرد عورت بن گیا تو یوں سخن سنج ہوتا ہے۔

تھا لے میں یہاں اگا صنوبر | واں شیشہ رہا ترش کے ساغر

مرد جب اپنی اصلی حالت پر آتا ہے تو اس کا بیان یوں کرتا ہے۔

[illegible]

ترکش پہ نگاہ کی تو تھا تیر قبضہ میں پھر آئی کھوئی شمشیر

زین الملک مدت سے کہنا اپنے بیٹے ملوح الملک سے ملتا ہے اور پوچھنا چاہتا ہے کہ اُس سے شادی کی یا نہیں لیکن فرق مراتب صاف صاف سوال کرنے سے مانع ہے۔ لالہ ہنال چند ابھی گل بکاؤلی اس کی زبان سے یہ لفظ ادا کرتے ہیں۔ " سرو آزاد ہو یا کسی شمشاد قد سے پیوند گیر" اگر استعارے سے مدد نہ لی جاتی تو تسنیم حق محاکات ادا نہ کر سکتے اور لالہ ہنال چند زین الملوک کی قوت حل کرنے سے قاصر رہتے۔ دونوں کے کلام جدت ادا سے عاری اور خلاف تہذیب ہوتے۔

اگرچہ مراتب علم سے جو مدارج پیدا ہوتے ہیں وہ مٹائے نہیں مٹ سکتے اور علوم مختلفہ اسلوب بیان سے زبان کی عام فہمی میں جو دقتیں پیش آتی ہیں وہ ہرگز دور نہیں ہو سکتیں لیکن یہ کوشش کی جا سکتی ہے کہ بے وجہ لغت بازی سے دامن بچایا جائے اور جدت ادا کو ایک مناسب حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ مثلاً اس فقرہ کا لطف " پھر جان دیدینا ہے تو جرأت شجاعت کی آخری منزل نہیں "۔ میرے نزدیک فہم عام کی قربان گاہ پر یوں بھینٹ چڑھایا جاتا " پھر ہمت اور بہادری یہی تو نہیں کہ جان دیدی جائے " یا تشنہ روح کی پیاس سے بیتاب ہو کر شراب شوق کی حلاوتوں سے لذت آشنا ہونے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا " اسکا اس طرح کیا جا سکتا ہے " جوانی کی امنگوں سے بیچین ہو کر مزے لوٹنے کیلئے اپنا سب کچھ گا۔ مگر اس تجویز پر عمل کرنا بہت دشوار ہے۔ سچ ہے۔ میرا یہ عیب ہے کہ صلاح دے سکتا ہوں مگر اس پر عمل نہیں کر سکتا۔

دور جدید

(از حضرت بسمل الہ آبادی)

اے شیخ و برہمن یہی ایک اسمیں ہیچ ہے ایمان جب نہیں ہے تو مذہب بھی ہیچ ہے
کوئی ناخوش ہو کہ خوش یہ غم نہیں ممبری پیغمبری سے کم نہیں
مزا ملاپ کا دل سے جو دل ملے تو ملے بندھی کلی نہیں کھلتی کلی کھلے تو کھلے
جو جا کے دم گھٹائیں یہ غیر ممکن ہے کسی سے حضرت بسمل اگر ملے تو ملے

کرشن اوتار

از حضرت برق دہلوی مرحوم

مٹا کے ظلمتِ ہستی کو جلوہ بار آیا — زمیں پہ حُسنِ ازل ہو کے بیقرار آیا
جگا کے ذروں کی تقدیر تابشِ رُخ سے — ضیا فروزِ جہاں مہرِ تابدار آیا
نظر کو نور، دلوں کو سرور دینے کو — سحابِ لطف و کرم برق در کنار آیا
سکھانے پریت کی ریت اور سنانے پریم کے گیت — لئے وہ بانس کی پوری میں لالہ زار آیا
طلسمِ ہستیٔ بے بود بے نقاب ہوا — امینِ راز برائے کشودِ کار آیا
مٹی جو ظلمتِ اوہام کھل گئیں آنکھیں — کہ منکروں کو حقیقت کا اعتبار آیا

تجلیٔ رُخِ روشن سے نور پھیل گیا
شرابِ نور سے کیف و سرور پھیل گیا

گوال بنکے بسر کی گوال بالوں میں — رہا بہارِ جہاں بنکے نونہالوں میں
تجلی پاش تھا جھرمٹ میں گوپیوں کے رہی — تھا ایک چاند کا جلوہ ہزار ہالوں میں
سُرورِ عشق سے تھا ساقیِ ازل مسرور — مئے طہور کا تھا دور حُسن والوں میں
اُسی کے نور کے پرتو سے تھا فروغِ جمال — ضیائے مہرِ منور تھی مہ جمالوں میں
ہزار رنگ سے جلوہ نمائی کی اُس نے — بسا دلوں میں، سمایا کبھی خیالوں میں
اماں جہان کو دی کنس کے مظالم سے — حیاتِ نو ہوئی پیدا شکستہ حالوں میں

نچایا کوہ کو اُنگلی پہ کاہ کی صورت
مٹایا نقشِ شبِ تار ماہ کی صورت

نوائے نے سے حقیقت کی ترجمانی کی — کدم کی چھاؤں میں دی داد گلفشانی کی
فضائے دہر کو نغموں سے کر دیا سرشار — نسیمِ لطف چلی کیف جاودانی کی
ہٹا کے بارِ سیاہ کالی دہ کو پاک کیا — بڑھائی آبرو آبِ گہر سے پانی کی

سحابِ فیض سے سیراب تشنہ کام ہوئے | رواں وہاں ہوئی اک لہر شادمانی کی
ہر ایک ذرۂ بیجاں میں جان سی آئی | وہ روح پھونک دی احساس زندگانی کی
عمل کے پردے میں "نظام" کا سبق دیکر | دکھائی منزلِ مقصود کامرانی کی

ہوا و حرص سے نفسانیت سے پاک کیا
بلند رتبۂ آلودگانِ خاک کیا

کیا جہاں کو منوّر ضیائے عرفاں سے | فروغِ نور ہوا جلوۂ فراواں سے
بقدرِ ذوق دیا سب کو لطفِ جلوۂ دید | نظر نوازی تو پر روئے تاباں سے
انھیں بھی بارشِ انوار سے کیا شاداب | جلے تھے خرمنِ ہستی جو برقِ عصیاں سے
جہانِ تیرہ کو گیتا سے جلوہ زار کیا | مٹائی تیرگیِ جہل بزمِ امکاں سے
"سوراٹ روپ" میں ارجن کو جب دیئے درشن | کیا حجاب خودی دور چشمِ حیراں سے
بنایا محرمِ اسرار ناشناسوں کو | علیم راز کیا وصلِ جان و جاناں سے

نہفتہ راز حیات و ممات کھول دیئے
تمام عقدۂ بند و نجات کھول دیئے

غزل

از جناب افسر صدیقی امروہوی

نظر حدود کی خوگر جمال نامحدود | مرے نصیب میں ہے ماتمِ مذاقِ شہود
اِدھر گمانِ تصوّر کہ میں اکیلا ہوں | اُدھر یقینِ محبت کہ آپ ہیں موجود
سوادِ شب میں نہاں ہے رہی ہے تابشِ مہر | عجیب شے ہے ترا جلوۂ حجاب آلود
اسی لباس میں وحشی کو نذرِ خاک کرو | کفن کو کیا کبھی ہونا نہیں غبار آلود
تم آؤ گے بھی تو کیا چین آئیگا مجھکو | علاجِ دردِ نہاں صبر ہے سو نا موجود
اِدھر اُدھر سے نظر کو بچاکے دیکھ ذرا | حجابِ ناز سے باہر ہے چہرۂ مقصود

حیات و موت سے افشا ہوا یہ راز افسر
کہ اک زیاں ہے نہاں زیرِ پردۂ ہر سود

تنقید کتب

مادرِ ہند[1]

یہ کتاب خان بہادر سید علی محمد صاحب شاؔد عظیم آبادی کی ایک مثنوی ہے جو مرحوم نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ملکہ وکٹوریہ کے جشن جوبلی کے موقعہ پر تصنیف فرمائی تھی۔ اسوقت اس کا نام "نوید ہند" رکھا گیا تھا۔ اس میں ملک کے ہندو مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے تعاون کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اسوقت ان کا اس مثنوی کو طبع کرانیکا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں بعض احباب کے اصرار پر حضرت شاؔد نے اس مثنوی پر نظر ثانی کر کے اس کا نام "مادر ہند" رکھا۔ جو اس لحاظ سے بہت مناسب ہے کہ اس میں ہندوستان کے دو بیٹوں نام و رحیم (ہندو مسلمان) کی باہمی ناچاقیوں کی وجہ سے جو خانہ ویرانی ہوئی ہے اس کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اس طرح لائق مصنف نے ایک نصیحت نامہ لکھکر بھارت ماتا کے ہندو مسلم فرزندوں کے لئے پیش کیا ہے۔ یہ مثنوی حسن و عشق کی چاشنی سے معرا ہے۔ اس پر بھی اسمیں سلاست زبان مضامین کی بلندی اور فن شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ شروع سے آخر تک مثنوی پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کی خوبیوں کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی تعریف میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

عشرت میں گلشت سے فزوں تر | خوبی میں بہشت سے فزوں تر || ہر گوشہ زمیں کا رشک گلشن | جس نخل کو دیکھئے وہ چندن
جینے لفنس جو تھی صبا میں | صحت تھی ملی ہوئی ہوا میں || ہر سنگ کو لعل پر شرف تھا | الماس بصورت خزف تھا
ہر ذرہ تھا آبرو میں گوہر | ہم سنگ جواہرات پتھر || بازار عدن وہاں کے رستے | پانی کے عوض گہر برستے
مخمل کی طرح زمیں میں نرمی | سردی تھی سوا نہ تیز گرمی || خوش رنگ ہر اک شجر کے اثمار | کوزوں میں لئے نبات تیار
جس پھول کو سونگھئے وہ خوشبو | جس نخل کو دیکھئے وہ دلجو

یہ بھارت ورش کا حال تھا۔ اب بھارت ماتا یا مادر ہند کا حال سنئے۔ فرماتے ہیں ؎

دیکھے جتنے سکندر زمانے | دنیا کے پڑھے جتنے فسانے || ذی جاہ و خجستہ کام تھی وہ | عالم میں بلند نام تھی وہ

[1] ملنے کا پتہ :- شاد بک ڈپو چوکھٹہ۔ پٹنہ سٹی

مشہور تھا فیض عام اس کا — تھا مادر ہند نام اس کا — تھے قصر جہاں کہ گھر میں ہر اک — کرتی تھی وہ سب پہ لطف یکساں

آتا جو کوئی تو مال دیتی — طالب کو جیب مال دیتی — شاہوں سے گدا سے کی دعا لیتی — راجہ تھا اس کو پیارا

اور اس مادر ہند کے بیٹے کیسے تھے؟

ہر گوشہ ملک سبز و شاداب — راجہ تھا کوئی نوکری نواب — الفت میں بھی سب کا تھا یہ عالم — اس نے بھی سنے خبر سنے تھا کم

دم بھر کو اگر وہ جاگ جاتے — انسیم بھی ڈپٹ سے بھاگ جاتے

لیکن جب مادر ہند کے دونوں فرزند رام و رحیم آپس میں لڑ کر خانہ ویرانی کا سامان بہم پہنچانے لگے تو ماں کا دل کڑھتا ہے۔ اور وہ کس محبت و شفقت اور کس سلیس زبان میں دونوں بیٹوں کو نصیحت کرتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دو چار گھڑی شکستہ حالاں — وہ بانوئے دلفگار و نالاں — سوچی کہ رہوں غرض اگر ہیں — گھر بیٹھ گئی آپ اپنا گھر میں
دونوں بیٹوں کو تب بلایا — شفقت سے ملی گلے لگایا — الفت سے ہر ایک پہ نظر کی — کس جوش سے لیں بلائیں سر کی
پھر گرم سخن ہوئی وہ اس طرح — تب ہے مجھے نیند آئے کس طرح — قسمت کا پلٹ گیا ہے پاسا — ایک ایک کے خون کا ہے پیاسا
اپنی ہے خبر تمہیں نہ گھر کی — لٹتی ہے کمائی عمر بھر کی — کھنک کر دیا دونوں نے خانہ — سب مٹ گیا میرا کارخانہ
آپس ہی میں لڑ کے زندہ درگور — بیٹو کس طرح ماں نہ روئے — ماں صدقے دلوں میں کیا سمائی — کی بھائی نے بھائی سے برائی
مجھ ماں کا تو کچھ کرو ٹھکانا — پیری کا اب آگیا زمانہ — لیجائے گا کس کے گھر مقدر — گذرے گی آخر عمر کیونکر
جس ماں نے پلا کے دودھ پالا — آغوش میں جس کی پر نکالا — جس ماں نے کئے بڑے بھلے دن — جو ماں کہ ہے اس طرح کی محسن
جس ماں نے کبھی نہ کچھ کیا چین — بچپن ہی تمہیں دیا ہے چین — راحت کسی طرح آئے تم کو — سینے سے رہی لگائے تم کو
رکھا تمہیں ہر گھڑی نظر میں — دی تم کو جگہ دل و جگر میں — اس ماں کا خیال تک نہ آیا — بیٹو! مجھے دل سے یوں بھلایا

غرض یہ مثنوی اس قسم کے انمول جواہر پاروں کا خزانہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں بیاری زبان و محاورے سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مثلاً۔

دونوں ہی ہیں نیکیوں میں مشہور — ہنہار ہیں دونوں چشم بد دور

دہلی اور لکھنو والے "ہونہار" بولتے ہیں اور مصنف صاحب پہلے مصرع کو یوں بھی لکھ سکتے تھے۔

ہیں دونوں ہی نیکیوں میں مشہور

کتاب کے شروع میں مولانا سیماب اکبرآبادی کا ایک طولانی دیباچہ بھی ہے جس میں مولانا موصوف نے مثنوی پر ایک تاریخی مضمون لکھ کر اردو فارسی مثنویوں کی ایک طویل

فہرست بھی دی جاتی تو یقیناً مفید ہوتی.

اگرکتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں مگر ان کے لئے ایک غلطنامہ بھی دیدیا گیا ہے چھوٹی تقطیع کے ۱۰۰ صفحات پر کتاب ختم ہوئی ہے.

اُردو اصطلاحات[1]

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے کالجوں اور اسکولوں کے طلباء کے فائدہ کی غرض سے انگریزی زبان کی خاص خاص اصطلاحات کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ بعض اصطلاحات کا ترجمہ خاصہ کیا گیا ہے۔ ورنہ بیشتر فیصدی انگریزی الفاظ کو اُردو حروف ہی میں لکھ دیا گیا ہے۔ بعض ترجمے غلط، بعض تشنۂ تکمیل اور بعض خالص پنجابی ہیں۔ ہم ذیل میں چند الفاظ بطور نمونہ درج کرتے ہیں:-

لفظ	ترجمہ کتاب	ریمارک
Aesthetic Feeli:	مذاقی تاثرات	
Apparatus	آلات	
Background	بیک گراؤنڈ	[بعض اصحاب اب اسکی جگہ پس منظر کہتے ہیں]
Belt	بیلٹ	[اس کے لئے اُردو لفظ پیٹی موجود ہے]
Corporal Punishm	بدنی سزا	[اسکی جگہ جسمانی سزا بہتر ہوگا]
Correspondent	کارسپانڈنٹ	[نامہ نگار کا لفظ عام طور پر رائج ہوگیا ہے]
Poultry	مرغی خانہ	
Puddling	گدّ دکرنا (یہ غالباً خالص پنجابی اصطلاح ہے)	پشتہ باندھنا کہیں گے.

بہر حال یہ کتاب خوبیوں سے خالی نہیں ہے۔ اور طلباء اس کے ذریعہ سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اصل انگریزی الفاظ اور ترجمہ میں اکثر جگہ املا کی غلطی ہوگئی ہے، جو امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں رفع ہوجائے گی۔

اس کتاب کا حجم ڈھائی سو صفحات ہے۔

اجنٹا کی نقاشی

اجنٹا کے غاروں میں قدیم ہندوستان کی نقاشی کے صدہا بیش بہا نمونے موجود ہیں۔ مگر

---

[1] ملنے کا پتہ: مسرز ایم صاحب گلاب سنگھ پبلشرز لاہور۔ قیمت غالباً ایک روپیہ

فن مصوری کے یہ انمول جواہر پارے صدیوں تک عوام کی نظر سے پوشیدہ رہے اور مرور زمانہ اور تغیرات موسم کی بدولت انہیں بہت کچھ نقصان پہونچا۔ آخر انیسویں صدی کے آغاز میں حسن اتفاق سے انگریزی فوج کے چند سپاہیوں کو ان غاروں کا سراغ مل گیا جس کے بعد رفتہ رفتہ ان غاروں کا دنیا بھر میں شہرہ ہو گیا چنانچہ دور دور سے ماہرین فن ان کی سیر کرنے آتے ہیں۔ اور قدیم ہندوستان کے فن نقاشی کا کمال دیکھ کر خود نقش حیرت بنجاتے ہیں۔

سرکار نظام کا تمام ملک پر احسان ہے کہ اُس نے قدیم ہندوستان کی اس نادر الوجود میراث کو محفوظ رکھنے کی ہر امکانی تدابیر اختیار کیں چنانچہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس کی گورنمنٹ کیطرف سے ریاست حیدرآباد کی تاریخی یادگار کی حفاظت کے لئے عرصہ سے آثار قدیمہ کا محکمہ قایم ہے۔ جس کے ناظم ملک کے نامور ماہر آثار قدیمہ جناب غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے۔ ایف۔ اے۔ ایس ہیں۔ اس محکمہ کی ان تھک کوششوں سے جملہ تصاویر بہت کچھ اپنی حالت پر اب تک قایم ہیں۔

یزدانی صاحب نے شروع ہی سے اجنٹا کے غاروں میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ ان تصویروں کی مذہبی روایات اور ان کی تاریخی اہمیت سمجھنے میں آپکو قابل قدر کامیابی ہوئی ہے۔ آپ نے ان تصویروں کو مختلف مدوں میں تقسیم کرکے اور ان کے دلچسپ حالات دریافت کرکے فنون لطیفہ کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب میں جو اس وقت ہمارے سامنے ہے مصنف نے ایک مختصر مگر جامع تنقیدی مضمون کیساتھ ان غاروں کے بارہ میں چند تصاویر شائع کی ہیں۔ تصویریں غیر معمولی اہتمام کیساتھ جرمنی میں چھپوائی گئی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس قابلیت کیساتھ یہ رنگین پلیٹیں طبع ہوئی ہیں اس سے کتاب کی شان دوبالا ہو گئی ہے۔ یہ تصویریں زیادہ تر بدھ مذہب کی دیومالا سے تعلق رکھتی ہیں۔ جنھیں سمجھنے کے لئے بدھ دھرم کے اصول و ارکان جاننے کی ضرورت تھی۔ مگر یزدانی صاحب کو قدیم تاریخ کی تحقیق و تفتیش کا عشق ہے اور وہ علوم و فنون کے بھی ماہر کامل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بدھ مذہب کی ناگزیر معلومات پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ اس کتاب میں سلیس و عام فہم زبان اور عمدہ پیرائے میں مختلف تصویروں کے محاسن اور فن کی باریکیوں پر قابل قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔

درحقیقت اس کتاب کو شائع کرکے اردو پر احسان عظیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ ابھی تک اردو کے ادبی خزانہ میں اس قسم کی کتابیں معدوم ہیں۔ اس کتاب کی لکھائی چھپائی کاغذ بھی قابل تعریف ہیں۔ ہماری رائے میں ہر ترقی خواہ اردو اور قدردان فن کو یہ کتاب اپنے

کتب خانہ میں رکھنا چاہیئے۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے۔

انقلاب روس

روس کے سیاسی انقلاب پر ابتک سیکڑوں مضامین اور بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی جاچکی ہیں۔ لیکن زیادہ تر افراط تفریط سے کام لیا گیا ہے۔ البتہ کتاب مندرجہ عنوان میں جو انجمن خادمان ہند کے ناموررکن پنڈت کشن پرشاد صاحب کول نے ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی فرمایش سے تحریر فرمائی ہے، حتی الامکان اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ مبالغہ آمیز جانبداری سے پرہیز کرکے بالشویک انقلاب کی اصلی صورت حال اور اُس کے نتائج کا جو روس میں رونما ہوے ہیں، صحیح صحیح نقشہ پیش کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ بالشویک انقلاب نے ملک روس میں نیا ایمان نئے عقائد نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیا ہے۔ اس کے علمبرداران کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے جہنم زار روس کو جنت ارضی بنادیا ہے اور اگر زمانہ نے اُنکا ساتھ دیا تو وہ دن دُور نہیں جب وہ تمام دنیا کو اپنے رسم و رواج اور عقائد کے ماتحت فردوس بریں کا نمونہ بنادیں گے۔ دوسری طرف مخالفین کا دعویٰ ہے کہ بالشویکوں نے ملک کو تباہی و بربادی کے عمیق غار میں جھونک دیا ہے۔ اور باشندگان پر ایسے ناگفتہ بہ مظالم کئے ہیں جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملسکتی۔ انقلاب روس کے صحیح حالات مرتب کرنے میں ایک دقت یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں اس کے لئے کافی مسالہ موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو روس کے متعلق بہت سی کتابوں کا یہاں داخلہ ہی ممنوع ہے، اور جو کتابیں یہاں ملتی ہیں اُن میں اکثر رنگ آمیزی کیساتھ تصویر کا ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں صاف ظاہر ہے کہ فاضل مصنف کو اس غیر جانبدارانہ کتاب لکھنے میں کسقدر دقتوں کا سامنا ہوا ہوگا۔ مگر ہمکو اس کتاب کے ہر صفحہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کول صاحب ان تمام مشکلات پر بخوبی حاوی ہوگئے ہیں۔ آپ نے انقلاب روس کے تاریخی حالات لکھکر وہ تمام اثرات بھی مفصل بیان کئے ہیں جو انقلاب کی وجہ سے روس کے لٹریچر، فنون لطیفہ اور روزمرہ زندگی میں رونما ہوئے ہیں۔ کتاب کا تاریخی حصہ کسیقدر طویل ضرور ہوگیا ہے۔ لیکن فاضل مصنف نے اس کتاب کے تمام ضروری معاملات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ اہل ملک اس مفید و دلچسپ تصنیف کی قدر کریں گے۔ کتاب ٹائپ میں عمدہ و دبیز کاغذ پر چھپی ہے۔ ضخامت ڈھائی سو صفحات

سلہ قیمت ڈھائی روپیہ ملنے کا پتہ:۔ کتابستان الہ آباد

کلامِ جوہر

یہ مختصر سی کتاب مولانا محمد علی مرحوم جوہر کے کلام کا مجموعہ ہے، جسے مولانا عبدالماجد صاحب بی اے دریابادی نے مرتب اور مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے مصنف کے فوٹو کیساتھ عمدہ کاغذ طباعت و کتابت کیساتھ شائع کیا ہے۔ شروع میں ڈیڑھ جزو کا قابل قدر مقدمہ ہے جسکو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا پہلا حصہ خود مولانا محمد علی کا لکھا ہوا ہے جس میں مرحوم نے اپنی شاعری کی ابتدا اور بعض دیگر امور پر روشنی ڈالی ہے۔ اسے مولانا کی خود نوشت "سوانح عمری" سمجھنا چاہیئے۔ دوسرے حصہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا کے حالات لکھے ہیں اور تیسرے میں ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

مولانا کی شاعری زیادہ تر سیاسی اور مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ مگر آپ کے اشعار ابھی تک احباب و اغیار کے دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ انکا کلام تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ ایک شعر میں التجا کی تھی ؎

یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو ہاں ... مار و دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دور۔

یہ درخواست ایسی پوری ہوئی کہ دیارِ غیر میں مرنے کے بعد قبر بھی وہیں بنی۔

تسخیرِ یاس حصہ اول

مولانا سید محمد شرف الدین یاس ٹونکی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اردو اور فارسی کے پروفیسر اور پرانی وضع کے بزرگ ہیں۔ آپ کا کلام بھی پرانی وضع کا ہے۔ کہیں حکیم مومن کی تخئیل ہے تو کہیں داغ دہلوی کی زبان ہے۔ کہیں کہیں غالب کے فلسفہ و حکمت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مکتبہ ملیہ دہلی نے آپ کا کلام تبرکاً شائع کیا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ چھوٹی تقطیع کے دو جز پر شائع ہوا ہے۔ قیمت پانچ آنہ

بیمار روح

یہ چھوٹے سائز کے اُنیس صفحوں پر ایک مختصر ڈرامہ ہے جسے سجاد ظہیر صاحب نے لکھا ہے۔ کل ڈرامہ کا لب لباب یہ ہے کہ میزبان عزیز اور بیمار مہمان بشیر میں بحث ہوتی ہے جس میں بشیر بالشویک خیالات کا اظہار کرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ اچھا ہے۔

قیمت چار آنہ ہے۔ ملنے کا پتہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

... چھوٹا سائز ۴۰ صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی

لطفِ سخن

جناب اختر جوناگڑھی

ہر سو نظر آتا ہے ہر جا نظر آتا ہے / پر چشم تماشا کو دھوکا نظر آتا ہے
آرائش و تزئین کو خود حسن کہاں دیکھے / آنکھوں کو کہیں اپنا منہ بھی نظر آتا ہے
حیرت نے کیا ظاہر جو راز تھا آنکھوں میں / یاں شوق تماشا بھی رسوا نظر آتا ہے!
وہ وادیِ سینا ہو یا قلّۂ فاراں ہو / مشتاق تجلی کو جلوہ نظر آتا ہے
ملتے ہی نہ ہو دھوکا کیوں عرض تمنا کو / دل تھا جو کبھی میرا اُن کا نظر آتا ہے
اللہ ری تنگ ظرفی ارمان بھرے دل کی / بند اتنے سے کوزہ میں دریا نظر آتا ہے
ہے بند زبان اختر آنکھوں کو ہے سکتہ سا / کچھ کہہ نہیں سکتا میں کیا کیا نظر آتا ہے

اثر۔ مسٹر فضل اثر بی۔ اے۔ آگرہ

ہو کے ہم مایوس عشق اے وفا کیا کریں / غم ہے تم خوش ہو تو پھر غم ہی کیوں مانگا کریں
تشنگیِ ذوق کا مٹنا حقیقی موت ہے / سامنے آنے سے بہتر ہے کہ وہ پردا کریں
لاالہ کو گل میں چھپے رہنے کا مقصد ہے ضرور / یعنی جس پردہ کو اُٹھائیں ہم تجھے دیکھا کریں
دیر و کعبہ برہمن اور شیخ کی جاگیر ہیں / اے تعین دوست! آخر ہم کہاں سجدہ کریں
یا ہمیں بیچارگی کے طعن دینا چھوڑ دے / یا وہ اک آنسو بتا دے ہم جسے دریا کریں
نام لیوا ہیں بہت آبادیوں میں اے اثر / چل کے ویرانوں میں اُنکے حسن کا چرچا کریں

اقبال۔ مولوی اقبال الدین احمد صدیقی

ساقیا کس لئے در بند ہے میخانے کا / فصل گل! اور چلے دور نہ پیمانے کا!
عمر بھر شغل رہا شیشہ و پیمانے سے / ہم سے چھوڑا نہ گیا در کبھی میخانے کا
یہ بھی سچ ہے کہ وہ سنتے رہیں بیٹھے کب تک / سلسلہ ختم نہ ہو جب مرے افسانے کا
شمع سو بار جہاں سے نہ ملوائے اقبال / حشر تو دیکھ چکے عشق میں پروانے کا

جوہر۔ منشی محمد علی لکھنوی

مبارک ہے رنگ محفلِ عالم سمجھتے ہیں — مسرت کو مسرت اور غم کو غم سمجھتے ہیں
تکلف سے بری ہیں پیروانِ پیر میخانہ — کلی ساغر بھی ملتا ہے تو جامِ جم سمجھتے ہیں
کوئی چارہ نہیں ہے لذتِ تقریر سے واعظ — ترے چلتے ہوئے فقروں کا مطلب ہم سمجھتے ہیں
فلک کی آنکھ کے آنسو لئے ہیں پھول دامن میں — حقیقت آشنا رازِ دُرِ شبنم سمجھتے ہیں
حیا پرور نگاہوں سے سرشک آلود آنکھوں سے — سمجھنے والے حسن و عشق کا عالم سمجھتے ہیں
نفس کی آمد و شد سے فنا کا درس ملتا ہے — سرودِ سازِ ہستی کو نوائے غم سمجھتے ہیں
نظر شیشے پہ، ساغر ہاتھ میں اور لب پہ توبہ ہو — بڑے ہی پارسا ہو تم کو جوہر ہم سمجھتے ہیں

رعنا۔ منشی برج لال جی۔ بی۔ اے ضیائی۔ راولپنڈی۔

کیا بزمِ تجلی سے اسیرِ خاکداں مجھکو — کہاں سے کھینچ کر ذوقِ نوا لایا کہاں مجھ کو
مہ و خورشید سے ظاہر ہے تیرے حسن کا جلوہ — سناتی ہیں ہوائیں تیرے دم کی داستاں مجھ کو
مثالِ عکس ہر اک آئینے میں میری منزل ہو — کیا میلانِ خود بینی نے پابندِ مکاں مجھ کو
مثالِ نقشِ پا قائم ہوا ہوں دشتِ الفت میں — بنایا پائمالی نے تری رہ کا نشاں مجھ کو
طلسمِ آب و گِل کو اک تڑپ میں توڑ کر رکھ دوں — اگر مل جائے رعنا غیب سے دردِ نہاں مجھ کو

سنبل۔ گوری سرن لال بی۔ اے گورکھپوری

قلب میں لیلیٰ ہو خون کے اور نہ ویرانے میں ہے — میں تو سمجھا ہوں کہ مجنوں میرے افسانے میں ہے
زندگی در اصل ہے مر مر کے بھی جینے کا نام — تو یہ سمجھا ہے کمالِ زیست مر جانے میں ہے
بے ریائی کے سبب پروانہ پروانہ ہوا — ورنہ سنبل کیا دھرا جل جل کے مرجانے میں ہے

عروج۔ جناب عروج زیدی بدایونی مدیر رسالہ "مومن"

سعیٔ تلاش میں تری، ہونے لگا ہے اختلاط — پردۂ رخ اٹھا کے پھر جوشِ طلب بڑھا بھی دے
حدِ کمالِ رنج ہی، مژدۂ انبساط ہے — سعیٔ جمالِ دلفریب، درد کو دل بنا بھی دے

فرحت۔ مسٹر گنگا دھر ناتھ بی۔ اے۔ ایل ایل بی کانپور

پیمانہ بھر چکا ہے مرے اضطراب کا — ساقی بڑھا ادھر بھی پیالہ شراب کا
کیا انقلاب ہے کہ ابھی ہو ابھی نہیں — ہستی دکھا رہی ہے تماشہ حباب کا
جس درجہ جوشِ غم میں ہے شانِ سکونِ غم — اتنا ہی مرتبہ ہے بلند اضطراب کا

ہستی و موت دہر میں کہنے کے نام ہیں — دراصل جلوہ ہے وہ عطا و عتاب کا
غافل فریب ہوش ہے وہم نمود و بود — اتنا خیال رکھ کہ یہ عالم ہے خواب کا
دنیا نے جس کو وصل سے تعبیر کر دیا — فرحتؔ وہ تھا سکون مرے اضطراب کا

فضاؔ۔ سید دل محمد فضاؔ جالندھری

تارِ نفس کو تارِ گریباں کئے ہوئے — جوشِ جنوں ہے کار نمایاں کئے ہوئے
اس کی نظر کو حاصلِ ایماں کئے ہوئے — دل ہے سکونِ عشق کا ساماں کئے ہوئے
تصویرِ دشت کھینچ گئی اے جوشِ آرزو — بیٹھا ہوں اب نظر کو بیاباں کئے ہوئے
اب تو اُٹھے نگاہ کہ اک عمر ہو گئی — لختِ جگر کو زینتِ داماں کئے ہوئے
ناکامیاں لئے ہوئے آئی ہے چشمِ شوق — تیری تلاش تا حدِ امکاں کئے ہوئے
اُسکی نگاہِ شوخ کا اندازِ دلفریب — جیسے ہو کوئی تیغ کو عریاں کئے ہوئے
دنیا سمجھ رہی ہے نہیں جرأتِ سوال — میں خود ہوں رازِ عشق کو پنہاں کئے ہوئے
وارفتگیٔ دل کا نگاہوں میں ہے مآل — رُخ اے فضاؔ ہوں جانبِ جاناں کئے ہوئے

ماہرؔ۔ از منظور حسین ماہرؔ القادری

کسی کی مست آنکھوں کو فقط اکبار دیکھا تھا — مرا دل آج تک اک کیف سا محسوس کرتا ہے
کوئی اہلِ نظر اس فلسفہ کو کاش سمجھا دے — نظر کو کس طرح جلوہ ترا محسوس ہوتا ہے
خدارا حقیقت اور راک تو ہی فیصلہ کر دے — نگاہیں دیکھتی ہیں جسکو جلوہ ہے کہ پردا ہے
یہاں آ کر ملاقی ہے دنیا دل کی اے ماہرؔ — دکن کی سرزمیں کیا ہے تمناؤں کی دنیا ہے

از جناب محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھ

مجھ کو ادائے شکر قابل بنا دیا — ان کی نگاہ ناز نے بسمل بنا دیا
کیا کہئے جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو — ہر ہر لہو کی بوند کو اک دل بنا دیا
دیکر متاعِ شوق، دلِ بے قرار کو — قطرہ کو تو نے بحر کا حاصل بنا دیا
کیا تھی وگرنہ قطرۂ خونابہ کی بساط — ان کی نظر نے دل کو مرے دل بنا دیا
تڑپا دیا پھر اس دلِ شوریدہ نے مجھے — بے تابیوں نے پھر اسے قاتل بنا دیا
ہاں ان کی چشمِ مست نے کونین سے مجھے — غافل بنا دیا، مجھے غافل بنا دیا
کس جانِ انتظار کی شمعِ جمال نے — خلوت کو میری غیرتِ محفل بنا دیا

علمی نوٹ اور خبریں

اپنے نامور والد بزرگوار کی طرح مولوی عنایت اللہ صاحب بی۔اے سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن اردو ادب کی توسیع و ترقی میں مصروف ہیں۔ دارالترجمہ میں رہ کر آپ نے اردو کی جو قابل قدر خدمت انجام دی ہے اس کا مفصل حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ اس عہدہ سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد آپ دہلی آکر تصنیف و تالیف و ترجمہ میں مصروف ہو گئے ہیں۔ حال ہی میں آپ نے نجم السحر کے نام سے انگریزی زبان کے مشہور و معروف فسانہ نگار رائیڈر ہیگرڈ کی ایک مشہور تصنیف کا ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اس کا حجم ۲۴۴ صفحات ہے اور قیمت صرف ۲؍
آپ نے سلامبو نام سے ایک مشہور فرانسیسی ناول کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ حال میں آپ نے اٹلی کے فلسفی شاعر ڈانٹے کی مشہور کتاب داستانِ جہنم کا ترجمہ کیا ہے جو بمسر ساقی دہلی کے اکتوبر نمبر میں تمام و کمال شائع ہوا ہے۔

مولوی سید محمد صاحب ایم۔اے لکچرار سٹی کالج حیدرآباد کی کتاب "ارباب نثر اردو" کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی و اضافہ کے ساتھ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس کتاب میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اہل قلم کی ادبی خدمات کا مفصل بیان ہے۔

رسالہ عصمت دہلی نے اپنے نامور بانی اور ادیب اردو مولانا راشد الخیری مرحوم کی یادگار میں ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جس میں مولانا مرحوم کے قدر شناسوں نے ان کی زندگی اور ادبی خدمات کے ہر پہلو پر معلومات کا کافی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ اس رسالہ کا حجم ۲۹۷ صفحات اور قیمت ۱۲؍

رسالہ ادب لکھنؤ نے راجہ صاحب محمود آباد کی گدی نشینی کی تقریب میں محمود آباد نمبر کے نام ایک خاص نمبر غیر معمولی اہتمام سے شائع کیا ہے اسمیں ریاست محمود آباد کی تاریخ اور سابق رؤساء کے حالات کے علاوہ علمی ادبی اور تاریخی دلچسپی کے کئی قابل قدر مضامین ہیں۔ ریاست محمود آباد کے مہاراجگان کی ذات والا صفات سے اردو اور اگر دو زبان کو ہمیشہ ایک خاص تعلق رہا ہے

رہے ہیں۔ حضور سابق مہاراجہ سر علی محمد خاں صاحب بالقابہ نے ملک و صوبہ کی بڑی اہم قومی خدمات انجام دیں اور جس فراخ دلی سے وہ احباب کی خاطر و تواضع و مہمان نوازی کرتے رہے اُس کی یاد مدت تک دلوں میں تازہ رہے گی۔ ہمکو اُمید ہے کہ نئے راجہ صاحب بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر ملک کی تمام مفید تحریکوں کے حامی و مددگار رہیں گے۔

ہم کو دلی افسوس ہے کہ آجکل ملک میں ہر طرف اُردو ہندی کی ناگوار بحث چھڑی ہوئی ہے حالانکہ دونوں زبانیں "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول پر اپنے اپنے طور پر ترقی کر سکتی ہیں۔ فی الحال ملک بحیثیت مجموعی حیثیت سے کسی ایک زبان کے عام رواج پانے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ ضرور ہے کہ عام تعلیم کی ترقی اور احساس قومیت کیساتھ ساتھ ہندوؤں میں ناگری حروف اور ہندی زبان کا رواج قدرتاً بڑھ رہا ہے لیکن جہانتک اُردو کا تعلق ہے وہ خود ہندو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کی محبوب زبان اور تاریخی حیثیت سے دونوں کے ارتباط باہمی کی ایک قابل قدر یادگار ہے اسکو نہ کسی کا رقیب بننے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دوسری زبان کو اس سے رقابت ہونا چاہئے۔ اگر یورپ کے لوگ تہذیب و ترقی کے خاطر کئی کئی زبانیں جاننا ضروری سمجھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندو مسلمان دونوں اُردو ہندی سے بخوبی واقف اور اُنکے قدر دان نہ ہوں۔ مگر دونوں طرف کے پُرجوش اصحاب باہمی رد و کد میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ بد قسمتی سے ہندی ساہتیہ پریشد کے گذشتہ اجلاس میں بعض لیڈران ملک نے اس معاملہ میں نئی الجھن پیدا کر دی ہے جس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن اُردو نے کیسقدر گرمجوشی کیساتھ شرح و بسط سے لکھا ہے۔ مہاتما گاندھی اور بعض دیگر اصحاب کیطرف سے رفع شکوک کی کوشش کی گئی ہے مگر اس سے اس مسئلہ میں پہلے سے بھی زیادہ گنجلک پیدا ہو گئی جس کا ہر محب وطن کو دلی افسوس ہوگا۔ البتہ اس رد و کد کا ایک مفید نتیجہ ضرور نکلا ہے کہ حامیان اُردو اپنا گھر سنبھالنے میں مصروف ہوگئے ہیں چنانچہ خاص خاص مقامات میں اُردو کو ترقی دینے کی تحریک شروع ہو گئی ہے اور اس کے لئے مختلف انجمنیں قایم ہو رہی ہیں۔ مگر اسکام میں عارضی جوش سے زیادہ غیر معمولی انہماک صبر و استقلال اور ایثار کی ضرورت ہے جس کے بغیر دراصل کوئی بڑا کام کبھی انجام نہیں پایا۔

مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے اردو کی حفاظت و ترقی کی ایک مفصل اسکیم تیار کی ہے جس پر غور کرنے کے لئے ۲۴ و ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو علی گڑھ میں

ایک آل انڈیا کانفرنس طلب کی گئی ہے۔ جس میں ملک کے منتخب خادمان اُردو کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس اسکیم کے ضمن میں جو تجاویز سوچی گئی ہیں انمیں بعض یہ ہیں :-

(۱) کافی سرمایہ سے اردو کا ایک پبلشنگ ہاؤس قایم کرنا۔

(۲) دنیا کے مختلف زبانوں کی بہترین قدیم و جدید تصانیف کے ترجمے شائع کرنا۔

(۳) اُردو کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کا ایک وسیع پیمانہ پر کتبخانہ قایم کرنا۔

(۴) رسم الخط کی اصلاح اور املا کی صحت کے متعلق مشورہ دینے کے لئے ایک ادبی مجلس قایم کرنا۔

(۵) اردو ٹائپ کو رواج دینا۔

ہم اس کانفرنس کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی ذات گرامی اس بات کی کافی ضمانت ہو کہ یہ کانفرنس کسی فوری جوش کے زیر اثر یا فرقہ وارانہ جذبات کے ماتحت نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس کے ذریعہ اُردو کی توسیع و ترقی کا باضابطہ کام انجام پائے گا۔

اُردو ہندی مسئلہ کے متعلق ایک قابل قدر مضمون کے دوران میں پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ممبر انجمن خادمان ہند نے ایک نہایت معقول تجویز یہ پیش کی ہو کہ صوبہ متحدہ کے مدرسوں میں اُردو ہندی دونوں کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ اس کے پہلے عرصہ ہوا مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی نے بھی زمانہ میں اس قسم کی تحریک پیش کی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی (جنکی رائے بقول ہمعصر الناظر اُردو کیلئے بالکل ویسی ہی ہو جیسی قانوندان اصحاب کیلئے پریوی کونسل کی نظیر) اسکی تجویز کی پُرزور تائید کی ہو لکھتے ہیں۔ کہ :- "دونوں کے پڑھنے سے دونوں کو تقویت ہوگی اچھی اُردو کے لئے ہندی جاننا ضروری ہے

اسی طرح اچھی ہندی لکھنے کے لئے اردو کا جاننا ضروری ہے"

ہمکو بھی اس رائے سے کامل اتفاق ہے۔

ناظرین کو معلوم ہے کہ کچھ عرصہ سے ترقی پسند مصنفین کی ایک آل انڈیا انجمن قائم ہوئی ہے جس کا مقصد ملکی ادب کو گزشتہ زمانے کے پامال و فرسودہ روش سے ہٹا کر نئے ڈھنگ پر لانا اور اسکو ملک کی روزمرہ زندگی کیلئے مفید کارآمد بنانے کی کوشش کرنا ہے چنانچہ اُردو کے متعلق الٰہ آباد۔ لکھنؤ۔ دہلی وغیرہ اسکی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ پچھلے دنوں انجمن کی تحریک پر اکثر مقامات میں روس کے نامور ادیب میکسم گورکی کے تعزیت میں یادگاری جلسے ہوئے۔

دہلی میں اس انجمن کی جو شاخ قائم ہوئی ہے اسکے پرجوش سکرٹری مسٹر شاہد احمد ایڈیٹر ساقی ہیں چنانچہ انکی کوشش عمل سے یہ شاخ خاص طور پر سرگرم کار ہے حال میں اس کے کئی جلسے بھی ہوئے جس میں اس کے عام مقاصد

کے علاوہ قابل قدر مضامین ہوتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس شاخ نے ایک رسالہ بھی شاہجہاں کے نام سے جاری کیا ہے جس کا ایک خاص نمبر بھی حال ہی میں ترقی ہندی کے نام سے شائع ہوا ہے خادمان اردو کو اس پرچہ میں کئی قابل قدر مضامین اور بہت سی کام کی باتیں ملیں گی۔

ہم کو یہ سنکر بہت افسوس ہوا کہ جولائی گذشتہ میں جناب عرش گیاوی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم طرز قدیم کے خوش فکر و کہنہ مشق شاعر اور حضرت تسلیم کے نامور شاگرد تھے۔ آپکی تصانیف میں حیات تسلیم، حیات مومن اور دیوان غزلیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپنے کئی کتابیں اور بھی لکھیں مگر یہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکیں۔ ذیل میں انکے چند اشعار بطریق یادگار ہمعصر سید پٹنہ سے نقل کر کے ہدیہ ناظرین ہیں۔

بے داغ الم دل میں پھولا نظر آیا — اس گل میں پھول آنے سے پہلے ثمر آیا
اک چھیڑ نکالی وہ ہے پیکان ستم نے — کچھ دیر کو بھی دل کا جہاں زخم بھر آیا!
جی ہی تو ہے اپنا جسے چاہا اُسے چاہا — دل ہی تو ہے ظالم جدھر آیا اُدھر آیا
اب رات نہیں صبح کے آثار ہیں ظاہر — بیدار ہو اے عرش کہ وقت سفر آیا

افسوس کہ ہندوستان کے پرانے اخبار نویس منشی ابن لال صاحب ایڈیٹر نیر اعظم مراد آباد کا بھی پچھلے ماہ انتقال ہو گیا آپ قدیم وضع کے بزرگ اور شمالی ہند کے سب سے پرانے ایڈیٹر تھے۔ ساٹھ برس سے اخبار نیر اعظم کی ایڈیٹری کر رہے تھے۔ کئی سال ہوئے آپ حج کرنے گئے تو عراق و شام و فلسطین وغیرہ ممالک کی سیر و سیاحت بھی کر آئے جس کے متعلق آپ نے ایک مفصل سفرنامہ شائع کیا۔ خدا غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ہمارے ناظرین زمانہ کے لئے رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم کی وفات از حد افسوسناک ہے۔ آپ رسالہ کے پرانے مضمون نگار تھے اور اکثر مضامین لکھتے رہتے تھے۔ اس طرف کچھ عرصہ سے بیمار تھے افسوس صد افسوس کہ آپکا بھی ستمبر کے آخری ہفتے میں لاہور میں انتقال ہو گیا۔ پنڈت صاحب شاید چالیس پچاس سال سے مضمون نگاری کے عادی تھے۔ تیس چالیس سال پہلے کی آپکی کئی کتابیں ابتک مشہور ہیں۔ آپ نے ایک ناول "ایم۔ اے بنکے کیوں میری مٹی خراب کی" کے نام سے لکھا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ بقول ہمعصر ریاست اردو اخبارات و رسائل میں سب سے زیادہ مضامین لکھنے والوں میں خان بہادر سلطان احمد خان صاحب کے بعد آپ ہی کا نمبر تھا۔ کسی زمانہ میں شاید ہی کوئی پرچہ آپ کے مضامین سے خالی ہوتا تھا لطف یہ کہ خدمت آپ نے کبھی کسی مالی نفع کے خیال سے اپنے ذمہ نہیں لی بلکہ ملک کی ادبی خدمت کو وہ اپنا فرض

مقدم سمجھتے تھے۔ مذہب کے اعتبار سے آپ برہمو سماج کے پیرو تھے۔ اور اس سے متعلق آپ نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ کچھ دنوں تک آپ پنجاب چیف کورٹ کے عہدہ جج پر فائز رہے اور ایک مقدمہ سازش کے کمیشن کے ممبر بھی مقرر ہوئے تھے۔ آپ نے اس کمیشن کے فرائض نہایت آزادی و انصاف پسندی سے انجام دیئے۔ ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں گورنمنٹ نے آپ کو "سر" کا خطاب دیا اور رعایا میں بھی آپ کو ہردلعزیزی حاصل رہی۔ پنجاب ہائی کورٹ میں آپ کو جو خاص پوزیشن حاصل تھی اس کا ثبوت صاحب چیف جسٹس کے تقریر سے ملتا ہے جو موصوف نے آپ کے ماتمی جلسے میں کی ہے۔ جسٹس ینگ صاحب نے آپ کی وفات حسرت آیات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے بجا طور پر فرمایا کہ

"مرحوم فرقہ پرستی کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ ان کا کام فرقہ پرستی کے اسپرٹ سے پاک و صاف ہوتا تھا۔ حالانکہ پنجاب میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کو فرقہ پرستی سے قطعی مبرا کہا جا سکے"

اس سے زیادہ کسی محب وطن ہندوستانی اور ملکی ادیب کی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ ہم کو بھی اپنے دیرینہ محسن کے انتقال کا دلی صدمہ ہے۔ ایشور ان کی آتما کو شانتی اور ان کے اہل خاندان کو اس حادثہ کے برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔

یہ مہینہ اُردو ادب کے لئے خاص طور پر منحوس ثابت ہوا چنانچہ اس ماہ کے پہلے ہفتہ میں اُردو کے نامور ادیب و محسن مولوی نور الحسن صاحب نیّر کاکوروی کا بھی انتقال ہو گیا۔ مولوی صاحب مرحوم کو ادب و شاعری کا ذوق اپنے نامور والد حضرت محسن سے ورثہ میں ملا تھا چنانچہ ضروری مشاغل سے جتنا وقت بچتا تھا آپ ہمیشہ اردو ادب کی خدمت میں صرف کیا کرتے تھے۔ مولانا نیّر کا سب سے بڑا کارنامہ نور اللغات ہے جو چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ یہ عظیم الشان کام اردو ادب کی ایک جماعت کے کرنے کا تھا مگر آپ نے سالہا سال کی جانکاہ کوشش اور محنت شاقہ سے اس کو تن تنہا انجام دیا۔ نور اللغات پر لکھنؤ کے بعض احباب نے مخالفانہ تنقید بھی کی ہے لیکن ان اعتراضات کے باوجود نور اللغات کی تالیف و تدوین اتنا عظیم الشان کام ہے کہ اس کی اہمیت اپنی جگہ پر بدستور قائم ہے اور رہے گی۔ اس کی بدولت نیّر مرحوم کا نام نامی صدیوں تک زندہ رہے گا۔

ادھر چھ سال سے آپ کی صحت قابل اطمینان نہ تھی آخرش علالت نے مرض الموت کی صورت اختیار کر لی۔ اور آپ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۶ء کو اس دنیائے فانی سے رحلت کر کے عالم جاودانی ہو گئے۔ خدا غریق رحمت کرے اور صاحبزادوں کو صبر کی توفیق دے۔ اردو ادب کے لئے آپ کا انتقال بہر حال ایک ناقابل تلافی حادثہ ہے۔ زمانہ اور اس کے ایڈیٹر پر آپ ہمیشہ نظر عنایت رکھتے تھے۔

بست عوام تسد مدعیت کے لئے

نمبر ۱۹۲

فارم اطلاع نامہ حسب دفعہ ۹ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

اسپیشل جج درجہ اول فرخ آباد

باجلاس مسٹر چمن چندر ملک صاحب بہادر اسپیشل جج درجہ اول فرخ آباد

نمبر مقدمہ ۹ سنہ ۱۹۳۶ء تاریخ پیشی ۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء مقرر ہے

ہرگاہ ایک درخواست حسب دفعہ ۴ - ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء (ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء) جیسا کہ بروئے ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے

محمد جلیل خاں خلف حافظ محمد امیر خاں قوم پٹھان ساکن موضع چتوڑہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد نے اس غرض سے پیش کی ہے کہ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ کے احکام اُس سے متعلق کئے جائیں

لہذا اس تحریر کی روسے حسب دفعہ ۹ (۱) ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء جیسا کہ بروئے ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے - اطلاع دی جاتی ہے کہ جملہ اشخاص جو محمد جلیل خاں مذکور کی ذات یا جائداد کے خلاف ہر دو ڈگری شدہ وغیرہ ڈگری شدہ خانگی قرضہ جات کے متعلق دعوے رکھتے ہوں وہ گزٹ میں اس اشتہار کے شایع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے دعووں کے متعلق تحریری بیانات اُس حاکم کے روبرو پیش کریں جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں۔ اور بصورت خلاف ورزی اس کے ہر ایک دعویٰ ڈگری شدہ یا غیر ڈگری شدہ خلاف سائل مذکور جملہ اغراض و اقعہ جات کے لئے زیر دفعہ ۱۳ - ایکٹ مذکور باضابطہ بیباق متصور ہوگا ۔

نام قرضخواہان

(۱) سوہن لال ولد ہنجل سنگھ قوم کوری ساکن موضع چتوڑہ پرگنہ کمپل

(۲) سورج بھان ولد خشو سنگھ قوم کوری ساکن موضع بھٹاسہ پرگنہ شمس آباد غربی

دستخط (بی) سُندر لال
منصرم اسپیشل جج صاحب بہادر درجہ اول
ضلع فرخ آباد - مقام فتحگڈھ

مہر عدالت

نوٹس حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء

باجلاس جناب اسپشل جج صاحب بہادر ضلع فرخ آباد [illegible]

صاحب بہادر اسپشل جج درجہ اول

تاریخ پیشی ۲۳ دسمبر ۱۹۳۶ء مقرر ہے۔ نمبر مقدمہ سنہ ۱۹۳۶ء

محمد جلیل خاں ولد محمد امیر خاں پٹھان ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل

بنام

سوہن لال ولد نہچل سنگھ قوم کوری ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد

سورج بھان ولد نتھو سنگھ قوم کوری ساکن موضع بشاسہ پرگنہ شمس آباد پچھم ضلع فرخ آباد

ہرگاہ ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جایداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء ایکٹ ۲۵ ۱۹۳۴ء جیسا کہ بروئے ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے سائل نے اس غرض سے پیش کی ہے کہ ایکٹ جایداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ کے احکام اس پر لگائے جاویں لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ (۱۱) ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء جیسا کہ بروئے ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے۔ اطلاع دی جاتی ہے۔ کہ جملہ اشخاص جو سائلان مذکور کی ذات یا جائداد کے خلاف ہر دو ڈگری شدہ یا غیر ڈگری شدہ خانگی قرضجات کے متعلق دعویٰ رکھتے ہوں وہ گزٹ میں اس اشتہار کے شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے دعووں کے متعلق تحریری بیانات اُس حاکم کے روبرو پیش کریں جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں اور بصورت خلاف ورزی اس کے ہر ایک دعویٰ ڈگری شدہ یا غیر ڈگری شدہ خلاف سائل مذکور بجز اغراض و موقعہ جات کے زیر دفعہ ۱۳ - ایکٹ مذکور باضابطہ بیباق متصور ہوگا۔

فہرست الف

نام موضع و پرگنہ و محال و پٹی	تعداد حقیت سائل	مالگذاری حصہ سائل
(۱) موضع [illegible] پور مکوہ کوزہ محال چہارم [illegible] پٹی [illegible] پرگنہ شمس آباد پچھم ضلع فرخ آباد	۱۰ بسوہ ۱۵ بسوانسی	27/4/-
(۲) موضع [illegible] محال [illegible] پٹی [illegible] پرگنہ شمس آباد پچھم ضلع فرخ آباد	۱۱ بسوہ ۱۰ بسوانسی ۱۶ کچوانسی ۱۰ تروانسی	490/-/-
(۳) موضع [illegible] محال [illegible] پٹی [illegible] پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد	۱۸ بسوہ ۱۵ بسوانسی	77/8/-

[illegible] محمد جلیل خاں [illegible]　　　　جلد ١٠ [illegible]　　　　61/5/-

[illegible] موضع [illegible] ١٣٢ پرگنہ کمپل　　　　جلد ٩٦-٢ [illegible]

تفصیل [illegible] وقف نامہ مورخہ یکم مئی ١٩٣٣ء مصدقہ رجسٹری [illegible]
جس کو محمد جلیل خاں سائل نے اپنی درخواست و بیان تحریری میں ظاہر کیا ہے اور [illegible]
[illegible] نے اپنے بیان تحریری میں مقبوضہ سائل ہونا ظاہر کیا ہے۔

نام و پتہ متولی

(١) مسماۃ نواب جہان بیگم زوجہ محمد جلیل خاں قوم پٹھان ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد
(٢) محمد توفیق خاں عرف پیارے میاں ولد محمد جلیل خاں قوم پٹھان ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

تفصیل جائیداد

(١) ایک قطعہ باغ ابنہ قلمی وکشل وغیرہ جس کی چہار دیواری پختہ پورب رویہ واقع موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب قبرستان و درختان ابنہ تخمی پچھم راستہ بعدہٗ باغیچہ نارنگی ومکان احمد منیر خاں ومکان مہر شاہ خاں وغیرہ۔ اوتر تالاب　دکھن اراضی افتادہ منقر۔

(٢) ایک قطعہ باغیچہ نارنگی وکشل وابنہ قلمی مع نشست گاہ اندرون باغیچہ جس کی چہار دیواری دروازہ خام جانب دکھن واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب آراضی افتادہ عبدالرحمٰن شاہ خاں وغیرہ۔ پچھم راستہ۔ اوتر راستہ سیر بعدہٗ کھیت طوطارام وغیرہ۔ دکھن راستہ گلی۔

(٣) آراضی افتادہ مع درختان ابنہ وجامن وبیل وغیرہ وقبرستان وتالاب واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب باغیچہ نارنگی وغیرہ ودرختان کنارا احمد منیر خاں تالاب جہانگیر خاں وغیرہ۔ پچھم مکان مسکونہ محمد جلیل خاں ومکان جس میں انجمن کے مکتب [illegible] آباد ہے۔ اوتر باغیچہ ابنہ قلمی موقوفہ وقبرستان۔ دکھن مکان طوطارام وسری رام وغیرہ کا لیستھ۔

(٤) آراضی افتادہ مع درختان املی وابنہ تخمی وکشل وقبرستان جس میں قبر شہید صاحب موسومہ [illegible] واقع ہے واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب پاٹت دوکان ابنہ موسومہ چکیا والی پچھم ... اترا ...

آراضی افتادہ موقوفہ۔

(۵) دوکان پاٹت ابنہ پختی موسومہ چکیا والی جس کے شرح درج ہیں درخت کٹھل وا ترینگ پاٹت ابنہ موقوفہ چکیا واقع ہے واقع موضع پتورہ پرگنہ کپل ضلع فرخ آباد۔

پورب باغیچہ نارنگی وکٹھل وانبہ قلمی موقوفہ دوانتہ وبسوہ وکیت طوطارام وغیرہ پچھم آراضی افتادہ موقوفہ وقبرستان۔ اوتر تالاب۔ دکھن نشست گاہ ولشست گاہ مکان سکونتی محمد جلیل خاں۔

(۶) ایک قطعہ مکان موقشست گاہ سکونتی محمد جلیل خاں تعمیر پختہ وخام اوترزو جس کے اندر صحن پچھم نشستی پختہ وجانب پورب کمرہ پختہ وجانب دکھن سہ دری خام وباورچی خانہ واقع ہیں اور صحن کو پختہ مذکور کے سہ دری خام چھپر چھپر کا ہے سہ صحن ودرختان نیب وغیرہ واقع موضع پتورہ پرگنہ کپل ضلع فرخ آباد۔

پورب مکان سماۃ محمدی بیگم ومکان سماۃ نیازن بیگم پچھم آراضی افتادہ موقوفہ اوتر پیش دروازہ۔ دکھن مکان صادق علی ومکان محمد جلیل خاں۔

(۷) ایک قطعہ مکان تعمیر خام جس میں اندر کھنک رعایا آباد ہیں۔ واقع موضع پتورہ پرگنہ کپل ضلع فرخ آباد۔

پورب مکان صادق علی پچھم درخت جامن وتالاب۔ اوتر آراضی افتادہ موقوفہ۔ دکھن پیش دروازہ

(۸) ایک قطعہ مکان تعمیر خام جس میں ڈکٹس منڈیاں کاہی واقع ہیں جس میں کسا والا وکھنک وغیرہ آباد ہیں واقع موضع پتورہ پرگنہ کپل ضلع فرخ آباد۔

پورب مکان محمد جلیل خاں پچھم راستہ گلی بعدہٗ مکان طوطارام کالستہ وغیرہ۔ اوتر گلی بعدہٗ مکان صادق علی دکھن گلی بعدہٗ مکان طوطارام ومکان مہابیر پرشاد کالستہ۔

(۹) حقیقت زمینداری تعدادی ۷ بسوہ، ۷ بسوانسی ۲ کچوانسی ۱۸ نزوانسی ۔ ۵ م سہام منہ جمیع لوازمہ وتوابع متعلقہ واقع موضع بہنار محال محمد منیر خاں پرگنہ کپل ضلع فرخ آباد منجملہ ۲۰ سہام کے۔

دستخط (۱) ... مہر عدالت

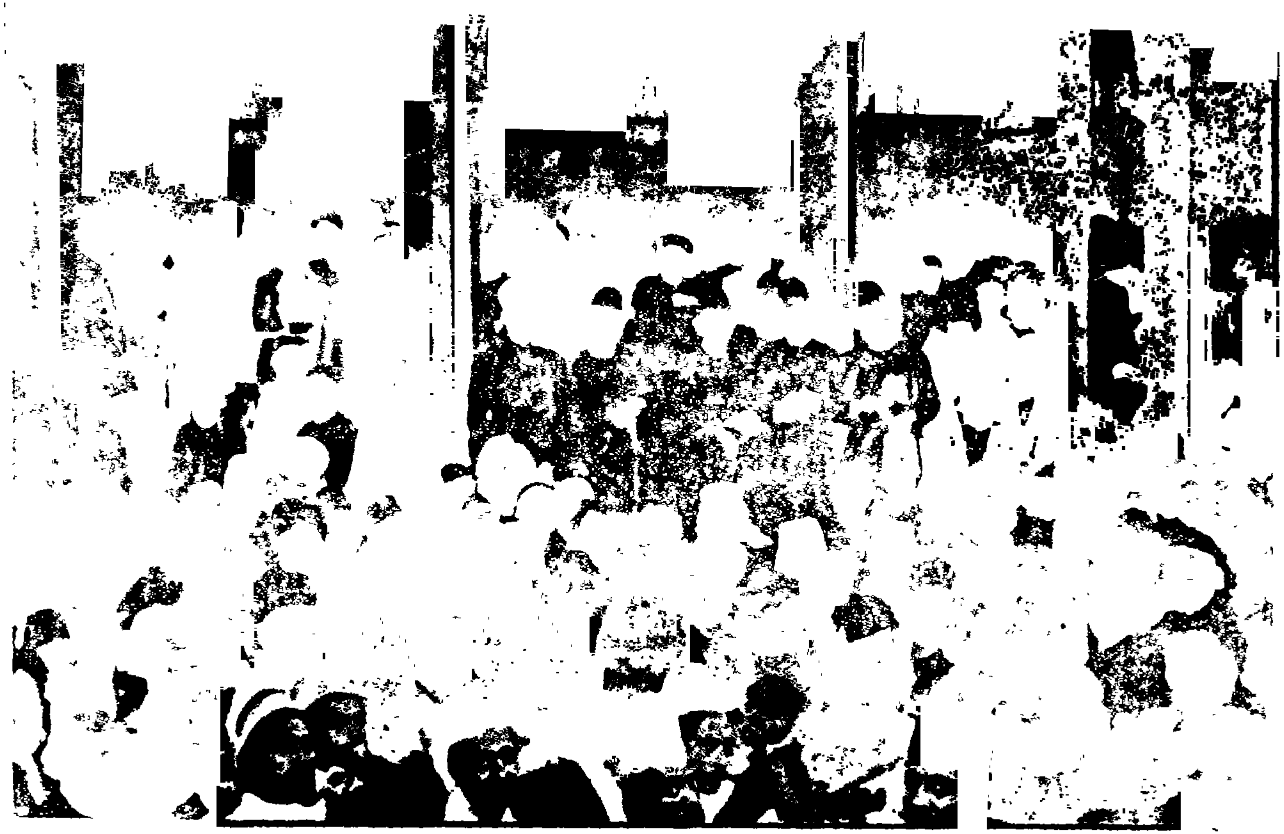
... ...

...

فہرست مضامین

[illegible]

اردو ادب میں



حیدرآباد مین مہر نفیس کي ایک مجلس
مہر نفیس وسط مین هین اور عارف انکے داهنے جانب هین

زمانہ

جلد [illegible] — نومبر ۱۹۳۶ء — نمبر [illegible]

میر نفیس

از مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی

آپ کا نام میر خورشید علی اور تخلص نفیس تھا۔ میر انیس کے خلف اکبر اور مستند جانشین تھے [illegible] لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہ میر خلیق اور میر انیس کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ شاہی مدرسہ میں عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کی زبان اور فن میں مشق و مہارت پیدا کی۔ نسخ و نستعلیق دونوں خطوں پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ شباب کے عالم میں سارا قرآن شریف ایک قلم سے لکھا تھا، لیکن وہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں تلف ہو گیا۔ اب بھی ان کے چند قطعات [illegible] جناب فائز کے پاس بطور یادگار موجود ہیں۔

صورت [illegible] خوددار، نیک، خوش [illegible] منکسر مزاج، مہذب اور سنجیدہ [illegible] [illegible] آنکھیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible]۔ ابتدا [illegible] کا [illegible] جوتا پہننے لگے تھے۔

مزاج میں عجز و انکسار بہت تھا۔ اب سے ...

طبیعت ثانیہ تھی۔ باتوں میں حلاوت اتنی کہ پہروں سیری نہ ہوتی۔ اشتعال ... ہمیشہ سادگی کا ملحوظ رہتا، کوئی کلمہ زبان سے ایسا نہ نکلتا جو گوشِ فصاحت کو گراں گزرے۔ اکثر انکسار کے طور پر کہتے کہ "مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا! یہ جو کچھ ہے صرف بزرگوں کی دعاؤں کا اثر ہے۔" اگر کوئی حسنِ ارادت کے جوش میں عرض کر دیتا کہ "حضور کے مرثیوں میں میر صاحب (انیس) کا رنگ ہے" تو فرماتے "یہ کیا کہا؟ کہاں وہ کہاں میں۔ لا چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک! ہاں اُن کے چمنِ فصاحت و بلاغت کا ادنیٰ خوشہ چیں ہوں"۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی ہمیشہ ملحوظ رہتی، معذوری میں قضا ہوئی اور نہ روزہ، اوراد و وظائف اور تلاوتِ قرآن مجید سے بھی غفلت نہ ہونے پاتی۔

امجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں میر خلیق نے فیض آباد کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کو مستقر بنانا چاہا تو اہل و عیال کو لیکر سبنی پاشیدیوں کے احاطہ میں مقیم ہوئے۔ اُس وقت میر نفیس بھی اُن کے ساتھ تھے۔ یہ زمانہ مرثیہ نگاری اور غزل گوئی کا زرین عہد کہا جا سکتا ہے۔

ہر چند میر ضمیر کو ضعفِ پیری نے گوشہ گیر بنا دیا تھا، مگر اُن کے شاگردِ رشید مرزا دبیر کی جودتِ طبع زمینِ شعر کو فلک الافلاک پر پہنچا رہی تھی۔ آتش و ناسخ اور اُن کے ہونہار شاگردوں کا طوطی بول رہا تھا۔ لکھنؤ شاعری کا معدن تھا اور دنیائے ادب اُس کے فیضان سے استفادہ کر رہی تھی۔ یہ ماحول تھا، اور یہ فضا تھی جس میں اس بلبلِ بوستانِ مصطفوی نے شاعرانہ زندگی کے مدارج طے کیے۔

یوں تو دنیائے ادب میں کون ایسا ہے جس نے انیس و خاندانِ انیس کے فضل و کمال کا اعتراف نہیں کیا مگر خصوصیت کے ساتھ ریاستِ عالیہ محمود آباد اس خاندان کی قدردانی میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ امیر الدولہ راجا امیر حسن خاں مرحوم خود سخن فہم و سخنور واقع ہوئے تھے اور تحسین تخلص فرماتے تھے اسلئے نہایت دریا دلی سے شعرائے باکمال کی قدردانی اور کمال نوازی فرماتے تھے چنانچہ جب لکھنؤ کی بادشاہی کا ورق اُلٹا تو بعض شعرائے عصر نے زمانے کے سخت گیر ہاتھوں سے تنگ ہو کر اسی سرکارِ فیض آثار کے ظلِ عافیت میں پناہ لی۔ راجہ صاحب مرحوم کو میر انیس سے خاص عقیدت تھی اور اپنے کلام کو اُن کے مشورے سے مزین فرماتے تھے۔ اُن کے بعد کسی کامل فن شاعر کی ضرورت محسوس ہوئی تو نگاہِ انتخاب نے میر نفیس کو چن لیا اور موصوف سے مشورۂ سخن فرمانے لگے اور وقتاً فوقتاً مزاج پرسی اور ملاقات کو بنفسِ نفیس میر صاحب کے سخن کدے میں تشریف فرما ہوا کرتے تھے اور میر نفیس بھی اکثر قیصر باغ یا محمود آباد جایا کرتے تھے۔ اتحاد و قدردانی کا یہ سلسلہ راجہ صاحب مرحوم کی زندگی تک قائم رہا۔ پھر اُن کے ...

[illegible] نفیس جاتا ہے۔ سر محمد علی محمد خاں ساحر جیسے سخن سنج نے خاندانی روایات کو برقرار رکھا۔[1]
میر نفیس کے پڑھنے کی مجلسیں بکثرت تھیں۔ لکھنؤ کی عشرہ اور وقتی مجلسوں کے علاوہ بیرون جات
اکثر مدعو ہوتے تھے اور قدردانانِ سخن ہاتھوں ہاتھ لے کر سر آنکھوں پر جگہ دیتے اور عزت و توقیر
کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ میر انیس کے انتقال کے بعد کئی سال تک متواتر آپ حیدرآباد دکن میں
نواب نظام یار جنگ بہادر، نواب بہرام الدولہ بہادر اور عسکر جنگ بہادر کی مجلسوں میں کمال کے
جوہر پیش کرتے رہے۔ ہر چند مرتبہ دانانِ دکن نے قدر و منزلت میں قصور نہیں کیا، لیکن سخن شناسانِ
لکھنؤ کی یاد کبھی محو نہ ہوسکی۔ دکن کے سوا ہندوستان کی کوئی شیعی ریاست اور بستی ایسی نہیں ہے جو
زمین پر آفتابِ سخن کی ضیا بار شعاعوں نے پرتو ڈال کر وہاں کے ذرّوں کو تابناک نہ کیا ہو۔ مگر قدر
کمال کے اعتبار سے ریاست عالیہ محمود آباد کو امتیازِ خصوصی حاصل ہے۔

مجلس پڑھنے کا انداز بہت پیارا تھا جب پڑھنا شروع کرتے تھے تو ایک مصرعہ دوسرے مصرعے سے
بہتر ہوتا تھا۔ آواز کے اتار چڑھاؤ اور لہجے کی سختی و نرمی سے مشکل سے مشکل مطالب ایسی خوبصورتی سے ادا کرتے
تھے کہ مفہوم سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ جوانی تو جوانی پیری میں یہ عالم تھا کہ جب منبر پر تشریف
لے جاتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بپھرا ہوا شیر بیٹھا ہے۔ ہر سال ۲۵ رجب کو دولت آباد کی بارہ دری
میں نو تصنیف مرثیہ پڑھتے تھے۔ شائقین سخن پروانوں کے مانند جمع ہوتے تھے۔ یہی مجلس میر عظیم ا

---

[1] ریاست کے موجودہ جواں بخت جواں سال والی خان بہادر راجہ محمد امیر احمد خاں بہادر بھی تمام ان اوصاف
امیرانہ سے متصف ہیں جو خدائے بزرگ و برتر نے ان کے اسلاف میں ودیعت فرمائے تھے۔ جب تک قانونی بلوغ
حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ریاست کی عنان نائب ریاست کے قبضے میں رہی آپ کی جبلی سخاوت و فطری
حق شناسی کے جوہر چراغ زیر داماں کی طرح ضیا پاشی کرتے رہے۔ آپ نے ان تمام قدیم نمک خواروں کو جو انتظامات
کی تبدیلیوں کی بدولت اپنی اپنی خدمات سے سبکدوش کر دیئے گئے تھے کبھی فراموش نہیں کیا۔ ہمیشہ مخفی عنایات سے
سرفراز فرماتے رہے اور اب جبکہ ریاست کے کل اختیارات حاصل ہو چکے ہیں، انہیں دوبارہ ان کی خدمات پر
بحال فرمانا شروع کر دیا ہے۔ خصوصاً شرفا پروری اور ادب نوازی کی ایسی مثالیں قائم فرما رہے ہیں جو اس کساد بازاری
کے دور میں کم ہیں۔ اپنے علم دوست و سخن نواز اسلاف کی طرح خود بھی لیلائے سخن کے مفتوں ہیں اور محبوب تخلص
فرماتے ہیں۔ چنانچہ اکثر اساتذۂ وقت دامنِ دولت سے وابستہ ہیں اور شاید ہی کوئی ادیب ہو جس کے آپ
قدردان نہ ہوں۔

اختتامِ مجلس تک منبر کے پاس کھڑے رہے ... مجلس ... معمول اپنی خدمت پہ حاضر تھا اور بیر تحسین مرثیہ منبر سے کوثر و تسنیم کا منہ پر ساتے ہوئے ... دفعتاً صف قدسے بلند ہوکر ادا ایک طرف انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے یہ مصرعہ کھا ہر اسلوب سے پڑھا کہ

وہ گردِ اٹھی، وہ جگر بند بوتراب آیا

کہ حاضرین بے اختیار مڑ کے دیکھنے لگے گویا کربلا کا خونیں میدان آنکھوں کے سامنے تھا اور وہ عاشورہ محرم کی قیامت خیز لڑائی دیکھ رہے تھے، چار ہزار شامیوں کا لشکر فرات کا گھاٹ روکے کھڑا تھا اور حسینؑ فوج کا بہادر علمبردار یکہ و تنہا علم بردوش و نیزہ بکف، سوکھا ہوا مشکیزہ پانی سے بھرنے آ رہا ہے! یہ تو پڑھنے کے انداز کی صرف ایک مثال ہے۔ اگر تحقیقات کو وسیع کیا جائے تو معلوم کتنی مثالیں اس سے بہتر و برتر دستیاب ہوسکتی ہیں۔

کلام کا ذخیرہ مرثیہ، سلام، نوحہ، رباعی، مناقب، مناجات اور بعض علمی و ادبی حواشی پر مشتمل ہے۔ انھوں نے میر انیس کی متابعت میں غزل گوئی کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ ابتدائے مشق سخن میں کچھ کہا بھی تو ضائع کر دیا۔ یہی باعث ہے کہ ان کے عاشقانہ کلام میں آنکھوں سے لگانے کو ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ انھوں نے دنیا کے زر و مال کو حقیر سمجھ کے اغنیا کے خزانوں پر کبھی نگاہ نہیں ڈالی۔ دولتمندوں کی مدح و ثنا اور امیروں کی دربار داری سے ہمیشہ اجتناب کیا بلکہ ہمیشہ اس خاندانی خیال کو ملحوظ رکھا کہ

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی! اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

ان کے کلام میں فصاحت و سلاست کے ساتھ ساتھ بلاغت و ندرت کی کمی نہیں۔ صفائی و روانی کا یہ چشمہ کوثر کی دھلی ہوئی زبان اور میر انیس کی میں ... تو علی نو ذحسنِ بیان، لطفِ زبان اور سوز مرثیہ کا بحرِ بے پایاں ہے کہ موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ کربلا کے واقعات کچھ ایسی صنائیوں اور نازک خیالیوں کے ساتھ شستہ و برجستہ عنوان سے تشبیہوں اور استعاروں کی چاشنی ملا کر پیش کئے ہیں جو میر انیس جیسے وہبی شاعر کے جانشین کے شایانِ شان ہیں۔ مرثیوں میں رزم و بزم، صبح و شام اور مختلف قدرتی مناظر کی کمی نہیں۔ جا بجا انسانی فطرت کی تصویر کشی بھی کامل طور سے موجود ہے۔ متانتِ خیال اور سنجیدگیٔ بیان کے اسوا مرثیہ کا تسلسل اور ارتقا مراتب کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ امام کا ارشاد، عزیزوں کی گفتگو، اہلِ حرم کی بات چیت، اصحاب و انصار کی عرض و معروض جس میں قدر مراتب کا امتیاز و فرق ہونا چاہیے مرثیوں میں تمام و کمال پایا

[illegible] کے ساتھ ساتھ ان کی آن بان شکوہ یا صفات اور تبرکات کے مرثیوں کے نمائندہ انگ۔ اگر ان کی تمام خصوصیات سے قطع نظر کر کے صرف ایک ہی خصوصیت کو دیکھا جائے تو ان کا استادانہ مرتبہ تسلیم کرنا پڑتا ہے چونکہ وہ تمام محاسن فضل و کمال جو قدرت نے ان کی ذات میں جمع کر دیئے تھے اور ہمیشہ ان کے نام کو زندہ رکھنے والے ہیں

آخر عمر میں ضعف پیری نے بالکل ہی نحیف و افسردہ کر دیا تھا، بات بات میں احباب سے فرمایا کرتے تھے: بھئی ہم تو چراغ سحری ہیں معلوم نہیں کس وقت باد فنا کا جھونکا چل جائے۔ کبھی کبھی نظم میں بھی اس خیال کا اعادہ فرماتے تھے جب ۵ رجب ۱۳۱۹ھ میں آخری مجلس پڑھی تو مرثیہ کے ایک بند کی ٹیپ میں اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا ؎

دعائے خیر سے روح حزیں کو شاد کریں
ہمارے بعد بھی احباب ہم کو یاد کریں

صاحبان کمال روشن ضمیر ہوا کرتے ہیں۔ ان کے تخیل کی توجیہیں واقعیت کے رنگ میں ڈوب کے ابھرتی ہیں چنانچہ میر انیس کی پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہو کے رہی۔ اس مجلس کے چار مہینے بعد چند روز بستر علالت پر کروٹیں لے کر بلبل بوستان مدحت ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء ۸ بجے رات کو ریاض خلد [illegible]۔ صبح کو دریا پر غسل دیا گیا اور میت کو نہایت احترام و اہتمام کے ساتھ حسینیہ ممتاز العلماء سید تقی صاحب میں لائے۔ شہر کے وضیع و شریف، علما و فضلا، شعرا و ادبا کا ہجوم تھا۔ مجتہد العصر میر آغا صاحب نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ ہزارہا مومنین نے ان کی اقتدا کی۔ پہر سوا پہر کے قریب اپنے خاندانی حجرے میں میر انیس کے برابر سپرد زمین ہوئے۔ شعرائے وقت نے سیکڑوں تاریخیں لکھی ہیں۔ ان میں سے مولوی عبدالرحیم کلیم کی تاریخ درج ذیل ہے ؎

بجنت شد قریب صبح خورشید علی طالع — فزوں از نور او نور جہاں چشم خازن شد
یعنی مرثیہ گوئی، امام مرثیہ گویاں — نجات اہل عالم را، کلام پاک ضامن شد
کلیم! از بہر سال ہجری فوتش رقم کردم
انیس و مونس جنت نفیس پاک باطن شد

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ جناب عون و محمد کے حال کا مرثیہ ہے۔ اس میں اسلامی صبح کی منظر کشی کرتے ہوئے معجز نگار قلم کا زور دکھاتے ہیں ؎

[illegible] پر ظہور ہوا — جو دور تیرگی شب کا تھا وہ دور ہوا

بپا سحر سے ہوئی حسین روشنی ہر سو ہوا — مہیا کون و مکاں آسماں کا نور ہوا

مطیعِ خالقِ لیل و نہار آ اٹھنے لگے
پئے نمازِ عبادت گزار آ اٹھنے لگے

کسی نے غسل کیا اور کیا کسی نے وضو — گلِ اذاں کی لگی جانے تا فلک خوشبو
نسیمِ طاعتِ ربِّ علا چلی ہر سو — شگفتہ جوششِ عبادت سے ہوگئے گرد

جہاں میں فصلِ صلوٰۃ و درود کی آئی
بہارِ تازہ قیام و قعود کی آئی

مصلیوں کے مصلّے بچھے برائے نماز — فلک کے اوج پہ جانے لگی صدائے نماز
نمازیوں کے وہ نور اور وہ حسن جائے نماز — ملک بھی وجد میں تھے دیکھ کر ادائے نماز

وہ کونسی تھی عبادت، جو سرفراز نہ تھی
نمازیوں کی وہ معراج تھی نماز نہ تھی

کربلا کے محشر خیز میدان میں صبح عاشورہ کی نمود اور امام حسینؑ کی جماعت نماز کی تصویر اس طرح پیش کی جاتی ہے۔

فریضۂ سحری میں اُدھر تھے محو حسینؑ — حضورِ قلب تھا فرضِ ادائے فرضِ العین
سبھوں کے آگے رسولِ خدا کے دل کا چین — پس امام غلامانِ شاہِ بدر و حنین

اِدھر سے صورتِ حسن جب فلک پہ جاتی تھی
صدائے مدح و ثنا آسمان سے آتی تھی

علیؑ کا چاند تھا اک اور قمر بنیؑ ہاشم سے تھے — خدا شناس تھے اور عارفِ پیمبرؐ تھے
حبیبِ سبطِ نبیؐ، عاشقانِ حیدرؑ تھے — اطاعت اور عبادت میں ختم کئے سر تھے

رخ اُن کے صورتِ خورشید کیوں نہ پُر ضو ہوں
امام ایسا ہو جن کے تو ایسے پیرو ہوں

دلوں میں اُن کے ولا شاہِ بے عدیل کی تھی — نگاہِ لطف ادھر خالقِ جلیل کی تھی
ہوس کثیر کی نے دولتِ قلیل کی تھی — خیال خلد کا تھا، چاہ سلسبیل کی تھی

خدائے پاک کا فاقوں میں شکر کرتے تھے
عطش میں ساقیٔ کوثر کا دم وہ بھرتے تھے

جب نماز ختم ہوئی، امام نے سلام پھیرا، عبادت گزاروں نے خدا کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلا کر مناجات شروع کی۔

پھر حمد و ثنائے رسولؐ و وصیؐ قدیر — یہ تھا لبوں پہ کہ اے قادرِ علیم و خبیر
غلام ہم ہیں علیؑ کے تو خادم شبیرؑ — مسافرت میں ہیں غمخوار سرو بدل گیر
لہو میں آج بھریں سر سے تا قدم یارب!
ہمارے نام شہیدوں میں ہوں رقم یارب!

دم دغا مدد شاہ نامدار کریں — نبیؐ کے آل پہ جانوں کو ہم نثار کریں
ستمگروں کو تہ تیغ شعلہ بار کریں — جہاں میں نام ہو وہ آج کارزار کریں
ڈگیں نہ پاؤں نہ لاکھوں سے کم رہیں یارب!
کٹیں جو سر بھی تو ثابت قدم رہیں یارب!

علیؑ کے گھر کی شجاعت دکھا دکھا کے مریں — عطش میں جرأت و ہمت دکھا دکھا کے مریں
دم جدال فتوت دکھا دکھا کے مریں — جو تو نے دی ہے وہ طاقت دکھا دکھا کے مریں
یہ جنگ آج کی سب کی نظر پہ چڑھ جائے
ہمارے بازوؤں کا زور آج بڑھ جائے

ادائے فرض کی خوشی میں مومنین مصافحہ و معانقہ کرتے ہیں۔ اس حالت کا مرقع ان لفظوں میں کھینچا گیا ہے ؎

یہ کہہ کے شکر کے سجدے نمازیوں نے کئے — شہ نے اپنے اُن کی طرف سرفرازیوں نے کئے
مصافحے بخوشی اٹھ کے غازیوں نے کئے — سلام کعبۂ دیں کو حجازیوں نے کئے
سپاہ کیں میں جو واں کوس جنگ بجنے لگے
حسینؑ گھر میں گئے۔ یہ سلاح سجنے لگے

ایک اور مرثیہ میں اس حالت کو یوں بیان کرتے ہیں جب امام حسینؑ جاں نثاروں کے جھرمٹ میں خیمہ گاہ سے میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوتے ہیں ؎

جبرئیلؑ پیادہ ہیں، نہ ہے شانِ سواری — مولا کی سواری ہے کہ اک قدرتِ باری
مٹی سے جو اُٹھا گرد ہے یاں باد بہاری — اس خاک میں ہو عنبر سارا کی ہے ساری
گلدستۂ جنت کو صبا لے کے چلی ہے
گھوڑے ہیں کہ پھولوں کو ہوا لے کے چلی ہے

ہاشمی جوان باری باری سے جاں نثاری کے جوہر دکھا رہے ہیں جناب مسلمؑ کے دو صاحبزادے شہادت کے جام نوش کر چکے جعفرؓ طیار کی اولاد کو شہادت کا درجہ مل چکا جناب زینبؑ کے صاحبزادے

جہاد کے شوق میں بے چین ہیں۔ دونوں بھائی مل کر امام کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اذنِ جنگ طلب کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں ؎

کیا شان ہے نبیوں ہیں ہے ہیبت دکھائیں   ہم بھی تو انہیں جوہرِ شمشیر دکھائیں
کچھ نعرۂ نمک خواریِ شبیرؑ دکھائیں   کچھ والدہ کے دودھ کی تاثیر دکھائیں

فوجوں کی جو کثرت ہے تو معذور نہیں ہیں
وہ بھی تو یہ جانیں کہ غلام شہِ دیں ہیں

جناب عون و محمد رخصت کے لئے خیمہ میں آتے ہیں۔ بیبیاں جمع ہیں حضرت زینبؑ اس لئے برہم ہیں کہ صاحبزادوں نے اب سے پہلے اپنے ماموں پر جانیں کیوں نہیں نثار کیں۔ لیکن جناب علی اکبر کو دیکھ کر گلے سے لگاتی ہیں جناب شہربانوؑ بھی وہاں موجود ہیں وہ دونوں صاحبزادوں کی سفارش میں زبان کھولتی ہیں ؎

بانوؑ نے کہا ان کو بھی چھاتی سے لگاؤ   جہاں ہیں مسافر ہیں، نہ بچوں کو رلاؤ
دونوں سے کہا، آؤ میں واری ادھر آؤ   جاتے ہو تو مادر کے قدم چوم کے جاؤ

بیٹوں کو یہ دولت کسی عنواں نہیں ملتی
سب ملتے ہیں دنیا میں مگر ماں نہیں ملتی

ماں کا دل صاف ہو گیا بیٹوں کو رن کی اجازت مل گئی صاحبزادے جہاد کے شوق اور ولولے میں خیمہ کی طرف بڑھے۔ ماں کی آنکھوں میں بچوں کا سپاہیانہ بانکپن کھپنے لگا۔ اس موقع پر قدرتاً جو جذبات پیدا ہو جاتے ہیں ان کی ترجمانی ملاحظہ ہو ؎

کچھ ہٹ کے جھکے وہ بہ تسلیم و ادب سے   دل سینوں میں بالیدہ ہوئے فرطِ طرب سے
تن کر جو چلے وہ تو کہا اس نے یہ سب سے   ملتی ہے بہت شان شہنشاہ عرب سے

ماموں پہ فدا ہوتے ہیں اقبال تو دیکھو
لوگو! مرے چھوٹے کی ذرا چال تو دیکھو

کیا مجھ کو بھلے لگتے ہیں اس وقت یہ دلدار   جی چاہتا ہے چھاتی سے لپٹا لوں پھر اک بار
اس عمر میں باندھے ہیں عجب حسن سے ہتھیار   کس نے یہ سکھائی ہے علی کی نہیں رفتار

زلفوں نے کھل کے ہیں سینے بھی تنے ہیں
کم سن ہیں کہ شادی ہے کہ دولہا سے بنے ہیں

پسرانِ جنابِ زینب کا رجز سنئے ؎

نعرہ ہے کہ ہم وارثِ شمشیرِ علیؑ ہیں   گو ہم ہیں مضطر ہیں شجاعِ ازلی ہیں
اسرارِ خفی جو ہیں وہ سب ہم پہ جلی ہیں   کونین کے والی ہیں تو خالق کے ولی ہیں
ہے عرشِ خدا نے دو جہاں طور ہمارا
پہلے جو ہوا خلق، وہ ہے نور ہمارا

پیاسے ہیں مگر چشمۂ کوثر سے ہیں بہتر   سب سے جو ہے برتر تو گلِ تر سے ہیں بہتر
پستی میں ہیں پر عرشِ منور سے ہیں بہتر   اعلیٰ سے ہم اعلیٰ ہیں تو بہتر سے ہیں بہتر
گر قرب ہی عالمِ بالا کو نہ ملتا
یہ اوج کبھی عرشِ معلیٰ کو نہ ملتا

نیمچوں کی تعریف میں سحر بیانی ملاحظہ ہو ؎

وہ نیمچے تھے اک غضبِ حضرتِ قہار   اک برگ مناجات تو اک صاعقہ کردار
چھوٹے ہوئے جلاد یہ قتال وہ خوں خوار   یہ برق وہ شعلہ، یہ شرر، خود وہ شرر بار
سر پر ہو جو مغرور، نہ تھا لشکرِ کیں کا
نصرت کا تو آیہ، وہ ظفر کا تھا نتیجا

جنگِ مغلوبہ کی شان دیکھیے، شہزادہ عون کے کم سن بچے کیوں کر دادِ شجاعت دیتے ہیں ؎

گھوڑوں کو دبا کر اِدھر آئے اُدھر آئے   نیزوں کو ہلا کر اِدھر آئے اُدھر آئے
ہر صف کو بھگا کر اِدھر آئے اُدھر آئے   فوجوں کو بھگا کر اِدھر آئے اُدھر آئے
پھرتی تھی نظر چار طرف آپ کہیں تھے
تلوار جدھر فوج میں چمکی یہ وہیں تھے

خاک اڑنے لگی بیچ میں جب غول کے آئے   اس صف کو بھگایا تو اُس غول کے آئے
اُن چھوٹی سی تیغوں کو جو سر پر تول کے آئے   نیزے کی ہر اک سمت گرہ کھول کے آئے
غُل تھا کہ یہ ہم نے یہ لڑائی نہیں دیکھی
اس طرح کسی صف کی صفائی نہیں دیکھی

غلّے کہیں ترکش تو کہیں تیر پڑے تھے   ٹکڑے کہیں چلّے کہیں بندِ کمر پڑے تھے
قبضے تھے کہیں اور کہیں نیمچے پھر پڑے تھے   منہ پھیرے ہوئے صاحبِ شمشیر پڑے تھے

نیزوں کی نوکیں نہیں [illegible]

تلواروں کے پھل ٹوٹ کے پھول بن کے

اللہ رے پریشانیٔ افواجِ ستمگر
وہ غول شتر دے پہ اگر دوڑے ابر

نیزہ تھا کہیں ہاتھ کہیں اور کہیں خنجر
یہ ڈھال وہ تلوار یہاں جسم وہاں سر

بھاگا کیے قدم رکھتے تھے ٹکڑوں پہ جگر کے
پہچانتا تھا باپ نہ لاشہ کو پسر کے

چاہیے تو یہ تھا کہ میر انیس کے گلستانِ فصاحت سے ہر رنگ و بو کے پھول چن کر گلدستہ تیار کیا جاتا مگر اسے کیا کیا جائے کہ رسالے کے مختصر اوراق مفصل تبصرے کے متحمل نہیں محاسنِ کلام و فصاحت کے مستغنی اور جگہ کی قلت عنان گیر۔ اسی کشمکش میں یہ تذکرہ تمام ہوتا ہے۔ خدا نے چاہا تو پھر کسی موقع پر اس شہنشاہِ ملکِ سخن کی بارگاہ میں نذرِ ارادت پیش کرنے کا افتخار حاصل کروں گا۔

آ۔ بوستاں میں رقصِ نسیمِ بہار دیکھ

از حضرت جوش ملیح آبادی

ہاں اے سرشتِ عابدِ شب زندہ دار دیکھ
ایماں ڈھل نہ جائے گا۔ صرف ایک بار دیکھ

تاچند جہت دخیزیٔ آئینِ خانقاہ
آ بوستاں میں رقصِ نسیمِ بہار دیکھ

مستوریوں میں لطف و عطا کا گزر نہیں
مستوں میں جوشِ رحمتِ پروردگار دیکھ

دودِ چراغِ مسجد و محراب تا کجا؟
آ اضطرابِ ابرِ سرِ کوہسار دیکھ

ظرفِ گلی میں آبِ وضو دیکھتا ہے کیا؟
جامِ خنک میں رنگِ مۓ خوشگوار دیکھ

تاچند اشتیاقِ نمودِ ہلالِ عید؟
ابرو پہ ناز طرفِ کلاہِ نگار دیکھ

تا کے طلسمِ کاکلِ پیرانِ پارسا؟
او نامراد! عربدۂ زلفِ یار دیکھ

تاچند ذکرِ حور و تمنائے سلسبیل؟
نازِ سہی قدانِ لبِ جوئبار دیکھ

کیا دیکھتا ہے عقل کی محفل میں رعبِ شیخ
بزمِ جنوں میں جوش کا عز و وقار دیکھ

کشورِ ہندوستاں اور حضرتِ جوش

از شاعرِ اعظم حضرت جوش ملیح آبادی

بالا ہیں جوش دامِ زمان و مکاں سے ہم
تخئیل قید و بند کو لائیں کہاں سے ہم

کوثر کی آرزو میں رہیں گے نہ تشنہ کام
پیماں یہ کر چکے ہیں مئے ارغواں سے ہم

اے حسنِ لازوال! قسم تیرے ناز کی
بیگانہ ہو چکے ہیں بہار و خزاں سے ہم

انمول بکنے والے ہیں جو چیز سے کبھی
ارزاں ہیں آجکل اسی جنسِ گراں سے ہم

اب اے خدا! عنایتِ بے جا سے فائدہ
مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

سو اک نئی زمیں سے گذرتے ہیں ہر نفس
ملتے ہوئے ہیں موجِ آبِ رواں سے ہم

کیا کہہ رہے ہو ہم سے اربابِ کیف و کم
باہر کھڑے ہیں حلقۂ سود و زیاں سے ہم

یہ طرفہ بات ہے کہ با ایں فقر و بیکسی
ہیں بہرہ یابِ دولتِ کون و مکاں سے ہم

جب چاہتے حسن، عشق کے سانچے میں ڈھال لے
پگھلے ہوئے ہیں آتشِ رطلِ گراں سے ہم

شکرِ خدا کہ شعر کی اکسیر مل گئی
اے عمرِ جاوداں تجھے لائے کہاں سے ہم

پائندہ باش اے غمِ ابروئے دلنشیں
اب کھیلتے ہیں موت کے تیر و کماں سے ہم

آب و ہوائے عالمِ نور و نوشِ نار
کتنے خجل ہیں سجدۂ کرّوبیاں سے ہم

ہر نقشِ پا پہ لوٹ رہی ہیں جوانیاں
یوں آ رہے ہیں خدمتِ پیرِ مغاں سے ہم

جنگل ہے، چاندنی ہے، شبِ ماہتاب ہند
ایسے میں اس کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

اہلِ زمیں غریب ہیں ہم نکتہ چیں نہ ہو
آتے ہیں گاہ گاہ یہاں آسماں سے ہم

اٹھنا تھا جن کو غیر زمینوں سے اٹھ چکے
اب جوش آگئے ہیں کشورِ ہندوستاں سے ہم

اشعارِ بالا سے ہمارے محترم دوست حضرت جوش کے شاعرانہ مسلک کی کما حقہ وضاحت ہوتی ہے۔ [illegible]

نظم شمع فروزاں کے عنوان سے جس نظم کو ہم درج کر رہے ہیں [illegible] شاید کسی عالم وارفتگی میں اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں کو [illegible] کر دیا ہے [illegible] شاعری [illegible] ہوتی ہے اس نے ہمارے ہی نیاز میں [illegible] اقتباسات [illegible] نہیں ہوتی لیکن جس نظم [illegible] ہیں جو نظم کر [illegible] کی پابندیوں سے [illegible] صاحب [illegible] نظم دونوں یکساں [illegible] اور وہاں دونوں ادبی شاعروں میں کوئی فرق نہیں کرنا چاہئے۔
ہماری اور ناظرین [illegible] کی خوش نصیبی ہے کہ جوش جیسا [illegible] پرست شاعر زمانہ کی بزم سخن کا بھی شمع فروزاں [illegible]
(ایڈیٹر)

شمعِ فروزاں

میں اے جوش اس دور میں ہوں وہ شاعر
اندھیرے میں جس طرح شمعِ فروزاں

حریفوں کے آگے مری شاعری ہے
کہ ہے پیشِ تورات و انجیل قرآں

مرا دل، وہ فیاض خرمن ہے، جس سے
چمن ریز ہے دامنِ خوشہ چیناں

دمِ فکر، دل میں مچاتی ہیں دھومیں
تمنائے بیداریِ نوعِ انساں

مرا شعر، اس عصرِ بے رنگ و بو میں
پسِ تیرگی جلوۂ آبِ حیواں

مرا دل دھڑکتا ہے یوں زیر و بم سے
جھلکتی ہے جس طرح، مژگانِ دوراں

مری طبع ہے تازہ اندیشیوں سے
شگفتہ تر از خندۂ نازنیناں

مری سادگی میں بھی وہ دل فریبی
شبِ ماہ میں جس طرح خوابِ طفلاں

شبِ تار میں، میری آشفتہ حالی
دمِ صبح، گویا خمِ زلفِ جاناں

مرے ذہن پر تیرگیٔ ابرِ معنی
جوانی کے ماتھے پہ جس طرح افشاں

مری بارشِ فکرِ رنگیں کی رَو میں
منقش تنک رنگیِ ہم نشیناں

بساطِ ادب پر، مری طبعِ رنگیں
سرِ شاخ جس طرح، مرغِ خوش الحاں

تراواں ہے دل میں مرے رنجِ وحشت
بہ اندازِ دوشیزگانِ بیاباں

مرے دل میں عہدِ تمنا کی راتیں
گھنے باغ میں جس طرح برق و باراں

مری چشمِ تر میں تمنا کی ہلچل
سرِ آب جس طرح، موجِ چراغاں

مرا دل جلے جو [illegible] کی زد سے
برشتہ تر از حسنِ صحرا نشیناں

زندگی کا صحیح فلسفہ

از مسٹر رام نرائن گم۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا
(چکبست)

ہمارا مادی جسم کیا ہے۔ کن اجزا سے بنا ہے۔ وہ کون سی طاقت ہے جو اس مشین کو چلاتی ہے۔ اسکی ساخت کی غرض کیا ہے۔ کس طرح یہ قائم رہتا اور کن وجوہ سے فنا ہوتا ہے۔ بیماری بڑھاپا اور موت سے بچنے کی کوئی تدبیر بھی ہے؟ یہ وہ اہم مسائل ہیں جن کے حل و عقد میں انسانی دماغ ازل سے مصروف رہا ہے اور شاید ابد تک اسی فکر میں مبتلا رہے گا۔ لیکن اس سلسلہ میں دورِ جدید کے سائنس داں جس نتیجہ پر پہونچے ہیں اُس کا مختصر بیان اس مضمون میں کیا جاتا ہے۔ تمہید کے طور پر انسانی جسم کے قدرتی نظام پر ایک سرسری نظر ڈالنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جسم کی ساخت۔ انسانی جسم عظام۔ پٹھوں۔ اعصاب۔ دماغ۔ احشاء (پھیپھڑے۔ دل۔ جگر۔ معدہ وغیرہ) غدود۔ خون۔ جلد وغیرہ پر مشتمل ہے جس کا حاکم دماغ ہے۔ دماغ کے دو حصے ہیں اوّل Conscious mind. (باخبر دماغ) یعنی وہ حصۂ دماغ جس کے فرائض میں سوچنا بحث و تحمیص۔ تمیز کرنا اور بیرونی دنیا سے سروکار رکھنا وغیرہ وغیرہ ہیں۔ حواس خمسہ کے ذریعہ اسکو براہ راست خبر پہونچتی ہے۔ مگر جسم کے اندرونی افعال و عملیات کی انجام دہی میں جب یہ خود مصروف ہوتا ہے تو اسکو کوشش زیادہ کرنا پڑتی ہے اور نتیجہ خفیف حاصل ہوتا ہے۔ Voluntary nerves (ارادیہ) اعصاب اس کے ٹیلیگراف آفس ہیں۔ دوسرا حصہ Sub-conscious mind (ماتحت دماغ) وہ اندرونی حصۂ دماغ ہے جسکو حواس خمسہ کے ذریعہ براہ راست خبر نہیں پہونچتی بلکہ وہ روح اور باخبر دماغ سے ہدایت حاصل کرتا ہے۔ باخبر دماغ میں جیسے ہی کوئی خیال پیدا ہوا کہ فلاں کام اس طرح انجام ہونا چاہئے لہٰذا ہی ماتحت دماغ Sympathetic nerves (غیر ارادیہ) اعصاب کے

جو خاص طور سے اس کے زیر اختیار ہیں ان پٹھوں سے جتنے وہ کام انجام پاسکتا ہے ایک [illegible]
ہے۔ تمام اندرونی افعال و عملیات جاری کرنا اس کے خاص فرائض میں سے ہے۔ بچپن سے
لیکر بلوغیت تک جسم کی تعمیر کا ذمہ دار ہے۔ غذا کا انضمام۔ غدودوں میں رطوبات لطیفہ کی تراوش
چلنا۔ پھرنا۔ کھیلنا۔ کودنا۔ سب کچھ اسی حصہ دماغ کے حکم و ہدایت سے ہوتا ہے۔ بیماری کے
مقابلہ میں زبردست لڑائیاں لڑنے کا بار بھی اسی بیچارے کی گردن پر ہے۔ جتنے کام ہم خود بخود کیا کرتے
ہیں وہ سب ماتحت دماغ ہی کی بدولت ہوتے ہیں جزئیات سے جزئیات (مثلاً گھاس چھیلنا)
اور اہم سے اہم کام (مثلاً انجن یا ہوائی جہاز چلانا) شروع میں نہایت دقت طلب معلوم ہوتا ہے
کیونکہ ابتداء میں باخبر دماغ اس طرف رجوع کرتا ہے جس میں بڑی کوشش سے کم نتیجہ حاصل کرنے کی
صلاحیت ہے۔ مگر رفتہ رفتہ مشکل سے مشکل کام میں بھی طاق ہو جاتا ہے
اس کی وجہ یہی ہے کہ ماتحت دماغ جس میں تھوڑی کوشش سے بڑا نتیجہ حاصل کرنے
کی صلاحیت ہے اس کام کو براہ راست اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ اسی حالت کا نام عادت ہے۔ اس حالت میں
باخبر دماغ کو عادتاً انجام پانے والے کاموں سے سبکدوش ہو کر دیگر ضروری مشاغل کی طرف متوجہ
ہونیکا موقع ملتا ہے۔

علم النفس (Psychology) کے ماہرین کا قول ہے کہ بڑا آدمی وہ ہے جس نے صحیح عادات
قائم کرلی ہیں۔ خیال و احساس کی عادت۔ کام کی عادت۔ اپنی ذات سے بہت کچھ امید رکھنے کی عادت
ہر کام میں ہمہ تن مصروف ہونیکی عادت۔ اور ہر ایک نئے کام کو کامیابی کیساتھ سرانجام دینے کی عادت
یہ سب عادتیں عموماً بڑے آدمیوں میں پائی جاتی ہیں۔ قوت ارادی بھی ایک عادت ہے جس کا خاصہ
ہر بات یا کام کو جو شروع کیا جائے ہمیشہ انجام تک پہونچا کر چھوڑنا ہے۔

غرض انسانی جسم کی مشین مکمل بنائی گئی ہے اور اسمیں ہر لحظہ سائنس کے تمام اصولوں پر عمل جاری
رہتا ہے۔ انسان نے جب علم کیمیا میں فضیلت حاصل کی تو اسکو اپنے جسم کی حیرت انگیز کیمیا میں کاریگری دیکھ کر
اسے چار و ناچار کہنا پڑا کہ اگر یہ کوئی کیمیا گر ہے تو کیا مارا۔
روشنی اور آواز کے قوانین معلوم ہونے کے بعد اسے تحقیق ہوا کہ ازل سے انسان کی آنکھیں اور کان
ٹھیک انہیں اصولوں پر کام کرتے چلے آرہے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

جسم کیسے قائم رہتا ہے؟ جسم اپنا وجود قائم رکھنے کی غرض سے تمام دنیاوی اشیاء سے اپنی غذا حاصل
کرتا ہے۔ اسے قدرت سے اپنی صحت کی درستی و تعمیر کے لئے نہایت [illegible]

[illegible] بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ سال کے آخر میں کوئی پرانا ریشہ باقی نہیں رہ جاتا۔ بعض بعض نازک ریشے ماہوار بدلتے رہتے ہیں اور گیارہ ماہ کے وقفے سے نظام کی تجدید بھی ہوتی رہتی ہے۔

<u>متحیر</u> مگر اس قدر مکمل ہونے کے باوجود جسمانی مشین از خود نہیں چل سکتی ہے اور روح کی طرح محتاج ہے جس طرح کہ انسان کی بنائی ہوئی مشین دھواں اور برقی طاقت کی۔ روح جسم و دماغ دونوں سے مختلف ایک لامحدود۔ لافانی۔ لازوال ربانی طاقت ہے۔ وہ نظر سے پنہاں مگر ہمہ گیر ہے۔ بڑے سے بڑے جانور سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے حشرات الارض تک میں یکساں روح ہے دراصل روح کسی مادی چیز کی محتاج نہیں ہے۔ اسے نہ ہوا کی ضرورت ہے اور نہ پانی کی۔ نہ غذا درکار ہے اور نہ دوا کی حاجت ہے۔ نہ اس پر کسی آفت غم صدمہ۔ بیماری یا بڑھاپے کا کوئی اثر ہوتا ہے۔ البتہ جس طرح روح کے بغیر مادی جسم محض مٹی کا تودہ ہے اُسی طرح دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کی غرض سے روح کو بھی لازمی طور پر کسی نہ کسی مادی جسم کی ضرورت ہے کیونکہ اسی مادی جسم کے بدولت روح کو دنیا کے حالات کی خبر پہونچتی اور اس کی مرضی پوری ہوتی ہے۔

<u>روح کا طرز حکومت</u> مادی جسم پر روح کی حکومت دماغی ضوابط کے ذریعہ ہوتی ہے یعنی روح کے ایما پر دماغ میں خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ حسب ضرورت ایک مرقع تیار کرتا ہے جس کے مطابق مادی کام کی تکمیل ہوتی ہے۔ مثلاً معمار پہلے اپنے دماغ میں عمارت کا مرقع تیار کرتا ہے اس کے بعد وہ عمارت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کی جو جو حیرت انگیز ایجادیں• آج ہمارے پیش نظر ہیں ان سب کا مرقع پہلے پہل انسانی دماغ ہی میں مرتب ہوا تھا۔ ادھر دماغ میں خیال پیدا ہوا اُدھر مقصد مطلوبہ کی تشکیل و تکمیل کی غرض سے متعلقہ پٹھوں کی جانب Nerve energy• (عصبی قوت) روانہ کی گئی۔ جو روح کی مرضی پوری کرنیکا واحد ذریعہ ہے۔ پٹھوں کو روان کرنے کے لئے قوت عصبی کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ موٹر کے لئے برقی طاقت، اور ہر ایک پٹھا اسی مناسبت سے تیزی یا سستی کیساتھ حرکت کرتا ہے جسقدر زوردار قوت عصبی اُس کی جانب روانہ کی جاتی ہے۔ ہمارا ہر کام کسی نہ کسی تصور کا نتیجہ ہوتا ہے اور چونکہ ہر خیال اور ہر کام میں خواہ وہ چھوٹا یا بڑا قوت عصبی کا صرف ہوتا ہے لہذا قوت عصبی کا گنجینہ جو براہ راست روح کے زیر نگیں ہے خالی ہوتا رہتا ہے۔ تجربات و مشاہدات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ابھی ہم اپنے نوے فیصدی دماغی ضوابط

• Radio, Television and Talkies.

سے خالی نہیں ہیں۔ عصبی قوت کا نقصان مضر ہے [illegible]
[illegible] کی طاقتوں سے اس کو بطریق احسن پیدا کرنے کے خاص خاص عمل بتائے ہیں۔ انسان کا عنصر تین قسم کا ہے اول جسمانی دوم دماغی سوم روحانی اور جب تک ان تینوں میں پورا توازن نہ ہوگا انسانیت کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ مثلاً عصبی قوت کی کمی بیشی پر نہ صرف ہر کام کی ناکامیابی اور کامیابی منحصر ہے بلکہ اس کی بے دریغ فضول خرچی کا رواج بھی مضر ہے کیونکہ جب ہمارے عصبی قوت کا خزانہ بالکل خرچ ہو جاتا ہے اور جسم میں اس کی کمی پیدا کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی تو روح اس قالب خاکی کو ترک کر دیتی ہے اور ہم کو اس مہیب اور ناگزیر آفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کو موت کہتے ہیں۔

بیماری۔ بڑھاپا اور موت سے بچنے کی تدابیر

بیماری۔ بڑھاپا اور موت کے متعلق دور جدید کے ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ یہ آفات خود ہماری "غلط کاری" کا ثمرہ ہیں اور اگر صحیح طریقوں پر زندگی بسر کی جائے تو ان سے یقینی طور پر نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

"غلط کاری" کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ یہ دنیا سبب اور نتیجہ کی جگہ ہے۔ قدرت کے قوانین پر عمل پیرا ہونے سے انسان سب کچھ حاصل کر سکتا ہے مگر ان قوانین سے انحراف یا خلاف ورزی کے مضر نتائج سے بچنا کسی حالت میں بھی ممکن نہیں ہے۔ "از دست تو ہیچ دست بالاتر نیست" کی ضرب المثل بالکل صحیح ہے۔ ہم کو ان قوتوں سے جو قدرت نے اپنی فیاضی سے ہماری فلاح و بہبود کی غرض سے عطا کی ہیں صحیح طریقہ پر پورا پورا کام لینا اور ان کے غلط و بیجا استعمال سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ انسانی مشین کو حسن و خوبی سے چلانے کے لئے روح۔ دماغ اور مادی جسم تینوں کا اشتراک عمل لازمی ہے۔ جسم کو بھی تجدید و درستی کی لامحدود طاقتیں ودیعت ہوئی ہیں۔ دماغ کے بھورے حصہ میں نو ارب اور ایک کھرب تیس ارب کے درمیان (cells.) ذرات جو صرف خورد بین سے دکھائی دیتے ہیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں کام کرنے کی بے حد صلاحیت ہے بشرطیکہ ہم ان کو کام کرنے کا موقع دیں یعنی ان کو استعمال کریں۔ قوت عصبی کا گنجینہ کبھی خالی نہیں ہو سکتا اگر اس کے نقصانات پورے کرنے کے صحیح طریقے عمل میں لائے جائیں۔ سائنس نے اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ ہم میں سے بہت ہی کم افراد ایسے ہیں جو اپنی جسمانی دماغی اور روحانی قوتوں کے دسویں حصہ کا بھی صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں تعجب ہے کہ ہم کو آئے دن بیماری بڑھاپا۔ موت۔ ناکامی۔ غلطی وغیرہ کی مصائب کا سامنا ہوتا ہے حالانکہ ان تمام آفات کی پوری ذمہ داری خود انسان کی گردن پر ہے۔ [illegible] حقیقت کی [illegible]

سائنس کی بربریت

(از مولوی محمد عبدالرزاق صاحب راشد ایچ۔ سی۔ ایس مددگار معتمد فینانس حیدرآباد دکن)

سائنس کی ترقی میں اہل مغرب کی ساعی جمیلہ تمام دنیا کے شکرگذاری کا باعث ہیں کیونکہ اس سے خلق اللہ کی راحت و آسائش میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ریل۔ موٹر۔ اسٹیمر۔ سائکل۔ ٹراموے۔ طیارے۔ وائرلیس۔ ایسے متعدد نو بنو اختراعات نے وقت و فاصلہ کا سوال اٹھا دیا ہے۔ برقی روشنی۔ برقی پنکھے۔ لاسلکی شعاع۔ ایسی ایجادات سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن آرام و راحت کے عوض اب سائنس انسانی ہلاکت کا آلہ بھی بن رہا ہے۔ اخبار بین اصحاب کو معلوم ہے کہ حبش و اسپین میں طیاروں کے ذریعہ کس قدر بم برسائے گئے۔ جنگ حبش میں زہریلی ہواؤں سے کیسی تباہیاں پھیلائی گئیں۔ سبز مستزاد یہ کہ دمدم گولیوں سے بھی چار باتھ کیا۔ اب جنگ میں جدید تہذیب کے حامیوں میں کوئی بھی ان سفاکانہ اور بیرحمانہ افعال کا تدارک نہیں کرسکتا۔ حالانکہ جدید تہذیب کا دعویٰ یہ ہے کہ سائنس راحتِ خلق کے واسطے کارفرما ہے۔ جرمنی نے جنگ عظیم میں جب اس طرح کی سفیہانہ حرکتیں کی تھیں اسوقت تمام دنیا خصوصاً یورپ میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا۔ جنگ عظیم کے اختتام پر صلح ہوئی مدبرین یورپ نے بین الاقوامی کوششوں سے نہ صرف آئندہ لڑائیوں کا انسداد کرنا چاہا بلکہ جنگ عظیم کی ذمہ داریتوں سے مواخذہ کرنے کی ٹھان لی چنانچہ قیصر جرمنی کو بالاتفاق جنگ کا محرک اور امن شکن قرار دیکر اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی نسبت برطانیہ کے پریس میں کئی ماہ تک مسلسل ہنگامہ آرائی ہوئی۔ بالآخر ہالینڈ میں قیصر کو نظر بند کیا گیا اور اسکی نقل و حرکت کو محدود کرکے اسے جرمنی جانے کی ممانعت کردی گئی۔ ان بندشوں پر غریب قیصر کے دل سے پوچھئے کہ اس کا کیا حال ہے۔ کوئی تین سال ہوئے شاہ اسپین جلاوطن کئے گئے۔ زار روس کی مطلق العنانی کا آج نام نشان تک نہیں۔ زار کا سارا خاندان نذر اجل ہوگیا ہے۔ یہ سب تاریخی واقعات ہیں۔ افسوس ہے کہ مسولینی جیسا مدبر ان شواہد کو پیش نظر نہیں رکھتا۔ اسے خبر نہیں کہ خود اس کا کیا حشر ہوگا۔ ؂ تقدیر کا پانسہ کسی وقت پلٹ سکتا ہے۔ کاش وہ تاریخ سے واقف ہوتا۔

ہر عمل کے لئے ہے ردِ عمل — دہر میں نیش کا جواب ہے نیش
شیر سے آسماں لیتا ہے — انتقام غزال واشتر و میش

سرگذشتِ جہاں کا نسخہ تھی — کہہ گیا ہے وہی [illegible]
شمع پروانہ را بسوخت و لے — نہ زد بر زباں شکوۂ دردِ دلِ خویش

ڈکٹیٹر مسولینی اطالیہ کا سب سے زیادہ صاحبِ دل سمجھا جاتا ہے جسے ہمارے ایک مفکر شاعر نے اس سے یوں خطاب کیا ہے۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب — ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی — ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب
رومۃ الکبریٰ دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر — ایں کہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بخواب
چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ — نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت یہ تمنا یہ نمود — فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے — زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے — وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

لیکن اس وقت مسولینی اقوامِ عالم کی نظروں میں ڈکٹیٹرشپ کی خرابیوں کا مجسم نمونہ بنی ہے۔ اس کی نیت کے نقوش اس کے لوحِ اعمال پر مرتسم ہو رہے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ دنیا کی تاریخ میں اس خودسر شخص کو کس طرح یاد کیا جائے گا۔

بہرکیف جنگِ عظیم کے بعد انسدادِ جنگ کے لیے جمعیتِ اقوام قائم کی گئی اور تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس منعقد ہوئی کہ کیمیائی ذرائعِ جنگ کا سدِباب کیا جائے۔ لیکن جذبۂ سپہ گری سے متاثر لوگ اس پر کیوں رضامند ہوتے۔ انہیں تو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ وہ بہاری وگیس فشانی کی تائید کرتے ہیں حالانکہ یہ نہایت مہلک اور بعید از انسانیت فعل ہے۔

یہ کس قدر دردناک امر ہے کہ جدید تہذیب کی علمبردار سلطنتیں ان ملکوں کے ساتھ ہلاکتِ انسانی کے کیمیائی ذرائع اختیار کریں جو صفاتِ ہستی میں ان سے پیچھے ہیں اور جنکو سائنس کی ترقی کی ہوا تک نہیں لگی حقیقت میں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یورپ کا ضمیر مُلا مردہ ہو گیا ہے جنگِ حبش میں اطالیہ کے طرزِ عمل کو ناپسند کرنے والے [illegible] اطالیہ کو درحقیقت مجرم سمجھتے ہیں مگر بعض اربابِ سیاست حاضرہ اس طریقہ کو لڑائی جیتنے کا زیادہ اثرانداز اور کم ضرر رساں طریقہ سمجھتے ہیں۔ اہلِ اطالیہ کا بھی یہی استدلال ہے کہ ماجلانہ فتح کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہ تھا مگر یہ حجت دور از کار ہے۔

عہدِ قدیم میں جنگ دست بدست ہوا کرتی تھیں اس وقت شجاعت کے قوانین کا منضبط کرنا ممکن

تمدن کی انتہا یہیں تک ہو جاتی تھی لیکن اب یہ ہے کہ سائنس نے یہ عکس کر دکھایا ہے کہ وہ دراز فاصلے سے انسانی ہلاکت کا سامان مہیا کر سکتی ہے کسی ملک کو اس کے ہلاک زدے بچانے کی کوشش کرنا فضول ہے اس لئے کیمیائی ملائیوں کی جنگ سے قوموں کو محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قانوناً اس کی ممانعت کر دی جائے ایسا نہ کیا گیا تو یورپ اپنے سائنس دانوں کی ایجادات سے خود ہی برباد و تباہ ہو جائے گا۔

مسٹر گلن جیمس نے مدلل ایک بہت کی مختصر کو اس کی تباہ کاریوں سے خطر میں ہے اسکا اشیاء: بہرحال اگر رائے عامہ نے اس طرز عمل کو موقوف نہ کیا تو عجب نہیں کہ آئندہ کسی روز جنگ پیرس۔ لندن۔ برلن۔ روما۔ ایک ہی شب میں دم گھٹ کر اپنی جانیں دیدیں۔

مقام افسوس ہے کہ ہمیں آج قلم کا ماتم کرنا پڑا ہے کہ جو سائنس خلق خدا کی خدمت کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے تھا اب اس کا وتیرہ تہذیب کی بربادی اور ہلاکت بن گیا ہے نظم عالم کی شعریت مٹی میں مل رہی ہے کیونکہ سائنس کی بربریت تمام عالم میں پھیل رہی ہے۔ افسوس۔

فریبِ زندگی

دفترِ حسرت ہے تالیف کتابِ زندگی
روز کھلتا ہے نئے عنوان سے بابِ زندگی

نقش بر بحرِ حوادث ہے حبابِ زندگی
دم کا ہے دورِ تغیر میں شبابِ زندگی

آب اور خاک و آتش کی باہم تفریق ہے
مجموعہ ہے چار سانسوں کا حسابِ زندگی

حاصلِ ہستی کا شاعر جب کبھی دل میں سوال
مل گیا گورِ غریباں سے جوابِ زندگی

کیا تغافل کیش ہو صہبائے عشرت کا خمار
جسکو دیکھو ہے وہ سرمست شرابِ زندگی

جلوہ کثرت سے پہلے ہوا اتنا لطیف
پردہ محمل تھا مجنوں کو نقابِ زندگی

ولنشا کا ہی صلہ ایثارِ الفت کیا ملا
خونِ ارماں میں نظر آیا ثوابِ زندگی

ایک طلسمِ موج فرسا ہے حوادث کا وجود
عارضی ہے چشمِ خود بیں آب و تابِ زندگی

کیوں سر بالیں کوئی آزردہ تقصیر ہے
آج جبتعل رنگ لایا ہے حجابِ زندگی

قرض

(از جناب فیاض الدین احمد خاں صاحب فیاض گوالیاری)

ایک انسانِ پریشاں مو پریشاں روزگار　　جس کی تیوری سے پریشانی کی شکلیں آشکار
جس کی قبل از وقت پیری ایک روحی انتشار　　کچھ دھوئیں کچھ رنگ پر جس کی خوشی کا انحصار
بال کچھ الجھی ہوئی داڑھی کے مرہونِ خضاب
کچھ مسرت کوش ٹوٹے بیچوں کے پیچ و تاب
اک طرف گوشہ میں ایک آب و نمک کی ذمہ دار　　گود میں اک چاند کا ٹکڑا لئے پروانہ وار
پھونکتی جاتی ہے چولھا کر کے اس بچے کو پیار　　سامنے ہیں اور بھی چھوٹے بڑے باندھے قطار
ان کی قسمت پر کبھی خود کو گھلا دیتی ہے وہ
دیکھ کر ان کو کبھی سب کچھ بھلا دیتی ہے وہ
چوڑی ایک اس ہات میں دو چوڑیاں اس ہات میں　　یوں عرق چہرہ پہ جیسے پھول ہو برسات میں
گورے گورے جسم پر افلاس کے نقش و نگار
ہاتھ سے دھویا ہوا ملبوس بھی پیوند دار!

گھن لگا کر گھر میں ڈھائے قہر وہ کیڑا ہے قرض　　جس کا حملہ ہے فنا کی لہر وہ کیڑا ہے قرض
جسم کے کانٹے کو نہ آئے لہر وہ کیڑا ہے قرض　　جان لیکر بھی نہ اترے زہر وہ کیڑا ہے قرض
وہ مرض ہے جس کا نسلوں تک اثر باقی رہے
جس کے ہر کشتہ کا پشتوں تک اثر باقی رہے
سود در سود ایک لعنت ہے دوامی مستقل　　جو پھنسا اس جال میں آ کے قویٰ ہیں مضمحل
قطرہ قطرہ کر کے جونکیں چوستی ہیں خونِ دل　　ہو کے رہ جاتا ہے کم مقدور انساں پا بہ گل
رفتہ رفتہ ہم کو یہ بیماریاں کھاتی رہیں
جائدادیں فیصدی ننانوے جاتی رہیں

طبقۂ اوسط میں ہے قرض اک بلائے ناگزیر | جن کو پاس وضع ہے ایک ڈھلائے ناگزیر
ہیں نمود و نام اسیر اسبابے ناگزیر | سر پہ ہے اہلِ وفا کے یہ جفائے ناگزیر

پیٹ بھرتا ہی نہیں ہے قرض کی کھائے بغیر
سوئیں کیوں چادر سے باہر پاؤں پھیلائے بغیر

مفلسوں کی تھوڑی سی تنخواہیں ہیں چھوٹا روزگار | اک کمانے والا گھر میں بال بچے بے شمار
منہ ہیں جتنے اتنے لقموں پر نہیں ہے اختیار | ہر مہینہ بیسیوں کو لینا پڑتا ہے ادھار

سود ادا کر دیں اگر بیوی کا زیور بیچ کر
قرض کی پوری نہیں ہوتی رقم گھر بیچ کر

کاش سعیِ مشترک سے چند اربابِ ہمم | ایک قومی بینک کی بنیاد ڈالیں بیش و کم
قحطِ زر میں قوم پر ہو سایۂ ابرِ کرم | لہلہا اٹھیں ہماری کھیتیاں جی جائیں ہم

یہ گنہ جائز ہے پابندِ صلوٰۃ و صوم کو
بن پڑے جیسے تباہی سے بچائے قوم کو

غزل

(مسٹر بدری ناتھ شاطر الہ آبادی)

کبھی ہوں بوئے گلِ تر کبھی صبا ہوں میں | تمہیں ہزار بہانے سے ڈھونڈتا ہوں میں
یہ ابتدا ہی سے دنیا میں سوچتا ہوں میں | کہاں ہوں کون ہوں کس واسطے ہوں کیا ہوں میں
مآلِ موسیٰ و منصور دیکھتا ہوں میں | خدا کی شان وہ خود بول اٹھا خدا ہوں میں
زمیں پہ لالہ و گل چرخ پر مہ و خورشید | تمہارے دیکھنے والوں کو دیکھتا ہوں میں
رہیں نہ صرصر و برق اس کے واسطے تکلیف | خود آج اپنا نشیمن اجاڑتا ہوں میں
نمودِ منزلِ ہستی سے واسطہ نہ رہا | اب اپنے مرکزِ اصلی کو ڈھونڈتا ہوں میں
ہم کو علائق نے کر دیا بے کار | یہ کیسی بھول بھلیاں میں کھو گیا ہوں میں
مرگ و زیست کے جھگڑے وہ حسن و عشق کے راز | نظامِ عالمِ ہستی سمجھ رہا ہوں میں

خدا کرے کہ کوئی کارگر ہو اے شاطر
ہزاروں عالم [illegible]

ہندو اتہاس اور ہندوؤں کا تاریخی ادراک

از شاکر جے۔ آر۔ رائے صاحب

مغربی ماہروں کی باتیں بے چون وچرا ماننے والے حضرات یہ سوال کریں گے۔ کہ "ہندو اتہاس" کے کیا معنے؟ پرانے زمانے کے اہل ہند تو ادراک تاریخ سے کلیتہً محروم ہی تھے پھر "ہندو اتہاس" کہاں سے آیا؟ اس سوال کا مفصل جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ہندوستان کے خاص حالات کا پورا لحاظ کر لیا جائے۔

بہرحال یہ بات کہ ہند قدیم کے لوگ ادراک تاریخ میں تہی دست نہ تھے۔ ذیل کی سے بخوبی ظاہر ہے۔

بنگال کے مشہور عالم ڈاکٹر نریندر ناتھ لا۔ ایم۔ اے۔ بیرسٹر کی رائے ہے کہ ویدک زمانہ کے تمام بڑے بڑے آچاریہ اتہاس کے ابھیاس پر زور دیتے ہیں۔ بلکہ رگ وید میں لفظ پران بار بار آیا ہے جس سے مراد پراچین کال کی داستان ہے۔ علاوہ ازیں منو سنگھتا اور ایتریہ آرنیک میں کرم پکار کے اتہاس کا ذکر آیا ہے۔ اور کوٹلیہ چانکیہ اپنے ارتھ شاستر میں راجہ کو تاریخ کے مطالعہ کی تاکید کرتا ہے اب سوچنے کی بات ہے۔ اگر اتہاس نہ تھا۔ تو اس کا مطالعہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟

(۲) من جشری۔ ایک بودھ عالم نے ۸۰۰ء کے بعد ایک مختصر تاریخ ہند مرتب کی تھی جس میں ۷۰۰ء قبل مسیح سے لے کر ۸۰۰ء تک کے تمام بڑے بڑے ہندو حکمرانوں کا ذکر ہے گویا چودہ سو سال کے دوران میں جتنے سرکردہ اور عالی ہمت شہنشاہ گزرے ہیں ان کا اجمالی حال بیان کیا گیا ہے۔ گیارھویں صدی میں من جشری کا ترجمہ تبتی زبان میں کیا گیا تھا اب تین سال کے قریب ہوئے۔ پٹنہ کے ممتاز فاضل مسٹر کاشی پرشاد جیسوال بیرسٹر نے ایک بودھ عالم کی مدد سے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔

۱؎ اینشنٹ انڈین ہسٹوریکل ٹریڈیشن ص ۔۔۔ مطبوعہ ۱۹۲۲ء

۲؎ امپیریل ہسٹری آف انڈیا ۔۔۔ دو سال ہوئے طبع ہوئی تھی۔

[illegible] بھاشا میں۔ سن عیسوی سے ڈیڑھ دو سال پہلے لکھی گئی تھی وہ سے یہ بھاشائی کتاب ناپید ہے۔ مگر اس کے اقتباسات بعض پرانے گرنتھوں میں پائے جاتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہند قدیم بیسک تاریخی حالات کا بیش بہا خزانہ غیر ملکی حملہ آوروں کے ہاتھوں لٹ گیا۔ اگر یہ کتاب ہاتھ آجائے تو پراچین زمانہ کا ستھرا اتہاس مرتب ہو سکتا ہے۔

۴۔ سنہ کے لگ بھگ ایک نامی عرب عالم ابو صالح نے مجموعۃ التاریخ مرتب کی تھی جس میں اس نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق دنیا کی مختصر تاریخ لکھی تھی۔ اس میں سندھ کی تاریخ پرانے زمانے سے عربوں کے حملہ تک مذکور ہے ابو صالح نے سندھ کے پرانے حالات سنسکرت کے ایک پرانے گرنتھ سے اخذ کئے تھے۔ سنہ میں ابوالحسن علی نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ سندھ کی پرانی تاریخ جس سے ابو صالح نے معلومات حاصل کئے تھے عرصہ سے ناپید ہے۔

۵۔ راج ترنگنی کا مصنف کہتا ہے کہ میں نے نیل مت پران کے علاوہ گیارہ اور پرانی مستند کتابوں سے راج ترنگنی کی تالیف میں مدد لی ہے۔ اس نے ان کتابوں کے نام بھی مع ان کے مصنفوں کے دیئے ہیں۔ مگر اب ان میں سے ایک کتاب بھی دستیاب نہیں ہوتی۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گمناڈ سنگتا۔ سندھ کی تاریخ قدیم اور راج ترنگنی میں مذکور کتابیں کہاں گئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کا یہ پرانا قاعدہ ہے کہ بڑے بڑے فاتح مفتوح قوم پر اپنا استمراری تسلط بٹھانے کے لئے سب سے پہلے ان کی تہذیب کے نشانات اور ان کی گذشتہ تاریخ کی یاد عوام کے دلوں سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر ماضی کی شوکت[1] محکوم کے دل میں قائم رہے تو نئی حکومت کو قیام ہی نصیب نہ ہو۔ یہ کلیہ صرف ہندوستان ہی کے متعلق نہیں بلکہ یونان[2] مکار تھیج۔ ایران۔ ہسپانیہ اور چین کی تاریخوں سے بھی صحیح ثابت ہوتا ہے۔ سنہ میں کشی راج

---

[1] وی۔ اے اسمتھ نے ان اقتباسات کا ترجمہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں شائع کیا تھا جس سے کتاب کے نایاب معلومات کا خاطر خواہ اندازہ ہو سکتا ہے۔ گمناڈ سنگتا کا پتہ لگانے والے کے لئے پنڈت بھگوت دت سابق سپرنٹنڈنٹ ڈی۔ اے۔ وی کالج سنسکرت لائبریری لاہور نے بھاری انعام کا اعلان کیا تھا مگر پتہ نہ لگ سکا۔

[2] جرنل بہار اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی مطبوعہ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء

[3] نامی ماہر ہسٹری وبشیر ایچ۔ آن شنٹ ہسٹری، میں لکھتا ہے: "جب سن عیسوی سے ڈیڑھ سو برس پہلے رومیوں نے کارتھیج فتح کر کے تباہ کیا۔ تو جیتا کی ایک نامکمل ٹوٹ گئی" اسی زمانہ کے لگ بھگ رومیوں نے یونان فتح کر کے وہاں کے علمی خزانے برباد کر دئے اور نام نہاد حکومت اختیاری بھی جاتی رہی۔ ایران کی حالت وسطی ایشیا کے ناتراشیدہ قوم کے حملے کے بعد بہت حسرت ناک ہو گئی تھی۔

[illegible]

[illegible] اپنا ملی ... [illegible] K ... [illegible]

مہتر سردار ... نے ... سامور کیا جس کا صدر مقام ... تھا۔ ... ہماچل سے ... طرف ممالک متوسطہ کے شمالی اضلاع، بہار اور بنگال تک کشن راج کا ڈنکا بجتا تھا۔ ونکٹ ... نے ... توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ اس نے ذات پات اٹھا دی۔ براہمنوں کی تقلید ... شہرائی۔ کشتری امراء اور ... کو رسوا کیا۔ اونچی ذات کے ہندو قتل چھپ چھپ کر ... تھے ... کو کشی سلطنت کے ہر حصہ میں ہونے لگی۔ مندر اور پاٹھ شالائیں ڈھا دی گئیں، پستکالے جلائے گئے۔ غرض سو سال[1] تک ہندوؤں پر سخت ظلم ہوتے رہے۔ مسلمان بادشاہوں نے بھی اسی قسم کی روش اختیار کی تھی۔ اور اولین مسلم حملہ آوروں کے حملوں کے دوران میں نالندا[2] اور اودنت پوری کے بیش بہا علمی خزانے برباد ہو گئے۔ غرض پردیسی حملہ آوروں کے حملوں میں ہندوستان کا بہت سا تاریخی مسالہ برباد ہو گیا۔

دُنیا

از جناب طالب چکوالی بی اے ایل ایل بی

حُسن کی کائنات ہے دنیا ... کس طرح بے ثبات ہے دنیا!
مُردہ دل کو سرائے فانی ہے ... زندہ دل کو حیات ہے دنیا
خواب ہے یا شباب کیفِ شراب ... ایک شیشے کی بات ہے دنیا
مٹ کے ملتا ہے لطف ہستی کا ... اک اچنبھے کی بات ہے دنیا
بوالہوس اس کے در کا کتا ہے ... اس کا مذہب ہے ذات ہے دنیا
اس کی دنیا ہے زن، زمین و زر ... فکر کی شش جہات ہے دنیا
اس کے ہو کر رہو کہ ترک کرو ... دونوں چالوں سے مات ہے دنیا!

یہ ہے طالب مقامِ راحت کا
حجرِ ہستی میں رات ہے دنیا

---

[1] ... ہسٹری آف انڈیا۔ جرنل ... سوسائٹی ... جلد ...

[2] نالندا ... صوبہ بہار۔ دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی۔ جہاں افغانستان، بلخ، بخارا، ترکستان، تبت، چین، ہند چینی، برما، سماترا، جاوا اور لنکا کے طلبا آتے تھے اور جن کا شمار دس ہزار تھا۔ تیسری صدی میں اس کی بنیاد پڑی تھی ... صدی میں ... ہو گیا ... مسلم حملوں کے دوران تباہ ہوئی ... (۱۰۵)

جذباتِ فراق

(پروفیسر رگھوپت سہائے فراق ایم - اے)

مٹ کے میں نے تجھ کو عالم میں نمایاں کر دیا
زندگی کی شمع گل کر کے چراغاں کر دیا

حسن کے جلووں کو وقفِ سوزِ پنہاں کر دیا
وصل کی کیفیتوں کو دردِ ہجراں کر دیا

دل کے اجزائے پریشاں مٹ کے ویرانے بنے
میں نے ان ذرّوں کو گم کر کے بیاباں کر دیا

قرب و دوری دے دیئے اہلِ ہوس کے واسطے
عاشقی کو بے نیازِ وصل و ہجراں کر دیا

عاشقی کو الجھنیں درکار تھیں کچھ - یہ نہ پوچھ
اب گریباں کر دیا اُن کو کہ داماں کر دیا

کنجِ زنداں کو جنوں نے وسعتیں صحرا کی دیں
ہوش کے صدقے کہ صحرا کو بھی زنداں کر دیا

شوخیوں نے چھیڑ کر حسنِ حیا پرور کو بھی
سر بسر موجِ تبسم ہائے پنہاں کر دیا

کون جانے عقدۂ ہستی نگاہِ مست نے
اور مشکل کر دیا یا اور آساں کر دیا

حسن خود افزوں نگاہِ شوق کی حیرانیاں
یوں ہی کیا کم تھیں کہ تو نے اور حیراں کر دیا

جن سے چشمِ مست کچھ خود بھی نہ واقف ہو سکی
ان نگاہوں کو بھی پیوستِ رگِ جاں کر دیا!!

وائے اے دستِ جنوں شائستگیٔ چاک کو
صرف داماں کر دیا وقفِ گریباں کر دیا

عشق کی تھی زندگی بس اک نگاہِ آشنا
اس کو بھی نذرِ تغافل ہائے پنہاں کر دیا

عشق پر وہ ہر طرح کا زعم و دعویٰ کیا ہوا
جس نے ہر اک جور کو جورِ پشیماں کر دیا

رنگ و بوئے الگلام پر کچھ اس کا درد بھی
جس تبسم نے گلستاں کو گلستاں کر دیا

عشق کو آیا ہے دینے حسن درسِ نیستی
بارہا شیرازۂ ہستی پریشاں کر دیا

تیرگیٔ یاس میں گم ہو کے دل نے بھی فراق
دہر کو دودِ چراغِ شامِ ہجراں کر دیا

جذباتِ فراق

اپنے حواس میں شبِ غم کب حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

دورِ فلک کہاں ہے یہ دورِ حیات ہے
حیرت سرائے عشق میں دن ہے نہ رات ہے

جینا جو آگیا۔ تو اجل بھی حیات ہے
اور یوں تو عمرِ خضر بھی کیا۔ بے ثبات ہے

کیوں انتہائے ہوش کو کہتے ہیں بیخودی
خورشید ہی کی آخری منزل تو رات ہے

گردوں شرارِ برقِ دلِ بے قرار دیکھ
جن سے یہ تری تاروں بھری رات رات ہے

آخر خیالِ عیش و سکوں چھوڑنا پڑا
ہے دل جو ڈال ڈال تو غم پات پات ہے

ہستی کو جس نے زلزلہ ساماں بنا دیا
وہ دل قرار پائے مقدر کی بات ہے

ٹوٹے فریبِ بیخودی و ہوش۔ مرحبا
اب دونوں غفلتوں سے مرا حیات ہے

یہ موشگافیاں ہیں گراں طبعِ عشق پر
کس کو دماغ کاوشِ ذات و صفات ہے

عنوان غفلتوں کے ہیں۔ فرقت ہو یا وصال
بس فرصتِ حیات فراقؔ ایک رات ہے

چچا کی یاد

از منشی حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی

سحرؔ مشکل سے ملے گا آدمی
فی زمانہ منشی شیو پرشاد سا

واہ قدرت سے ملا تھا کیا مزاج
تھے کئی اوصاف جس میں بر ملا

آپ کے سینہ میں بیشک تھا وہ دل
درد تھا جس میں سراپا قوم کا

ہر ضرورتمند کے امداد کو
ہر طرح تیار رہتے تھے سدا

وہ محبت جس کی کوئی حد نہ تھی
وہ مروت تھی نہ جس کی انتہا

آپ کی نیکی تھی ہر کس کے لئے
آپ کا جو خلق تھا وہ عام تھا

وہ بزرگانہ روش تھی جس سے سب
تھے عموماً آپ کو کہتے چچا

یاد سے تا نہ رہے گا عمر بھر
موت کا اس وقت ہے جو حادثا

مٹ گیا تو صفحۂ ہستی سے آہ!
اے نشانِ لطف و اخلاق و سخا!

[illegible]

راہِ نجات

ایک قصہ

از ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ

مادھو کی ماں کب مری، یہ اُس کو نہیں معلوم لیکن اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا کبھی پیٹ بھر کھانے کو آسانی سے نہیں ملا۔ غریبی نے اُس کی سوتیلی ماں کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اُس کا لڑکپن اور اُس کی شرارت آمیز شوخیاں تو ماں کے آتشیں مزاج کو بھڑکانے کے لئے کافی تھیں۔ وہ شہر کی رہنے والی تھی اور ابھی ناز برداری کی مستحق تھی۔ ایسی صورت میں اُس کا چیں بجبیں ہونا یا سختی سے پیش آنا قدرتی تھا۔ نہ گھر میں کسی کو مادھو کو ٹھیک وقت پر کھلانے کی پرواہ تھی اور نہ اُسے کھیلنے سے فرصت ہی ملتی تھی۔ جب جی میں آتا، کھانا کھانے بیٹھ جاتا۔ کبھی وقت سے دو گھنٹے پہلے اور کبھی چار گھنٹے بعد۔ پہلے تو اکثر جواب ملتا "اس وقت کیا دھرا ہے۔ ابھی ساگ پکتا ہے چلو۔" گھڑی بھر میں آنا۔ مادھو پہلے تو اُٹھتا ہی مشکل سے، لیکن اگر جاتا تو پھر گھنٹے دو گھنٹے تو کیا دن دن بھر غائب رہتا۔ شام کو آتا تو بھبکیوں کی پروا کئے بغیر تھالی لیکر کھانے بیٹھ جاتا اور خوب کھاتا۔ کھانا کم پڑتا تو اتنا شور مچاتا کہ پڑوسی دوڑ آتے۔ کبھی چوکے میں گُھسنے کی دھمکی دیتا۔ کبھی بغیر شور و غل مچائے کسی پڑوسی ہی کے گھر کھا لیتا۔ ماں کی نگاہ میں غیر جگہ بلا بلائے کھانا قابلِ سرزنش تھا۔ لیکن ضدی مادھو اس حرکت سے باز نہ آتا تھا۔ دشمن کو تکلیف دینا سکونِ قلب اور تسکینِ دل کا آسان ذریعہ ہے۔

بارہ برس کی عمر میں ماں کی پُر زور مخالفت کے باوجود مادھو اسکول بھیجا گیا۔ پڑھنے لکھنے میں تو اُس کا جی بالکل لگتا نہ تھا لیکن ماں کی مخالفت دیکھ کر وہ مدرسے کی چار دیواری میں قید ہونے کے لئے راضی ہو گیا۔ مگر غریبوں کی قسمت میں علم کہاں۔ کبھی کتاب نہ ہونے کی شکایت۔ کبھی فیس نہ پہونچنے کا جھنجھٹ۔ ماسٹروں کی فرمائشات اور گھر کی پریشانیاں علیحدہ۔ پہلے تو مادھو کا باپ کتابیں وغیرہ گاؤں کے لڑکوں سے جو مادھو سے ایک سال آگے تھے مانگ لایا تھا لیکن دوسرے ہی سال کورس کی کتابیں بالکل بدل گئیں۔ مگر جب مادھو نے باپ کے سامنے یہ عذر پیش کیا تو وہ اُسے لڑکے کا بہانہ سمجھا اور پنڈت جی کے پاس جا کر فریاد کی۔ پنڈت جی نے کورس کے تبدیلی کے متعلق بورڈ کے ممبروں کی پالیسی۔ پبلشران اور مؤلفوں کی خدائی خصوصیت وغیرہ پر ایک مفصل لیکچر دیا لیکن باپ نے یہی سمجھا کہ یہ تمام بلائیں "پاس کرائی" نہ پہونچے

کا نتیجہ تھیں۔ فیس کی شکایت بجا تھی لیکن اس کے نزدیک اس پر زیادہ زور اس لئے دیا جاتا تھا کہ ماسٹر صاحب کے پاس بیٹھے رہنے کے بجائے وقت بے وقت پہنچتے تھے اور اس حد تک کبھی کبھی ناغہ ہو جاتا۔ چار و ناچار ادھر کو گھر بیٹھنا پڑا۔ وہ پھر خوش خوش نظر آنے لگا۔ ابھی تک گلی ڈنڈا اور گلی کھیلنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا اب اس میں آوارگی کا بھی اضافہ ہوا۔ اور وہ اکثر رات کو بھی غائب رہنے لگا۔

یہ حالت دیکھ کر باپ کو شادی کی فکر ہوئی۔ متوسط طبقے میں گیارہ بارہ برس کے لڑکوں کا غیر شادی شدہ رہنا خاندانی نقص اور ناداری کا کھلا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ مگر ایسی حالت میں جب تک کہ لڑکا خود کمانے کھلانے کے لائق نہ ہو جائے اس پر خانگی دباؤ ڈالنا کتنا خطرناک ہے۔ ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں سوسائٹی غریب اور غلام بچے پیدا کرنے پر لوگوں کو مجبور کرتی ہے۔

(۲)

غریب کسان قرض سے کوسوں دور بھاگتا ہے کیونکہ مہاجن کا آخری حملہ اس کے کھیتوں پر ہوتا ہے۔ انہیں کھیتوں پر جس کی آمدنی سے وہ اپنے کنبہ کی پرورش کرتا ہے۔ سیکڑوں بھیک منگوں کی جھولی بھرتا ہے اور سرکاری حملوں کی مٹھی گرم کرتا ہے انہیں کھیتوں کا اناج پنڈت جی کو کتھا پران سنانے پر آمادہ کر کے اُسے جنت کے خواب بھی دکھاتا ہے۔ مگر افسوس۔ دنیا بھر کی پرورش کرنے والا کسان قرض لینے پر مجبور ہے اس کا ایثار اس کی چھوٹی موٹی بے ایمانیوں پر آسانی سے پردہ ڈال سکتا ہے اور وہ خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اس کو یہ منظور نہیں۔ اس کا دل صاف و سادہ ہے۔ گندے کاغذ پر روشنائی کی ایک آدھ چھینٹ چنداں بد نما نہیں معلوم ہوتی لیکن سادہ ورق پر دھبہ بھی پڑ جائے تو آنکھوں میں بہت کھٹکتا ہے کسان بھی جانتا ہے کہ ایک ہی لغزش میں اس کے سارے اوصاف مٹی میں مل جائیں گے۔ بس موقع پر اُسے روپیہ ملنا چاہئے۔ وہ زیادہ سود سے بھی نہیں بھاگتا۔ اس کا لڑکا بیمار ہے اُسے پندرہ روپیہ دے دیجئے چاہے پرونوٹ پر پندرہ کے بجائے پچیس روپے لکھا لیجئے۔ سود کے علاوہ دعائیں مفت میں لیجئے۔ بموقعہ مدد دینے کا احسان الگ۔ گنا، مٹر، چنے کی فصل میں چاہے اس کے لڑکے ترسیں اور ان چیزوں کے لئے ٹکر ٹکر تاکیں لیکن وہ تم کو فصل کے شروع ہی میں مٹکا بھر رس اور مٹر کی پھلیاں ضرور پہنچا دے گا۔ تم سے اتنا بھی نہ ہوگا کہ ہمدردی سے اس کے ہاتھ پر دو ایک پیسے رکھ دو۔ وہ بڑی بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ان چیزوں کا کوئی معاوضہ لینا گناہ سمجھتا تھا لیکن اب وہ اپنی غریبی سے مجبور ہے تاہم وہ اپنی احسانمندی کا ثبوت ضرور دیگا۔ حالانکہ انہیں چیزوں کو بازار میں فروخت

[illegible] ۔ وہ ان کی عادت نہ بگاڑ سکا۔ وہ نہیں چاہتا
کہ اس کے لڑکے بھی تماری طرح بچپن سے ہی کام چور ہو جائیں اور دوسروں پر منحصر رہیں۔ اسے معلوم ہے
کہ شروع سے ایسا ہونے کے بعد وہ کام ہی کی عادت کو برا دخل ہے۔

سوا سو روپیہ خرچ ہو گیا۔ مادھو کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ سوتیلی ماں کے دل میں بھی
پیار ہوا۔ اب تک رتنی کا دل پتھر تھا لیکن خدمت نے سخت پتھروں کو توڑ کر صاف اور شیریں پانی کا
چشمہ پیدا کیا۔ وہ مادھو کے ساتھ شفقت سے پیش آنے لگی۔ نئی بہو اپنی خدمت کی بدولت ماں کے
گلے کا ہار بن گئی۔ پیر دبانا۔ سر میں تیل ڈالنا۔ برتن مانجنا۔ روٹی بنانا۔ یہاں تک کہ گھر کے کل کام کو
اس نے سنبھال لیا۔ اب رتنی گھر کے کام کاج سے استغنا دیکر حاکم کی طرح صرف حکم دیتی تھی۔
کام کرنے والا کوئی دوسرا ہی تھا۔ نئی بہو خانگی معاملات میں اس سے مشورہ ضرور کر لیا کرتی تھی مگر محض
اپنی سعادتمندی کا سکہ جمانے کے لئے ورنہ وہ رتنی سے زیادہ عقلمند اور ہوشیار واقع ہوئی تھی۔

مادھو گلی ڈنڈا بھول گیا۔ اگر اسے کھیلنا ہوتا تو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ دل بہلا لیتا تھا۔ ماں
جاتے دنوں سے اس کے پیچھے پڑی تھی اب شفقت سے پیش آنے لگی۔ اب پانی پیتے وقت مادھو
کو بغیر مانگے ہی گڑ مل جاتا تھا۔ کھیلنے کے لئے بھی اس سے اصرار کیا جاتا تھا لیکن اب اس کی طبیعت
ہی اس طرف مائل نہ ہوتی تھی۔ وہ روز ڈھور چرانے جاتا اور رات سے دو گھنٹے پہلے لوٹ
آتا تھا پھر رات کے چارے کا انتظام کر کے دودھ دوہتا۔ اس سے فراغت پاتا تو بچے کو لیکر گھنٹے آدھ
گھنٹے ٹہلاتا تھا۔

(۳)

ناگ پنچمی کا مبارک تیوہار تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رتنی ایک ٹوکری میں دہی کا مٹکا۔
تھوڑا سا گھی اور ایک کٹھل رکھ کر گوددی ساہو کے گھر پہنچا۔ گوددی ٹاٹ پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا
تھا۔ سامنے دو چار حاجتمند اپنی اپنی سنا رہے تھے۔ رتنی کو آتا دیکھ کر پیش بندی کے طور پر بولا اس
خیال سے کہ تقاضہ کر دینے پر اس سوغات کا کوئی صلہ دینا نہ پڑے گا بولا۔ "ارے بھائی رتنی بڑا
برا حال ہے۔ اور دس آدمی دروازے سے لوٹ جاتے ہیں۔ اب تو سال بھی ختم ہو گیا!"

گھورو پاسی جس کو کلکتہ جانے کے لئے کرایہ کی ضرورت تھی بولا "ہاں مہتو۔ سب کیا
ہوا گیا سمجھو۔ ساہو کے گھر میں کوئی پیڑ لگا ہے کہ سب کو دیں جب ایک سے ملے تب
دوسرے کو دیں!"

رمی نے کہا: "ان کو دو بیا جائے اُڑا کا ہے گھر کا کوئی بھی ہو؟"
گوبری ساہو کو روپیوں کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ وہ گھر تو کو روپیہ دینا چاہتا تھا جس سے اسے سیکھنے کی ضرورت تھی کیونکہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ مہاجن کو قرض وصول کرنے کی جلدی تھی مگر وہ بھلا اتنی سود بڑھائے گی۔ وہ صبر کرنے والے قصاب کی طرح شکار کو موٹا کر کے ذبح کرتا ہے۔

گوبری ساہو نے رمی کا شکار دیکھتے ہوئے کہا۔ "کتنے دن کا ہے؟"

رمی نے غرور سے سر اونچا کر کے کہا۔ "تازہ ہے ساہو آجکل چھوکرا سوا کرت ہے تین چار سیر دودھ ہو جاتا ہے۔"

ساہو کا لڑکا بیٹھا تھا ٹوکری اٹھا لے گیا تھوڑی دیر میں ہانپتا ہوا آیا۔ اور ٹوکری پٹک کر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولا: "واہ! بتا ہیں لے آئے۔" اسے اندیشہ تھا کہ کہیں رمی باہر چلا گیا ہو۔ اسی لئے وہ اسقدر تیزی سے دوڑتا آیا تھا۔

رمی نے سمجھا تحفہ قبول نہ ہوا تو لیکن ناک بھوں چڑھانے نئی فرمائش نہ ہوتی۔ کہا اچھا بیٹا کل لے آؤں گا۔ مگر وہ چلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ دوسرا لڑکا آیا اور گوبری کی طرف دیکھ کر بولا: "بابو چاکسل۔"

رمی نے کہا۔ "اچھا بچا۔ کمبل بھی آ جائے گا۔"

(۴)

رمی سر پر ٹوکری رکھے چلا جا رہا تھا کہ راستے میں گوبری مل گیا۔ رام رام۔ کے بعد ساہو نے پوچھا۔ "کہاں کی تیاری ہے بھتو؟"

رمی نے ٹوکری دکھاتے ہوئے کہا۔ "ساہو جی۔ کل کا تقاضا تھا۔ سو لایا ہوں۔"

گوبری نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک گائے چاہیئے۔ چھوٹی سی کہ چارہ کم کھائے اور دودھ زیادہ دے۔"

"گائے تو گھر ہی میں ہے ساہو۔"

"یہی تو میں سوچ رہا تھا لیکن ذرا لحاظ معلوم ہوتا تھا۔"

"تو پھر چل کے دیکھ لو۔"

"سب دیکھا بھالا ہے۔"

"دام۔ کام۔"

"دام.... دیکھا جائے گا۔ ابھی تو ہمارا ہی حساب ہے۔"

"تو ہم کب تک بے حساب کرکے اپنی رقم سے کاٹ لو اور بتائے دو۔"

گوبری کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ رمئی اتنا ہوشیار ہوگا۔ خیال تھا کہ اچھی سی گائے سودے میں مار لاؤں گا۔ جھینپ کر بولا۔ "ہاں ہاں۔ جب چاہو حساب کرلو۔ ہم ہفتہ تم سے ہی مانگتے ہیں۔ اتنے دن ہوگئے میں نے تو کبھی تقاضہ بھی نہیں کیا۔ اور ہم حساب جب چلاتے ہو حساب کرلو۔ سوا سو کا پُرنوٹ بارہ مہینے سے اوپر ہوگیا۔"

گوبری نے حساب لگا کر کہا۔ "دیکھو ہمارے ایک سو ساٹھ سے زیادہ ہوتے ہیں۔"

برہمن کا پترا اور مہاجن کا بہی کھاتہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ ابھی تک اس کی اتنی ہی قدر ہے جیسی سیکڑوں برس پہلے تھی۔ رمئی نے کہا "اچھا سا ہو گائے لے لو تو سو روپیہ اور باقی سہی۔"

"تو کیا گائے کے ساٹھ روپیہ لوگے"

"بڑی سیدھی جنس ہے یہ تو ہونی ساہو جب چاہو تین ساڑھے تین سیر دودھ دوہ کے دیکھا"

"بھائی ہم تو پچیس ہی لیں گے۔ آخر بیوپار کس لئے کیا ضرورت پر کام نہ آؤ تو سہی۔ کچھ ہرج نہیں۔ گائیں تو بہت ہیں۔ مگر چاہتا تھا کہ آخر روپیہ دینا ہی ہے تمہیں سے لے لوں۔ اچھا روپے کا نشہ کر دیا۔ ایسا نہ ہو کہ برائی ہو۔ میں دعویٰ نہیں کرنا چاہتا۔" گوبری نے سونٹا اٹھاتے ہوئے کہا۔

رمئی گوبری کے باپ کے وقت سے ہی دودھ گھی کتھل وغیرہ پہونچایا کرتا تھا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ ساہو ہم نے بھی یہی سمجھ کر راہ و رسم بڑھائی تھی کہ وقت پر ہمارے کام آؤ۔ لیکن کسان احسان جتانا گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس سے چھچھلی اور کیا بات ہوگی کہ کسی کو کھلا کر اس کا ذکر کرے۔ دعوے کی دھمکی سن کر رمئی نے کہا۔ "اچھا پھر لیتے جاؤ۔"

رمئی نے گائے دے دی۔ ساٹھ ستر کا مال پچیس روپیہ پر کسان اپنا مال اچھی قیمت پر کبھی نہیں فروخت کرسکتا۔ وہ ہر حالت میں مجبور اور مہاجن مختار ہے۔ مہاجن چاہے تو کسان کو بغیر پانی مار سکے۔ گائے بکتے ہی مادھو پر پھر پھٹکار پڑنے لگی۔ سوتیلی ماں برہم ہوگئی۔ مادھو کی عمر گھر بیٹھنے لائق نہ تھی۔ جب سے بیاہ آئی تھی وہ مادھو اور اپنے بچے کے درمیان کوئی خاص فرق نہ سمجھتی تھی مگر اب مادھو پھر غیر ہو گیا۔ وہ نالائق تھا۔ ماں کا منشا یہ تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لئے پردیس چلا جائے لیکن وہ کھل کر کچھ نہ سکتی تھی۔ وہ خود جلتی تھی اور مادھو کو جلانا پسند کرتی تھی۔ ×

جس دن گوبری نے گائے لی اس کے چھبیسویں دن مادھو گھر سے غائب ہوگیا۔ حالانکہ

تھے جی کے سکے جتنے روپے اس سال کے کچھ کم فاقہ ہے تھے۔ گھر میں فاقے کی نوبت آ گئی لیکن رجنی چپ تھی کیونکہ کچھ بھی نہیں پایا ہوا تو اس کی رات سے

(۵)

مادھو پانچ برس کے بعد کما کر لوٹا۔ رجنی اس کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی خدا کے گھر سے آ گیا ہو یا آسمان کا کوئی فرشتہ آئے قرض سے نجات دلانے کے لئے زمین پر آ گیا ہو۔ لڑکا بھی کمانے کی کتھا سنا رہا تھا کہ کس طرح اس نے پردیس میں گائے مول لی اس کا دودھ بیچ کر پیسے بچائے اور گائے بھینس لے کر اپنا روزگار بڑھایا۔ دوران گفتگو میں اس نے گوردی ساہو کا نام کئی مرتبہ دُہرایا۔

رجنی سن رہی تھی اس نے دھیرے سے مادھو کو بلایا۔ وہ کئی مہینے سے بیمار تھی۔ اٹھنے کی سکت نہ تھی مادھو اندر جا کر چارپائی کے قریب ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔

رجنی نے کہا۔ "بیٹا میں تو کئی مہینے سے بیمار ہوں۔ بچنے کی کوئی امید نہیں اور نہ زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ بہو دیکھ لی۔ لڑکا کھلا لیا۔ اب کیا چاہیئے۔ تمہارے سامنے مرجاتی تو گت بن جاتی۔"

مادھو نے آنسو روکتے ہوئے ماں کو دیکھا۔ اتنے میں رجنی کا لڑکا ہرکھو آ گیا۔

رجنی نے سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا بچپن ہی سے میں نے بڑا مزاج دکھایا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ تم میری زندگی میں کچھ کرنے لائق ہو جاؤ سو وہ بات آج پوری ہو گئی۔ میں ہرکھو کو تم سے زیادہ پیار کرتی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم غیر ہو۔ ماں ہمیشہ چھوٹے بچے کو جو مجبور ہوتا ہے زیادہ پیار کرتی ہے لیکن میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ سختی کی ہے تم بھی ہرکھو کو مار پیٹ کر اپنی طرح بنا لو۔ باپ دادا کی کمائی بیچ کر کھانا حرام ہے۔"

رجنی نے ہرکھو کو بھاگنے والی ترقی لینے کے لئے بھیجا تھا جب وہ نہ لوٹا تو کھانستا ہوا وہ خود رجنی کے پاس آیا۔ رجنی نے کہا "آؤ بیٹھو میں تم سے آج ایک بات کہتی ہوں بولو مانو گے۔"

رجنی "کہو" کیا بات ہے۔

" دیکھو اب مادھو گھر کا مالک ہوگا۔"

" بس کہ اور کچھ۔"

بڈھوں کو گھر کے کاموں سے استعفا دیتے ہوئے بڑا رنج ہوتا ہے وہ بھی چاہتے ہیں کہ کام چاہے جو کرے لیکن مالک کا فرضی خطاب انھیں کو دیا جائے۔ رجنی اٹھ کر جانا چاہتا تھا کہ رجنی نے ٹھنک کر کہا۔ "کیا کہا چاہتا ہے۔" رجنی رجنی کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا کہا۔ "اچھا بھئی تم تو

(۶)

مادھو منی کے پاس سے اٹھا تو سیدھا گودری کے پاس پہونچا اور کہا کہ میں بھوپ سنگھ کے پاس چلتا ہوں تم بھی بہی کھاتہ لے کر آؤ اپنا روپیہ لیجاؤ۔"

گودری حیرت میں آگیا کاغذ نکالا صرف ایک سادے ورق پر ٹکٹ اور انگوٹھے کا نشان لگا تھا نہ تاریخ درج تھی نہ رقم کا ذکر تھا۔ بھوپ سنگھ کا نام سنکر ڈر گیا اور کاغذات الٹنے پلٹنے لگا۔

بھوپ سنگھ گاؤں کے مکھیا تھے اکثر غرضمندوں کو مال دیا کرتے تھے لیکن مادھو کے ہاتھ میں نیا چھاتا دیکھکر دوہری سے بولے "آؤ چیلا کب آیا۔ لا کچھ لایا ہے چھاتا تو بڑا اچھا ہے۔ لا ہمی سہی۔"

مادھو "آج سویرے" "آپ گودری مہاجن کا حساب طے کرا دیں۔"

"ابھی چل دھوپ تو ہے لیکن (مادھو کا چھاتا لیتے ہوئے) کچھ حرج نہیں۔"

گودری ابھی پس و پیش میں پڑا تھا کہ بھوپ سنگھ آگئے اور پرو نوٹ طلب کیا۔ ساہو نے پرونوٹ دکھلانے میں آنا کانی کیا۔ لیکن ٹھاکر نے ڈانٹ بتا کر لے ہی لیا۔ سادہ کاغذ دیکھکر انہوں نے ہنستے ہوئے کہا "او ہو لالہ یہ جعل! گواہ کون بنے گا۔ کتنے روپے ہیں۔ دیکھا! مادھو۔ لوگ زمیندار سے چھپا کر کاغذ لکھاتے ہیں کہ دو چار روپیہ دینا نہ پڑے۔ تمہیں بتاؤ زمیندار دو چار روپیہ لیکر کتنا بڑا کام کرتا۔"

"سوا سو روپیہ ہیں صاحب آج سات سال ہو گئے۔"

"تو دعویٰ کیوں نہیں کیا۔"

گودری نے کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو چپ تھا غصہ کے مارے اس کے منھ سے بات نہ نکلتی تھی۔

بھوپ سنگھ۔ "کچھ ملا بھی ہے"

گودری "پینتیس روپیہ میں ایک گائے ملی تھی"

ٹھاکر نے پہچے پر حساب لگاتے ہوئے مادھو سے کہا "لاؤ روپیہ لائے ہو نوّے روپیہ اور دو۔"

مادھو نے رقم گن دی اور ٹھاکر نے اٹھا کر اپنی دھوتی میں باندھ لی۔ گودری نے دہائی دی تو مادھو نے اس کی طرفداری کی مگر ٹھاکر جھلا گئے اور ایک پائی نہ دی جعلی کاغذ دکھلاتے ہوئے انہوں نے کہا "دیکھو اگر روپیہ دینا چاہتے ہو تو میں یہ کاغذ گودری کو دے دوں وہ اب بھی تم سے نوّے کا کئی گنا وصول کر سکتا ہے۔ اور نہیں تو گودری ہو تو تم کو عدالت چلنا منظور ہے۔"

گودری نے نحیف آواز میں کہا نہیں صاحب ہماری عدالت آپ ہی ہیں۔"

بھوپ سنگھ نے کاغذ پھاڑتے ہوئے کہا "کرار دیکھا تم نے؟ حق ملنے کے بعد میں کاغذ ... پھاڑ دیتا ہوں۔ پھر تو عدالت سے بھی مقدمہ خارج ہو جاتا ہے" ...

(۶)

رمیش ہرگنی ... مادھو گھر کا مالک ہے پیداوٹ والے واقعہ سے وہ سخت متاثر ہوا۔ وہ جاہل ان ناخواندہ ہونا گناہ کبیرہ سمجھتا ہے۔ اس لئے اس نے خود بھی تھوڑا بہت پڑھ لیا ہے۔ اور پٹواری کے کاغذات دیکھ سکتا ہے۔ اب اس میں اتنی ہمت ہو گئی ہے کہ زمیندار کو مالگذاری دینے کے بعد اس سے رسید کے لئے اصرار کرے۔

ہرکھو اسکول جاتا ہے اور شام کو گھر چلا آتا ہے۔ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔ جب ڈھونڈ ... روپیہ پیدا کرکے مادھو کے ہاتھ پر رکھ دے گا تو شادی ہو جائیگی۔

مادھو کے ایک لڑکی ہے۔ ہرکھو مدرسے سے پڑھ کر آتا ہے تو گھر پر اسے پڑھاتا ہے۔ گاؤں میں مادھو کی ایک دکان ہے جس میں آدھے کے حصے دار بھوپ سنگھ بھی ہیں۔ ان کے ڈر سے مادھو سے کوئی نہیں بولتا۔ گودری کا کام بگڑ رہا ہے کیونکہ مادھو بیوپار بھی کرتا ہے۔ لیکن غریبوں کو لوٹنے کے لئے نہیں بلکہ ان کی مدد کرنے کے لئے وہ روپیہ پڑا نہیں رہنے دیتا۔ وہ تقاضوں کا قائل ہے اور قرضداروں کے کان گرم کیا کرتا ہے۔ سود بڑھا کر جائداد نیلام کرانا اسے پسند نہیں۔

بھوپ سنگھ اس کے قانونی مشیر ہیں۔ جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی وہ انہیں سے جا کر پوچھتا ہے لیکن وہ ان سے کسی بات میں دبتا نہیں پھر بھی ان کو خوش رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

جذبات حسرت

مولانا حسرت موہانی کی یہ تازہ غزل ہے جو آپ نے مشاعرہ شملہ کے موقعہ پر کہی۔

اسی کا جلوہ ہر جانب عیاں ہے ۔۔۔ نمود حسن بے صورت کہاں ہے
ملی دل کو مراد نامرادی ۔۔۔ ترے غم کی بدولت شادماں ہے
فقیر بینوائے درگہ عشق ۔۔۔ امیر بے نیاز دو جہاں ہے
نکلتے ہائے کیونکر یاد ان کی ۔۔۔ جو دل پر محبت پاسباں ہے

نہ چھوڑی تم نے حسرت ...
تمنا پیر ہو کر بھی جواں ہے

شملہ سے الوداع

(از جناب پنڈت ہنسراج صاحب ترم جبری دہی)

الفراق اے بال شملہ کے نظارو الفراق — الفراق اے چرخ رفعت کوہسارو الفراق
الفراق اے رشکِ جنت سبزہ زارو الفراق — الفراق اے دوستو اے غمگسارو الفراق

چھوڑ کر اس کیف کی وادی کو اب جاتا ہوں میں
بخت لے جاتا ہے مجکو ورنہ کب جاتا ہوں میں

موسم سرما میں دیکھی برف باری کی جھڑی — بعد دیکھا اور دیکھی ژالہ باری بھی تری
موسم گرما میں ساری مال پھولوں سے بھری — گلرخوں کا اس جگہ جمگھٹ وہاں ٹولی کھڑی

کوئی مصروف تماشا کوئی محو انتظار
ہوش پر قابو کسے پہلو میں دل تھا بیقرار

بزم جم کی جام جم کی یاد ہے دنیا تری — فکر فردا سے بہت آزاد ہے دنیا تری
خوبی تہذیب نو ایجاد ہے دنیا تری — گلرخوں کے فیض سے آباد ہے دنیا تری

پھر رہے ہیں مال پر وہ کیف کی دنیا لئے
سب کے سب ساقی ہیں گویا ساغر و مینا لئے

ان کے پاس اک خنجرِ غدار کا جوڑا بھی ہے — ان کے پاس اک نرگس بیمار کا جوڑا بھی ہے
یعنی قدح بادۂ سرشار کا جوڑا بھی ہے — ان کے پاس اک جام زہر یار کا جوڑا بھی ہے

سیکڑوں ساماں ہیں ان کے پاس یوں کیا کیا نہیں
ہاں مگر جس کو وفا کہتے ہیں وہ اصلا نہیں

دیکھ لیں شملہ تری ہم نے بہاریں دیکھ لیں — نیلگوں بادل سے پانی کی پھواریں دیکھ لیں
سرمدی لئے شانی آبشاریں دیکھ لیں — گھاٹیوں میں چشموں اور سوتوں کی دھاریں دیکھ لیں

بعد بارش دھوپ بادل سب نرالے ہیں ترے
حسن و فطرت گلے میں باہیں ڈالے ہیں ترے

پک نک

ایک نقشہ

(از شریمتی کملا دیوی چودھری۔ مترجمہ از منشی کانتی پرشاد وما۔ بی۔ اے)

"برسات کا موسم۔ ابر کا دن اور اتوار کی تعطیل۔ ان تمام نعمتوں سے استفادہ حاصل نہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے:"

صبح آنکھ کھلتے ہی ستیش کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا اور اُس نے فوراً ہی پک نک کا پروگرام تیار کر لیا۔ پھر کیا تھا ایک سنٹ بھی دل پر قابو رکھنا اُس کے لئے دشوار ہو گیا برابر کے کمرے میں جا کر اُس نے سبودھ کے سر پر صراحی الٹ دی۔ "عجیب آدمی ہو۔ ارے ایسا اچھا دن سو کر برباد کر رہے ہو"

بیچارے سبودھ نے رات کے بارہ بجے تک کتابوں سے مغز پچی کیا تھا اور آج کے لئے اسے از سر نو تر و تازہ کرنیکا پروگرام بنایا تھا۔ کہ

(۱) صبح دس بجے تک خواب خرگوش میں مست رہے گا۔ اور پھر آنکھ کھلتے ہی گرم گرم چا کی ایک پیالی پئے گا۔

(۲) دس سے گیارہ بجے تک پلنگ ہی پر لیٹے ہوئے دالمین کے تار جھنجھنائے گا اور بیچ بیچ میں ستیش اور سدھیر سے گالی گلوج کے مراسم بھی پورے کرتا رہے گا۔ اس کے بعد گیارہ سے ساڑھے گیارہ بجے تک آدھی بالٹی اور ساڑھے گیارہ سے ساڑھے بارہ بجے تک گوڈ ریج سوپ رگڑ رگڑ کر غسل کریگا۔

(۳) ساڑھے بارہ سے دو بجے تک کا وقت بالوں میں تیل ڈالنے اور دماغ کو طاقت پہونچانا۔ کنگھے آئینے سے بال سنوارنے پومیڈ اور خوشبودار پاؤڈر سے افزائش حسن کی کوشش کرنے اور ولایتی لونڈے والی ترکیب دماغ کو تر و تازگی کی فکر کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ان سب باتوں سے فارغ ہو کر چند سے چہل قدمی کرنا۔ مالک مکان وکیل صاحب سے نمستے کہنا اور پھر کھانے کی میز پر آ۔ عرکی دال۔ آلو کی ترکاری اور روٹی کھانا تجویز کیا گیا تھا۔

اس کے بعد ڈھائی سے چار بجے تک سہ پہر تک تاش۔ کیرم وغیرہ کھیلنا۔ پھر ایک گھنٹہ انجن پالش۔ خوب کسرت وغیرہ سے لیس ہو کر گرجا گھر کی طرف گھومنے نکل جانا۔ اس کے بعد کسی سینما ہاؤس میں بیٹھ کر بزم عشق کی چال ڈھال کا تماشا دیکھ کے اپنی روحانی قوت کو بیدار کر کے اس پر لطف دن کو ختم کر دینے کا ارادہ تھا۔

ان خوبصورت لمحات کو ختم کرنے کے بعد پھر وہی کھانا۔ پڑھنا۔ کالج جانے کی فکر وغیرہ۔ ستیش لمحات بھی سہ ماہی تعطیل کر سارا پروگرام بگاڑ دیا۔

غصے سے جل کر ایک ہی سانس میں بہت سی گالیاں ختم کر کے سبودھ بولا۔ کون بیوقوف کہتا ہے کہ اتوار کے دن سونا وقت برباد کرنا ہے۔

ستیش مسکرا کر بولا۔ آپ سیدھی طرح سے بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہو جائیے۔ مجھکو اس کا وقت نہیں ہے۔ میں نے سونے سے بھی بڑھیا پروگرام بنایا ہے۔

تیسرے کمرے میں سدھیر لیٹا ہوا تھا۔ ان دونوں کی نوک جھونک سن کر اس سے بھی بستر پر پڑا نہ رہا گیا۔ فوراً موقعہ واردات پر پہونچ کر بولا۔ کیا معاملہ ہے یار۔

ستیش نے پکنک کے پروگرام کے ساتھ ہی ایک اور دلچسپ پروگرام بھی پیش کیا جس کو سنتے ہی سبودھ فوراً بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نیند پوری ہونے کا غم دور ہو گیا اور تینوں دوست پکنک کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔

(۲)

کالج ہوسٹل میں جگہ نہ ملنے کے سبب سے سدھیر، ستیش اور سبودھ ایک وکیل صاحب کے مکان کے ایک حصہ میں رہتے تھے۔ بیچارے وکیل صاحب سیدھے سادے اور نیک آدمی تھے۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی کالج چھوڑے ہوئے انہیں ابھی تھوڑے ہی دن ہونے تھے۔ پھر بھی نہ معلوم کیوں جوانی کا چلبلا پن ان کے مزاج سے رخصت ہو چکا تھا۔ ہر وقت متفکر رہتے تھے۔ گھر اور کچہری کے سوا دین دنیا سے کوئی تعلق رکھنا ان کے مذہب کے خلاف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کی شکل سے وہ خوف کھاتے ہیں۔ کوئی چھیڑ کر بات چیت کرنے لگے تو جواب دینا ہی پڑتا تھا ورنہ وہ خود کسی کو گفتگو کا موقعہ نہ دیتے تھے۔ اگر کوئی جان پہچان کا مل جاتا تو حتی الوسع اس سے آنکھ چرا کر بچ نکلتے۔ یوں مزاج کے اکھڑ نہ تھے۔ اور کسی سے بات چیت کرنے کی بلا میں پھنس جاتے تو اس سے خلق سے پیش آتے۔ اور ہمدردی و محبت سے بات چیت کرتے۔ مگر دوسروں سے ملنے جلنے میں منہ چرایا کرتے۔

اس چوکڑی کے لئے وکیل صاحب ایک عجیب چیز تھے۔ یہ کیسے آدمی ہیں۔ اس عمر میں اتنے بے کیف کیوں ہیں۔ ہر وقت متفکر بنے رہتے ہیں۔ ان سوالوں کے حل کرنے میں یہ لوگ اپنا دماغ کھپایا کرتے۔ کبھی کبھی اسی مضمون پر اچھا خاصہ مباحثہ چھڑ جاتا کوئی کہتا میاں بیوی میں نہیں بنتی ہے کوئی کہتا بالکل چغد ہیں۔ نہ ہنسنے کی کوئی وجہ بھی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ ان کی

چوہی کو " دیکھا نہیں سب بڑی بڑی ہستی مارا عظیم ہستی ہی ہے"

شاید آپ نے بھی اپنی عقل کا کرشمہ دکھایا ہے"

"یہ بھی ممکن ہے کہ کسی سے محبت کرتے ہوں اور والدین نے خلاف منشا شادی کر دی"

حفیظ نے کہا" ہو سکتا ہے۔ سعید تمہاری رائے صحیح معلوم پڑتی ہے"

میز پر زور سے ہاتھ مار کر سعود بولا" ہرگز نہیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ وکیل صاحب کے پاس دل ہی کب ہے جو کسی سے محبت کر سکیں۔

"تو بھائی فلاسفر ہوگا"

"اجی واہ۔ فلاسفر ہوتا تو قانون کی کتابوں سے مغز پچی کرنے جاتا۔ تم بھی نرے جانگلو ہو، اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ وہ آج فلاسفی کا پروفیسر بن جاتا"

"ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے"

"وہ کیا"

"کسی نجومی چکر میں پڑ کر یوگ ابھیاس کر رہا ہے"

"ممکن ہے"

"اسے یار کچھ بھی ہو کسی نہ کسی طرح اس راز کو دریافت کرنا چاہیئے لیکن وہ تو پیٹھ پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا۔ پاس جاتے ہی اڑیل گھوڑے کی طرح لاتیں جھاڑنے لگتا ہے"

تینوں دوست وکیل صاحب کے متعلق اسی قسم کی خوش گپیاں کر کے انکا مذاق اڑایا کرتے اور اس کے ساتھ ہی ان سے بے تکلفی بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے جاتے۔

وکیل صاحب کی خلوت پرستی میں ان کے آنے سے خلل پڑ گیا تھا۔ پہلے تو بیچارے بہت گھبرائے۔ کہ کہاں سے یہ بلا سر لے لی۔ کتنی ہی مرتبہ وہ اسقدر پریشان ہوئے کہ مکان خالی کرانے کی ٹھان لی لیکن پھر مروت نے گوارا نہ کیا۔

ان تینوں دوستوں نے صبح شام وکیل صاحب کے گھر کا چکر لگانا فرض کر لیا تھا۔ کسی نہ کسی بہانے روزانہ وکیل صاحب کو دیکھتے ہی رہتے تھے۔ انکا نوکر بیمار ہوا تو ڈاکٹر کے گھر جا کر دوا لانے کا کام تو زبردستی اپنے ذمے لے لیا۔ غرض اس طرح انہوں نے وکیل صاحب پر اپنا سکہ جما ہی لیا۔ وکیل صاحب بھی آخر پتھر کے تو تھے نہیں۔ آہستہ آہستہ بات چیت میں بے تکلف ہونے لگے لیکن پھر بھی وہ زیادہ گھلنا ملنا نہ چاہتے تھے۔

آئے وکیل صاحب غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر ناشتے کی فکر میں تھے کہ تینوں لڑکوں نے آکر گھیر لیا اور منت سماجت سے ان کو بھی پکنک کے لئے تیار ہی کر لیا۔ وکیل صاحب بیچارے کیا کرتے تعطیل کا دن تھا۔ کچھ بہانہ بن نہ پڑا۔ گھر میں جاکر بیوی سے بولے "لڑکے کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ مجھے اپنے ساتھ پکنک میں لیجانے کے لئے مصر ہو رہے ہیں"

"تو جاتے کیوں نہیں جاتے گھر میں بیٹھے بیٹھے تندرستی خراب کر رہے ہو۔ نہ معلوم تمہیں ہو کیا گیا ہے کہ کہیں جاتے آتے بھی نہیں۔ ایسی بھی کیا آخر انسان ہی ہے بھول ...."

فقرہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ وکیل صاحب نے بیوی کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ "لڑکے پاس ہی کمرے میں کھڑے ہیں سن لیں گے تو قیامت ڈھا دیں گے"

لیکن وہ دروازے ہی میں کان لگائے کھڑے تھے۔ باہر ہی سے بولے "شکریہ بھابی جی۔ وکیل صاحب کو تیار کر کے کھچڑی بنانے کا سامان بھی ساتھ کر دیجئے"

پھر ایک دوسرے کے کان میں کہنے لگے "یار کوئی بڑا اسرار ہے۔ بھول کا لفظ سنا"

(۳)

پکنک پارٹی گنگا کے کنارے ایک سنسان مقام پر پہنچی۔ نہانے کے بعد کھچڑی پکی آم لائے گئے اور سبھوں نے اصرار سے وکیل صاحب کو کھلایا۔ اب سوال اٹھا کہ کیا کیا جائے۔ کسی نے کہا ذرا سیر کی جائے کسی نے کہا تاش کھیلے جائیں۔ وکیل صاحب کو ان لوگوں نے اتنا زیادہ کھلا دیا تھا کہ ان کے لئے لیٹے رہنے کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر یہی طے ہوا کہ سب لوگ لیٹکر ہی گپ شپ کریں۔ اب دوسرا سوال یہ درپیش ہوا کہ گفتگو کا موضوع کیا ہو۔

ستیش بولا "وکیل صاحب آپ رومانیت کے مسئلے پر کچھ فرمائیے"

وکیل صاحب اس بات سے گھبرا اٹھے بولے "نا بھیا یہ بات میرے بس کی نہیں تم لوگوں نے میرے پیٹ میں اتنا ٹھونس دیا ہے کہ بولا تک نہیں جاتا تمہیں لوگ کچھ کہو"

"تو ہم لوگ یہ موضوع ہی گفتگو شروع کریں گے آپ کتائیں گے تو نہیں"

"بالکل نہیں میں بھی خوب لطف اٹھاؤں گا"

پھر کیا تھا دنیا بھر کی الم غلم باتیں ہونے لگیں برسات کا موسم تھا چاروں طرف گھٹا چھائی ہوئی تھی سامنے سے بہتی ہوئی گنگا کی دھارا آنکھوں کو شاداں کر رہی تھی۔ آم کی شاخوں سے کوئل کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ اس دلآویز منظر سے متاثر ہوکر سب لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ وکیل صاحب بھی ان لوگوں کی دلچسپ باتوں

[illegible] موضوع شروع ہو گیا اور گفتگو دھیرے دھیرے سے شروع ہوئی۔

ستیش بولا "وکیل صاحب آپ خدا پرست ہیں یا منکر۔"

وکیل صاحب کے کان کھڑے ہو گئے بات ٹالتے ہوئے بولے ان باتوں کو چھوڑو کوئی دوسرا مضمون شروع کرو۔ ہم لوگوں نے تاڑ لیا ہمیشہ وکیل صاحب اسی بات پر کنی کاٹتے ہیں آج اس کا فیصلہ ہو جائے۔

ستیہ دیو بولا "بھائی ہم تو خدا پرست ہیں اور سدھیر تم؟"

سدھیر کان پر ہاتھ رکھ کر بولا "ارے رام رام۔ میں تو ناستک کا لفظ سن کر ہی کان بند کر لیتا ہوں۔ میں پکا سناتنی ہوں۔"

ستیش کہنے لگا "میں تو بھائی رادھا سوامی ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ کیوں وکیل صاحب آپ کی کیا رائے ہے۔ رادھا سوامیوں نے ترقی تو بہت کی ہے۔"

سدھیر منہ پچکا کر بولا "ترقی۔ دنیاوی ترقی کی ہے۔ روحانی ترقی تو خود حاصل کی جاتی ہے سبھا سوسائٹی سے اس سے کیا واسطہ۔ ویسے تو خوبیاں سناتن دھرم میں ہیں اور کسی دھرم میں نہیں۔ کیوں وکیل صاحب آپ کی کیا رائے ہے۔"

وکیل صاحب کو یہ باتیں شروع ہی سے ناپسند تھیں ناک بھوں سکیڑتے ہوئے بولے "یہ تو بری بات۔"

وکیل صاحب اس مضمون پر ہمیشہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ لڑکوں کا شوق اس سے اور بھی ابھرتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وکیل صاحب کو اس مضمون کی گہری واقفیت ہے اور ہم لوگوں سے اس لئے کتراتے ہیں کہ ہم مذاق اڑائیں گے۔ ستیش نے اس مرتبہ حکمت سے کام لے کر کہا "وکیل صاحب آپ خاموش رہ کر ہمارا سارا مزا کرکرا کر دیتے ہیں۔ آپ اپنے خیالات کو آزادی سے بیان کیوں نہیں کرتے۔"

وکیل صاحب نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں ایسا تو نہیں ہے۔ میں خاموش کہاں ہوں۔ تم لوگوں کی باتوں کا مزہ لے رہا ہوں۔"

"تو پھر آپ کیوں نہیں بتاتے کہ سناتنی ہیں یا آریہ سماجی۔"

اس مرتبہ وکیل صاحب کچھ گھبرا کر بولے "بھیا معاف کرو میں اس مضمون پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیوں وکیل صاحب اس میں حرج کیا ہے۔"

"حرج کچھ نہیں لیکن مجھے ان باتوں میں لطف حاصل نہیں ہوتا۔"

"خیر جانے دیجیے لیکن آپ کی چال ڈھال سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی خاص مسئلہ [illegible] کے قائل ہیں"

اور ہم لوگ کچھ بھی نہیں سمجھے ہوئے تھے۔ آپکی حیثیت بالکل درویشانہ ہے۔ نہیں وکیل صاحب۔ آپ چھپا رہے ہیں ہم تو آپ سے در پردہ معرفت لئے بغیر نہ رہیں گے۔"

تینوں دوست وکیل صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔ "ہاں ضرور ضرور۔ آپ سے اتنا قرب حاصل ہوتے ہوئے بھی ہم لوگ تاریکی میں رہیں ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیئے:"

"تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ارے بھائی میں تو تمہارا جیسا ہی ایک معمولی آدمی ہوں ان باتوں کو کیا جانوں"

"نہیں وکیل صاحب۔ بہت ہو چکا۔ آپ ہم لوگوں کو ٹرخایئے نہیں۔ آپ کیا ہیں ہم خوب جانتے ہیں"

اب وکیل صاحب بہت متفکر ہوئے۔ کہیں یہ لوگ میرے بارے میں کچھ سن تو نہیں آئے ہیں جو اس طرح پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اپنا شک رفع کرنے کو آخر کار انہوں نے دریافت کیا۔ "اچھا تم لوگوں نے میرے بارے میں کیا کیا خیالات بنا رکھے ہیں:"

لڑکے تاڑ گئے کہ چور کی داڑھی میں تنکے والی بات ہے۔ بولے۔ "وکیل صاحب۔ آپ کے بارے میں مختلف خیالات ہیں۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کریں:"

وکیل صاحب نے اطمینان کی سانس لی کہ ان لوگوں کی قیاس آرائیاں ہی ہیں کچھ سنا نہیں ہے۔ بولے۔ "ناراضگی کی کیا بات ہے۔ کہو نہ:"

ستیش بولا "وکیل صاحب۔ آپکی پیراہانہ شکل و سیرت دیکھکر میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ یوگ ابھیاس کرتے ہیں اور عنقریب ہی آپ بیوی بچوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے اور پھر ہم لوگ پچھتائیں گے کہ ایسے عالم با عمل کی صحبت حاصل کر کے بھی ہم لوگ کندۂ ناتراشیدہ ہی رہے:"

سمیر بولا "میرا خیال کچھ اور ہے۔ آپ کو میں ایک پُر فطرت آدمی سمجھتا ہوں۔ آپ سب سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ کسی سے بات نہیں کرتے۔ مبادا کہیں آپکا کوئی راز افشانہ ہو جائے۔ اور کیا عجب ہے آپ کسی خفیہ سازش کے سرغنہ تو نہیں ہیں۔"

وکیل صاحب چونک پڑے۔ سٹپٹا کر بولے "رحم کرو۔ تم نے تو مجھے گرفتار ہی کرا دینے کی سوچ رکھی ہے۔ للہ کسی کے سامنے کچھ کہہ مت بیٹھنا:"

سبودھ بولا: "معاف کیجئے۔ آپ اپنے منہ سے نہ کہیں لیکن آپ سے کوئی زبردست گناہ ضرور سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں آپ ہمیشہ غمگین رہتے ہیں۔"

اب تو وکیل صاحب بہت بے چین ہو گئے۔ "للہ بخشو۔ تم لوگوں نے تو مجھے چکر میں ڈال دیا۔ آخر

میرے سامنے ہیں تمہارے ایسے خیالات کیوں ہیں۔ سچ کہتا ہوں سن بالوں میں بیٹھ کر تو بجز بھلائی کے کچھ نہیں ہوا

" تو پھر آپ اس طرح کیوں رہتے ہیں۔ ذرا زندگی میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کیجئے ہم لڑکوں نے

تہیہ کر لیا ہے کہ آپکی یہ پریشانی دور کر کے ہی دم لیں گے:

شیش کہنے لگا " وکیل صاحب آپ سوشلسٹ ہو جائیے:

" نہیں وکیل صاحب آپ رادھا سوامی بن جائیے:

" اور کچھ نہیں تو ہمارے کلب کے ممبر ہی ہو جائیے:

" ہی نام کرو نا۔ پھر تو ہم لوگ نہیں پکڑے ہی جائیں گے:

" بھائی نا میرے حال پر رحم کرو۔ سبھا سوسائٹی سماج ان چیزوں سے میں بہت گھبراتا ہوں:

" آخر گھبرانے کی وجہ:

" وجہ یہی کہ میں عہد کر چکا ہوں کہ کبھی کسی سبھا سوسائٹی کے چکر میں نہ پڑونگا اسی عہد کی وجہ سے تو ۱۹۴۲ء

کے جنگ آزادی میں حصہ نہ لے سکا:

اب کیا تھا۔ اتنی دیر بعد وکیل صاحب راہ پر آئے۔ لڑکے چیونٹوں کی مانند ان سے چپٹ گئے۔ باری

باری سے سب اسی سوال کو دہرانے لگے " بتائیے وکیل صاحب آپ نے ایسا عہد کیوں کیا تھا:

۴

آخر بیچارے وکیل صاحب اپنی رام کہانی سنانے کے لئے آمادہ ہو گئے لیکن ڈرتے تھے کہ کہیں یہ

لڑکے پھر بھی میرا مذاق نہ اڑائیں۔ ادھر لڑکوں نے ستیا گرہ کر رکھا تھا۔ سب بضد تھے کہ آپ کی داستان سنے

بغیر نہ ہم خود گھر کو جائیں گے نہ آپکو جانے دینگے۔ تینوں میں ایک بھی نرم نہ پڑتا تھا۔ اشاروں اشاروں میں

ایک دوسرے کو سمجھا چکے تھے کہ اس مرتبہ اگر شکار ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ وکیل صاحب کا

سانپ چھچھوندر کا سا حال تھا۔ آخر کوئی چارہ نہ دیکھ کر بولے " اچھا بھائی میری رام کہانی سنو لیکن وعدہ

کرو کہ سوائے تم تینوں کے اور کسی کو یہ حال معلوم نہ ہوگا۔ اور پھر تم لوگ بھی اس کا ذکر چھیڑ کر مجھے کبھی

شرمندہ نہ کرو گے:

لڑکوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔ سریندر بولا " میں اپنی ہونے والی بیوی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کسی

سے نہ کہوں گا۔

سدھیر بولا: میں ماں گنگا کی پتی کی قسم کھاتا ہوں۔ اپنی مادر وطن کی خاک پاک سے منہ کالا کر دیکھا جاؤنگا:

شیش کہنے لگا " میں تو رادھا سوامی ہونے والا ہوں۔ اسلئے رادھا سوامی دیال کی قسم کھا کر یقین دلاتا

کو تم سے عمر کی قسمیں کھلاؤ۔ جب سب نے شرط کی کہ ہم مذاق میں سدھیر بھائی کی اور اپنی بیوی کو سند دیکہ ہم فلسفہ چھوڑ آدمی ہیں۔

وکیل صاحب بگڑ اٹھے: تم لوگ تو ابھی مذاق اڑا رہے ہو۔ میں ایسا بدتمیز نہیں ہوں کبھی میں بھی کالج اسٹوڈنٹ رہا ہوں:

"لیجئے آپ یقین ہی نہیں کرتے۔ ہم لوگوں کی قسم کا بھی اعتبار نہیں پھر جس طرح کہئے ہم وعدہ کرنیکو تیار ہیں۔ سچ وکیل صاحب ہم (SERIOUSLY PROMISE) کرتے ہیں کہ کسی سے نہیں کہیں گے اور نہ کبھی اس کی آڑ میں آپکا مذاق اڑائیں گے۔ سبھی نے ایک زبان سے اس بات کو دہرایا۔ تب وکیل صاحب اداس طبیعت سے اپنی رام کہانی سنانے لگے۔

-زمانہ طالبعلمی میں مجھے بھی رفاہ عام کے کاموں سے دلچسپی تھی۔ اور سبھا سوسائٹی کا ممبر بن جانا فخر کی بات سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے روحانیت سے بھی شوق تھا۔ اُن دنوں آریہ سماج کا بڑا چرچا تھا۔ میرے اوپر بھی اس کا رنگ چڑھا۔ پہلے تو سماج کے جلسوں میں جانا شروع کیا کہیں سن لیا کہ کسی آریہ سماجی کی اسپیچ یا مباحثہ ہے تو کیسا ہی ضروری کام کیوں نہ ہوتا اس کو چھوڑ کر پہونچ جاتا۔ سندھیا ہون وغیرہ بھی روزانہ مشاغل میں داخل ہو گئے ستیارتھ پرکاش کا مطالعہ بھی روزانہ کرتا تھا۔

پہلے گھر میں سماجی نام پڑا۔ پھر دوستوں میں اسکے بعد تمام شہر میں کٹر آریہ سماجی مشہور ہوگیا۔ میں بھی اپنے کو اعلیٰ ہندو رشیوں کی اولاد کہلانے کے قابل بنانیکی دھن میں تھا۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ ویدوں کا حکم حرف بحرف بجا لاؤنگا۔ برہمچاری رہنے کا زمانہ خیر و خوبی سے گذار کر گرہست آشرم بان پرست اور آخر میں سنیاس کے فرائض بجالاؤنگا۔ غرض انہیں خیالات میں محو ہو کر ست جگ کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

انہیں دنوں میرے گھر میں ایک ہنگامہ ہوگیا۔ میری عدم واقفیت میں والدہ نے میری شادی پختہ کرلی تھی اور فریق ثانی سے وعدہ بھی کرلیا تھا۔ میں نے جب یہ سنا تو پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ خیر شرم کو بالائے طاق رکھ کر فرض پر ڈٹے رہنے کا عزم کیا۔ والدین کے اس فعل پر میری آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ نکلے۔ ہائے ایک وہ زمانہ تھا کہ والدین خود اپنی اولاد کو رشیوں کے گرکلوں میں بھیجا کرتے تھے اور آج وہ لوگ ہی انہیں اس کا عزم شکست کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

میرے یہ کہنے پر کہ کم سے کم پچیس سال تک برہمچاری رہنے کی بعد شادی کرونگا۔ والدہ صاحبہ نے رو رو کر کہرام مچا دیا۔ والد صاحب نے بھی کہہ دیا کہ میں اپنا قول نہیں توڑ سکتا۔ اُن کے یہاں سب تیاری ہوگئی ہے شادی اسی مدت میں کرنی ہوگی۔ اولاد کا فرض ہے کہ بزرگوں کے حکم کی تعمیل کرے۔"

[illegible] بہت مختصر ہو گیا۔ [illegible] لیکن جب نتیجہ کچھ نہ نکلا تو مسئلہ کو پریسیڈنٹ صاحب کے پاس [illegible] کرنے کے لئے ایک جلسہ طلب کیا گیا۔

سب ممبر حیران تھے کہ آخر کیا کیا جائے۔ بحث مباحثہ میں بہت وقت خرچ ہو گیا علما میں سرگرم مباحثہ چھڑا کئی دن ختم ہو گئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا وہی ڈھاک کے تین پات۔ بالآخر میری عقل رسا نے کام دیا۔ میں نے طے کر لیا کہ بزرگوں کا حکم سر آنکھوں پر شادی کئے لیتا ہوں لیکن پچیس سال کی عمر پوری ہونے تک اپنی بیوی کو بیوی نہ سمجھوں گا۔ اس طرح میرا عقیدہ بھی قائم رہے اور بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل بھی ہو جائے گی۔ اس فیصلہ کی دل کھول کر داد دی گئی اور میں اس وقت لوگوں کی نگاہوں میں ایک معزز ہستی بن گیا۔ تمام شہر مجھے برہمچاری جی کے نام سے پکارنے لگا۔ میں یہ خطاب سن کر خوش ہوتا تھا کہ اب تھوڑے ہی دنوں میں میرا شمار بڑے بڑے فضلا میں ہونے لگے گا۔ بہرحال جب کبھی برہمچریہ پر میری تقریر ہوتی تو لوگ سنتے کیونکہ سبھی یہ سمجھتے تھے کہ میں آپ بیتی کہہ رہا ہوں۔

اس طرح شادی کے بعد دو سال تو امن امان سے گزر گئے۔ ابھی مکلاوہ کی رسم نہ ہوئی تھی اور بیوی میکے ہی میں تھیں۔ میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ان کے آنے پر انہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا کھانے پینے رہنے سہنے غرض ہر بات میں اس کا خیال رکھتا تھا کہ کوئی بات برہمچریہ کے قواعد کے خلاف نہ ہونے پائے۔

غرض میں گیروے کپڑے پہننے لگا اور ہلکی غذا کھاتا زمین پر سوتا اور عورتوں سے دور رہتا وغیرہ وغیرہ برہمچریہ کی ہدایات پر کاربند رہنے لگا۔ راستے میں بھی اگر کوئی عورت سامنے آ جاتی تو میں آنکھ بند کر کے کھڑا ہو جاتا تھا۔ میرے دوست میرا مذاق اڑاتے لیکن میں کسی کی پرواہ نہ کرتا۔ اور لوگوں کی عقل پر رحم کھاتا کہ یہ لوگ برہمچریہ کی عظمت سے کیسے ناواقف ہیں۔

کالج کے راستے میں لڑکیوں کا اسکول پڑتا تھا میں جب اس کے پاس پہنچتا تو تیزی سے بائیسکل پر نکل جاتا اگر کبھی اتفاق سے کسی بھی صورت پر نظر پڑ جاتی یا کوئی سریلی آواز سنائی دیتی اور اس سے دل میں گدگدی ہو جاتی تو گھر آ کر مجھے تزکیہ نفس کے لئے گایتری وغیرہ کا پاٹ کرنا پڑتا۔

ایک مرتبہ مجھے سسرال جانا پڑا۔ وہاں پہنچتے ہی سالی سالیوں کی فوج کے ساتھ میرے سامنے پیش ہو گئیں اور ہنسی مذاق کرنے لگیں جس سے میرا خون خشک ہونے لگا اور میرے لئے وہاں دو دن بسر کرنا دوبھر ہو گیا۔ اتنا غنیمت تھا کہ کھانے کے وقت خوشدامن صاحبہ موجود رہتی تھیں ورنہ میں تو بھوکا ہی مرتا۔

ایک روز خوشدامن صاحبہ کہیں گئی ہوئی تھیں اسلئے سالی صاحبہ چھم چھم کرتی آئیں اور کھانے کے [illegible]

لگی یہ کہ نہیں بہت طبیعت خراب ہے بیچاری بعد میں خود کوئی بیاہ لانے کے لیکن وہ کب ٹال سکتی تھیں۔ مجبور کر کے والد صاحب دھوم دھام سے بیاہ کر لے آئے۔

راستے میں مجھے اتنی الجھن نہیں ہوئی مگر چوکے کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ عورتوں کا جمگھٹ ہے۔ ان کی خوش گپیوں نے مجھے اور بھی چونکا دیا۔ خیر ڈرتا ڈرتا کسی طرح چوکے میں پہنچا اور کھانے لگا۔ بیٹھتے ہی سب عورتیں میرا منہ تکنے لگیں۔ اور ہر طرح سے مجھے حیران کر ڈالا۔ مگر میں آنکھ بند ہونے چکا تھا بیچارے اتنے میں سالی صاحبہ میرے سامنے تھال رکھ کر بولیں "لیجئے شروع کیجئے۔ مگر اتنا دھیان رکھئے کہ لقمہ منہ کے بجائے کہیں ناک میں نہ چلا جائے۔"

میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سالے صاحب کی آواز آئی "ہاں ہاں کیا کرتے ہو؟" گھبرا کر میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ انہوں نے فوراً سامنے سے تھال ہی سرکا دیا جس پر سب عورتیں ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگیں اور سالے صاحب بھی ہنسنے لگے اور اپنی بہن کو جھڑک کر بولے "یہ بھی کوئی مذاق ہے۔" سالے صاحب کی آواز پر میں نے آنکھیں کھولیں تو شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ سامنے تھال نہیں بلکہ کڑاہی میں آگ رکھی ہوئی تھی۔

(۵)

میرے مسرور ہونے کے بعد والد صاحب نے تیسرے سال گونا کر دیا لیکن میں اپنی بیوی سے میل جول پیش آنا اچھا نہیں سمجھتا تھا جیسا کہ گھر کے دوسرے لڑکیوں سے۔ پہلے تو میرا ارادہ ہوا کہ اس کی جانب آنکھ اٹھا کر ہی نہ دیکھوں لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بالکل غیر تعلیم یافتہ ہے تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ بہرحال تعلیم نسواں کا حامی تھا اور پڑھنے لکھنے کی یہی عمر ہوتی ہے اسلئے اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ اُسے بھی پڑھانے لگا۔

پہلے تو وہ میرے سامنے آتے ہوئے بہت شرمائی لیکن میں نے اُسے سمجھا دیا کہ ابھی کئی سال تک مجھ کو استاد سمجھو اور مجھ سے کوئی پردہ نہ کرو۔

میرا یہ عہد دیکھ کر میرے والدین بھی یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ اچھا ہے برخوردار پہلے بھی پڑھا کر لیجئے اب کتنے سال ہو گئے ہیں۔

میں اپنے چند وقت کا زیادہ حصہ اسے پڑھانے میں صرف کرنے لگا۔ میری بیوی بڑی فرمانبردار تھی۔ جو کچھ میں کہتا تھا اس کی حرف بحرف تعمیل کرتی اور بڑی محبت کے ساتھ پڑھتی تھی جب تک میں اجازت نہ دیتا وہ میرے پاس سے اٹھتی نہ تھی مگر بہن کو لکھنے پڑھنے کی اتنی شائق نہ تھی۔ عمر میں بھی وہ چھوٹی تھی۔ کھیل کود میں لگی رہتی تھی اسلئے کبھی کبھی مجھے تنہا بیوی کو پڑھانا پڑتا تھا۔

میں بھی اس کی گفتگو اور نشست و ... بھی طرح واقف ہو گیا اور یہ جان گیا کہ [illegible]
کو پڑھا رہا ہوں۔ مجھے اس لطف میں یہ بھی خیال نہ آیا کہ یہ جوانی ہوتی ہے جب سوچا جائے تو محسوس
کرتا ہوں کہ پہلی تو بہانہ تھی ورنہ اسے پڑھانے سے غرض کس کو تھی یہ تو اک بہانہ ہی تھا۔

جاڑے کا موسم تھا۔ دن میں کالج سے فرصت نہ ملتی تھی رات میں دو دو بجے تک اسے پڑھایا کرتا
میں پڑھایا کرتا تھا۔ ایک روز پڑھاتے پڑھاتے میں اونگھ گیا جمیلہ تو پہلے ہی سے نیند کی ماری تھی وہ اٹھ کے
وہ نیچے چلی گئی مگر وہ بیچاری میرے حکم کے بغیر کیسے چلی جاتی بیٹھی رہی۔

بارہ بجے کے قریب جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میز پر سر رکھے ہوئے وہ بھی سو رہی ہے۔ اُف
اس کا حسن خفتہ کتنا دلآویز معلوم ہوا میں بڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے اس نظارے سے لطف اٹھاتا رہا۔

پھر خیال آیا کہ بیچاری سردی سے ٹھٹھر رہی ہوگی شال بھی نہیں اوڑھے ہے۔
میں نے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اُسے جگا دیا۔ خیال تھا کہ اُسے جگا کر نیچے بھیج دوں گا لیکن اس کے جسم
ہاتھ لگاتے ہی میرے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اور میں بے خود ہو گیا۔

وہ گھبرا گئی "یہ کیا۔ میرا ہاتھ چھوڑیئے۔ آپ تو کہتے تھے کہ ...." شرم سے اس کی نگاہ جھک گئی۔ اور زیادہ
کچھ نہ کہہ سکی۔

اس کے بعد بہت دن مزے سے گذرے۔ اس کی عشق و محبت میں مجھے اپنی عہد شکنی کا بھی کچھ غم نہ تھا
بے فکری سے دن گذرتے جا رہے تھے لیکن ایک روز دوپہر کو کالج سے واپس آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پلنگ پر
بھاوج بیٹھی سسکیاں رہی ہے۔ دریافت کرنے پر شرما کر کہا "تم تو اپنی شرم کرتے ہوئے بیٹھے ہو۔ مگر مجھ کو اب سب [illegible]
میں نے کہا "کیا بات ہے"

"بھلا یہ سالا کنبہ پیشہ ہے بھگا تا ابھی بھی تہمت لگا رہی ہیں۔ اور سخت ناراض ہیں کہتی ہیں میرے
گھر میں اب تیری گنجائش نہیں ہے۔ تم تو ان کی نظر میں بہ ہماری چاہ میں؟"
میں بڑی مصیبت میں پڑ گیا۔ مارے شرم کے کچھ کرتے دھرتے نہ بنتا تھا۔ اتنے میں والد صاحب
بھی آ پہنچیں۔ غصے سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس لڑکی کے کرتوت کا کچھ تم کو بھی حال معلوم ہے؟
میں تو شرم کے مارے زمین میں گڑا گیا تھوڑی دیر میں بھرائی ہوئی آواز میں کہا "معاف کیجئے
ابا جی سارا قصور میرا ہی ہے"
پھر کیا تھا والد صاحب کا سارا غصہ کافور ہو گیا خوشیاں منائی جانے لگیں ہم نے دو شادے آ
سے گھر والوں کو راضی کیا کہ ابھی کسی سے اس کا ذکر نہ کریں۔ لیکن ہوا کہیں چھپ سکتا تھا [illegible]

تمام شہر میں اس کا چرچا ہونے لگا کیا بتاؤں دوستوں نے کیسی کیسی پھبتیاں لیں میں نے تو بہ چاچ سے مستعفی دیدیا۔ مگر ان کا عصہ نہیں گیا۔ غرض اس روز سے میری زندگی ہی بدل گئی۔ وہ شرم آج تک دور نہیں ہوئی ہے اس وقت تک میں سب سے منہ چھپاتا ہوں۔ سجا سوسائٹی سب سے مجھے نفرت سی ہو گئی ہے۔ خدا مجھے دوبارہ ایسے چکر میں نہ ڈالے۔

وکیل صاحب کی دلچسپ کہانی کے ساتھ ساتھ یہ مزیدار پک نک بھی ختم ہو گیا۔ اس روز سے لڑکے ہمارے وکیل صاحب کو نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ آپ اپنی کہانی سب کو سنا دیا کیجئے جس سے آپ کی شرم دور ہوگی۔ ورنہ مفت زندگی برباد ہوگی۔

مُبارک باد شادی

۱۰ نومبر ۱۸۸۳ء میں کانپور کی ایک دلخوش کن تقریب حافظ محمد صدیق صاحب کے صاحبزادہ بلند اقبال میاں محمد توفیق کی شادی خانہ آبادی تھی۔ اس موقعہ پر مکرمی خان بہادر مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی نے "نذرِ محبت" کے عنوان سے ایک مبارکبادی نظم لکھا تھا جو ہدیۂ ناظرین ہے

زبان بلبل پہ ہے ترانہ چمن میں بزمِ طرب جمی ہے
نسیم پھرتی ہے گنگناتی، گلوں میں کرتال بج رہی ہے

غرور کرو پل کہ ہے یہ چمن پر، ترانہ پھولوں کو بانکپن پر
بنے ٹھنے بیٹھے ہیں شگوفے کلی کلی اک دلہن بنی ہے

کسے دے ترجیح کس پہ کوئی، کبھی ہوا کھلونہ جا رہی ہے
کسی کی پوشاک ہے شہابی کسی کا ملبوس اگرئی ہے

کہیں ہے لالہ ایاغ بر کف کہیں ہے مستی خروش نرگس
گلوں نے رخ پر ملا ہے غازہ پسند نسرین کو سادگی ہے

صبا نے اٹھکھیلی کر کے کہا، دبایا سوسن نے ہونٹ اپنا
قیامت اس پر یہ ہے کہ گل کی ذرا سی بھی مستی کا دل لگی ہے

عجب بہانہ سماں اثر ہے وہ کیوں نہ ہیرے وہ نیک ساعت
کھلے ہیں توفیق کے گرے پھول اسی کی ہر سمت خرمی ہے

وہ دن بھی آئے کہ بھائی صدیق دیکھیں پوتوں کے سہرے یا رب
نہ تیری سرکار میں کمی تھی، نہ تیری سرکار میں کمی ہے

تنقید کتب

غالب

عام خیال ہے کہ غالب پر مولانا حالی پانی پتی کی "یادگار غالب" سے بہتر اور جامع و مانع کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ مگر "یادگار غالب" کی تصنیف کے وقت غالب کے تمام خطوط اور تحریریں خواجہ حالی کے پیش نظر نہ تھیں۔ اِس لئے اِس بات کی سخت ضرورت تھی کہ کسی صورت سے مرزا غالب کے زیادہ سے زیادہ حالات ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں۔ مگر اس کے لئے مرزا غالب کے تمام خطوط، تمام تحریروں، تمام تصنیفات اور ان کے علاوہ یادگار غالب اور غالب کے متعلق لکھے ہوئے تمام مضامین اور کتابوں پر تحقیق و تدقیق کی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ کام سخت محنت اور انتہائی دیدہ ریزی کا کام تھا جسے مولانا غلام رسول صاحب مہر بی۔ اے ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب لاہور" نے نہایت محنت و جانفشانی سے انجام دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ غالب کے خطوط اور دوسری تصانیف کی ورق گردانی کرکے اور ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر مطالعہ کر کے حالات کا جمع کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کی مشکلات سے وہی حضرات واقف ہو سکتے ہیں جنہیں اس قسم کے ریسرچ کے کاموں کا عملی تجربہ حاصل ہو۔ مگر اس کے ساتھ مولانا غلام رسول مہر بی۔ اے نے جملہ واقعات کو تنقید صحیح اور واقعات تاریخ کی روشنی میں بھی جانچ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دیا ہے۔ مثلاً فاضل مصنف نے "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے متعلق لکھا ہے کہ :-

"انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بڑی محققانہ کتاب ہے۔ لیکن غالب کے متعلق اس کی تحقیق کا سرمایہ بھی صد درجہ مضحکہ خیز نظر آیا۔ مثلاً یہ مرقوم ہے کہ غالب نے اپنے فارسی دیوان میں جا بجا اسد تخلص استعمال کیا ہے۔ حالانکہ غالب کی کچھ اوپر تین سو غزلیات فارسی میں ایک جگہ بھی اسد تخلص

پتہ ۔ دفتر انقلاب لاہور قیمت [illegible]

نہیں آیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ غالب کے چچا کی وفات کے بعد شاہ دہلی نے پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ حالانکہ غالب کا مستقل ... بلا ذاتی پنشن شاہ دہلی سے متعلق تھی اور نہ پچاس روپیہ ماہانہ تھی۔ پنشن سرکار انگریزی نے مقرر کی تھی۔ اور فیروز پور جھرکہ کی بنا تک اس سے متعلق رہی۔ بعد ازاں براہ راست انگریزی خزانہ سے متعلق ہو گئی اور اس کی مقدار ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ یا ساڑھے سات سو روپیہ سال تھی۔ شاہ دہلی سے تاریخ نگاری کے صلے میں جو پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے ان کی ابتدا جون ۱۸۵۰ء سے ہوئی جبکہ غالب کے چچا کی وفات پر چوالیس برس گزر چکے تھے۔

فاضل مؤلف نے اِن بزرگوں سے بھی شرف نیاز حاصل کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا جو مرزا غالب سے تعلقات رشتہ داری رکھتے تھے۔ مثلاً نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو وغیرہ۔ فاضل مؤلف نے بڑی تلاش و تجسس سے مرزا غالب کے بعض ایسے خطوط بھی بہم پہونچائے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

اِس کتاب کے اسلوب بیان کی سب سے بڑی خوبی اس کا طریقہ استدلال ہے۔ لائق مصنف جگہ جگہ پختہ دلائل سے سابق تذکرہ نگاروں کی تردید و تصحیح کرتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً مرزا غالب پہلے اسد تخلص فرماتے تھے۔ لیکن غالب تخلص اختیار کر لیا تھا۔ اِس کے بارہ میں مولانا آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ "غالب نے ۱۲۴۵ھ میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا" اس بیان کی تصحیح فاضل مؤلف نے اِس طرح کی ہے:۔

"غالب ۱۲۴۲ھ میں کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے تھے وہاں اُنھوں نے جو غزل کہی تھی اس میں غالب تخلص استعمال کیا ہے ؎

جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو ... لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

اِس سے ظاہر ہے کہ وہ ۱۲۴۵ھ سے پہلے ہی اُردو میں بھی غالب تخلص فرمانے لگے تھے۔"

فاضل مؤلف کی یہ ستم ظریفی ہے کہ تحقیق و تدقیق کے دُھن میں وہ خود مرزا غالب پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً مرزا نے ایک خط میں حبیب اللہ خان ذکا حیدرآبادی کو لکھا تھا کہ:۔

"میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔"

اور مولوی سراج الدین احمد صاحب کو ایک فارسی خط میں لکھا ہے:-

نیائے دادا مامن از سمرقند بہ آہنگ ہند کرد و بہ لاہور بہ معین الملک گرویدہ بود
بعد از معین الملک دست از شغل شستہ بہ دلی آمد و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان بہادر پیوست۔

ان دونوں بیانوں پر فاضل مؤلف تنقید فرماتے ہیں کہ:-

شاہ عالم کی بادشاہی کا زمانہ ۱۱۷۳ھ سے شروع ہوتا ہے اور نواب معین الملک جن کے پاس غالب کے دادا لاہور میں ملازم ہوئے تھے ۱۱۶۶ھ میں انتقال کر گئے تھے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ غالب کے دادا احمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔

کہنے کو تو فاضل مؤلف کہہ گئے لیکن بعد میں خیال آیا کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"
اس لئے یوں لیپ پوت کرتے ہیں:-

"غالب کا یہ بیان غالباً خاندانی روایات پر مبنی ہے۔ نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس بیان کی تصحیح نہ کر سکے۔"

اسی طرح ایک جگہ اور چوٹ کی ہے:-

"غالب نے ایک موقعہ پر بہن کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن حقیقتہً ان کی کوئی حقیقی بہن نہ تھی ممکن ہے یہ ذکر رشتہ کی کسی بہن کا ہو۔"

غرض جہاں تک تحقیق و تدقیق کا تعلق ہے غالب پر اب تک اس سے بہتر کتاب نہیں شائع ہوئی۔ زبان بھی ادبی ہے اگرچہ کہیں کہیں "پنجابیت" کا اظہار ہو گیا ہے۔

قدردانان غالب کے لئے یہ کتاب قابل دید ہے اور اسے بھی کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں میں جگہ پانا چاہیئے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ سائز بڑا حجم دو سو اسی صفحات، غالب کی تصویر اُن کی تحریر کا عکس اور نواب علاؤ الدین احمد خان کے نام وثیقہ جانشینی کا عکس بھی ہے۔

شب چراغ

یہ آٹھ مختصر افسانوں اور مضامین کا مجموعہ عجیب و غریب چیز ہے ہر افسانہ فرضی ہے۔ لیکن واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ تمام افسانے اس قدر دلچسپ ہیں کہ ایک بار شروع کر کے بغیر ختم کئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اسلوب بیان بھی پسندیدہ اور زبان سلیس و شگفتہ ہے۔ بعض بعض افسانوں کا طرز ادا فلسفیانہ ہے۔ پہلا افسانہ "حسین مغالطہ" بہت دلچسپ ہے۔ اس میں مردانہ اور زنانہ نظریے

کا تصادم دکھایا گیا ہے۔ مردانہ نظریہ یہ ہے۔

"مرد نظرِ عورت پر کاسہ ہے۔ عورت مرد کے انگشت کی انگوٹھی ہے۔ عورت مرد کے قوی ہاتھوں میں ایک نازک کوزہ ہے۔ اور عورت مرد کے باغِ شباب کی ایک کمزور تیتری ہے۔ مرد مرد ہے اور عورت عورت!"

اِس کے مقابل زنانہ نظریہ یہ پیش کیا گیا ہے۔

"عورت حُسن ہے۔ حُسن شاعر، صاحبِ نگار اور موضوعِ جمیل ہے۔ عورت کی شکست حُسن کی شکست ہے۔ حُسن کی شکست فطرت کی شکست ہے۔ اور فطرت کی شکست دنیا کی تباہی و بربادی ہے"

اِن دونوں نظریوں کے تصادم کا کیا نتیجہ ہوا۔ یہ آپ کو کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

دوسرا افسانہ "منزل کا تعاقب" دراصل ایک نئی نویلی مگر تعلیم یافتہ شریف دلہن کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اِس کے مطالعہ سے ہر عورت کو معلوم ہو سکتا ہے کہ زن و شوہر میں کس طرح کا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ نیز آنکہ اگر عورت اپنے خاوند کو مطیع اور اپنے گھر کو نمونہ جنت بنانا چاہے تو کیونکر بنا سکتی ہے ممکن ہے بعض شوخ طبائع کو یہ سنجیدہ اور حکیمانہ چیزیں خشک اور بے مزہ معلوم ہوں۔ اِس لئے فاضل مصنف نے غلطیوں کی ایک رات" لکھ کر تمام باتوں کی تلافی کر دی۔ پڑھیئے اور ہنسیئے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، چھوٹی تقطیع کے چار جزو۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب قصر الادب دفتر مشاعرہ آگرہ۔

مقالات

چھوٹی تقطیع کے اس پونے تین جزو کے رسالہ میں سید احمد الدین احمد صاحب ایم۔اے، مارہروی نے حسب ذیل مسائل پر تنقیدی بحث کر کے بعض عام غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضامین یہ ہیں

(۱) کیا اورنگ زیب سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث تھا؟ (۲) کیا فیروز تغلق غاصب تھا؟
(۳) نورجہاں اور جہانگیر کے تعلقات پر ایک نظر (۴) علاؤ الدین و پدمنی (۵) کیا محمد تغلق پاگل تھا۔

شاہ محمد سلیم بک ایجنسی الہ آباد سے طلب فرمائیں۔ قیمت ۶ر

شاہ ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری

(حضرت جگر بریلوی [illegible])

تفسیرِ حسن و عشق کا پیمان کر دیا — تو نے جو تاج و تخت کو قربان کر دیا
آزادگی کی شمع جلا دی جہان میں — ظلمت کدہ میں نور کا سامان کر دیا
"پابند بن کے رہ نہیں سکتا ہے بادشاہ!" — بانگِ دہل سے تو نے یہ اعلان کر دیا
آئین ساز دیکھ کے حیران رہ گئے — جتنے تھے سب کو دل میں پشیمان کر دیا
قربانیوں کا دے کے سبق اہلِ دہر کو — دشواریٔ حیات کو آسان کر دیا
ویران پڑی ہوئی تھی محبت کی سرزمین — سیراب کر کے اُس کو گلستان کر دیا
اس مادہ پرست زمانہ کے برخلاف — جاری جہاں میں عشق کا پیمان کر دیا
حُسنِ وفا کی چار طرف دھوم ہو گئی — دنیا کو قدر عشق کی معلوم ہو گئی
رہتا اگر تو تخت نشین بن کے شہریار — برطانیہ کے تاج کا بڑھتا بہت وقار
لیکن جو راز دے کے محبت کا وہ شرر — جس کی چمک پہ دولتِ کونین بھی نثار
تو بے نیازِ افسر و اورنگ ہو گیا — جب آتشِ نہاں نے کیا دل کو بے قرار
پہلے تھا صرف مالکِ دیہیم و تخت تو — اب حکمراں دلوں پہ ہے اے شاہِ نامدار
تاریخ پیش کر نہ سکیگی تیری نظیر — ہم نے سنے ہیں سہل کئی مغربی شہریار
روشن خیالیوں سے تیری تھا ہمیں یقیں — اصلاح پائے گا کبھی بھارت کا حالِ زار
کیا جانے کیا مشیتِ پروردگار ہے — ایثار پر تیرے دلِ شاعر نثار ہے
اے شاہِ صدحبا تجھے! تو نے کیا وہ کام! — جذبات کا تو دشمن ہے کہتے ہیں خاص و عام
زیرِ نگیں نہیں گو ہے وہ عالی مقام آج — ہے شاد دل جہاں تیرا اور روح شاد کام
بیجا قیود سے تیرا دل پاک ہو گیا — کہتا سی کو ترک ہیں ہمت تیا اسی کا نام
تیرے بہتر سے تاج بقائے دوام کا — دنیا کے تخت و تاج کو کوئی نہیں قیام
جان و جگر کو حُبِ وطن پر کریں نثار — قربانیوں کا تجھ سے سبق لیں یہ ہیں فسانہ
[illegible] اگر روحِ بیا ہی ناگوار — آزادیٔ وطن کا جب تک ملے پیام
[illegible] خدا [illegible] جانشین کر — [illegible] وہ [illegible] انتظام

ملک معظم جارج ششم اور ملکہ معظمہ ایلزبتھ

ملک معظم پرنس البرٹ فریڈرک آرتھر جارج۔ ڈیوک آف یارک۔ ارل آف انورنس اور بیرن کلارنس کے۔ جی۔ پی۔ سی۔ کے۔ ٹی۔ پی۔ جی۔ سی۔ ایم۔ جی۔ جی۔ سی۔ وی۔ او۔ ڈی۔ سی۔ ایل۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ء بروز جمعہ کو ایک بجکر ۲۰ منٹ پر اپنے بڑے بھائی شاہ ایڈورڈ ہشتم کی جگہ تخت نشین سلطنت ہوئے۔ آپ مرحوم شاہ جارج پنجم اور ملکہ معظمہ میری کے دوسرے بیٹے ہیں۔ ۱۴ دسمبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ اور پرنس البرٹ کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے پہلے بحری فوج میں کام کرنا شروع کیا۔ چار سال تک بحری کیڈٹ کالج میں تربیت حاصل کرنے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں مڈشپ مین ہو کر بحری فوج میں داخل ہوئے۔ جنگ عظیم کی سب سے بڑی بحری لڑائی جنگ جٹ لینڈ میں آپ بھی شریک تھے اس وقت آپ سب لفٹننٹ تھے لیکن دشمن کی گولہ باری سے کوئی خوف دل میں نہ لائے اور بہادری سے جنگ میں حصہ لیا جس کی بدولت آپ کے جنگی خدمات کا سرکاری مراسلات میں خاص اعزاز کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

آپ جہاز میں اپنے ساتھی افسروں کی طرح تکلیف کیساتھ بہت سادہ زندگی بسر کرکے ہنسی خوشی سے اپنے فرائض ادا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کسی وقت بھی آپ نے اپنے اعلیٰ رتبہ یعنی شاہزادگی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

جنگ عظیم کے آخری سال میں آپ فرانس میں ہوائی فوج کے ساتھ شامل ہو گئے جس کے بعد ۱۹۱۹ء میں بحری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے مگر اس سے پہلے آپ نے پائلٹ کا امتحان پاس کرکے سکواڈرن لیڈر کے درجہ پر ترقی حاصل کرلی تھی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے برادر خورد ڈیوک آف کنٹ کیساتھ کیمبرج یونیورسٹی میں کچھ دنوں تک تعلیم حاصل کی اور ایک مختصر گرمخت کورس میں شامل ہو کر تاریخ۔ مالی تجارتی اور سیاسی مسائل کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

۱۹۲۰ء میں آپ کو ڈیوک آف یارک کا خطاب عطا ہوا۔

۱۹۲۳ء میں آپ نے لیڈی الزبتھ بوزلیون سے شادی کی جو ارل آف سٹریتھمور کی بیٹی ہیں آپ کے والد صاحب سکاٹ لینڈ کے بہت قدیم اور مشہور خاندانی رئیس ہیں۔ بہرحال اس شادی پر تمام انگلستان و سکاٹ لینڈ میں بڑی دھوم ہوئی اور عام طور پر لوگوں نے بڑی خوشیاں منائیں۔ آپ کو و نیز ڈچز صاحبہ کو انگلستان اور ممالک غیر میں اکثر سرکاری رسموں میں ملک معظم جارج پنجم کی جانب سے شرکت کرنا پڑتی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں آپ اور ملکہ الزبتھ نے مشرقی افریقہ میں پانچ مہینے کا دورہ کیا پھر ۱۹۲۷ء میں آپ نے سلطنت

کی سیاحت

[illegible]

ہز [illegible]

آپ کے دل میں ہمیشہ سے غریبوں کی بہبودی کا خیال رہا ہے۔ جس وقت [illegible] کارخانہ داروں اور مزدوروں کے درمیان اچھے اور ہمدردانہ تعلقات رہیں۔

چند سال ہوئے آپ نے سمندر کے کنارے ایک کیمپ قائم کر کے اس میں چند سو لڑکوں کو یکجا کیا جن میں نصف تو بڑے بڑے پبلک اسکولوں کے طالب علم تھے اور نصف غریبوں کے لڑکے۔ اس طرح آپ نے امیر و غریب دونوں طبقوں کے لڑکوں کو یکجا کر کے دونوں کے درمیان انسانی محبت و مساوات کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ آپ اس کے بعد ہر سال ایسا کرتے رہے ہیں۔

آپ فوجی محکموں سے بھی ہمیشہ عملی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ آپ بحری فوج کے ہوائی عملہ، بری فوج کے میجر جنرل اور ہوائی فوج کے ایئر چیف مارشل رہ چکے ہیں۔

اب آپ اکتالیس سال کی عمر میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے تخت پر بیٹھے ہیں جس کی آبادی اس وقت پچاس کروڑ انسان ہیں۔ آپ کے کندھوں پر ایک عظیم الشان ذمہ داری کا بوجھ ہے لیکن خاندانی روایات، ابتدائی تربیت، عملی تجربات اور فطری اوصاف سب لحاظ سے آپ اس کے اٹھانے کے قابل ہیں۔

ملکہ [illegible] اگست [illegible] کو پیدا ہوئی تھیں۔ آپ [illegible] کے قریبی [illegible] آپ کے [illegible] بھائی جنگ عظیم میں [illegible] میدان جنگ میں کام آیا۔ جنگ عظیم میں آپ کے گھر میں [illegible] قائم کیا گیا تھا اور آپ اپنا وقت زخمی سپاہیوں کی خدمت میں صرف کیا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد سے آپ [illegible] اور ہر طرح کی خیراتی تحریکوں میں [illegible] حصہ لیتی رہی ہیں۔ آپ نے اپنے حسن اخلاق کی بدولت [illegible] اپنی عزت اور محبت قائم کر لی ہے اور [illegible] انگلستان [illegible]

[illegible] شہزادی [illegible]

[illegible]

شاہ ایڈورڈ کی دستبرداری

اس سال ملک موجودہ عہد کا سب سے بڑا واقعہ ملک معظم شاہ ایڈورڈ ہشتم کی تاج و تخت برطانیہ سے شاندار دستبرداری ہے عشق و محبت کی قربانگاہ میں دنیا کا یہ شاہانہ سب سے بڑی قربانی ہے مگر اس اہم واقعہ کو محض اس نظر سے دیکھنا غلطی ہوگا۔ کیونکہ شاہ ممدوح سلطنت برطانیہ کی رہنمائی سے یہ سمجھکر کنارہ کش ہوئے ہیں کہ موجودہ حالات میں وہ تاج کے اہم فرائض اور نازک ذمہ داریوں کو اپنے اطمینان قلب اور اعلیٰ معیار کے بموجب ادا نہ کر سکیں گے۔ موجودہ زمانہ میں فرض کا ایسا اعلیٰ معیار اس سے پہلے اور کس نے قایم کیا تھا؟ شاہ موصوف شاہزادہ ویلز اور تاجدار برطانیہ کی حیثیت سے پچیس سال سے برابر ملک و سلطنت کی بہترین خدمت کر رہے تھے۔ رعایا کے ہر طبقہ میں وہ بیحد ہر دلعزیز تھے اور ادنیٰ سے ادنیٰ طبقے کے ساتھ انھیں انتہائی ہمدردی تھی اور بیکاروں و بے روزگار لوگوں کے وہ خاص طور پر ہمدرد و حامی تھے۔

اس وقت سلطنت برطانیہ میں ان سے زیادہ اور کسی کو اہم ملکی مسائل حل کرنے کی اہمیت حاصل نہیں لیکن ان کو دوسرے گلوبات کا روز افزوں احساس ہو رہا تھا کہ وہ تن تنہا اپنے شاہانہ بار کو اٹھا نہیں سکتے اب تک انھوں نے اپنے رفیقہ حیات کا انتخاب نہیں کیا تھا لیکن اب اس کے بغیر زندگی دوبھر معلوم ہوتی تھی۔ اتفاق سے جس خاتون کی طرف انکا دل مائل ہوا وہ برطانوی تخت و تاج کے گذشتہ روایات اور سلطنت برطانیہ کے شان و شوکت کے معیار پر پوری نہ اترتی تھی۔ نیز ان کا انتخاب مسیحی پادریوں کے اخلاقی معیار کے مطابق بھی نہ تھا۔ وزرا سلطنت نے بھی اولوالعزم بادشاہ کا ساتھ نہ دیا۔ انگلستان کی شاہی تاریخ اور شاہانہ روایات میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ بادشاہ کی بیوی سلطنت کی ملکہ نہ سمجھی جائے۔ ورنہ شاہ ایڈورڈ اس کیلئے بھی تیار تھے بلکہ وہ علحدہ پسند کی شادی کر لیں اور یہ ان کی خانگی زندگی کا ایک نجی واقعہ سمجھا جائے۔ انکو اور ان کی محبوبہ کو اس میں بھی اعتراض نہ تھا کہ اس شادی کی اولاد کو تخت و تاج سے کوئی سروکار نہ رہے۔ لیکن وزرائے سلطنت اس کے لئے تیار نہ تھے اور انگلستان کے مذہبی رہنماؤں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی انگلستان کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر بھی نہ ملی۔ چنانچہ وزیر اعظم مسٹر بالڈون نے اس معاملے میں کسی قسم کے مصالحت کو روا نہ رکھا کیونکہ یہ مصالحت آئین سلطنت اور روایات شاہی دونوں کے خلاف تھی نیز اس سے اصولی و عملی دونوں حیثیت سے آخر کار تاج برطانیہ

کی عظمت و احترام میں فرق آنے کا خوف تھا۔ پارلیمنٹ میں مسٹر بالڈون کے حامیوں کے علاوہ مخالف پارٹی
نے بھی مسٹر بالڈون کی اسی بات کی تائید کی وزیر اعظم اعلان کر چکا تھا۔ کہ کنزرویٹو کا اپنا فرض ہی نہیں شکست
دینے کا بھی مکمل ارادہ ظاہر کرتی رہتی ہے اس اہم وقت کے موقع پر کہ جب کہ انتخاب کا تعلق بادشاہ ایڈورڈ
کی ذات سے وابستہ تھی لیکن اس وقت سب سے زیادہ اہمیت سے بالاتر ہو کر اسے قائم کرنا اپنا فرض منصبی سمجھا
آخر وقت تک کے نزدیکی رائے پر قائم رہے۔ اپنے خیال کے مطابق ہندوستان و برطانیہ کی عظمت قائم رکھنے کے
ذہن میں انھوں نے اسے سب سے بڑے اخبار کی پرواہ نہ کی۔ اس موقع پر وزیر اعظم نے سلطنت
برطانیہ کے تمام نوآبادیوں کو بھی شریک مشورہ کیا کیونکہ قانون ویسٹ منسٹر کی رو سے جو چند ہی سال ہوئے پاس
ہوا ہے تخت و تاج کی وراثت کے متعلق اب برطانوی نوآبادیوں کو بھی رائے دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔
البتہ ہندوستان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ابھی تک دولت مشترکہ برطانیہ میں ہمارے ملک کو نوآبادیوں یا خود مختار
مقبوضات کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی ہے خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تمام اجزائے سلطنت
کے ذمہ دار وزرا نے وزیر اعظم بالڈون کی رائے سے اتفاق کر کے شاہ ایڈورڈ کے تجویز شادی کو ناپسند کیا۔
بہرحال جب وزیر اعظم نے ان اعتراضات کو اپنے آقائے نامدار کے گوش گذار کر دینا اپنا فرض منصبی سمجھا شاہ ایڈورڈ نے تمام
عذرات کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ سن کر ان پر غور کیا مگر وہ پہلے ہی تمام پہلوؤں پر غور کر چکے تھے اس لئے انھیں
وزیر اعظم کی باتوں پر کوئی تعجب نہ ہوا اور انھوں نے بلا کسی پس و پیش کے تاج و تخت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا
مسٹر بالڈون نے بہت کچھ کہا وزرائے سلطنت نے مکرر غور کے لئے التماس کیا۔ احباب نے پارلیمنٹ کو شکست کر کے
دوسری پارلیمنٹ کے انتخاب کرانے کی رائے دی کیونکہ بادشاہ کو آئین کی رو سے شادی کے معاملے
میں پوری آزادی حاصل تھی۔ اور کوئی شخص انھیں اس بنا پر تاج و تخت سے محروم نہ کر سکتا تھا۔ پارلیمنٹ کی
برخاستگی اور وزرائے سلطنت کی معزولی کا بھی انھیں پورا حق و اختیار تھا علاوہ ازیں وہ مخالف پارٹی کے لیڈروں
یا دوسرے ممتاز ممبران پارلیمنٹ سے قلمدان وزارت سنبھالنے کی استدعا کر سکتے تھے یہ بھی ظاہر تھا کہ عوام کی
ہمدردی انھیں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہے لیکن اگر کسی معاملے میں ان کے اور وزرا کے درمیان نزاع ہو گی تو
عوام اپنے محبوب بادشاہ کا ساتھ دیں گے۔ لیکن تاج اور پارلیمنٹ یا تاج اور وزرا کے درمیان کبھی جنگ چھڑ جانے کا لازمی
قومی مفاد کو نقصان عظیم پہنچنے اور سلطنت برطانیہ کی آئینی عظمت میں فرق آنے کا اندیشہ تھا۔ دوسرے تاج کی
حیثیت ہمیشہ بحث و مباحثہ سے بالاتر رہی ہے۔ فرق آنے کا احتمال تھا اس لئے انگلستان کی
بہتری کے لئے اپنی طرف ہونے ہمت کی شاہ ایڈورڈ نے اپنی ذات کے متعلق پارلیمنٹ یا وزرا سے
جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس صورت میں شاہ مجروح ہوتے۔ طرفداروں

[illegible] ہوتا تو شاید جنگ عظیم اور آئینی جماعتوں میں اختلاف و تصادم ہو جاتا جو سلطنت کے حق میں کسی طرح مفید نہ تھا کیونکہ اس سے ہندوستان کے قومی تحریک کو بہت نقصان پہنچتا معلوم ہوتا ہے بجز اس کے کہ اس وقت برطانیہ دنیا میں اپنی سیاسی نیابت قائم رکھنے کے انتظامات میں مصروف ہے اور کروڑوں پونڈ کے مصارف فوج کے ہر شعبہ کی از سر نو تنظیم کا خیر مقدم بیانہ ہو رہا ہے بس تمام ملک ان کا ایسے وقت مناسب نہیں ہے کیونکہ دوسرے ملک شاہ ہند ہو بستیت لیجانے کی کوشش میں ہیں اور اس آئینی جنگ میں بلا تعنت پیدا ہو جاتا

شاہ ایڈورڈ کو گذشتہ گیارہ مہینوں کے دوران میں اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک رفیقہ زندگی کی امداد و ہمدردی کے بغیر اپنے شاہی فرائض کو خاطر خواہ طریقے پر ادا نہیں کر سکتے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کو تاج و تخت کے ساتھ انہیں اپنے خانگی معاملات میں کوئی آزادی نصیب نہیں اور قدیم مراسم اور پرانے توہمات کی زنجیریں توڑنے کی کوشش برطانیہ کے ملکی مفاد کے لئے سخت مضر ہوگی، وہ ایک باعزت انسان کی طرح اپنے عزم محبت [illegible] یا شاید قول و قرار سے بھی پھرنا نہ چاہتے تھے۔ اور اطمینان قلب کیساتھ بادشاہی بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے تخت سے دستبرداری کا اٹل ارادہ کر کے دنیا کے روبرو ایثار و فرض شناسی کی انتہائی مثال پیش کر دی۔ اور وزیر اعظم سے صاف صاف کہدیا کہ وہ جلد سے جلد نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے جلیل القدر منصب سے علیحدہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ ان کے دل میں کسی سے کوئی ناراضگی نہیں اور وہ اپنے خاطر قوم و ملک کسی پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے ہیں اور اپنے جانشین و برادر عزیز ڈیوک آف یارک کے راستے میں مشکلات پیدا کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے انھوں نے تہیہ کر لیا کہ جلد سے جلد ان کے تخت نشینی کا انتظام کر کے جہانتک ممکن ہو اپنی طرف سے ان کے بار عظیم میں کوئی اضافہ نہ ہونے دیں۔

شاہی خاندان ارکان حکومت اور عرض و طول سلطنت برطانیہ میں اس عظیم الشان فیصلہ سے جو تہلکہ پڑ گیا اس کا بیان ناممکن ہے۔ دوسرے ملکوں کا حال تو ہم کو معلوم نہیں لیکن ہندوستان کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادنے و اعلی سب طبقوں میں شاہ ایڈورڈ کی دست برادری کا ماتم کیا گیا ہے۔ اس ایثار کی قدر دانی اور شاہ ایڈورڈ کیساتھ ہمدردی میں سیاسی تفرقات کی قید بھی باقی نہیں۔ کونسا دل ہے جو شاہ ایڈورڈ کی عظیم الشان قربانی سے بے اثر رہا۔ اور کون آنکھ ہے جو اس شاہی مصیبت پر پُرنم نہیں ہوئی۔

اس دست کشی کی پوری اہمیت سمجھنے کیلئے یہ خیال کرنا ضروری ہے کہ شاہ ایڈورڈ کا یہ فیصلہ ان کے لئے انقلاب عظیم سے کم نہ تھا جس میں دولت و ثروت اور مرتبہ کے نقصان کے علاوہ زندگی کی تمام دلچسپیوں سے دائمی مفارقت کا سوال تھا جن فرائض کی انجام دہی کے لئے انھوں نے تمام عمر اسقدر جانفشانی سے تیاری کی تھی جس اعلیٰ خدمت کی قابلیت انھوں نے اسقدر کد و کاوش کے بعد حاصل کی تھی۔ اپنے عہد

[illegible]

[illegible] کے پرستاروں کا ہجوم ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے اس لیے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں [illegible] دُنیا [illegible] سے ان کے دل بہت بڑھ کر [illegible] تھے اور جن سے انہیں تمام عمر محبت رہی دائمی مفارقت ہو گئی ہے

مگر شاہ ایڈورڈ ہشتم کے اصل معنی میں جمہوریت کے بادشاہ تھے۔ جب ان کی کلیسا نے ان سے [illegible] تو انہوں نے ایک منٹ میں تخت چھوڑنے کا ارادہ کیا کیونکہ وہ اپنی پوری قوت و قابلیت کیساتھ اپنے فرائض انجام نہ دے سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے جذبات کے آگے دنیا کے بڑے سے بڑے پوزیشن کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور صدق و وفا کی راہ میں تخت سلیمان سے بھی زیادہ عظیم الشان بادشاہت پر لات مار دی۔ اس ایثار عظیم کی خواہ مغرب میں کوئی قدر نہ ہو لیکن مشرق میں اس کا چرچا ہمیشہ دنیا تک باقی رہے گا۔

شاہ موصوف کے ذاتی پسند کے متعلق ہم کو کیا کسی کو بھی زبان کھولنے کا حق نہیں ہے۔ گو یہ واقعہ بہت افسوسناک اور درد انگیز ہے کہ ان کی نظر انتخاب مقبول عام نہیں ہوئی۔ اور ان کے انتخاب کو نہ برطانوی آئین و روایات کی تائید حاصل ہو سکی اور نہ ان کے ہوا خواہ مدبرین ہی اس کی علانیہ حمایت کر سکے۔

ہم مزید تفصیلات میں جانا پسند نہیں کرتے لیکن یہ تو ضرور کہیں گے کہ کلیسائے انگلستان کے مشہور و معروف پادریوں کا اعتراض قدیم اخلاقی معیار کے مطابق ہے لیکن اس معاملے میں شاہ ایڈورڈ ہشتم سے کوئی غلطی یا کمزوری ظہور میں آئی تو [illegible] اس کی پوری قیمت ادا کر چکے ہیں کسی کو انہیں [illegible] کرنے کا حق نہیں ہے۔

لیکن ہم اس پادری صاحبان کا اعتراض ہم وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری رہنماؤں میں بھی ایسی اخلاقی جرات پیدا ہو لیکن انگلستان سے شاہ ایڈورڈ کی روانگی کے بعد آرچ بشپ کنٹربری اور آرچ بشپ یارک کی ملامتی تقریریں مسیحی فیاضی کے صریحاً منافی ہیں۔ ان تمام مذہبی رہنماؤں نے اپنے ناصحانہ لعن طعن سے یقیناً ملک و مذہب کی کوئی خدمت نہیں کی مگر ان لوگوں کی [illegible] ہم گنہگار بندوں کے [illegible] باہر ہی ہوتی ہے

مسٹر بالڈون کی قدامت پرستی کے متعلق چاہے کچھ کہا جائے لیکن انہوں نے جس قابلیت و مستقل مزاجی کا اپنے خیال کے بموجب برطانوی آئین اور ملکی مصالح کی حفاظت کی اس کی بدولت ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ ابتداء سے آخر تک آئین و ضابطہ کے مطابق رہا۔ بقول خود انہوں نے [illegible] کے ساتھ اپنے وفاداری کا حق بھی سمجھا کہ وہ اپنے آقائے نامدار کے روبرو کل واقعات بلا کسی لحاظ یا رو رعایت کے پیش کر دیں۔ انہوں نے بادشاہ سے بھی زیادہ تاج و سلطنت کا احترام ضروری سمجھا اور پارلیمنٹ

معاملات کی آئینی پوزیشن کو ایک لمحہ کے لئے بھی نظر انداز نہیں کیا اور اس میں ادنےٰ سی تخفیف گوارا کی بلکہ نقادوں کو یہ اعتراض رہا ہے کہ انھوں نے مخالف پارٹی کے لیڈروں کو الجھا کر کیوں ملایا۔ وہ پارلیمنٹ کے لیڈر وزیراعظم تھے۔ اس حیثیت سے پارلیمنٹ کی عزت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ وزیراعظم کی حیثیت سے برطانیہ کا وقار قایم رکھنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ وہ ضرور شاہ وقت کے وفادار ملازم تھے لیکن قومی مفاد اور ملکی اخلاق کی حمایت شاہان انگلستان کا فرض منصبی ہے اس میں کسی قسم کی کمی آنے دینا اُن کے فرایض منصبی کے خلاف تھا۔ انگلستان کا بادشاہ ملک و قوم کا خادم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اہل برطانیہ کے قلوب پر حکومت کرتا ہے مگر اس حکومت کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ بادشاہ قوم و ملک کے لئے اپنا سارا عیش و آرام بلکہ جان و مال تک نثار کر دے۔ شاہ ایڈورڈ اس بنا پر تخت سے دستبردار نہیں ہوئے کہ انھیں اپنے پسند کی شادی کرنے کا اختیار نہ تھا۔ وہ جس لیڈی سے چاہتے بلا خوف مزاحمت عقد کر سکتے تھے لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ اس معاملے میں ناقابل عبور مشکلات حایل ہیں۔ تو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ شادی کرنے کے بعد قدرتاً ملک و سلطنت کی وہ توقعات اُن کی ذات سے وابستہ نہ رہ سکیں گی جو ایثار جذبات کی حالت میں ان کی میراث تھیں اور جیسے ہی انھیں محسوس ہوگا وزرائے سلطنت اور پارلیمنٹ کی رائے پر عمل کرنے کی صورت میں وہ اپنے شاہی فرایض بہ احسن وجوہ ادا نہ کر سکیں گے اُن کی غیور طبیعت نے خواہ مخواہ تخت سلطنت پر متمکن رہنا گوارا نہ کیا۔ اور انھوں نے ناقابل تنسیخ فیصلہ کر کے اپنے عندیہ کا فوری اعلان کر دیا۔

مختلف ارکان سلطنت و اہل انگلستان نے بھی اس اہم و نازک موقعہ پر جس لاثانی ضبط و تحمل کا ثبوت دیا وہ بجائے خود قومی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اور ہم تو اس کو تمام دنیا کے لئے ایک سبق آموز واقعہ سمجھتے ہیں خصوصاً ہندوستانیوں کے لئے تو اس قضیہ میں بیسیوں سبق موجود ہیں۔ دنیا میں تخت و تاج کی ہوس میں کیا کیا مظالم برپا نہیں ہوئے ظلم و ستم۔ دغا فریب۔ کشت و خون عام کہاں نہیں ہوا ہے۔ کتنے مرتبہ خون کی ندیاں نہیں بہی ہیں۔ لیکن برطانیہ کے عظیم الشان تاجدار نے جس شان و شکوہ سے ایسی وسیع و زبردست حکومت پر لات مار دی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈھے بھی نہ ملے گی۔

شاہی خاندان کے ہر فرد نے اپنے طرز عمل سے ہم لوگوں کے لئے حسن اخلاق اور حسن سلوک کی حدیں کھینچ دیں۔ شروع سے آخر تک شاہ ایڈورڈ کا سب سے بڑا خیال یہی تھا کہ چھوٹے بھائی کو عنان حکومت سنبھالنے میں کوئی قباحت نہ ہونے پائے اور کار سلطنت میں کسی طرح کا خلل یا ہرج واقع نہ ہو ڈیوک آف یارک کی کیفیت تھی انہیں دنیا کے سب سے بڑی بادشاہت ملنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ الٹا انہیں اپنے بڑے بھائی کی محبت و رہنمائی سے محروم ہونے کا رنج ہے۔ چنانچہ شاہی حلف اٹھاتے وقت انکے قدم

[illegible] نے بیرن ہاؤس کونسل سے بھی [illegible] کہ اس وقت [illegible]
[illegible] سے محروم ہو گیا ہے اُن کی دلی ہمدردی اُن کے ساتھ ہے [illegible]

وہی بات بھی اُن کی سالگرہ تھی مگر انھوں نے اس موقعہ پر معمولی خوشی کی بھی پروا نہیں کی۔ اور اپنی سلطنت میں کسی قسم کے دھوم دھام کی اجازت نہیں دی۔ خود بھی کسی تقریب میں شامل نہیں ہوئے اور خاص احباب کی دعوت بھی نہیں کی بلکہ اپنے قدیم محل میں صرف بھائیوں اور خاندانی عزیزوں کیساتھ ماحضر تناول فرمایا۔ چنانچہ اس روز نہ توپیں سر ہوئیں نہ سلامیاں لی گئیں اور نہ کہیں جلسے ہوئے اور نہ خطابات و اعزازات تقسیم کئے گئے۔ بلکہ اس مرتبہ نوروز بھی سرکاری حیثیت سے نہ منایا جائے گا اور خطابات کی فہرست کی اشاعت ایکماہ تک ملتوی رہے گی۔

شاہ ایڈورڈ تخت سلطنت چھوڑتے ہی اپنے تمام جائداد و جاگیر سے بھی دست بردار ہو گئے۔ وہ آسانی سے اپنے معمولی خطابات اور ذاتی جاگیر اپنے قبضہ میں رکھ سکتے تھے لیکن اُن کی خودداری و بلند ہمتی نے اس کو گوارا نہ کیا کہ تخت سلطنت سے کنارہ کش ہونے کے بعد وہ معمولی شہری سے سا کوئی رتبہ اپنے لئے باقی رکھیں۔

شاہ جارج ششم نے البتہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بڑے بھائی کو ہز رائیل ہائی نس ڈیوک آف ونڈسر کا لقب عطا فرمایا۔ لیکن ابھی تک کوئی خاص جاگیر علیحدہ نہیں کی گئی ہے اور شاید اس کی ضرورت بھی نہ پڑے۔

پارلیمنٹ نے صرف ڈھائی گھنٹہ کے اندر دستبرداری کا قانونی ضابطہ پاس کر دیا۔ اس موقعہ پر مدبران ملک نے جو مختصر تقریریں کیں اُن میں ضروری واقعات تو بیان کر دئے گئے لیکن ہر شخص نے شاہ سابق و مادر مہربان ملکہ میری کے جذبات کا پورا احترام ضروری سمجھا۔ مسٹر چرچل نے ملک میں کچھ خلفشار پیدا کرنا چاہا تھا لیکن پارلیمنٹ کے ہر طبقے نے اُن پر علانیہ اظہار ناپسندیدگی کیا جس کے بعد انھیں بھی چون و چرا کی ہمت نہ ہوئی۔

اخبارات اور عوام نے بھی غیر معمولی ضبط سے کام لیا۔ رعایا کے قریب قریب ہر طبقے میں شاہ سابق بیحد ہر دلعزیز تھے چنانچہ ایسے بڑے واقعہ پر انگلستان میں جو کچھ ہو جاتا تعجب نہ ہوتا۔ شروع میں عوام کے جو مظاہرے ہوئے انھیں جلدی دبا دیا گیا۔ دراصل عوام ملک کو جیسے ہی اس مسئلہ کی آئینی حیثیت اور اسکی مشکلات کا اندازہ ہو گیا اور یہ معلوم ہوا کہ خود شاہ ایڈورڈ کسی قسم کی الجھن پیدا کرنا نہیں چاہتے اور نہ اپنے ذات والا صفات کے متعلق کوئی مباحثہ پسند کرتے ہیں۔ ویسے ہی عوام نے مردانہ سکوت اختیار کر لیا شاہ و ملکہ معظمہ بھی اس قضیے کے فیصلے تک اپنے محل بکنگھم پیلس میں نہیں بلکہ اپنا ایک دوسرا قلعہ تھا اسکا میں مقیم رہے اور [illegible]
بہرحال اس اہم و نازک [illegible] سلطنت اور آئینی گورنمنٹ نے اپنے تدبیر [illegible] کا پورا ثبوت [illegible]



ہر مجسٹی ملکہ الزبتھ معہ شاہزادیاں بلند اقبال

سال نو اور زمانہ

زمانہ کیلئے یہ سال کئی معنوں سے اچھا نہیں گذرا۔ یہ اتنی مدت ہمارے لئے ایک خلائی سانحہ ہے چند سال سے بعض بیماریاں انہیں ... کیطرف زیادہ متوجہ ہو چکا ... دیتی تھیں اہم ... تھے اور ... انکا تھا ... مدت سے ... پہلے بھی ... ہمارے خیال کی تائید کی۔ بہرحال ملک کے ساتھ زمانہ کو بھی ان کی نا وقت وفات سے نقصان عظیم پہنچا۔

اس سال بعض خاص انتظامی مشکلات بھی حائل رہیں۔ مثلاً زمانہ کے مستقل کاتب کی علالت اور دیگر کاتبوں کی ... کمیابی کی وجہ سے اس کی اشاعت میں تاخیر ہو جاتی ہے جو ہمکو ناظرین سے بھی زیادہ ناگوار ہے لیکن اس کی شکایت کا ناظرین کو جو حق حاصل ہے وہ ہمیں میسر نہیں۔ ہم کئی بار کہہ چکے ہیں اور ایکبار پھر عرض کرتے ہیں کہ اردو ادب کی کساد بازاری کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ تینتیس سال کی مسلسل خدمت کے بعد بھی زمانہ کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم انتظامی مشکلات پر آسانی سے حاوی ہو سکیں۔ زمانہ اور بھی بہت سے انتظامات کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ اشاعت کے اعتبار سے بھی یہ سال ہمارے لئے حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک قدردانان زمانہ نے توسیع اشاعت کی فکر اپنے ذمہ نہیں لی ہے۔ مگر اب انہیں اس سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ اور اپنے دیرینہ خادم کے استحکام کے لئے مستعد ہو جانا چاہیئے۔

زمانہ کی زندگی کا یہ تینتیسواں سال ختم ہوتا ہے۔ آئندہ سال سے اس کا چونتیسواں سال شروع ہوگا۔ مضامین کے لحاظ سے اس سال بھی زمانہ کا معیار حسب معمول بلند رہا اور اگر ہمارے ناظرین اس سال کے شائع شدہ مضامین نظم و نثر کا دیگر معزز رسالوں کی فہرست مضامین سے مقابلہ کریں گے تو زمانہ کو شرمندگی کا موقعہ نہ ملیگا۔ ہمارے لئے یہ خوشی کی بات ہے کہ جس معیار کو سامنے رکھ کر ۱۹۰۳ء میں ہم نے زمانہ کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی وہی معیار اور وہی مقصد اب بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ پچھلے تینتیس سال کے عرصہ میں ہمارے بہت سے رفقا ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی ساتھیوں نے اس دنیائے فانی سے منہ موڑ لیا! یہ ایک دردناک داستان ہے۔ جس سے ہم اسوقت اپنے ناظرین کو بے لطف کرنا نہیں چاہتے مگر بطور نمونے کے ... سرور جہان آبادی، ... بسمل، ... اور پریم چند جیسے معاونین کے احسانات سے ہم اور ہمارے ناظرین کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں۔ آج ہمارے یہ پرانے رفیق ہمارا ساتھ دینے کو دنیا میں موجود نہیں ہیں اور جلد یا دیر میں یہ مثل ... ہم پر بھی صادق ہوگی۔ اسلئے ہمکو مقررہ معیار کے بموجب زمانہ کی آئندہ زندگی قائم رکھنے کے انتظامات سے غافل نہ رہنا چاہیئے چنانچہ کچھ عرصے سے بعض تجاویز ہمارے زیر غور ہیں اور ہمکو امید ہے کہ ہمارے ناظرین بھی زمانہ کی اعلیٰ خدمت کے استحکام میں امداد کی کوشش فرمائیں گے۔ جہانتک ایڈیٹوریل فرائض کا تعلق ہے موجودہ عملہ کے علاوہ ہمکو آئندہ سال دو دوستوں سے خاص امداد ملنے کی توقعات ہیں ... یعنی رگھوپت سہائے فراق اور ... پرشاد صاحب ... جنکی اعلیٰ نظم و نثر سے ناظرین زمانہ واقف ہو چکے ہیں۔ دونوں صاحب الہ آباد یونیورسٹی کے ... ہیں۔ دونوں تعلیم ... کے ... ہوتے ...

مستعد ہیں چنانچہ ہمیں اُن کی ذات سے اِس امر کی توقع ہے کہ وہ زمانہ کو ترقی کیساتھ جاری رکھنے میں ہمکو پوری مدد دیں گے۔ فی الحال ہم اُن سے جنوری آیندہ سے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہونے کی درخواست کر رہے ہیں۔ آئندہ جیسی ضرورت ہوگی اُن کو اس کی بقا کے لئے ہر ممکن انتظام کرنا ہوگا۔

ہمکو بھروسہ ہے کہ زمانہ کیلئے آئندہ سال گذشتہ سال سے بہتر ثابت ہوگا۔ اور ہمارے ناظرین و شائقین بھی اب خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر زمانہ کے توسیعِ اشاعت کی کوشش کیلئے تھوڑا سا وقت نکال کر اس کے استحکام کا انتظام کر دینگے تاکہ اس کے استقلال و استحکام کیلئے اسباب کی سخت ضرورت ہے کہ اس کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو تاکہ ہم اور ہمارے رفقائے کار اپنے حوصلوں کے مطابق ناظرین کی ادبی خدمت کا حق ادا کر سکیں۔

موجودہ جلد ہم زیرِ نمبر کیساتھ ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور دسمبر کا پرچہ یادگارِ پریم چند کے نام سے خاص اہتمام کیساتھ شائع کرینگے۔ اس کے صفحات کے نمبر بھی کتابی حیثیت سے علیٰحدہ رہیں گے۔ اس نمبر کیلئے خاص تیاریاں ہو رہی ہیں اور اس کے لئے بعض خاص احباب سے خصوصیت کیساتھ مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ بہت سے مضامین موصول ہو چکے ہیں مگر بعض ابھی لکھے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہم ناظرین سے اس نمبر کی اشاعت کیلئے تھوڑی سی مہلت مانگتے ہیں۔ ہمکو امید ہے کہ یہ نمبر آخر جنوری ۱۹۳۷ء تک شائع ہو جائیگا۔ مگر اس کی وجہ سے جنوری ۱۹۳۷ء کے پرچے کی اشاعت میں فرق نہ ہوگا۔ وہ بھی جنوری کے خاتمہ سے پہلے ہی حاضرِ خدمت ہوگا۔ ہمکو امید ہے کہ پریم چند کی خاطر ہمارے ناظرین اس تاخیر کو بخوشی گوارا کریں گے۔ ہمکو بھروسہ ہے کہ جو یادگار نمبر حاضرِ خدمت ہوگا اُس سے اس انتظار کی زحمت کی پوری تلافی ہو جائیگی۔ ہماری کوشش ہے کہ اس نمبر میں ہمارے مرحوم دوست کی زندگی اور اُن کے ادبی کارناموں کا ایک مکمل مرقع پیش کر دیا جائے۔

اگلے سال زمانہ میں کئی اہم مضامین شائع ہوں گے چنانچہ جنوری کا پرچہ ہمارے آئندہ پروگرام کا اچھا خاصہ نمونہ ہوگا۔

اطلاع ضروری | جن صاحبان کی خریداری کا سال جنوری سے شروع ہوتا ہے اُن سے التماس ہے کہ اس نمبر کے پہنچتے ہی آئندہ سال کی قیمت مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں۔ دسمبر نمبر کا انتظار نہ کریں۔ کیونکہ دسمبر نمبر یادگارِ پریم چند کے نام سے شائع ہوگا اور آخر جنوری ۱۹۳۷ء تک شائع ہوگا۔ اس پرچے کی ضخامت معمول سے کہیں زیادہ یعنی سوا سو صفحات سے کم نہ ہوگی۔ اور اس میں پریم چند جی کی متعدد تصاویر دی جائیں گی۔ غرض پوری کوشش ہے کہ یہ نمبر ہمارے مرحوم دوست کی مکمل یادگار اور ادبی حیثیت سے ایک قابلِ قدر اور لائقِ دید چیز ہو۔

جن صاحبوں کی قیمت ختم جنوری ۱۹۳۷ء تک بذریعہ منی آرڈر وصول نہ ہوگی اُن کی خدمت میں جنوری ۱۹۳۷ء کا زمانہ سالانہ قیمت کیلئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ ارسال ہوگا۔ قیمت طلب پیکٹ میں [illegible] ڈاک خرچ زیادہ پڑتا ہے اور منی آرڈر سے قیمت بھیجنے والے اس [illegible] نوٹ۔ قاعدہ ڈاکخانہ کے مطابق ویلیو پے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زیادہ ڈاکخانہ میں امانت نہیں رکھے جا سکتے۔ اس لئے التماس ہے کہ جو صاحبان منی آرڈر سے قیمت نہ بھیجیں وہ براہ مہربانی جنوری نمبر کا قیمت طلب پیکٹ ڈاکخانہ سے وصول [illegible] فرمالیں۔ ڈاکخانہ میں پڑا نہ رہنے دیں۔ جن صاحبوں کو آئندہ خریداری منظور نہ ہو وہ فوراً بذریعہ [illegible] منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ و نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں۔ تاکہ رقم درست [illegible]